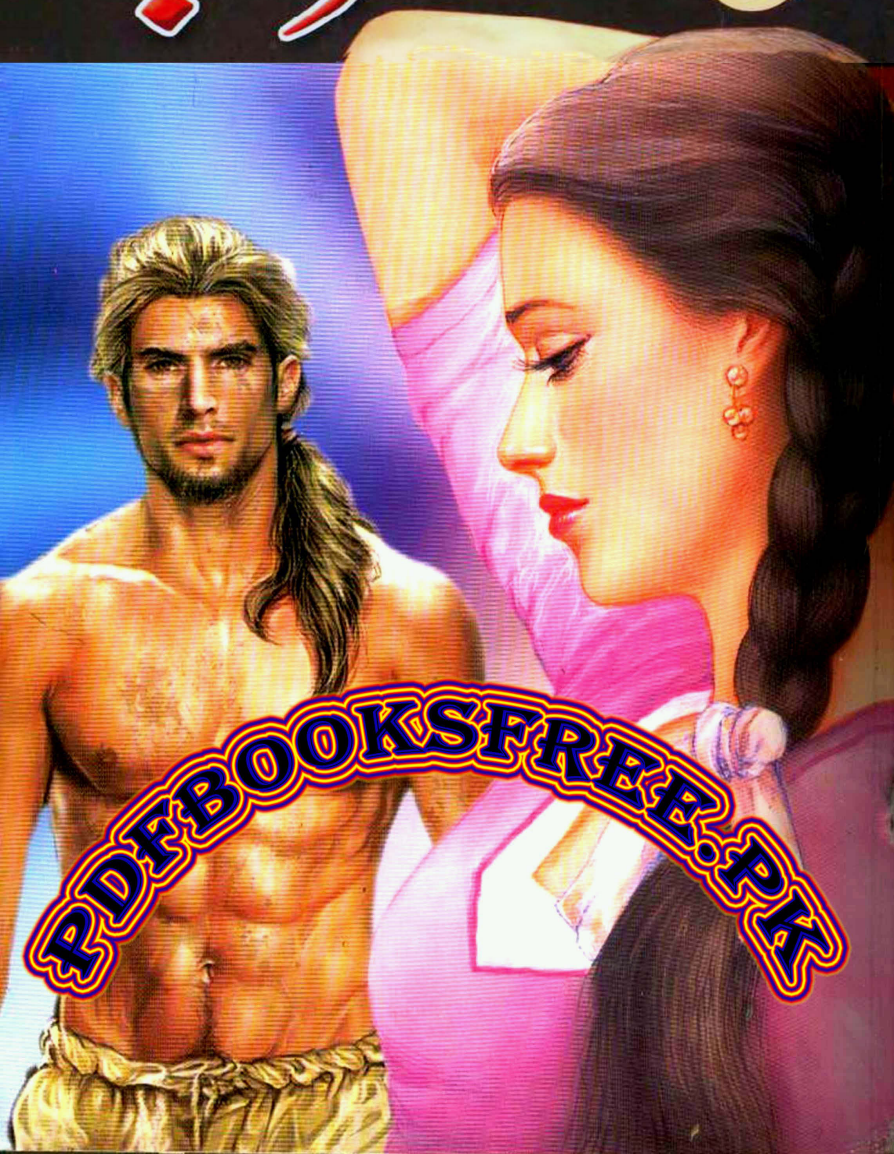


ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

14



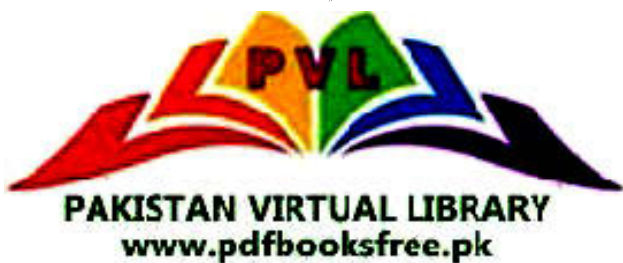
PDFBOOKSFREE.PK

ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تھلکہ خیز کہانی

سراب

چودھواں حصہ

کاشف زیر

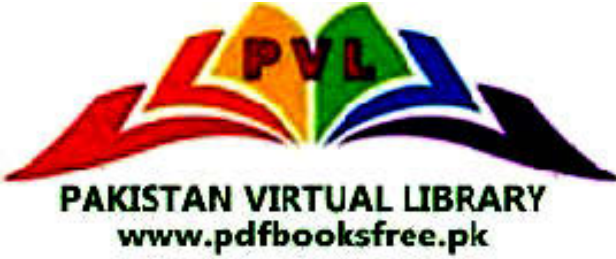


علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 37247414

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بارشاعت ————— اول
مطبع ————— یو این ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ————— عاطف رحمن۔ لاہور
قیمت ————— 250 روپے
بیرون ملک ————— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر



ISBN 978-969-517-320-6

Stokist: (U.K)

Azhar Enterprises

315, Dickenson Road

Longsight, Manchester, M13 0NR

Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علی بابا سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

ایک ہوٹل ابھی بھی کھلا ہوا تھا۔ پک اپ کی آواز سن کر اندر سے ایک نو عمر لڑکا نکلا۔ وہ یقیناً دبیر تھا اور اتنی سردی میں کسی گاہک کے چکر میں باہر آیا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو یا ہندی میں پوچھا۔

"کیا چاہتے.....؟ کھانا ہے..... کرہ بھی ہے۔"

"میرے ساتھ دوزخی ہیں ہمیں کسی اسپتال یا ڈاکٹر کا بتاؤ۔"

"میرے کو نہیں پتا۔" اس نے رکھائی سے کہا ایک نظر میں موجود افراد کو دیکھا اور واپس مڑ گیا۔ میں

نے غلت میں اسے آواز دی۔

"اے ایک منٹ میں تمہیں پانچ سو روپے دوں گا۔"

میری بات نے وہ اثر کیا جو طاقتور ترین میگنٹ بھی لوہے پر نہیں کرتا ہے۔ وہ پلٹ کر کھنچا چلا آیا۔

"کیا..... کیا دے گا۔"

"پانچ سو روپے۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم مجھے اسپتال یا ڈاکٹر تک پہنچاؤ

گے۔"

"پہلے پانچ سو روپیہ دو۔"

میں نے پانچ سو والی گڈی سے ایک نوٹ کھینچ کر اس کی طرف بڑھایا وہ لینے لگا تو میں نے کہا۔ "اندر

آؤ۔"

وہ جھجکا لیکن پھر لالچ غالب آ گیا شاید وہ سارا دن کام کر کے چالیس پچاس روپے کما تا ہو گا اس کے لئے

پانچ سو روپے بہت بڑی رقم تھی۔ وہ اندر آ گیا۔ میں نے اسے نوٹ دیا۔ "اب بتاؤ ڈاکٹر کہاں ہے۔"

"ادھر اسپتال نہیں..... ڈسپنسری ہوتا..... ڈاکٹر بھی ادھر ہی رہتا۔"

اس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر بھی ڈسپنسری میں یا اس کے پاس رہتا تھا مجھے تسلی ہوئی۔ میں اس کی رہنمائی

میں پک اپ آگے بڑھاتا گیا۔ اسے بٹھاتے وقت میں بھول گیا کہ اسلحہ والا بیگ آگے فرنٹ سیٹ کے سامنے رکھا تھا

لڑکے کے پاؤں اس سے ٹکرائے تو اندر سے لوہا بجنے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "اس میں کیا ہوتا؟"

"اوزار ہیں۔" میں نے جواب دیا مگر اس کا رد عمل بتا رہا تھا کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ بیگ میں کیا ہے۔ اس کا

جسم اکڑ گیا تھا اور وہ مجھ سے ڈر اور ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اور ڈسپنری دونوں اوپر تھے۔ پک آپ فورڈ بیل ڈرائیو تھی اس لیے کسی نہ کسی طرح اس نہایت ترجمے راستے پر اوپر چڑھ گئی۔ درحقیقت پورا قصبہ ہی بہت ترچھی ڈھلان پر آباد تھا۔ یہ پیدل کے راستے تھے جن پر میں گاڑی چڑھا لیا تھا۔ شکر ہے ڈسپنری کے سامنے جگہ ہموار اور بڑی تھی وہاں آرام سے پک آپ پارک ہو گئی۔ لڑکے نے کہا۔ ”اب ہم جاتا..... اوھر مالک انتظار کرتا۔“

”ضرور جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”پر یاد رکھنا کسی سے ہمارے بارے میں کچھ الٹا سیدھا کہا تو ہم آجائیں گے اور تم سے صرف پانچ سوئیں تمہاری جان بھی لے جائیں گے۔“

وہ سہم گیا۔ ”ہم کسی سے نہیں بو لے گا۔“

”اگر نہیں بولا تو نیچے ہوٹل میں رہنا جاتے ہوئے پانچ سو اور دے کر جائے گا۔“ میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ ”یہ تو ڈسپنری ہے ڈاکٹر کدھر ہوتا ہے؟“

”وہ اوپر والا اس کا گھر ہے نیچے سے گھنٹی بجائے تو وہ آجائے گا پر مریض دیکھنے کی فیس لے گا۔“

میں نیچے اتر آیا۔ لڑکا نیچے چلا گیا اور میں نے گھنٹی بجائی۔ اوپر سے کوئی چلایا۔ ”کائے کو آیا ہے..... اتنی رات گئے۔“

”مریض ہے اس لیے آیا ہے۔“ میں نے نیچے سے جواب دیا لہجے سے ڈاکٹر جنوب کا لگتا تھا۔ ڈسپنری سرکاری تھی لیکن لڑکا بتا چکا تھا کہ وہ فیس لیتا ہے یعنی آدمی بد عنوان تھا اور ایسے آدمی سے ذیل کرنا بہتر ہوتا ہے۔ بانو کے سر میں چوٹ آئی تھی لیکن شیا م کا زخم گولی کا تھا۔ ڈاکٹر اس کی پولیس رپورٹ پر اصرار کرتا لیکن وہ نوٹوں والا آدمی تھا اس لیے امید تھی کہ پولیس رپورٹ پر اصرار نہیں کرے گا اور ملنے والے نوٹوں سے سر دکار رکھے گا۔ ایک منٹ بعد گنجا، کالا اور چھوٹے قد کا ڈاکٹر نیچے آیا۔ اس کی شکل پر وہی مکروہ پن تھا جو اس مقدس پیشے کو کاروبار بنالینے والوں کے چہرے پر ہوتا ہے مگر اس وقت ہمیں اپنا کام نکلوانا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔

”کس کو دیکھتا ہے؟“

”دو زخمی ہیں، راستے میں حادثہ پیش آ گیا تھا۔ ایک لڑکی بے ہوش ہے۔“

اس نے سر ہلا کر ڈسپنری کا تالہ کھولا اور زخمیوں کو اندر لانے کو کہا۔ میں نے بانو کو اٹھایا جب کہ ریٹانے شیا م کو سہارا دیا اور اوشا خود چلی آئی یوں ہمارا سارا قافلہ اندر پہنچ گیا۔

ڈاکٹر نے بد مزگی سے دیکھا۔ ”یہ جلوس کدھر کولا تا ہے۔“

”ڈاکٹر باہر سردی بہت ہے دوسرے ہم تمہیں ہر چیز کی ادائیگی کو یں گے۔ اس لیے اعتراض اور بحث مت کرو مریضوں کو دیکھو۔ پہلے اس لڑکی کو دیکھو اس کے سر پر شدید چوٹ ہے۔“

ڈاکٹر نے بانو کو دیکھا تو اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے اس نے کہا۔ ”اسے اندر لاؤ۔“

اندر ایک چھوٹا سر جیکل روم تھا۔ میں نے بانو کو نیمبل پر لٹایا۔ ڈاکٹر نے اس کا زخم دیکھا اور جلدی سے ایک الماری سے ایک شیشی نکال کر اس کی دوا سرخ میں بھر کر بانو کو کونسل میں انجکٹ کر دی اور پھر اس کی نبض اور گھڑی پر نظر رکھ کر دیکھنے لگا۔ ایک منٹ بعد اس نے بانو کا ہاتھ چھوڑا اور بولا۔ ”چوٹ ٹھیک نہیں ہے اس انجکشن کا اثر نہیں ہوا ہے ایک اور انجکشن دے گا اگر اس کا اثر بھی نہیں ہوا تو لڑکی کو کسی بڑے اسپتال لے جانے کا ہے۔“

”کیا دماغ متاثر ہوا ہے؟“

”سر کا چوٹ ہے اور کیا ہوئے گا۔“ اس نے کہا اور الماری سے ایک انجکشن نکال کر اس کی سیل توڑی اور سرخ میں بھر کر اسے بانو کے بازو میں لگا دیا۔ ”انٹزل بلڈنگ ہو سکتا ہے۔“

میرے اندر رفتہ رفتہ غصہ ابھرنے لگا تھا۔ راج کنور کے پہلے ہی مجھ پر کئی قرض تھے اور اس نے بانو کے قرض کا بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر بتایا۔ ”ابھی آدھے گھنٹے بعد پتا چلے گا کیا ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے تب تک تم دوسرے آدمی کو دیکھو اسے گولی لگی ہے۔“

”گولی۔“ وہ بدکا۔ ”یہ پولیس کیس ہے۔“

”پولیس کو کیا پتا۔“ میں نے انڈین روپے کی ہزار والی گڈی نکالی اور اس میں سے دونوں نکال کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیئے۔ ”یہ رکھو، یہ معاوضہ نہیں ہے اس زحمت کا شکریہ ہے جو تمہیں ہوئی ہے۔“

ان دونوں نے اس کی مزاحمت آن واحد میں ختم کر دی تھی اور اس نے یوں نوٹ لے کر جیب میں ڈالے جیسے اس کا حق تھے۔ وہ باہر آیا شام کا معائنہ کیا اور پھر اسے بھی سر جیکل روم میں لے آیا ٹیبل پر بانو لیٹی تھی اس لیے اسے پھیل جانے والی کرسی پر بٹھایا۔ پہلے اسے زخم سن کرنے والا انجکشن دیا اور زخم صاف کیا۔ اس کے بعد اپنے آلات گرم پانی سے صاف کیے۔ گرم پانی کے لیے وہاں برز اور ششے کا برتن موجود تھا۔ نوٹ لینے کے بعد اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا کہ کیا ہوا تھا اور گولی کیسے لگی؟ اسے شام کے پاس چھوڑ کر میں باہر آیا جہاں ریٹا اور اوشا بیٹھے تھے۔ اوشا نے بانو اور ریٹا نے شام کے بارے میں پوچھا۔ ”شام ٹھیک ہے، ڈاکٹر اس کی گولی نکال رہا ہے لیکن بانو کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“

اوشا پریشان ہو گئی۔ ”تب کیا ہوگا رے؟“

”شاید اسے کسی بڑے اسپتال لے جانا پڑے لیکن ابھی ڈاکٹر نے آدھے گھنٹے کا کہا ہے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ بانو کو کسی بڑے اسپتال لے جانا خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ وہاں ہماری شناختی دستاویزات مانگی جاتیں اور مشکوک ہونے کی صورت میں پولیس کو کال کی جاسکتی تھی لیکن ڈاکٹر کا کام رہتا تو بانو کو اسپتال لے جانا بھی لازمی تھا۔ گویا خطرہ مول لینا پڑتا۔ دوسری طرف رامن اینڈ کمپنی بھی ہماری تلاش میں ہو سکتی تھی۔ یہ قصبہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا بلکہ پہلی آبادی یہی تھی اور رامن یہاں لازمی تلاش کرتا۔ وہ سب سے پہلے ہوٹلوں میں پوچھتا اور اس کے بعد یہاں تک آتا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں واپس ڈاکٹر کے پاس آیا۔ وہ شام کے زخم سے گولی نکال چکا تھا اور اب پٹی لگا کر خون روک رہا تھا۔ شام کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا مگر اب اس پر تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”سنوہم بھوکے پیاسے ہیں اگر کھانے پینے کو مل جائے تو ہم ادائیگی کریں گے؟“

”کھانا مل جائے گا چائے بھی ملے گا۔“ اس نے کہا۔ ”پانی ادھر ڈھنری میں بہت ہے۔ کھانا چائے کچھ

دیر بعد ملے گا۔“

اس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں سے فارغ ہو کر ہمارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرے گا۔ اپنا کام وہ ختم کر چکا تھا۔ صورت اور کردار سے قطع نظر وہ ماہر ڈاکٹر تھا اس نے بہت تیزی سے بانو اور شام کو ریٹ منٹ دی

تھی۔ میں بانو کے پاس آیا کھائی سے اس کی نبض دیکھی۔ پہلے کے مقابلے میں مجھے اس میں معمولی سی بہتری نظر آئی تھی۔ اس کا سانس بھی دھیمالیکن باقاعدگی سے چل رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دماغ پر لگنے والی چوٹ فی الحال خطرناک نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے شام کی پٹی سے فارغ ہو کر بانو کے سر کی بینڈیج کی لیکن اس نے زخم پر ایسی کوئی چیز نہیں رکھی جس سے خون رک جاتا یا زخم پر دباؤ آتا۔ آدھے گھنٹے میں سے بیس منٹ گزر چکے تھے۔ اپنا کام کر کے ڈاکٹر نے دوسرے کمرے میں جا کر فون اٹھا کر کسی کو مراٹھی زبان میں ہدایت دی۔ مجھے صبح سے معلوم نہیں تھا بس اندازہ تھا کہ یہ مراٹھی زبان ہے۔ وہ شاید کھانے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ میں نے درمیان میں مداخلت کی۔ ”ہم دہی ٹیرین ہیں میٹ نہیں کھاتے۔“

”ادھر بھی میٹ نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے تسلی دی۔ ”ابھی بیس منٹ میں سب آجائے گا۔“ میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”ڈاکٹر ہمارے ساتھ ایک مسئلہ اور ہے ہمیں کپڑے بگوا چائیں۔ یہ کپڑے موسم کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہیں۔“

”ادھر نیچے کپڑے کا دکان ہے۔ پردہ صبح کھلے گا۔“

”ہم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے ہیں۔ راستے میں سردی سے بچاؤ کے لیے کپڑے مل سکتے ہیں۔ اگر دکان والا ہمارے لیے زحمت کرے تو ہم اسے قیمت سے اوپر دیں گے۔“

اس نے سوچ کر کہا۔ ”اگر تم کو ایرجنسی ہے تو دکان ابھی کھل سکتا ہے میرے جاننے والے کا دکان ہے۔ پردہ یہودی ہے اس وقت اپنی مرضی کا قیمت لے گا اور ایک پیسہ بھی کم نہیں کرے گا۔“

میں خوش ہو گیا۔ ”یہ اچھی بات ہے اپنے جاننے والے کو بلاؤ میں اسے زیادہ معاوضہ دوں گا۔“

ڈاکٹر نے کسی کو کال کی اور اس سے بھی مراٹھی میں بولتا رہا انداز ایسا تھا جیسے لڑ رہا ہو۔ اس نے فون بند کیا اور بولا۔ ”بہت کھڑوس بڑھا ہے پر جنکس کا معاملہ ہے ابھی ادھر آئے گا۔“

”لڑکی کا کیا حال ہے؟“

وہ سر جیکل روم میں آیا جہاں بانو بدستور بے سدھ پڑی تھی اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض، دل کی دھڑکن اور آنکھ کی پتلی کا معائنہ کیا اور پھر سر ہلایا۔ ”کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے اب اسے بڑے اسپتال لے جانے کا ہے؟“

”بڑا اسپتال کہاں ملے گا؟“

”ادھر شملہ میں ملے گا۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ ”شملہ یہاں سے دور ہے۔“

”کدھر دور ہے بابا..... سو میل کا دوری ہے یہاں سے۔ یہ ماٹری کا علاقہ ہے شملہ تھوڑا دور ہے۔“

وہ جو نام لے رہا تھا وہ سب میرے لیے اجنبی تھے۔ مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ ہم بھارتی ریاست ہماچل پردیش میں تھے اس کے کس علاقے میں تھے اور وہ کسی دوسری جگہ سے کتنا دور تھا یہ بالکل پتا نہیں تھا۔ اس کی اطلاع نے مجھے مایوس کیا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ بانو کی حالت شاید بہتر ہو جائے اور شاید اسے کسی باقاعدہ اسپتال لے جانے کی ضرورت نہ پڑے مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور اب اسے کسی بڑے اسپتال لے

جانا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اس کی حالت کو کوئی فوری خطرہ تو نہیں ہے؟“

”ابھی تو نہیں ہے لیکن بے ہوشی کا نائم جیسے جیسے بڑھے گا خطرہ بڑھتا جائے گا۔“

تھوڑی دیر میں اوپر سے ایک لڑکا بڑے سے تھال میں گرما گرم پوریاں اور بھاتی لے آیا۔ ساتھ میں اچار اور چٹنی بھی تھی۔ بھوک نہیں تھی حالانکہ دال چاول کب کے ہضم ہو چکے تھے مگر حالات نے بھوک اڑادی تھی خاص طور سے بانو کی حالت نے۔ مگر جسم کی گاڑی چلانے کے لیے کھانا ضروری تھا۔ میں نے اوشا اور رینا کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ شام کے لیے بڑے سے گلاس میں گائے کا دودھ آیا تھا جس پر دیسی گھی تیر رہا تھا۔ یہ اس کے لیے بہترین خوراک تھی۔ میں نے کھانے کے دوران رینا سے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے تم لوگ یہیں رہ جاؤ۔“

”یہاں کیسے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”ہم بالکل خالی ہاتھ ہیں اور کچھ بھی نہیں ہے۔“

”میں تم کو اتنی رقم دے جاؤں گا کہ تمہارے نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی اور تم لوگ آرام سے چند دن یہاں رہ سکو گے۔ اس دوران میں شام کی حالت ٹھیک ہو جائے گی اور پھر تم واپس جاسکو گے۔“

رینا نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لیکن کیا تم ہم پر اعتماد کر سکتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”تمہارے جانے کے بعد ہم پولیس کو اطلاع دے سکتے ہیں۔“

”اس صورت میں تمہیں اس رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں گے جو میں تمہیں دے کر جاؤں گا وہ کسی کی رقم ہے جو میں نے اس سے زبردستی لی ہے۔ اگر تم چھپاؤ گی تب بھی پولیس اگلو الے گی اور تم جانتی ہو پولیس کس طرح اگلواتی ہے۔ پولیس کو اطلاع دے کر تم خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گی۔“

رینا سہم گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، کسی سے نہیں کہیں گے۔“

میں نے ایک یورو کی گڈی نکال کر اسے دی۔ ”یہ ایک لاکھ یورو ہیں بھارتی روپے میں ساٹھ لاکھ روپے بن جائیں گے۔ میرا خیال ہے تمہاری گاڑی اور ٹریلر کی قیمت اس سے کم ہی ہوگی۔ اس میں تم دونوں چیزیں نئی لے سکتے ہو۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”تھینک یو۔“

میں نے اسے دس ہزار بھارتی روپے بھی دیئے۔ ”یہ مقامی اخراجات کے لیے ہیں یورو چھپا کر رکھنا کسی کو پتا چل گیا تو اس رقم کے لیے تمہیں قتل بھی کر سکتا ہے۔“

رینا نے فوری طور پر رقم اپنے گریبان کے سیف میں غائب کر لی۔ ڈاکٹر سر جیکل روم میں تھا اس لیے میں نے موقع دیکھ کر یہ بات کر لی۔ میرے ذہن میں تھا کہ میں ان دونوں کو یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ یہی نہیں میں نے پک آپ بھی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کا ذکر ان لوگوں کے سامنے ضروری نہیں تھا۔ کھانے کے فوراً بعد گرما گرم چائے آگئی اور اس کے بعد ہم کچھ ضروریات سے فارغ ہوئے۔ اس دوران میں ڈاکٹر کا واقف کار آگیا تھا وہ ڈاکٹر کا دوسرا نمونہ تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور ڈاکٹر سے کہا۔ ”تمہارا واقف کار تم سے کچھ زیادہ ہی نہیں ملتا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”کیونکہ یہ میرا گامبھائی ہے پر بھگوان کسی دشمن کو بھی ایسا بھائی نہ دے۔“

”ٹھیک کہا۔“ اس کے بھائی نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ ”تیرے جیسا بھائی دینے سے بہتر ہے
نکھ بیچ دے۔“

”وہاں تم جائے گا اپنے کروت کی دج سے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا اور اس سے پہلے یہ برادرانہ لڑائی
طول کھینچتی میں نے سیز فائر کرایا۔

”بس آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟“
”سجاش گپتا۔“

”اس کی بیوی ادبش گپتا بولتی ہے۔“ ڈاکٹر نے مداخلت کی جس پر بھائی نے اسے خونی نظروں سے
دیکھا تھا اور انکشاف کیا کہ ڈاکٹر شوکیہ گپتا کو اس کی بیوی کیا کہتی تھی۔ شوکیہ کا ہم قافیہ یہ لفظ قطعی ناقابل اشاعت
تھا۔

”ڈاکٹر پلیز..... یہاں خواتین بھی ہیں۔ آپ دونوں اپنے خاندانی معاملات خاندان تک محدود رکھیں۔
میرے ساتھ ایک شدید ذہنی خاتون ہے جسے فوری کسی بڑے اسپتال منتقل کرنے ضرورت ہے۔“ اس بار میں نے
ذرا سخت لہجے میں کہا اور ڈاکٹر شوکیہ کو مزید دو ہزار پیش کیے جو اس نے بلا جھجک قبول کر لیے اس کا مطلب تھا کہ یہ
معقول فیس تھی۔ سجاش گپتا کے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”میرے یہ ساتھی صبح تک
تمہارے ساتھ ہوں گے پھر ان کی کسی ہوٹل تک رہنمائی کر دینا جہاں یہ چند دن رک سکیں۔“
”تم فکر مت کرو۔“ اس نے سرور لہجے میں کہا۔ چند گھنٹوں میں چار ہزار اکرا کر وہ خوش تھا۔ کسی بڑے شہر
کا ڈاکٹر ہوتا تو اسی کیس کے دو تین گنا زیادہ وصول کر لیتا۔

میں نے اوشا کو وہیں رکھنے اور بانو کی دیکھ بھال کرنے کو کہا۔ سجاش گپتا کی دکان نیچے سڑک پر تھی۔
رات گہری ہونے کے ساتھ دھند بھی اتنی تھی اس لیے بیس گز کے بعد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دکان چھوٹی تھی لیکن
سجاش گپتا نے اس میں دنیا جہاں کا مال ٹھونس رکھا تھا۔ نومولود بچے سے لے کر سات فٹ قد و قامت کے شخص
کے کپڑے اس کے پاس دستیاب تھے۔ میں نے اپنے لیے دو عدد جمیز جینٹس اور شرٹس کے ساتھ ہلکی جیکٹ لے
لی۔ تقریباً ایسے ہی لباس اوشا کے لیے لیے۔ البتہ بانو کے لیے ایک گرم جیکٹ اور چھوٹا کبل لے لیا۔ سجاش گپتا
کے پاس جوتے بھی تھے۔ اپنے لیے جو گرز لیے اور اوشا کے لیے ایسے لیدر شوز لیے جن میں چلنے پھرنے میں
آسانی ہو۔ یہ سارا سامان ایک بیگ میں آگیا اور سجاش گپتا نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تین گنا دام مانگے جو میں
نے ادا کیے تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا اس کا خیال تھا کہ بھادڑاؤ کے بعد میں اسے دو گنے دے دوں گا۔
”ایک چیز اور چاہیے۔“ میں نے کہا تو وہ دل و جان سے مہیا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

”حکم کرو جی۔“

”میرے پاس پک آپ ہے لیکن مجھے بے ہوش مریضہ کو لے جانا ہے اس کے لیے گاڑی درکار ہے۔“
”اوپر چکی تو نہیں ملے گی لیکن پرائیویٹ کار ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”ایک لوٹا ہے رہن کمار وہ چلاتا

ہے۔“

”اسے بلاؤ میرے پاس وقت کم ہے۔“

”وہ رات کو جاتا تو نہیں ہے لیکن میں بات کرتا ہوں۔“ اس نے موہاں نکالا۔

”اس سے کہنا میں نارٹل کرائے سے دو گنا دوں گا اور ٹپ الگ ملے گی۔“

خاصی دیر بعد رپن کمار نے کال ریسیو کی اور سبھاں گیتا کو بے نقط سنائیں۔ جواب میں اس نے بھی بہت کچھ کہا اور پھر میرے اشارے پر اصل بات پر آیا۔ پہلے تو رپن کمار نے اس وقت سو رگ جانے سے بھی انکار کیا لیکن جب سبھاں گیتا نے میری ہیکش دھرائی تو وہ زکھ جانے پر بھی راضی ہو گیا۔ وہ دس منٹ بعد آ گیا۔ نام کے برعکس وہ کسی قسم کا کمار نہیں لگ رہا تھا اس کے بجائے چینی فلموں کا ایکسٹرا لگ رہا تھا کیونکہ اس کے نقوش چینی تھے۔ اس ریاست میں رہنے والے مقامی افراد کے نقوش تبتی ہیں جو چینیوں سے مشابہہ ہیں۔ وہ بیس ایکس برس کا نوجوان تھا اور گاڑی اصل میں اس کے باپ کی تھی لیکن ان دنوں وہ دلی گیا ہوا تھا۔

”کہاں جاتا ہے؟“ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”کتنا لوگ ہے؟“

”شملہ جاتا ہے اور تین افراد ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”ایک مرینہ ہے اسے جلد از جلد شملہ کے کسی اچھے

ہسپتال تک پہنچانا ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تین ہزار ہوں گے۔“

”منظور ہے اگر تم نے جلدی اور آرام سے پہنچایا تو انعام الگ ملے گا۔“

اس نے سر کھجایا۔ ”جلدی اور آرام سے..... دونوں کام ایک ساتھ؟“

”مطلب یہ کہ رفتار تیز ہی رکھنا لیکن گاڑی کو جھکے نہ لگیں بیمار کو تکلیف نہ ہو۔“ میں نے سمجھایا۔ ”اب تم فنا

فٹ گاڑی شوکیہ گیتا کی ڈھنری تک لے آؤ۔“

میں واپس آیا سبھاں گیتا دکان میں رہ گیا تھا۔ اوشا اور رینا میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اوشا کو

کپڑے دیئے۔ ”یہ پہن کر آؤ۔“

وہ ہاتھ روم میں چلی گئی میں رینا کے ساتھ شام کے پاس آیا وہ مزید بہتر حالت میں تھا۔ ڈاکٹر شوکیہ اوپر چلا گیا تھا اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شام سے بھی بات کر لی اور اسے سمجھا دیا کہ پولیس یا میرے دشمنوں کے پاس جانے کی صورت میں نقصان انہیں ہوگا۔ ”میں نے رینا کو ایک لاکھ یورو کی رقم دے دی ہے جو تمہارے محل نقصان سے کئی گنا زیادہ ہے اور میں پک آپ بھی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر رینا کو ڈرائیونگ آتی ہے تو تم کل ہی یہاں سے جاسکتے ہو۔“

”ہم پولیس کے پاس نہیں جائیں گے اور نہ ہی ان لوگوں سے رابطہ کرنے کا ارادہ ہے۔“ شام نے مجھے

یقین دلایا۔

”تم لوگوں کی عافیت اسی میں ہے کہ جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ان لوگوں کی سفاکتی تم دیکھ چکے

ہو۔“ میں نے اسے مزید ڈرایا۔ ”اگر ان کے ہاتھ لگ گئے تو وہ اذیت دے کر ماریں گے۔“

رینا اور شام کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اوشا لباس بدل کر آئی۔ پنٹ ٹرٹ دونوں اس کے ناپ کے مطابق تھے اور وہ ان میں کہیں اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے کپڑے بدلے۔ پھر اوشا کی مدد سے بانو کو جیکٹ پہنائی۔ رپن کمار اپنی نسان

کار لے آیا تھا یہ سولہ سترہ سال پرانی کار تھی لیکن بہترین حالت میں اور اندر سے خاصی کشادہ تھی ہمیں ایسی ہی گاڑی درکار تھی۔ میں نے بانو کو اٹھا کر اس کی عقیقی نشست پر لٹایا اور اوشامی وہیں ایک کونے میں آگئی وہ بانو کو بھی سنبالتی۔ اس پہاڑی راستے پر جھٹکے لازمی تھے۔ میں آگے آجاتا۔ میں نے رپن کمار سے کہا۔ ”ڈکی کھولو سامان رکھنا ہے۔“

وہ ڈکی کھولنے لگا اور میں پک آپ کی طرف آیا تاکہ اسلحہ والا بیک لے سکوں لیکن جب میں نے دروازہ کھولا تو مجھے فرنٹ سیٹ کے آگے خلا نظر آیا تھا۔ ہاتھ مارنے پر تصدیق ہوگئی وہاں سے بیک غائب تھا۔ یک دم میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی اور میں نے بے ساختہ آس پاس دیکھا۔ میرے پاس صرف ایک پستول تھا اور اگر راسن اینڈ کمپنی یہاں آگئی تھی تو اس ایک پستول سے مقابلہ مشکل تھا۔ مگر جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں واپس کار تک آیا اور ڈکی میں کپڑوں والا بیک رکھا۔ ریٹا باہر آئی تھی۔ میں نے اسے پک آپ کی چابی دی۔

”ہوشیار رہنا دشمن یہاں بھی آسکتا ہے۔“

اس کا رنگ اڑ گیا۔ ”اب مجھے ڈر لگ رہا ہے تمہارے جانے کے بعد وہ آگئے تو.....؟“

اب تک مجھے آس پاس کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آیا تھا بلکہ سرے سے کوئی آدمی ہی نہیں تھا سردی میں سب اپنے گھروں میں مقید ہو گئے تھے دیسے بھی شہروں سے ہٹ کر گاؤں دیہات میں جلد سونے کا رواج ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے لگنے لگا کہ اسلحہ والے بیک کی گمشدگی راسن اینڈ کمپنی کا کام نہیں تھا اگر وہ یہاں تک آئے ہوتے تو صرف اسلحہ غائب کرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اب تک دھاوا بول چکے ہوتے۔ ہم سب سامنے تھے اور میں صرف ایک پستول سے مسلح تھا۔ راسن کے پاس مجھ پر قابو پانے یا مجھے قتل کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہوتا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا تھا۔ میں نے ریٹا کو مشورہ دیا۔ ”پک آپ یہاں سے ہٹا کر کھڑی کر دو اور ڈسپنری کے اندر رہنا۔“

”نہیں ڈاکٹر ہمیں اپنے مکان میں لے جا رہا ہے۔“

”یہ اور اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا اور رپن کمار کے ساتھ والی سیٹ پر آگیا۔ ”اپنا خیال رکھنا۔“

”تم لوگ بھی۔“ ریٹا نے ہاتھ ہلایا۔

رپن کمار کا بہت احتیاط سے نیچے لایا تھا۔ اس کے بازو اتنے گرپ والے نہیں تھے اور بعض جگہوں پر تو پھسل رہے تھے بہر حال ہم کسی نہ کسی طرح نیچے آگئے۔ اس نے کار آگے بڑھانے کا ارادہ کیا لیکن میں نے اسے ہوٹل کے سامنے روکایا اور اندر آیا جہاں کاؤنٹر پر ایک مقامی آدمی اوکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تمہارے ہوٹل میں ایک لڑکا کام کرتا ہے پندرہ سولہ سال کا ہوگا سر پر سرخ اونٹنی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔“

”رگھو۔“ آدمی نے کہا۔

”ہاں.....“

”وہی مجھے اسے شپ دینا تھی۔ وہ کہاں ہے؟“

آدمی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ حرامی تو چلا گیا۔ نوکری چھوڑ گیا۔“

”کہاں گیا اس کا گھر کہاں ہے۔“

”پیچھے پہاڑوں میں کہیں رہتا ہے یہاں کام کرتا تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے آیا اور اپنا حساب کر کے چلا گیا۔“

لڑکا میری توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا تھا اس نے اسلحہ والا بیک دیکھ لیا تھا اور موقع پا کر اسے نکال لیا۔ اسے اسلحہ کی قیمت کا اندازہ تھا اسی لیے وہ جگت میں نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ اسلحہ وہ اچھے داموں فروخت کر سکتا تھا۔ اس پر رے خطے میں غیر ملکی اسلحہ کی مانگ تھی اسے گاہک تلاش کرنے میں دشواری پیش نہ آتی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ اس کے پیچھے جاتا۔ اگر بانو کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید میں جانے کا سوچتا لیکن اس وقت میں بالکل نہیں جاسکتا تھا۔ میں آدمی کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ رہن کمار نے کوئی سوال کیے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس میں بیٹھ نہیں تھا لیکن بند کھڑکیوں کے ساتھ اس کی ضرورت نہیں تھی اور جیسے جیسے ہم نیچے جاتے موسم اور بہتر ہو جاتا۔ شملہ کے بارے میں، نہیں صرف اتنا جانتا تھا کہ کسی زمانے میں وہاں شملہ معاہدہ ہوا تھا اور یہ گرمائی تفریحی مقام تھا۔ البتہ رہن کمار شملہ کے بارے میں خاصا جانتا تھا۔ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا۔

”صاحب یہ عجیب جگہ ہے ادھر ایک ہی وقت میں ایسا موسم ہوتا ہے کہ آدمی کوئی شرٹ میں گرمی لگتی ہے اور شہر کے اوپر والے حصے میں آدمی کو گرم کپڑوں کے ساتھ جیکٹ لینا پڑتی ہے۔ ادھر عام کپڑوں میں گزرا نہیں ہوتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے صاحب کہ شملہ کا نچلا حصہ صرف تین سو میٹر اونچا ہے سی لیول سے اور اوپر والا حصہ بائیس سو میٹر اونچا ہے۔ تو فرق ہوا نا؟“

یہ واقعی حیرت انگیز بات تھی کہ ایک ہی شہر میں بلندی کا اتنا فرق تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ لاہور اور مری کی بلندی کا فرق تھا جو ایک ہی شہر میں پایا جاتا ہے۔ اسلام آباد بھی پانچ سو میٹر بلند ہے۔ اس کے پاس بلند ترین جگہ دامن کوہ کے اوپر والے پہاڑ ہیں جو تقریباً سترہ سو میٹر اونچے ہو جاتے ہیں۔ رہن کمار نے بتایا کہ سردیوں میں جب اوپر شدید برف پرتی ہے تو وہاں کے رہنے والے نیچے آ جاتے ہیں۔ نیچے بھی سردی تو اچھی خاصی ہوتی ہے لیکن برف نہیں پڑتی ہے۔ میں رہن کمار کی باتوں سے ذہن بٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بانو کے لیے تشویش بڑھ رہی تھی۔ جب ہم روانہ ہوئے تو اسے بے ہوش ہوئے تقریباً تین گھنٹے گزر چکے تھے اور اس کی بے ہوشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے خطرہ بڑھ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ زخم اس کے دماغ کو متاثر کرتا اس کا علاج ضروری تھا۔ شملہ بڑا شہر تھا مجھے امید تھی کہ وہاں ایسا اسپتال ضرور ہوگا جہاں بانو کا علاج کیا جاسکے۔

ایک خدشہ یہ تھا کہ راستے میں پولیس نہ روک لے۔ اسے دکھانے کے لیے ہمارے پاس کوئی شناختی چیز نہیں تھی اور صرف ایک پستول کی مدد سے میں پولیس والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ راسن اینڈ کمپنی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ پولیس کو خبردار نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ خود جرم کر رہے تھے۔ مگر ساتھ ہی ایک سوہوم سا خدشہ تھا کہ راسن سابق راء ایجنٹ تھا وہ اپنے سوسر استعمال کر سکتا تھا اور بھارت کی خفیہ ایجنسیوں کو میرے پیچھے

لگا سکتا تھا مگر ابھی تو وہ خود مجھے تلاش کر رہا تھا۔ یہ حربہ وہ ناکام ہونے کے بعد استعمال کرتا کیونکہ میں اگر بھارتی ایجنسیوں کی گرفت میں آتا تو اس کے بھی پول پٹنے کھل جاتے۔ خاص طور سے وہ کنور ہیلز میں جس کھیل میں لوٹ تھا یہ اس کے گلے پڑ جاتا۔ میں نے رہن کمار سے پوچھا۔ ”راتے میں چیک پوسٹ تو نہیں آتی ہیں؟“

”آتی ہیں لیکن وہ گاڑی کے کاغذات دیکھ کر جانے دیتے ہیں۔“

”تلاشی لیتے ہیں؟“

”نہیں جب تک کوئی لٹوانہ ہو تلاشی نہیں لیتے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ایک گھنٹے بعد پہلی چیک پوسٹ آئی اور رہن کمار چند منٹ میں کاغذات دکھا کر واپس آگیا۔ دوسری چیک پوسٹ شملہ میں داخل ہونے سے پہلے ملی اور یہاں بھی معاملہ خیر و عافیت سے منٹ گیا۔ کار اور ڈرائیور لینے کا یہ فائدہ ہوا کہ مجھے خود کسی سے بات نہیں کرنا پڑی۔ اگر میں پک آپ لے آتا تو مجھے پہلی چیک پوسٹ پر دھر لیا جاتا۔ چند منٹ بعد ہم شملہ کے تاریخی شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ میں نے رہن کمار سے کسی اچھے اسپتال کا کہا تھا لیکن وہ یہاں اسپتالوں سے واقف نہیں تھا لیکن اس نے کہا۔ ”فکرمات کرو صاحب ادھر ہوٹل میں سارا انفارمیشن ملتا ہے۔“

شملہ انڈیا کا ٹورسٹ ہب کہلاتا ہے اور یہاں سیاحوں کی سہولت کے لیے بے شمار ادارے اور افراد کام کر رہے ہیں۔ رہن کمار نے ایک قمری اسٹار ہوٹل کے سامنے کار روکی اور اندر جا کر اسپتال کے بارے میں معلوم کر کے آگیا۔ اس نے بانو کی حالت بتائی تھی اور ہوٹل میں چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے ٹورسٹ گائیڈ کاؤنٹر سے معلوم کر لیا کہ اسے کس اسپتال لے جایا جائے جہاں اسے بہترین ٹریٹ منٹ مل سکتی تھی۔ میں نے ایسی کوئی چیز پاکستان کے کسی ٹورسٹ پوائنٹ پر نہیں دیکھی ہمارے ہاں عام طور سے لوگوں کو یہی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ان کے ہوٹل یا دکان کے آگے والی عمارت یا دکان میں کیا ہے؟ رہن کمار نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر ایک نندو مائرسٹ ہاسپٹل ہے پر مہنگا ہے۔“

”رقم کا مسئلہ نہیں ہے لیکن ہمارے پاس کاغذات نہیں ہیں۔“

”صاحب ہوا کیا تھا؟“ رہن کمار نے پہلی بار مجھ سے کوئی سوال کیا۔

”راتے میں گاڑی کو حادثہ پیش آیا وہ سامان سمیت کھائی میں گر گئی اور ہم مشکل سے اپنی جانیں بچا سکے

تھے میری بہن کو اسی دوران میں چوٹ لگی۔ ڈاکٹر شوکیہ کہہ رہا تھا کہ دماغ پر چوٹ لگی ہے۔“

اس نے مجھے تسلی دی۔ ”یہ کوئی سرکاری ہاسپٹل توڑی ہے جو کاغذات مانگتے گا۔“

کچھ دیر بعد رہن کمار نے نندو ماہاسپٹل کے سامنے کار روکی۔ یہ وسطی شملہ میں کئی منزلہ اور خاصا بڑا ہاسپٹل تھا۔ ایمرجنسی ایریا میں کاررکتے ہی دوپہر امیڈک آگے آئے۔ میں نے اترتے ہوئے انہیں اسٹریچر لانے کو کہا۔ جب تک میں نے بانو کو گود میں اٹھا کر باہر نکالا وہ اسٹریچر لے آئے تھے۔ بانو کو اس پر لٹایا اور وہ اندر لے جانے لگے میں نے رہن کمار سے کہا۔ ”تم یہیں پارکنگ میں روکنگن ہے تمہاری عریض ضرورت ہو۔“

”ہم ادھر ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

ادشا میرے ساتھ آئی تھی۔ ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے فوری طور پر بانو کو انیڈ کیا اور مجھ سے تفصیل

پوچھی۔ میں نے چوٹ کی نوعیت اور ڈاکٹر شکیہ کا خدشہ بیان کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”سی ٹی اسکین کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کے پاس رقم ہے تو میں ہزار روپے کا ڈنٹر پر جمع کرا کے رسید لے لیں ان کا سی ٹی اسکین کرنا ہے۔“

”میں جمع کراتا ہوں آپ ٹریٹ منٹ شروع کریں۔“ میں نے کہا اور کا ڈنٹر پر آیا۔ یہاں بانو کا نام ریٹا و جے اور اپنا نام شیا م و جے بتایا تھا فوری طور پر ذہن میں یہی نام آئے تھے۔ اوشا کا نام کسی نے پوچھا نہیں۔ بانو سے رشتہ بہن کا بتایا تھا جس پر اوشا خوش ہوئی تھی۔ ورنہ وہ بانو سے بھی جلتے لگی تھی۔ کوائف کے ساتھ میں نے بیس ہزار روپے جمع کرائے۔ مجھ سے میرے یا بانو کے کاغذات نہیں مانگے گئے تھے۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سارے کام نمنا کر ہم ویننگ روم میں آگئے۔ یہ خاصا آرام دہ اور اضافی سہولتوں سے آراستہ ویننگ روم تھا۔ ایک کونے میں چائے کافی، کولڈ ڈرنک اور اسٹیکس کی مشینیں لگی تھیں۔ لوگ اس میں مطلوبہ قیمت ڈال کر چیز نکال سکتے تھے۔ یہ سب کچھ مناسب داموں پر دستیاب تھا۔ سہولت کے نام پر لوٹ مار نہیں تھی۔ میں اپنے لیے کافی اور اوشا کے لیے چائے نکال لایا۔ اس نے کافی لینے سے انکار کیا تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے اور ہم گزشتہ بیس گھنٹے سے مسلسل بھاگ دوڑ میں تھے۔ نہایت دشوار گزار سفر کیا تھا۔ باقی وقت میں بھی کوئی آرام نہیں ملا تھا اس لیے ہم دونوں کا تھکن سے برا حال تھا۔ خاصی دیر بعد پہلا موقع تھا کہ ہم سکون سے بیٹھے تھے کیونکہ اب ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ ویننگ روم میں نشستیں آرام دہ تھیں اس لیے اوشا تو چائے پی کر دیں دراز ہو گئی۔ ویسے بھی اس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے ہم بے تکلفی سے اٹھ بیٹھ سکتے تھے۔ میں نیم دراز تھا اور منتظر تھا کہ ڈاکٹر بانو کے بارے میں بتائے میں نے اوشا کو سمجھا دیا تھا کہ یہاں مجھے شہباز نہ کہے اور بانو کا لفظ بھی زبان پر نہ لائے۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم سمجھتے ہیں رے سب سن لیا ہے۔“

”دوسروں کے سامنے تم نہیں بولو گی ورنہ وہ تمہاری زبان سن کر چوٹ کھاتے ہیں۔“

”اسی لیے تو خاموش ہیں رے۔ ہم بدھی کم رکھتے ہیں پر پاگل نہیں ہیں۔“

”تم تو خود دوسروں کو پاگل بنادو۔“

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھے اور مسکرائی۔ ”تو تو نہیں بنا پاگل؟“

میں اسے کیا بتاتا آدمی محبت کا پاگل پن ایک بار کرتا ہے اور میں یہ پاگل پن کر چکا تھا۔ ”میں اس قسم کا

آدمی ہی نہیں ہوں۔“

”ہم نے تو آج تک ایسا آدمی ہی نہیں دیکھا۔ اگر تجھے چھو کر نہ دیکھا ہوتا تو پسنا سمجھتے۔ بھگوان سمجھتے۔“

”لاحول ولا.....“

میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”میں انسان ہوں اور مجھے انسان رہنے دو۔ تم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے رے ابھی دیکھا ہی کیا ہے، بچپن سے جوانی تک باپو کو دیکھا۔ پھر راج محل کے

لوگوں کو دیکھا۔“

”دنیا اس سے کہیں بڑی ہے اور اس میں بہت کچھ ہے اب تم وہاں سے نکل آئی ہو اس لیے بہت کچھ

دیکھو گی۔“

”شہباز تو ہمیں اپنے ساتھ رکھے گا نا؟“

”ہاں جب تک حالات اجازت دیتے ہیں۔“

”حالات کیا؟“

”تم دیکھ رہی ہو میں کیسے مارا مارا پھر رہا ہوں اگر حالات تمہیں مجھ سے جدا کر دیں تو میں کیا کر لوں گا۔“

”اچھا اگر ہم پھنجر گئے تو ہمیں تلاش کرے گا؟“

”کیوں نہیں..... جب تک میں تمہارے بارے میں مطمئن نہیں ہو جاتا تمہیں اپنے ساتھ ہی رکھوں گا۔“

اوشا کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر آگیا یہ وہی ڈاکٹر تھا جس نے بانو کا معائنہ کیا تھا۔ ”ڈاکٹر ریٹا کیسی

ہے؟“

”ناٹ بیڈ..... بٹ ناٹ گڈ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”برین کور پر سولین ہے۔“

”وہ ٹھیک ہو جائے گی؟“

”ہاں سولین ریوود کرنے کے لیے ایک مائنز آپریشن کرنا پڑے گا اس کے لیے آپ کو کچھ ڈاکو منٹس سب

مٹ کرنا ہوں گی۔“

”ڈاکٹر ہم دلی سے آئے ہیں اور ہماری گاڑی کو حادثہ پیش آگیا اس میں سب تباہ ہو گیا ریٹا کو چوٹ آئی

ہے اب ہمارے پاس کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے آپ ایڈمٹنٹی نہیں ہے تو کوئی ریفرنس دے سکتے ہیں۔ آپریشن کے لیے یہ لازمی ہے۔ اس کے

بغیر آپریشن نہیں ہوگا۔“

”دیکھیے یہ اس کی زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔“

”آئی نو..... بٹ اٹ ایز روڈز آف اوور ہاسپٹل..... اور میں کوئی بہت مشکل کام تو نہیں کہہ رہا ہوں۔“

آپ آسانی سے دلی یا پورے انڈیا سے کسی کا بھی ریفرنس دے سکتے ہیں۔ وہ شخص تصدیق کر دے کہ آپ کو جانتا

ہے تو کام ہو جائے گا۔“

میں سوچ رہا تھا کہ اس دشمن سرزمین پر کس کا حوالہ دوں یہاں ایک بھی ایسا مہربان نہیں تھا جو تصدیق

کرنے کے لیے تیار ہو جاتا جو جانتے تھے وہ میری جان کے دشمن تھے۔ اچانک مجھے رانا دیاس کا خیال آیا۔ راجا

عمر دراز کا دوست ہونے کے ناطے وہی انڈیا میں میرا ہمدرد ہو سکتا تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور ڈاکٹر سے کہا۔

”مجھے ایک فون کی ضرورت ہے اور ڈائریکٹری بھی چاہیے۔ حادثے میں میرا سیل فون بھی برباد ہو گیا سارے

کونٹیکٹس اسی میں تھے۔“

”آئیے میرے ساتھ، فون ڈائریکٹری نہیں ہے لیکن ہیلپ لائن سے آپ نام بتا کر کسی کا نمبر لے سکتے

ہیں۔“

وہ مجھے ایک کمرے میں لایا اور پھر اکیلا چھوڑ گیا۔ میں نے پہلے ہیلپ لائن سے رانا دیاس کے محل کے

نمبر زمانگے آپریٹر نے مجھے درجن بھر نمبر دکھوا دیئے۔ میں نے پہلا نمبر ملایا اور محل کی سنسنی خیز لہجے والی آپریٹر

نے کال ریسیو کی۔ میں نے کہا۔ ”رانا صاحب سے بات کرنی ہے؟“

”کون سے رانا صاحب؟“ اس نے رس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”رانا دیاس؟“

”وہ تو اس وقت آرام کر رہے ہیں اور اس وقت کسی سے بات نہیں کر سکتے ہیں۔“

”اچھا ان کے سیکرٹری یا محل کے کسی اہم آدمی سے بات کرائیں یہ ایمر جنسی ہے۔“

”آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں؟“

”آپ کہہ سکتی ہیں کہ میں راجا عمر دراز کے ریفرنس سے بات کر رہا ہوں۔“

”ایک منٹ ہولڈ کریں۔“ اس نے کہا اور میز پر بجنے لگا۔ ایک منٹ بعد ایک مرد لائن پر آگیا۔

”شاد احمد سیٹنگ آپ کون ہیں۔“

”شاد صاحب مجھے ایمر جنسی میں رانا دیاس صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”اس کے لیے راجا عمر دراز کا حوالہ کافی نہیں ہے۔ اپنا تعارف بھی کرائیں۔“

”بعض وجوہات کی بنا پر میں اپنا تعارف نہیں کر سکتا لیکن آپ رانا صاحب کو مزید حوالہ دے سکتے ہیں کہ

ہاتھ والا بات کرنا چاہتا ہے۔ میں بتا دوں کہ یہ ایمر جنسی ہے اور رانا دیاس صاحب سے بہر صورت رابطہ لازمی ہے۔“

”آپ کچھ دیر ہولڈ کریں۔“ اس نے کہا اور پھر میز پر چلنے لگا۔ میں صبر سے انتظار کرنے لگا۔ طویل فاصلے کی یہ کال یقیناً مہنگی تھی لیکن یہ لوگ مجھ سے کال بھی چارج کر سکتے تھے۔ بیس ہزار روپے پیشگی جمع کرا کے میں نے یہ استحفاظ حاصل کر لیا تھا۔ تقریباً تین منٹ بعد رانا دیاس خود لائن پر تھا اس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

”تم ہاتھ والے بات کر رہے ہو؟“

”اگر آپ میری آواز پہچان سکتے ہیں تو.....“

”ٹھیک ہے لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ رانا دیاس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اس بار بھی خود نہیں آیا ہوں لایا گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میری ایک ساتھی شملہ کے نندورما ہاسپٹل

میں داخل ہے اور اس کی برین سرجری ہونی ہے اس کے لیے انتظامیہ کو کسی کاریفرنس چاہیے۔ میرے ذہن میں صرف آپ ہیں۔“

”میں سمجھ گیا میری بات کراؤ۔“

میں ہولڈ کرا کے باہر آیا ڈاکٹر موجود تھا اس نے اندر آکر رانا دیاس سے بات کی اور جب اس نے اپنے حوالے دیئے تو ڈاکٹر فون پر مودب ہو گیا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”آپ تو اتنی بڑی شخصیت ہیں کہ آپ سے بات کرنا ہی میرے لیے اعزاز کی بات ہے..... جی آپ بالکل بے فکر رہیں..... مس رینا کو مکمل کیئر دی جائے گی۔ ہمارا اسٹینڈرڈ انٹرنیشنل ہے۔“ اس نے بات کر کے فون میری طرف بڑھا دیا۔

”جی رانا صاحب۔“

”میں نے بات کر لی ہے تم اخراجات کی طرف سے بھی بے فکر رہو بل میں ادا کروں گا۔“

”نہیں رانا صاحب آپ کا یہی احسان کم ہے بل کا مسئلہ نہیں ہے۔“

”سٹ آپ۔“ اس نے شفقت سے کہا۔ ”جب بڑے کچھ دے رہے ہوں تو چھوٹوں کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں تم کہاں رکے ہو؟“

”فی الحال تو کہیں بھی نہیں.....“

”یہاں ایک ہوٹل ہے ہمالیہ ہوٹل کے نام سے..... تم وہاں چلے جانا اور میرا حوالہ دو گے تو کمرے مل جائیں گے اور کوئی تم سے نام بھی نہیں پوچھے گا۔“

”اب میں پہلے سے زیادہ احسان مند ہوں۔ مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔“

”پھر وہی بات..... خیر تم اپنا کام کرو اور جلد از جلد واپس چلے جاؤ اگر اس میں مسئلہ ہو تو مجھے کال کرنا۔“

رانا دیاس سے بات کرتے ہی میرے لیے راتے کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ مگر اس نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ میں جتنی جلدی ہو سکے بھارت کی حدود سے نکل جاؤں یہاں میرے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو پھر رانا دیاس بھی میرے لیے شاید ہی کچھ کر پاتا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ فون پر محتاط تھا اس نے کوئی نام نہیں لیا حد یہ کہ عمر دراز کی بات نہیں کی اور نو دی پوائنٹ بات کر کے فون بند کر دیا۔ میں ڈاکٹر کے پاس آیا۔ ”ڈاکٹر کس نوعیت کی سرجری ہے۔“

”یہ ہلکی قسم کی سرجری ہوتی ہے اس میں کھوپڑی کھولنا نہیں پڑتی ہے۔ ہم ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے آپریٹ کر لیتے ہیں اور کا میاب سرجری کی صورت میں آدمی تین سے چار دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ اس اسپتال میں بین الاقوامی معیار کی سہولیات تھیں۔ رانا دیاس سے بات ہونے کے نصف گھنٹے کے اندر بانو کو آپریشن روم میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس دوران میں اس کے تمام ضروری ٹیسٹ ہو گئے تھے اور اس کے گروپ کا خون مہیا کر لیا گیا تھا۔ زخم کان کی سیدھ میں ماتھے کے ساتھ بالوں کے نیچے تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق آپریشن تقریباً دو گھنٹے جاری رہ سکتا تھا۔ تب تک یہاں رکنابیکار تھا۔ میں اوشاکو لے کر باہر آیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کی فیس پر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جب میں باہر آ رہا تھا تو کاؤنٹر پر موجود آدمی نے مجھے بلا کر جمع کرائی بیس ہزار کی رقم بھی واپس کر دی تھی۔ رہن کمار پارکنگ میں اپنی کار میں سو رہا تھا میں نے اسے جگایا۔

”آپ صاحب..... اب کدھر چلنا ہے؟“

”ہمالیہ ہوٹل دیکھا ہوا ہے؟“

”بالکل دیکھا ہوا ہے۔“ اس نے مستعدی سے کہا۔

”بس تو اس طرف چلنا ہے اور اگر میں جہیں مستقل ہاؤز کرنا چاہوں۔ میرا مطلب ہے آنے والے تین

چار دن کے لیے؟“

”کیوں نہیں صاحب۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”بالکل ہو گا، دن کے ہزار روپے ہوں گے اور ڈیزل آپ ڈلو او

گے۔“

”میں چندرہ سودوں گا ڈیزل بھی اس میں شامل ہو گا یہ ٹھیک ہے؟“

”ایک دم ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو گیا۔

ہمالیہ ہوٹل مزید بلندی پر تھا اور یہاں سے دور تک پھیلی روشنیوں کا نظارہ بھلا لگ رہا تھا۔ ہوٹل جدید ترین اور شیشوں والی عمارت میں تھا۔ بہ ظاہر یہ کسی چین ہوٹل کا نہیں تھا لیکن اس کا معیار کسی مشہور فائیو اسٹار ہوٹل سے کم نہیں تھا۔ ہم اندر آئے۔ ریسپشن پر دو خوب صورت لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک نے شیشے آئینے میں پوچھا۔ ”میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

اوشا اس کی زبان نہیں سمجھی تھی لیکن اس کے لگاؤٹ بھرے انداز پر اس نے برا مانایا اور گھور کر اسے دیکھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”میں رانا دیاس کے ریفرنس سے آیا ہوں۔“

اس نے اپنے سامنے رکھے ایل سی ڈی پر چپک کیا۔ یہ جدید ترین ٹچ اسکرین ایل سی ڈی تھا۔ پھر مسکرائی۔ ”بالکل ریفرنس موجود ہے میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

”مجھے دو سنگل روم چاہئیں لیکن کمرے ساتھ ہوں۔“

لڑکی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت دکھائی دی تھی کہ میں اوشا کے لیے الگ کمرہ لے رہا تھا۔ مگر اس نے اعتراض نہیں کیا۔ تیسرے فلور کے دو کمروں کی چابیاں اس نے کاؤنٹر پر رکھیں۔ ایڈوائس کا پوچھنے پر حسب توقع اس نے انکار کر دیا اور بولی۔ ”تمام پے منٹس مسٹر رانا دیاس کے ذمے ہیں آپ ہوٹل کی ہر سروس ان کے بی ہاف پر استعمال کر سکتے ہیں۔“

میں نے بوجھ سا محسوس کیا۔ رانا دیاس عمر دراز کا دوست ہونے کے ناطے میرے لیے بڑا اور قابل احترام تھا اور اس نے پہلے بھی میرے اور میرے ساتھیوں کی بے لوث مدد کی تھی لیکن اس طرح سے میری ہر ذمہ داری اٹھالینا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا اگر میرے پاس رقم نہ ہوتی تب بھی میں اس سے یا کسی سے مدد لینا پسند نہ کرتا۔ مگر اب مجبوری تھی میں اس معاملے میں انکار کر کے اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک اسمارٹ بیل بوائے نے ہمیں ہمارے کمروں تک پہنچایا۔ میں نے کپڑوں کا بیگ لے لیا تھا۔ ویسے ضرورت نہیں تھی مگر میں سوچ رہا تھا کہ صبح ہوتے ہی ہوٹل اور اپنی شخصیت کی مناسبت سے کپڑے لے لینے چاہئیں۔ ہم نے جو پہنا ہوا تھا وہ اس معیار کا نہیں تھا۔ اوشا کو پینٹ شرٹ کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ بھی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ بیل بوائے کو ٹپ کے ساتھ رخصت کر کے میں اوشا کے کمرے میں آیا۔ اس نے کمرے کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی محل سے کم نہیں ہے رے۔“

رانا دیاس جس ہوٹل میں رکنا ہوگا اسے اسی معیار کا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اوشا سے کہا۔ ”تم دروازہ بند کر کے سو جاؤ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ فون اٹھا کر نمبر دبا کر کہہ سکتی ہو چیز یہیں پہنچ جائے گی۔“

”ہم سمجھتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اس وقت تو دل چاہ رہا ہے بس اشان کر کے سو جائیں۔“

”ایسا ہی کرو، میں ابھی اسپتال جاؤں گا اور شاید وہاں سے دیر سے واپس آؤں تم پریشان مت ہونا۔ یہ کمرے کی چابی سنبھال لو۔“

میں اپنے کمرے میں آیا۔ دو دن سے نہانے کا موقع نہیں ملا تھا اور پہاڑوں اور جنگلوں میں پھر کر حلیہ اب ہو رہا تھا۔ نہا کر تھکن کم ہوئی تھی۔ میں نے باہر آ کر کافی کا آرڈر دیا۔ ابھی ایک گھنٹہ گزر رہا تھا آدھے گھنٹے

بعد میں دوبارہ اسپتال جاتا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر ڈاکٹرز نے چوبیس گھنٹے میں بانو کو چھٹی دے دی تو میں اسے ریلیز کرا کے یہیں لے آؤں گا۔ اسپتال عوامی جگہ تھی اور وہاں کسی وقت بھی شناخت کا مسئلہ سامنے آ سکتا تھا یہاں یہ خدشہ نہیں تھا۔ بانو کے مکمل صحت یاب ہوتے ہی ہم یہاں سے نکل کر جاسکتے تھے۔ کافی پی کر میں نیچے آیا اور چابی کاؤنٹر پر جمع کرا دی۔ ”میری ساتھی اوپر آرام کر رہی ہے اس کا خیال رکھیے گا۔“

”آپ فکر نہ کریں رانا صاحب کا نام ہی کافی ہے اب آپ اور آپ کی ساتھی مکمل طور پر ہماری ذمہ داری ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہوٹل کے یہ دونوں کمرے بک ہی نہیں ہیں۔“ لڑکی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کوئی یہاں آپ تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔“

گلتا ہے رانا دیاس نے کچھ زیادہ ہی بریف کر دیا تھا۔ میں مطمئن ہو کر باہر آیا۔ رہن کمار ہوٹل کے باہر موجود تھا کیونکہ اسے پارکنگ میں رکنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ میں نے یہاں تک آنے کی رقم ادا کر دی تھی۔ اس لیے وہ مطمئن تھا۔ ہم اسپتال پہنچے۔ کیونکہ اس بار امیر جنسی نہیں تھی اس لیے گاڑی باہر رکوالی اور رہن کمار سے انتظار کرنے کو کہا۔ میں امیر جنسی کی طرف بڑھا کیونکہ فی الحال بانو وہیں تھی۔ ابھی میں کچھ دور تھا کہ ایک گاڑی تیزی سے میرے پاس سے گزری اور امیر جنسی کے سامنے رکی اور پھر اس سے جو شخص اتر ا سے دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا وہ رامن تھا اور مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اسٹریجر والوں کو اشارہ کیا اور وہ اسٹریجر لے کر نیچے آئے۔ رامن کے ساتھ آنے والے نے اس کے ساتھ مل کر عقبی نشست سے ایک آدمی کو اٹھا کر اسٹریجر پر ڈالا۔ میں اتنی دیر میں ایک درخت کی آڑ میں ہو چکا تھا اور میں دوبارہ اچھل پڑا کیونکہ اسٹریجر پر لیٹا ہوا شخص راج کنور تھا۔ وہ شدید زخمی اور بے ہوش لگ رہا تھا۔ اس کے سفید لباس پر جا بے جا خون کے دھبے تھے اور وہ ساکت تھا۔ اس کے لیٹنے ہی جیمر امیڈک اسٹریجر اندر لے گئے۔

میں اس اتفاق پر حیران تھا جہاں میں بانو کو لے کر آیا تھا وہیں رامن راج کنور کو لے آیا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ راج کنور کا دشمن تھا پھر وہ اسے اسپتال کیوں لے کر آیا تھا۔ اس کا اور منشی جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً سے بیشتر اس کا کام تمام کر دیں۔ وہ اس وقت اپنے سابق آقا کے لیے سخت پریشان لگ رہا تھا۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ جب میں نے راج کنور کو چھوڑا تو وہ تقریباً ٹھیک تھا گولی نکالنے کے بعد اس کا زخم بھی بہتری کی طرف مائل تھا پھر اس کے ساتھ کیا ہوا کہ وہ اس حالت میں اسپتال تک پہنچا تھا۔ رامن باہر موجود تھا اور موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ شکر ہے یہاں آتے ہوئے اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ورنہ وہ یقیناً راج کنور کو بھول کر میرے پیچھے پڑ جاتا۔ اسے موبائل پر بات کرتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میرے پاس موبائل نہیں تھا دوسرے مجھے اپنے پیارے یاد آئے جو میرے لیے بے قرار ہوں گے اور پاگلوں کی طرح میری تلاش میں ہوں گے میں انہیں اطلاع دے سکتا تھا کہ اب آزاد ہوں۔ مگر فی الحال رامن کے خطرے سے نجات حاصل کرنی تھی اگر وہ اندر بانو کو دیکھ لیتا تو اس کے لیے خطرہ بن جاتا۔ ایک بار بانو کے بارے میں انکشاف ہوتا کہ وہ پاکستانی ہے تو بات پولیس تک چلی جاتی اور پھر میری اور اوداش کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیے اور میرے ذہن میں ایک ہی خیال آیا تھا۔ پستول میری جیکٹ میں موجود تھا۔ میں راستے کے بجائے باغ والے حصے میں درختوں اور تاریکی کی آڑ لیتے ہوئے

راسن کی طرف بڑھا اب اس نے کار سے ٹپک لگائی تھی اس کے ساتھ آنے والا شخص راج کنور کے ساتھ اندر جا چکا تھا اور جب راسن نے بات مکمل کر کے اپنے قدم اندر کی طرف بڑھائے تو میں اس کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے وہ سڑکیوں تک پہنچتا میں اس کے بالکل پیچھے آ گیا اور پستول اس کی پشت سے لگا دیا۔ وہ رک گیا تھا اور اس نے کن آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سکون سے بولا۔ ”شہباز..... تم.....؟ کیا چاہتے ہو؟“

”تمہاری جان لینا نہیں چاہتا ورنہ راستے میں کہیں بھی تمہیں گولی مار سکتا تھا یہاں بھی آرام سے تمہیں شوٹ کر کے چلا جاتا اور کسی کو میری جھلک بھی نظر نہ آتی۔“

”او کے تم میری جان لینا نہیں چاہتے پھر؟“

”واپس چلو اور گاڑی میں بیٹھو۔“ میں نے حکم دیا۔ ”میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا لیکن تم مرنا چاہو تو مجھے اعتراض کے بجائے خوشی ہوگی۔“

بادل نا خواستہ وہ واپس آیا۔ میں نے اسے نشانے میں لیتے ہوئے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھے ہی میں بھی اندر آ گیا اس کا ہاتھ اپنی جیکٹ کی طرف جا رہا تھا لیکن جب میں نے ٹال اس کی گدی پر رکھی تو وہ ساکت ہو گیا میں نے جیکٹ سے اس کا پستول نکال لیا پھر ہاتھ پھیر کر تلاشی لی لیکن مجھے کوئی اور آتشیں ہتھیار نہیں ملا ہاں کوئی چاقو خنجر تھا تو اس کا ہاتھ نہیں تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھولنے کا حکم دیا اس نے قمیص کی ایک پستول اس میں بھی تھا اور دونوں پستولوں کے چھ عدد فاضل میگزین بھی تھے میں نے یہ خزانہ سمیٹ لیا۔ اس وقت یہ اسلحہ میرے لیے خزانے سے کم نہیں تھا۔ راسن جیسے آدمی سے یہی توقع تھی کہ وہ سر سے پاؤں تک مسلح ہو گا۔ مزید تلاشی کا موقع نہیں تھا۔ نہتا ہوتے ہی اس کا سکون ہوا ہو گیا تھا اور اس نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔

”اب کیا چاہتے ہو؟“

”یہاں سے چلو۔“

”میرے ساتھی نے مجھے غائب پایا تو.....“

”وہ پہلے تمہیں کال کرے گا اور تم اسے مطمئن کرو گے۔ اب چلو یہاں سے۔“ میں نے کہتے ہوئے ٹال تختی سے اس کی گدی میں دہائی تو اس نے انجن اشارٹ کیا اور گاڑی اسپتال سے باہر لے آیا۔ یہاں آتے ہوئے میں نے شملہ کا کچھ معائنہ کیا تھا میں اسے سڑک پر سیدھا چلنے کو کہا۔ راستے میں مجھے ایک قدرتی تفریحی باغ دکھائی دیا تھا اور رات کے اس پہر وہاں کسی کی موجودگی ممکن نہیں تھی۔ میں نے سیٹ بیلٹ باندھ لی کہ اگر راسن کوئی شرارت کرے تب بھی مجھے بے قابو نہ کر سکے۔ ”تم حیران ہو گے کہ تم میری تلاش میں تھے اور میں نے تمہیں تلاش کر لیا؟“

”میں ایسی باتوں پر حیران نہیں ہوتا ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں جو میں دشمن کے خلاف کر سکتا ہوں وہ وہی میرے خلاف بھی کر سکتا ہے۔“

”مگر تم ایک عقل مند آدمی ہو۔ اس لیے مجھے امید ہے تم میرے سوالوں کا جواب دو گے اور اپنی عقل مندی جھانڈنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

”تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”اتنی جلدی کیا ہے؟ کچھ دیر بعد پوچھوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ آگے جو باغ نظر آ رہا ہے گاڑی اس کے پاس روک لینا، بلکہ اندر لے چلو۔“

اس نے ایک چھوٹی سڑک جو باغ کے اندر تک جا رہی تھی اس پر گاڑی موڑ دی۔ ایک جگہ جو مین روڈ سے خاصی دور تھی وہاں گاڑی رکوئی اور ہم دونوں نیچے اتر آئے تھے۔ میں پوری طرح چوکنا تھا راسن عام آدمی نہیں تھا وہ بلیک کیٹ کمانڈر اور را کا ایجنٹ رہ چکا تھا اور یقیناً لڑائی کے تمام طریقوں سے واقف تھا لیکن میں اپنے انداز سے ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ میں بہت زیادہ چوکنا ہوں میں ایسا ظاہر کر رہا تھا کہ میں اسے عام سادھن سمجھ رہا ہوں۔ یہاں کہیں کہیں پول یسپ روشن تھے۔ مگر باغ کا بڑا حصہ تاریکی میں تھا۔ میں نے حکم دیا۔ ”اپنا موبائل دو۔“

اس نے جیب سے موبائل نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ یہ جدید ترین آئی فون تھا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا اور اس کی طرف دیکھا۔ ”راسن میرے کچھ سوالوں کے درست جواب دے کر تم اپنی زندگی بچا سکتے ہو۔ ہر غلط جواب پر میں تمہیں ایک گولی ماروں گا پہلے ایک پاؤں میں پھر دوسرے پاؤں میں اور دونوں ہاتھوں کے بعد تمہارے دل و دماغ کی باری آئے گی۔ تم سمجھ رہے ہو کہ تمہارے پاس چو اُس محد وہ ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تم مجھے مارنا چاہتے ہو پھر بہانے کیوں تلاش کر رہے ہو؟“

”سچ بھی یہی ہے لیکن میں قاتل جہلت نہیں رکھتا ہوں میں ممکن حد تک دشمن کو بھی قتل کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ تم چاہو تو اس جہلت کا فائدہ اٹھا سکتے ہو۔“

وہ سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔“

”تب گھنٹوں کے بل بیٹھ جاؤ اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لو۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو اس نے قہقہے کی اور بیٹھ گیا۔

”اب پوچھو۔“

”راج کنور کیسے تمہارے ہاتھ لگا؟“

”وہ سڑک پر زخمی حالت میں ملا تھا۔ میں اسے پھیل لے گیا۔“

”اتنی دیر سے اسپتال کیوں لائے؟“

”میں نہیں جانتا وہاں میں نے اسے نشی جی کے سپرد کر دیا تھا اور وہ پھیل کے ڈاکٹر کو دکھا رہے تھے پھر مجھ سے کہا کہ اسے اسپتال لے جاؤں۔“

مجھے لگا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ”تم اور نشی جی دونوں اس کی جان کے دشمن ہو رہے تھے تو اتنی مہربانی کیوں؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم نے ماننا ہے تو مانو ورنہ تمہاری مرضی۔“

”راج کنور کی حالت کیسی ہے؟“

”ٹھیک نہیں ہے پھیل کے ڈاکٹر نے اسے اسپتال لے جانے کو کہا تھا۔“

”جب اسے آرام سے ایمبولینس میں لایا جاسکتا تھا اس طرح گاڑی میں ڈال کر کیوں لائے؟“

”وقت نہیں تھا ایسولینس آنے میں وقت لگتا۔“

”پیس میں کیا ڈرامہ چل رہا ہے؟“

”تم جانتے ہو وہاں رہے ہو اور اس کے پیچھے اصل میں نشی جی ہے۔“

”اور تم؟“ میں نے جیسے لہجے میں پوچھا۔

”میں صرف ایک مہرہ ہوں۔“

”تم نے جس طرح سے گرینڈ مارے اس سے لگ رہا تھا کہ تم ہم سب کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو اس

لیے اچانک راج کنور کے سلسلے میں پالیسی کیوں تبدیل ہوئی۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”بڑے کنور کی کیا پوزیشن ہے؟“

”وہ اپنے کمرے میں نظر بند ہے اور معاملات نشی جی کے ہاتھ میں ہیں۔“

”خفیہ راستے سے فرار کے وقت ہمیں روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی؟“

”میں نہیں جانتا میں آدی لینے باہر گیا ہوا تھا۔“

”آدی کیوں..... پیس میں آدمیوں کی کمی تھی؟“

”میں اپنے آدی لینے گیا تھا بعد میں انہی کی مدد سے تمہیں روکنے کی کوشش کی۔ ابھی پیس کے کسی آدمی پر

اعتبار نہیں کر سکتے ہیں۔ اندر کی تبدیلیوں کا باہر کے لوگوں کو علم نہیں ہے۔“

میرا بھی یہی خیال تھا صرف ایک چیز کھٹک رہی تھی کہ یہ راج کنور کو بچانے کی کوشش کیوں کر رہے تھے۔

میں نے راسن سے کہا۔ ”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں مجھے بتا دو کہ راج کنور کو بچانے کی کوشش کیوں کر

رہے ہو؟“

”میں جواب دے چکا ہوں۔“ اس نے کہا اور اچانک اسپرنگ کی طرح اچھلا تھا۔ میں نے اضطرابی طور

پر فائر کیا لیکن وہ ان ہماڑیوں کے عقب میں جا کر اجن کے ساتھ بیٹھا تھا میں اس کے پیچھے جھپٹا تو وہ بھاگتا

دکھائی دیا۔ ذرا سی دیر میں وہ دس بارہ گز آگے نکل گیا تھا اس بار میں نے سکون سے نشانہ لیا اور فائر کیا۔ میں پہلے

ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ میرے قابو میں آیا تو اسے بخشوں گا نہیں۔ اس نے فرار ہو کر میرے لیے فیصلے پر عمل کرنا

آسان بنا دیا تھا۔ فائر ہوتے ہی وہ قلابازی کھا کر گر ا اور جب میں بھاگ کر اس مقام پر پہنچا تو وہ غائب تھا لیکن

ہلکی روشنی میں وہاں زمین پر خون کا دھبہ نمایاں تھا۔ گولی اسے لگی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی جس میں پتھر تھے

اور گھاس اگی ہوئی تھی اس سے آگے ایک ندی بہہ رہی تھی یہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن کوئی اس میں گرنا تو یہ اسے بہا

کر لے جاسکتی تھی۔ خون کے دھبے ندی تک گئے تھے۔ تو کیا راسن ندی میں کود گیا تھا یا گر گیا تھا؟ مجھ سے بچنے

کے لیے وہ یہ خطرہ مول لے سکتا تھا۔

اب اس کے پیچھے وقت ضائع کرنا بیکار تھا۔ فائر کی آواز دور تک گئی ہوگی اور اگر آس پاس پولیس موجود

ہوتی اور وہ تفتیش کے لیے آجاتی تو مشکل میں پڑ جاتا اس لیے تیزی سے واپس آیا۔ کار کی چابیاں غائب تھیں۔

راسن نے اترتے وقت چابیاں نکال لی تھیں۔ میں نے تار چھیل کر انجن ہاٹ وائر کیا اور واپس اسپتال کی طرف

روانہ ہو گیا۔ کار اسپتال سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ چھوڑ کر باقی فاصلہ پیدل طے کیا اور رہن کمار کے پاس پہنچا۔ وہ حسب معمول کار میں سو رہا تھا میں نے شیشہ بجایا تو وہ اٹھ گیا اور مجھے دیکھ کر باہر نکل آیا۔ ”آپ آگیا صاحب..... میم کیسا ہے؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”یہی تو مجھے معلوم کرنا ہے لیکن میں اندر نہیں جاسکا۔ یہاں مجھے اپنے کچھ دشمن نظر آئے ہیں۔ اگر ان سے سامنا ہو گیا تو مسئلہ ہو جائے گا۔“

وہ فکرمند ہو گیا۔ ”آپ کا دشمن..... میں آپ کے ساتھ ہے۔“

”فکرت کرو وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے کوئی بڑی دشمنی نہیں ہے یوں سمجھ لو خاندانی جھگڑا ہے۔ تم اندر جاؤ اور ریسپشن سے ریٹا کی حالت پوچھ کر آؤ۔“

”ریٹا۔“ وہ چونکا۔ ”آپ تو میم صاحب کو بانو بولتا تھا۔“

”یہ اس کا تک نیم ہے۔ اصل نام ریٹا ہے۔ تم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہاں غیر متعلقہ لوگ کتنے ہیں۔ یعنی باہر کے لوگ۔“

رہن کمار نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا۔“

وہ نیچے اتر اتر اور جاتے جاتے پلٹ آیا۔ ”صاحب کوئی لغو تو نہیں ہے میں بہت غریب آدمی ہے۔“

”کوئی لغو تو نہیں ہے تم بے فکری سے جاؤ۔“ میں نے اسے تسلی دی اور جیسے ہی وہ اسپتال کے گیٹ میں

داخل ہوا میں بھی کار سے اتر کر اس کے پیچھے گیا تھا وہ چابی لے گیا تھا اس لیے میں نے کار لاگ کر دی۔ وہ

ایمر جنسی میں گیا اور میں نزدیک ہی باغ میں ایک درخت کے پیچھے ٹک گیا۔ یہاں سے ایمر جنسی کا دروازہ زیادہ

دور نہیں تھا رہن کمار اندر گیا تھا کہ رامن کے ساتھ آنے والا شخص باہر نکلا۔ وہ موبائل پر دیکھ کر کچھ کر رہا تھا۔

اچانک میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں نے جلدی سے رامن کا موبائل نکال کر تیل آف کر دی اسی لمحے

اسکرین روشن ہوئی اور اس پر سنسٹوش لکھا ہوا آیا۔ دوسری طرف وہ شخص کان سے لگائے انتظار کر رہا تھا کہ کال

ریسیو کی جائے۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے کال کاٹ دی۔ فوراً ہی اس نے موبائل ہٹا کر دیکھا اور دوبارہ نمبر

ملایا۔ وہی سنسٹوش تھا اور رامن کو کال کر رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا لیکن امکان تھا کہ اس کا کوئی دوسرا ساتھی اندر نہ ہو۔

وہ دوبارہ کال ملاتے ہوئے گیٹ کی طرف جانے لگا۔ میں اس کے جانے کے بعد باغ سے نکلا اور ایمر جنسی میں

آیا۔ وہاں رہن کمار ریسپشن پر موجود آدمی سے بات کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

”اچھا ہوا صاحب آپ آگیا یہ مجھ کو کچھ نہیں بتا رہا۔“

میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”تم جاؤ اور گاڑی میں میرا انتظار کرو۔“

رہن کمار گیا تو میں نے ریسپنسیفٹ سے پوچھا۔ ”میری سسٹر ریٹا کا آپریشن ہوا ہے میں ڈاکٹر سے ملنا

چاہتا ہوں۔“

اس نے ریکارڈ دیکھا۔ ”یہ کیس ڈاکٹر انٹونی کے پاس ہے وہ کمرہ نمبر بارہ میں ہوں گے۔ اسی گیلری میں

آگے دائیں طرف مڑ جائیں سیدھے ہاتھ کا دوسرا کمرہ ہے۔“

میں بارہ نمبر کمرے میں آیا جہاں ڈاکٹر انٹونی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا تو میں نے سکون کا سانس

لا اس کا مطلب تھا سب ٹھیک تھا۔ پھر اس نے تصدیق کی۔ ”کانگریج لیشن..... آپریشن کامیاب رہا ہے۔ مس رہنا کو کمرے میں شفٹ کر دیا ہے۔“

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”ضرور لیکن ابھی وہ بے ہوش ہیں۔ تقریباً سات گھنٹے بعد ہوش آئے گا۔ اس کے بعد ہم چیک کریں گے اور اس کے بعد ہی کوئی ان سے مل سکے گا۔“

”میں صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کم دھڑی۔“ وہ بولا۔

بانو ایک کمرے میں بستر پر دراز تھی اسے اسپتال کا لباس پہنا دیا گیا تھا اور اس کے سر ہانے مختلف اقسام کی مشینیں اس کی جسمانی حالت بیان کر رہی تھیں۔ سر پر پٹی تھی اور چہرہ زرد زرد ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر انھونی نے کہا۔ ”یہ بہت مضبوط لڑکی ہے مجھے امید ہے یہ چند دن میں ری کور کر لے گی۔“

”مجھے بھی امید ہے۔“ میں نے کہا۔ اس کمرے کے ایک طرف شیشے کی دیوار تھی اس کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر سے گزرنے والا کوئی بھی شخص بانو کو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے پردہ برابر کر دیا اور ڈاکٹر انھونی سے کہا۔ ”ہلیز اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ اس کمرے میں کوئی غیر متعلقہ فرد نہ آئے۔ میں اپنی بہن کے معاملے میں حساس ہوں۔“

”آپ فکر نہ کریں میں عملے کو ہدایت کر دیتا ہوں۔ ویسے چند گھنٹے بعد ایک نرس آ جائے گی اور وہ مستقل یہاں رہے گی۔“

ہم واپس ڈاکٹر کے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ میں نے راج کنور کو ہاسٹریچر پر دیکھا وہ پیرامیڈک اسے کہیں نے جا رہے تھے۔ اسے چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور سر پر پٹی بندھی تھی۔ میں چونکا اور ڈاکٹر سے کہا۔ ”یہ اشوک جی ہیں۔“

”نہیں یہ کنور ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”اچھا مجھے شکل دیکھ کر شک ہوا تھا میرے ایک جاننے والے ہیں یہیں شملہ میں رہتے ہیں لیکن بہت مرمے سے رابطہ نہیں ہے ورنہ میں ان کا ریفرنس دیتا۔ انہیں کیا ہوا؟“

”ایکسی ڈینٹ۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”بلندی سے گرنے سے کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں پسلیاں ٹوٹنے سے پیچھے ہڑے اور دل کی جھلی متاثر ہوئی ہے۔“

”جان کو خطرہ تو نہیں ہے؟“

”آنے والے بارہ گھنٹے اہم ہیں۔“

میں نے مزید سوالات سے گریز کیا اور ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ راج کنور کو کہیں اور لے جایا جا رہا تھا اور امید کم تھی کہ راج کنور کے لیے آنے والوں میں سے کوئی اتفاق سے بانو کو دیکھ سکے۔ میں باہر نکل رہا تھا کہ راج کنور کے ساتھ آنے والا اندر آیا۔ اگرچہ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا لیکن امکان تھا کہ اس نے مجھے دیکھا ہو۔ اسے آتے دیکھ کر میں جلدی سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ وہ ریسپشن پر آیا اور پھر وہاں موجود شخص سے بات کر کے اندر کی طرف بڑھا وہ میرے پاس سے گزرا تو میں ستون کے دوسری طرف سے ہوتے

ہوئے اس کی پشت پر نکلا اور باہر کی طرف بڑھا۔ ایک مشکل مرحلہ آسانی سے طے ہو جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

اب میں کچھ دیر آرام کر سکتا تھا۔ میرے پاس سات آٹھ گھنٹے کا وقت تھا۔ چھ سات گھنٹے کی نیند مجھے تازہ دم کر دیتی اور اس کے بعد میں اپنا لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا ہے۔ رہن کمار کے ساتھ ہوٹل واپس آیا اور ہوٹل استقبال پر اسے اپنا ڈرائیو قرار دے کر ہوٹل کی پارکنگ میں جگہ دلا دی۔ اوپر کمرے میں آیا اور بستر پر لیٹا تو نیند کے بجائے آنکھوں میں اپنی تصویریں آگئیں۔ اب تک مجھے موقع نہیں ملا تھا۔ کوئی رابطہ کا ذریعہ نہیں تھا لیکن اب مجھے ایک عدد موبائل مل گیا تھا۔ میں نے اسے اسپتال میں آف کر دیا تھا اب دوبارہ آن کر کے میں نے پہلے عبداللہ کا نمبر ملایا۔ اس پر تیل جاری تھی لیکن کال ریسپونڈ نہیں ہو رہی تھی۔ عبداللہ سوتے میں بھی تیل آف نہیں کرتا تھا۔ شاید وہ موبائل سے دور تھا یا سروس میں مسئلہ آ رہا تھا کہ مجھے تیل سنائی دے رہی تھی اور وہاں تیل نہیں نک رہی تھی۔ دوسری بار نام کا مکوشش کے بعد میں نے کال کر سویرا کا نمبر ملایا یہ دوسرا نمبر تھا جو میرے ذہن میں تھا۔ اس نے چند بلز کے بعد کال ریسپونڈ کی اور آہستہ سے بولی۔ ”ہیلو۔“

”سویرا۔“ میں نے کہا تو وہ یقیناً تڑپ گئی تھی۔

”شہباز..... آپ شہباز ہیں۔“

”ہاں میری جان۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں شہباز ہوں۔“

اس وقت میں احتیاط کا تقاضہ بھی فراموش کر گیا تھا اور اپنے نام کا اقرار کر لیا۔ سامنے وہ ہستی تھی جس کے آگے میں انکار کر رہی نہیں سکتا تھا۔ وہ رونے لگی۔ ”آپ کہاں چلے جاتے ہیں..... کیوں مجھے اتنا ستاتے ہیں..... میں ہل ہل جیتی مرتی ہوں۔“

”تم جانتی ہو میں حالات کے آگے مجبور ہوں۔ وقت کا کھلونا ہوں۔ وقت جہاں چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے۔“

”وہ خود پر قابو پانے لگی۔“ آپ کہاں ہیں نمبر کے ساتھ انڈیا کا کوڈ آرہا ہے۔“

”میں انڈیا میں ہی ہوں۔ اب خیریت سے ہوں اور اللہ نے چاہا تو چند دن میں تم لوگوں کے پاس ہوں گا۔“

”ان شاء اللہ۔“ وہ بولی۔ ”سب بہت پریشان ہیں، بیٹو واپس آ گیا تھا اور اس کے ساتھ وسیم اور سفیر لاہور گئے تھے۔ اس سے زیادہ مجھے نہیں معلوم ہے۔ سفیر آپ کے غائب ہونے کا سن کر دہی سے آ گیا تھا۔“

بیٹو کی واپسی کا سن کر میں نے بہت عرصے بعد اچھا محسوس کیا تھا۔ میں نے سویرا سے کہا۔ ”میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا ہوں۔ تم باقی سب کو بتا دینا اور عبداللہ سے کہنا کہ میں اسے کال کروں گا۔ اگر کوئی لاہور میں ہے تو اسے مزید کارروائی سے روک دیا جائے۔ یہ پیغام لفظ بہ لفظ پہنچانا۔“

”ٹھیک ہے۔“

”ہاں جی اور بابا کو سلام کہنا۔ میں جلد دوبارہ رابطہ کروں گا۔“

”پلیز اتنی جلدی مت بند کریں۔“ اس نے التجائی۔

”میں دیا بغیر میں ہوں اور یہاں احتیاط لازمی ہے۔ میں اپنی واپسی کے دروازے بند کرنا نہیں چاہتا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”پھر کال کریں گے؟“

”ہاں..... اللہ حافظ۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل بند کر دیا۔ یہ راسن کا موبائل تھا اور اسے زیادہ دیر استعمال کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا حکومتوں کے لیے کسی موبائل سے جگہ کا پتا چلانا کوئی مشکل کام نہیں تھا اسی طرح یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ پاکستان کی جانے والی کالز کی نگرانی ہوتی ہوگی۔ سویرا سے بات کر کے میرا ذہن ہلکا ہو گیا تھا اور میں لیٹا تو کچھ دیر میں سوچا تھا۔ پھر میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی۔ گھڑی میں صبح کے دس بج رہے تھے گویا میں چھ گھنٹے سو لیا تھا۔ دروازے پر اوشا تھی۔ وہ اندر آئی۔

”تو نے ڈر دیا رے..... ہم کتنی دیر سے دروازہ کھتا ہے تھے۔“

”میں دیر سے آیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”تم کب اٹھیں؟“

”دیر ہوئی، ناشتہ بھی کر لیا۔“

”اب مجھے کرنا ہے لیکن پہلے نہالوں۔“ میں نے اٹھ کر جسم کھولا۔ ”بانو ٹھیک ہے آپریشن ہو گیا ہے۔“

ناشتہ کر کے باہر چلیں گے پہلے کپڑے اور کچھ چیزیں لیں گے اس کے بعد بانو کی طرف جائیں گے۔“

وہ بانو اور شاہنگ کا سن کر خوش ہو گئی۔ میں نے روم سروس کو ناشتے کا آرڈر دیا اور واش روم میں آ گیا جب تک نہا کر باہر آیا۔ ناشتہ آ گیا تھا اور کئی دن بعد یہ پہلا ڈھنگ کا کھانا تھا جو میں نے کھایا۔ اوشا نے صرف چائے میں ساتھ دیا۔ اس نے کہا۔ ”رات من بہت گھبرا رہا تھا دل چاہ رہا تھا تیرے پاس آ جائیں۔“

”نئی جگہ ہے اس لیے گھبرا رہا ہوگا۔“

”نہیں تیری یاد آ رہی تھی۔ ٹو نے الگ کرہ کیوں لیا ہم ایک کمرے میں رہ سکتے ہیں۔“

”نہیں ایک کمرے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ دشمن ہماری تاک میں ہیں اور اگر انہوں نے دھاوا بولا تو

سب ایک ہی جگہ مل جائیں گے۔ ہمارا الگ الگ رہنا ہی ٹھیک ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”دشمن کا بہانہ کیوں کرتا ہے یہ بولنا کہ ہمارے ساتھ اسکیلر رہتے ہوئے گھبراتا ہے۔“

”یہی ہے ماجس اور پیٹرول ایک جگہ رہیں تو آگ بھڑکنے کا خطرہ تو ہوتا ہے۔“

”تو بھڑکنے دے نا؟“ اس نے اس طرح کہا کہ مجھے پسینہ آ گیا۔

”اوشا ٹو کیوں بھول رہی ہے کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں اور ٹو زہریلی ہے۔“

اس نے مایوسی سے کہا۔ ”اگر میں وٹس کنیا نہ ہوتی تب بھی ٹو میرے پاس نہ آتا۔“

”نہیں یہ میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”اوشا اگر میرے ساتھ رہنا

چاہتی ہے تو آئندہ اس پر بات مت کرنا۔“

اس نے غصہ کی سانس لی۔ ”ٹھیک ہے رے، رہنا تو تیرے ساتھ ہے اب جیسے چاہے رکھ۔“

میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اوشا کبیل ہوتی جا رہی تھی اور میں اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا

تھا۔ جب کہ اسے یہاں چھوڑ کر جانا بھی مشکل لگ رہا تھا وہ کنور پیلس میں ٹھیک تھی وہاں آرام سے رہ رہی تھی اور

اس کے بدن میں بھرے زہر کی وجہ سے کوئی اسے کھلونا بھی نہیں بنا سکتا تھا۔

اس کے مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکالنا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم نیچے آئے تو لابی میں اوشا نے پوچھا۔ ”وہ ہتھیاروں والا بیک کہاں ہے؟“

”آہستہ بولو۔“ میں نے آس پاس دیکھا لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ ”وہ ڈپسٹری کے باہر گاڑی سے چوری ہو گیا تھا۔“

”تو اب خالی ہاتھ ہے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”اگر رامن اور اس کے لوگ مل گئے تو کیا ہوگا؟“

”نہیں ایک پستول ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ اسے دو عدد مزید پستولوں کے بارے میں نہیں بتایا دوسری صورت میں اسے پوری داستان سنانی پڑتی اور فی الحال اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ جو مال غنیمت میں ملے تھے۔ مجھے رامن کا خیال تھا اگر وہ بچ گیا تھا تو پھر خبر مشکل تھی لیکن اگر مارا گیا تھا تو وہ پہر تک خبر آجانی چاہیے تھے۔ میرے اور اوشا کے کمرے میں ٹی وی تھا لیکن مجھے دیکھنے کا خیال نہیں آیا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں رہن کار فریش اور تیار تھا اس نے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے صاحب؟“

”کسی اچھے شاپنگ سینٹر میں لے چلو جہاں کپڑے مل سکیں۔“

کچھ دیر بعد رہن کار نے ایک اعلیٰ درجے کے گارمنٹ اسٹور کے سامنے گاڑی روکی۔ ”یہاں سب ملے گا صاحب۔“

میں اور اوشا اندر آئے تو فوراً ہی ایک سیلز گرل ہماری طرف لپکی اور بچھ جانے والے انداز میں بولی۔

”میڈم سر میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

”ہمیں کچھ کپڑے چاہئیں۔ ان کے لیے ساڑھیاں اور شلوار سوٹ دکھاؤ۔ مجھے سوٹ اور کچھ ڈریس پینٹس اور شرٹس درکار ہیں۔“

سیلز گرل نے ایک سیلز بوائے کو بلا کر مجھے اس کے حوالے کیا۔ ”دیش آپ کو بہترین گائیڈ کرے گا میڈم میرے ساتھ ہیں۔“

وہ اوشا کو خواتین والے حصے میں لے گئی۔ مردوں والے حصے میں اعلیٰ ترین سوٹ بھی تھے لیکن میں نے ایک مناسب قیمت کے سوٹ کے ساتھ دو پینٹس اور شرٹس کے ساتھ بنیان، نیکرز اور موزے بھی لیے تھے۔ ایک ٹائٹ سوٹ لیا اور ایک سادہ سوتی ٹراؤزر اور اس کے ساتھ ٹی شرٹ بھی لے لی۔ سیلز بوائے میری خریداری سے کچھ مایوس ہوا تھا۔ مگر وہ اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ بل بھی اعلیٰ معیار کا تھا یہ سارا سامان صرف پچیس ہزار میں آیا تھا اور کیونکہ میرے پاس دشمنوں کا مال تھا اس لیے میں نے بلا جھک ادائیگی کر دی اور پانچ سو سیلز بوائے کو ٹپ دی تھی تو وہ خوش ہو گیا تھا۔ دوسری طرف اوشا نے ساری کسر پوری کر لی تھی۔ وہ اُن پڑھ تھی اور دنیا بھی نہیں دیکھی تھی لیکن شاپنگ خواتین کی فطرت میں ایسے شامل ہوتی ہے جیسے مچھلی کی فطرت میں تیرنا اور پرندے کی فطرت میں اڑنا شامل ہوتا ہے۔ اس نے تین عدد بہترین ساڑھیاں، ان کے بلاؤز، تین عدد شلوار سوٹ جو جدید ترین فیشن کے تھے۔ دو عدد کرتے پاجامے، ٹائٹ سوٹ جو خاصا سنسنی خیز تھا اس کے علاوہ کچھ خفیہ اشیا جنہیں اس نے خفیہ رکھنے کی قلمی کوشش نہیں کی تھی۔ سیلز گرل مجھے بتا۔ زبر آدہ تھی کہ ان میں سے کس شے کی کب قیمت تھی لیکن

میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”مجھے صرف ٹوئٹل مل بتایا جائے۔“

اس نے ٹوئٹل مل جو کپڑوں سے پرنٹ ہو کر نکلا تھا مجھے تھما دیا اور یہ بچپن ہزار روپے کی رقم تھی۔ مل ادا کرتے وقت میں نے دعا کی کہ سویرا شاہنگ کی ایسی شوقین نہ ہو۔ اس پر مجھے اپنی محنت کی کمائی خرچ کرنا تھی۔ یہ خاصا سامان تھا اس کے لیے یہیں سے دو چھوٹے سوٹ کیس لیے۔ اسٹور میں جوتوں اور سینڈلز کا شعبہ بھی تھا۔ میں نے اوشا سے کہا۔ ”تم یہاں ٹرائی روم میں اس میں سے کوئی لباس پہن لو۔“

وہ خود بھی یہی چاہتی تھی اس لیے خوش ہو گئی۔ میں جوتوں والے شعبے میں آیا میرے پیروں میں جو گر آرام دہ لیکن عام سے تھے یہاں سے میں نے بہترین قسم کے براڈ ڈ جوتوں کے دو جوڑے اور ایک سلیپر لیا۔ ابھی میں نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ مجھے اپنا حلیہ تبدیل کرنا چاہیے۔ جوتوں کے بعد میں گھڑیوں اور سن گلاس والے حصے میں آیا۔ یہاں ایک سن گلاس اور ایک ریم لیس زیرو کی عینک لی۔ ایک عدد گھڑی لی۔ اس اثنا میں اوشا آگئی۔ سلیز گرل نے اسے ساڑھی پہننے میں مدد بھی نہیں دی تھی بلکہ اس کا میئر اسٹائل بنا کر ہلکا سا میک اپ بھی کر دیا تھا اور وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ وہ پہلی بار شرماتے ہوئے بولی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہا ہے رے۔“

اس کی زبان پر سلیز گرل مہذبانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔ ”دیکھ رہا ہوں کہ کیا تھیں اور کیا ہو گئیں۔“

”کیا ہم پہلے اچھے نہیں تھے؟“ وہ افسردہ ہو گئی۔

”نہیں بابا اچھی تو تم پہلے بھی تھیں لیکن اس لباس نے تو نکھار دیا ہے۔“

آف وائنٹ اور ہلکے نیلے پھولوں والی ریشمی ساڑھی اور مختصر کسا ہوا بلاؤز اس کے سراپے کے تناسب میں اصل رہا تھا۔ جدید وضع کے آرام دہ سینڈل پہننے کے بعد ری سہی کسر پوری ہو گئی۔ میں نے چہرہ چھپانے کے لیے بڑے بڑے سن گلاس لیے جن کا فیشن ان دنوں تھا۔ اوشا مکمل طور پر بدل گئی تھی اب اسے کوئی دیکھتا تو اس کا دھیان کنور بیلس کی خاموشی کی طرف ہرگز نہ جاتا۔ مجھے بھی اپنا حلیہ بدلنا تھا اس لیے اسپتال جانے سے پہلے ہم واپس ہوئیں آئے۔ ہوٹل کے سیلون میں ہمیں نے نیا میئر اسٹائل بنوایا۔ سائیزوں سے بال چھوٹے کرتے ہوئے اوپر بڑے بال چھوڑ دیئے تھے۔ مانگ ترچھی تھی۔ بڑی ہوئی شیو صاف کرائی۔ فیشل اور اسکرپ سے چہرہ صاف کیا اور میرا ہلکا جانے والا رنگ نکھر گیا تھا۔ اس حلیے کے ساتھ ریم لیس عینک لگانے پر میں نے خود کو بدلا ہوا محسوس کیا۔ یہ حلیہ کسی بزنس ایگزیکٹو جیسا تھا۔ سوٹ پہن کر میں اوشا جتنا ہی بدل گیا تھا۔ اب دیکھنے والا آسانی سے مجھے شہباز کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے اپنے کمروں میں کھایا اور اس دوران میں ہمیں دل پر جبر کر کے خود کو پاکستان کال کرنے سے روکتا رہا۔ میں خود کو یاد دلاتا رہا کہ ایسا کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اگر ایک بار بھارتی ایجنسیوں اور پولیس کو میرے بارے میں پتا چل گیا کہ میں بھارت میں ہوں تو اس کے بعد یہاں سے نکلتا میرے لیے مزید مشکل ہو جائے گا۔ دو بجے ہم بانو کو دیکھنے کے لیے اسپتال روانہ ہوئے۔ وہاں مجھے راج کنور سے متعلق کوئی مفصل دکھائی نہیں دیا تھا اور رامن کو بھی فی الحال میں نے ذہن سے نکال دیا تھا۔ ریسپشن پر اب ایک خاتون تھی

لیکن ڈاکٹر انقونی موجود تھا اور پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ پھر مسکرایا۔ ”مائی گاڈ آپ بالکل بدلے ہوئے انسان لگ رہے ہیں۔ اب آپ کی اصل پر سنائی سانسے آئی ہے اور دیوی جی بھی بدل گئی ہیں۔“

میں نے سرد آہ بھری۔ ”بس حادثے اور پھر درد بردی نے پریشان کر دیا تھا اب ذرا اطمینان ہوا ہے ہمارا تو سارا سامان بھی حادثے میں برباد ہو گیا تھا۔ خیر یہ باتیں ہوتی رہیں گی یہ بتائیے رینا کیسی ہے کیا اب ہم اس سے مل سکتے ہیں؟“

”بالکل آپ ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ وہ ہوش میں ہیں اور دو گھنٹے بعد ان کو دوبارہ سلا دیا جائے گا۔ کیونکہ پین کلر کا اثر کم ہو گا تو وہ پین محسوس کریں گی۔“

ہم ڈاکٹر انقونی کے ہمراہ بانو کے کمرے میں آئے۔ ایک نرس اسے جھج سے سوپ پلا رہی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھل گئی۔ میں نے ڈاکٹر انقونی سے کہا۔ ”پلیز کیا ہم کچھ دیر کے لیے اکیلے میں مل سکتے ہیں۔“

”یہ نرس اپنا کام ختم کر لے پھر.....“

”یہ کام ہم کر لیں گے۔“ اوشا نے آگے بڑھ کر کہا تو نرس اٹھ گئی اور پھر ڈاکٹر کے ساتھ باہر چلی گئی۔ اوشا نے بانو سے ہاتھ ملایا۔ ”کسی جواب؟“

”میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ لوگ تو ایسا لگ رہا جیسے مٹی مون منا کر آرہے ہیں۔“

”ہنی مون کیا؟“ اوشا نے پوچھا۔ میں نے ہونٹوں پر ہنسا کر کہا۔

”مطلب گھوم پھر کر آرہے ہیں۔ بانو کی بچی دماغ پر چوٹ لگی ہے اور قابو زبان پر نہیں رہا۔“

وہ کھسیا گئی۔ ”سوری..... چوٹ کی وجہ سے واقعی ایسا ہوا ہے۔ جب سے ہوش آیا ہے ڈاکٹر دوں نے سوال پوچھ پوچھ کر دماغ خراب کر دیا ہے۔“

میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”شکر ہے تمہیں بروقت یہاں لے آئے اور آپریشن ہو گیا۔“

”ہمارا تو ہمیں بیٹا جا رہا تھا تمہیں بے ہوش دیکھ دیکھ کر۔“ اوشا نے اسے جھج سے سوپ پلانا شروع کیا۔

”بانو یہاں تمہارا نام رینا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا نام شیم ہے اور اوشا تو اوشا ہی ہے۔“

”ڈاکٹر جب مجھ سے میرے بارے میں کوئی سوال کرتا تو میں کہتی کہ میرے بھائی کو بلائیں میں ان کے سامنے ہی کسی سوال کا جواب دوں گی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”شاباش.....“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”بانو مجھے تم پر فخر ہے۔ تم نے کسی موقع پر مجھے مایوس نہیں کیا ہے۔ بس یہ بات یاد رکھنا اور ہاں ہمارا تعلق دلی سے ہے اور ہم تفرق کر کے واپس آ رہے تھے کہ گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا۔“

بانو مسکرائی۔ ”میں نے یہی بتایا ہے۔“

”اب بتاؤ کہ ہوا کیا تھا دیسے مجھے بھی اندازہ ہے کہ کیا ہوا تھا اور راج کنور نے تم پر چھپ کر حملہ کیا تھا۔“

”ہاں وہ بھگا تو میں اس کے پیچھے گئی اور اس نے ایک جگہ چھپ کر کسی سخت چیز سے میرے سر پر وار کیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔“

”اتفاق سے راج کنور بھی یہیں داخل ہے۔ وہ بلندی سے گر کر شدید زخمی ہوا تھا اس کا آپریشن ہوا ہے اور

ڈاکٹر اس کے لیے بارہ گھنٹے اہم قرار دیے ہیں۔“

بانو کے ساتھ اوشا بھی چونک گئی اس نے شکوہ کیا۔ ”مٹو نے ہمیں بتایا نہیں۔“

”موقع نہیں ملا..... مجھے بھی اتفاق سے معلوم ہوا اور اسے میرے سامنے یہاں لائے تھے۔“

”کون لایا تھا؟“ بانو نے سوال کیا۔

”راسن اور ایک اجنبی شخص تھا۔“

”آپ نے راسن کو ایسے ہی جانے دیا؟“ بانو نے سوال کیا وہ اوشا کی نسبت زیادہ ذہین تھی اور مجھے بھی سمجھنے لگی تھی۔

”ہاں مجھے موقع نہیں ملا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بانو میں نے تمہیں رانا دیاس کے بارے میں بتایا تھا۔

مجھے اس سے مدد لینا پڑی اور اس سے یہاں میرے لیے بہت آسانی ہو گئی ہے۔ میں نے پاکستان والوں کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ پہلے بھی جان گئے ہیں کیونکہ بیٹو میاں صاحب کی قید سے فرار ہو گیا تھا۔“

پاکستان کا سن کر وہ بے قرار ہو گئی تھی۔ ”ہم یہاں سے کب جائیں گے؟“

”جیسے ہی تم ٹھیک ہوتی ہو۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بولی۔

”نہیں تمہارا آپریشن ہوا ہے اور جب تک ڈاکٹر تمہیں ٹھیک نہ قرار دے دے تمہیں سفر نہیں کرنا ہوگا۔“

وہ کسمائی۔ ”شہباز صاحب جب سے میں نے سنا ہے راج ککڑ یہاں ہے مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔ اگر میں لنگر نہیں کر سکتی تو مجھے کہیں اور شفٹ کر دیں۔“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے ہم جس ہوٹل میں مقیم ہیں وہ بہت محفوظ ہے اور وہاں رانا دیاس کا اثر بھی ہے میں تمہیں وہیں لے جاؤں گا اور کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر وہیں تمہارا چیک اپ کرتا رہے۔ مگر فی الحال تمہیں اسپتال سے کہیں منتقل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تم آپریشن کی تکلیف میں ہو۔“

”تب آپ ڈاکٹر سے پوچھیں کہ مجھے کب تک اجازت مل سکتی ہے۔“

”میں بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور باہر آیا۔ ڈاکٹر اپنے کمرے میں تھا میں نے اس سے بانو کو ریلیز کرنے کا پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

”چھتیس گھنٹے آپریشن کی تکلیف شدید رہتی ہے جسے صرف مارفین سے دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اسے عام پین کمرے قابو کیا جاسکتا ہے اور بیتر گھنٹے بعد اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

”زخم کتنے دن میں بھر جائے گا اور یہ ایئر ٹریول کر سکے گی؟“

”اس میں کم سے کم پانچ دن چاہئیں۔ ہم نے کھوپڑی میں صرف دہلی میٹر کا سوراخ کیا تھا اسے بھرنے میں اتنے دن لگ سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن وہ اسپتال کے ماحول سے گھبراتی ہے اگر میں اسے ہوٹل شفٹ کرنا چاہوں نرس سمیت، یہ کتنی دیر میں ممکن ہو سکے گا۔“

”یہ بھی کم سے کم چوبیس گھنٹے بعد ہو سکے گا۔ جب ہم دوبارہ سی ٹی اسکین سے چیک کر لیں کہ سولین ٹھیک

ہورہی ہے۔“

یعنی بانوکل صبح سے پہلے ہاسپٹل سے ریلیز نہیں ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”کل صبح چوبیس گھنٹے مکمل ہوتے ہی ان کا سی ٹی اسکین اور دوسرے ٹیسٹ ہوں گے اس کے بعد جانے کی اجازت ملے گی۔ مگر چوبیس گھنٹے میں ایک بار چیک کے لیے ہاسپٹل لانا لازمی ہوگا۔“

میں واپس آیا تو نرس آپجی تھی اور اس نے اطلاع دی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تھا اور اب بانو کو دوائیں دی جانی تھیں۔ ہم روانہ ہوئے اوشانے راستے میں کہا۔ ”کیوں نفی مون منائیں۔“

رہن کمار جس طرح چونکا تھا میں پچھتایا کہ بی مون کی یہ وضاحت کیوں پیش کی تھی۔ رہن کمار شرارت سے بولا۔ ”صاحب میڈیم صاحب کہہ رہی ہے تو منالو۔“

”تم ڈرائیونگ پر توجہ دو۔“ میں نے اسے ڈانٹا اور اوشا سے کہا۔ ”باہر نکلتا ٹھیک نہیں ہے ہمارے دشمن بھی یہاں آگئے ہیں اور ان سے سامنا ہو گیا تو بلاوجہ مسئلہ ہو جائے گا۔ جب تک بانو ٹھیک نہیں ہو جاتی ہمیں ہوٹل میں رہنا ہوگا۔“

اوشانے منہ بنایا لیکن پھر مان گئی۔ اس نے خود کو کلی طور پر پیری مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ شام ہم نے ہوٹل میں ٹی وی کے سامنے گزاری تھی اور میں مختلف نیوز چینل لگا کر راسن کے بارے میں خبریں تلاش کرتا رہا تھا۔ اس دوران میں مجھے پہلی بار بھارتی میڈیا کو ٹھیک سے دیکھنے کا موقع ملا اور مجھے پہلی بار ٹھیک سے پتا چلا کہ یہاں پاکستان کے بارے میں کس طرح بات کی جاتی ہے۔ پاکستان سے متعلق یا اس کے کسی فرد کے بارے میں کوئی بھی خبر ہوائین میڈیا کا رویہ انتہائی منفی ہوتا تھا۔ معمولی بات کو یوں پیش کیا جاتا جس سے پاکستان کا خراب تاثر ابھرتا تھا۔ جب کہ جن معاملات پر بھارت سے ہمارے تنازعات تھے ان پر پورٹنگ کا انداز اخلاق کی ہلکی ترین سطح سے گرا ہوتا تھا اور بعض چینلوں پر تو کھلم کھلا گالیاں دی جا رہی ہوتی تھیں۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا اور مجھے اپنے وطن کے میڈیا کا خیال آیا جو دن رات بھارت سے دوستی اور امن کی آشا کے گیت گاتا ہے اور بھارتی چینلوں کے پروگرام دکھانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور بھارت کے ساتھ دیرینہ تنازعات کا ذکر کیا بھی جاتا تو نہایت معذرت خواہانہ انداز میں۔ کاش کہ یہ لوگ تین چار دن بیٹھ کر بھارتی میڈیا کو دیکھیں کہ وہ پاکستان اور اس کی حکومت کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

ایک اہم خبر جو کشمیر اور اس سے اوپر لداخ میں بننے والے دریاؤں اور گلشیرز کے بارے میں تھی۔ یہ پانی کا بہت بڑا منبع تھے اور بھارت ان دریاؤں اور گلشیرز کا پانی اپنے قابو میں کرنے کے لیے چالیس بڑے پروڈیکٹس پر کام کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک درجن پروڈیکٹس وہ ہمارے حصے کے دریاؤں پر بن رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق ان پروڈیکٹس کی تکمیل کے بعد انڈیا ہمارے حصے کا نوے فیصد پانی روکنے پر قادر ہو جائے گا اور جب چاہے گایہ پانی چھوڑ کر سیلاب سے ہماری فصلوں اور آبادیوں کو برباد کر سکتا تھا۔ یہ الفاظ اس رپورٹر کے تھے جو ان پروڈیکٹس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہمارا میڈیا اور ارباب اختیار مصلحتوں کا شکار ہیں یا وہ ملک کے نقصان کو اپنا نقصان نہیں سمجھ رہے ہیں۔ عوام کو ان گنت مسائل میں اس طرح گم کر دیا گیا ہے وہ صبح شام بجلی، گیس، پانی، مہنگائی اور امن و امان کے سوا کچھ سوچتے ہی نہیں ہیں۔ سربراہ مملکت سے لے کر عام فرد تک خود میں گم ہے۔ پتا

نہیں ہمارا کیا ہوگا؟ میں نے نہایت دکی دل کے ساتھ ٹی وی بند کیا۔

رامن کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ یہاں شام کو بھی دو اخبارات چھپتے تھے میں نے ہول والوں سے انگریزی کا اخبار منگوا لیا اور اس کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا مگر رامن تو رامن کسی زخمی یا لاش کے بارے میں بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ اگر وہ مارا گیا ہوتا تو اس کی لاش لازمی دریافت ہوتی وہ ندی زیادہ بڑی نہیں تھی اور نیچے آبادیوں سے گزرتی تھی۔ رامن نہ صرف بچ گیا تھا بلکہ اس نے اسے پولیس کیس بھی بننے نہیں دیا تھا جس سے اخبار والوں کو خبر ملتی۔ شاید اس نے چھپ چھپا کر اپنا علاج کرا لیا تھا۔ میں نے اب تک اس کا موبائل آف رکھا تھا۔ میں نے صرف ایک بار پاکستان رابطہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال منور تھا کہ رامن را کا سابق ایجنٹ تھا اور وہ اپنے تعلقات استعمال کر کے اپنے نمبر کی نگرانی کرا سکتا تھا اگر وہ بھارتی حکام کو میرے بارے میں بتا دیتا تو یقیناً میرے لیے بہت زیادہ مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ شملہ زیادہ بڑی جگہ نہیں تھی یہاں کسی کو تلاش کر لینا زیادہ مشکل نہیں تھا اور اگر تلاش حکومت کی جانب سے ہوتی تو یہ بہت آسان ہو جاتا۔ بھارتی حکام کے پاس میری تصویر موجود تھی۔ یہ مشتہر ہو جاتی تو میرے لیے کہیں بھی چھپنا بہت مشکل ہو جاتا۔ بہر حال اب بھی مجھے شبہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح میری تلاش جاری تھی اور میں اسی وجہ سے یہاں سے پاکستان رابطہ کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

اوشا میرے ساتھ خوش تھی اور وہ مصر تھی کہ آج رات میرے کمرے میں رکے گی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے اپنے کمرے میں جانے پر راضی کر لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سکون سے سوچا اور آنے والے دنوں کے حوالے سے چند فیملے کیے خاص طور سے اوشا کے بارے میں اور پھر سو گیا۔ صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ بہت دنوں بعد میں نے ایک سرسبز کی اور اور پھر ہاتھ لے کر اوشا کے کمرے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اس نے بستر سے اٹھ کر دروازہ کھولا اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار تھا اور اس نے گزشتہ روز لی ہوئی نائکی زیب تن کی ہوئی تھی۔ رانوں سے ذرا نیچے اس باریک نائکی میں اس کے بدن کی تمام حشر سامانیاں نمایاں تھیں۔ میں بے ساختہ لاحول پڑھ کر رہ گیا اور پھر پوچھا۔ ”تم ابھی تک سو رہی ہو۔ کپڑے نہیں بدلے۔“

”ہاں رے.....“ وہ لا پرواہی سے بولی۔ ”کرتا ہی کیا ہے۔“

”ناشتہ کرتا ہے اور پھر مجھے بانو کو لینے جاتا ہے۔“

”ہمیں نہیں لے جاؤ گے؟“ اس نے جلدی سے کہا

”نہیں آج تم آرام کرتا۔ دیے بھی تم آرام کے موڈ میں ہو اور اب جلدی سے کپڑے پہن لو میں ناشتہ

منگوا لوں۔“

”پہننے ہوئے تو ہیں اچھے نہیں لگ رہے۔“ اس نے شوخی سے کہا اور گھوم کر خود کو دکھایا۔

”اچھے ہیں۔“ میں نے جز جز ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن کم ہیں۔“

”تو بھول رہا ہے ہم تو اس سے بھی کم کپڑے پہنتے تھے رے۔“ وہ دواش روم جاتے ہوئے بولی۔ نصف

گھٹنے میں وہ تیار ہوئی اس دوران میں ناشتہ آ گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نیچے آیا اور ریسپشن پر موجود اسی خاتون سے بات کی جس نے مجھے رانا دیاس کے حوالے سے تسلی دی تھی۔

”مجھے ایک کمرہ اور چاہیے۔ اس میں ایک مریضہ کا قیام ہوگا اور ساتھ میں اس کی نرس بھی ہوگی۔“

”کیوں نہیں سر۔“ اس نے مستعدی سے کہا۔ ”نرس خود ہائر کریں گے یا ہوٹل کی طرف سے مہیا کی جائے ہمارے پاس ڈاکٹر بھی ہوتا ہے۔“

”نہیں نرس ساتھ آئے گی۔“

”روم اسی فلور پر چاہیے جہاں آپ ہیں۔“

”اگر وہاں مل جائے تو اور اچھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن کنفرم نہیں ہے کہ مریضہ کب تک آسکے گی۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا روم ابھی سے آپ کے نام ہو جائے گا۔ آپ جب چاہیں اسے یوز کر سکتے

ہیں۔“

میں باہر آیا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ابھی تک رہن کمار کا معاوضہ نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے گزشتہ روز اور آج کے معاوضے کے ملا کر تین ہزار دیئے۔ وہ خوش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”تم گاڑی میں آرام سے رہ لیتے ہو؟“

”کیوں نہیں صاحب کوئی پہلی بار تھوڑی ادھر آیا ہے سیزن میں تو زیادہ وقت ایسے ہی گزرتا ہے بہت کم بستر پر سونا نصیب ہوتا ہے۔ ہم کو عادت ہے۔ ابھی جوان ہے ہر طرح سے گزارا کر لیتا ہے جب بوڑھا ہو جائے گا تب بستر پر آرام کرے گا۔“

ہم اسپتال پہنچے۔ اس بار بھی میں احتیاط سے دیکھ بھال کر اندر گیا تھا۔ ریسپشن والا مجھے پہچاننے لگا تھا میں نے اس سے پہلے راج کنور کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بغیر سوال کے بتایا کہ اس کے آپریشن کا میاب رہے تھے اور اب وہ پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ مجھ پر اس کا ایک قرض اور ہو گیا تھا لیکن ابھی میں بانو کو یہاں سے منتقل کرنا چاہتا تھا اس کے بعد اسے دیکھتا۔ ڈاکٹر انتھونی آف تھا اس کی جگہ ڈاکٹر امرتسرنگھ ڈیوٹی پر تھا وہ روایتی ہنس کھ کھ تھا جو سادگی میں بھی پھلجھڑیاں چھوڑتا ہو۔ اس نے بانو کا سن کر کہا۔ ”لوسر جی..... کاکی فٹ فٹ ہے آپ جب چاہو لے جاؤ، پر چوبیس گھنٹے میں ایک بار اس کا چیک لازمی ہوگا اگر بنکی بنکی باتیں کرے تو فوراً ادھر لانا ہوگا۔“

”ڈنسی فکری نہ کرو امرتسر جی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ویسے ادھر امرتسر میں پیدا ہوئے ہو؟“

وہ ہنسا۔ ”نہیں جی میرا پپو ادھر کا تھا پر جوانی میں یہاں شملہ آ گیا اور میں یہیں پیدا ہوا ہوں نے باپ کی محبت میں میرا نام امرتسر رکھ دیا۔ دیکھا ایک بار بھی نہیں ہے۔“

مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ خالص سکھ نمونہ پنجاب سے باہر پیدا ہوا تھا اور یہیں پلا بڑھا تھا۔ بانو کا سی ٹی اسکین ہو گیا تھا اور دماغ کی جملی پر آنے والا دم تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ دوسرے ٹیسٹ بھی مثبت آئے تھے۔ اسی لیے اسے اتنی جلدی جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ ڈاکٹر امرتسرنگھ نے اسپتال کی طرف سے ایک نرس ساتھ کی جسے بانو کے بارے میں مکمل ہدایات دی گئی تھیں اور تمام ضروری دوائیں ساتھ کی تھیں۔ میں نے ریلیز آرڈر اور بل پر سائن کیے جواب رانا دیاس کو بھیجا جانا تھا اور مجھے اس کی ایک کاپی بھی دی گئی تھی۔ وہ ایسبولینس ساتھ کر رہے تھے لیکن میں نے صرف ویل چیز لی۔ بانو کو اسی پر بٹھا کر باہر گاڑی تک لائے اور ہوٹل روانہ ہو گئے۔ بانو گزشتہ دن کے مقابلے میں زیادہ بہتر لگ رہی تھی اور اس کے چہرے کی سرخی بحال ہونا شروع ہو گئی تھی۔ البتہ

ہن کلرکی وجہ سے وہ کسی قدر غنودگی میں تھی۔ اسے ذہیل چیز پر اس کے لیے مخصوص کمرے میں پہنچایا گیا جہاں موٹل انتظامیہ نے وہاں سے عام بیڈ ہٹا کر مریضوں کے لیے مخصوص بیڈ بچھا دیا اور نرس کے لیے ایک آرام دہ کاؤچ کا بند بست کر دیا تھا۔ یہ کمرہ بھی اسی فلور پر تھا۔ بانو لیٹنے ہی سو گئی تھی۔ یہ اس کے لیے اچھا تھا وہ جتنا آرام کرتی اتنی جلدی اس کی صحت بحال ہو جاتی۔ نرس اس کی خوارک کا مکمل چارٹ بھی لائی تھی اور اسے اسی لحاظ سے دن میں چار سے پانچ بار کھانا دیا جاتا۔ یہ بھی اس کی جلد بحالی کے پروگرام کا حصہ تھا۔ اوشا کو پتا چلا تو وہ بھی آئی تھی لیکن بانو سو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”اسے سونے دو یہ جتنا آرام کرے گی اتنی جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔“

بانو کو دو پہر میں جا کی مگر دو گھنٹے بعد کھانا اور دوائی لے کر پھر غنودگی میں چلی گئی۔ اب اسے مارفین نہیں دی جا رہی تھی اور پین کلرگولی کی صورت میں دی گئی تھی۔ اس کے اثر سے وہ چار سے پانچ گھنٹے درد سے بچی راتی۔ نرس نے بتایا کہ دو سے تین گھنٹے اسے درد برداشت کرنا ہوگا اور اس کے بعد اگلی پین کلر دی جائے گی اس سے ایک تو وہ عادی نہیں ہوگی اور جسم پر پین کلر کے منفی اثرات کم ہوں گے دوسرے درد سے اندازہ ہوگا کہ یہ نارمل نوعیت کا ہے یا کوئی مسئلہ ہو رہا ہے۔ میں اور اوشا بھی شام تک اس کے ساتھ رہے تھے۔ جاگنے کے بعد وہ دو گھنٹے ہم سے گپ شپ کرتی رہی اور کھاتی پیتی رہی پھر دوائی کرو گئی۔ اگلی صبح اس کی حالت اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ اس نے نرس سے مزید پین کلر نہ دینے کی درخواست کی۔ نرس نے ڈاکٹر کو کال کر کے اس کا مشورہ لیا اور اس نے کہا کہ اگر درد حد سے زیادہ نہ ہو تو ٹھیک ہے۔ بانو سارا دن جاگتی رہی اور نرس کے سہارے کے بجائے وہ خود اٹھ کر واش روٹم گئی تھی البتہ نرس اس کے ساتھ تھی کہ اگر اسے چکر آئے تو وہ اسے سنبھال لے۔

شام کو اسے اسپتال لے گئے جہاں اس کا ایک سی ٹی اسکین اور ہوا۔ اس میں تصدیق ہو گئی کہ جھلی پر آنے والی لوے فیصد سو جن ختم ہو چکی تھی اور دس فیصد سو جن بھی ایک دو دن میں اتر جاتی۔ اس کی پروگریس دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے جوئیں گھنٹے والی حاضری سے منع کر دیا اور اب وہ اثر تالیس گھنٹے بعد دوبارہ اسپتال جاتی۔ سر سے بینڈیج اتار کر صرف ایک چھوٹی سے پٹی ٹیپ کی مدد سے لگا دی گئی تھی۔ اسے سر کے علاوہ باقی جسم دھونے کی اجازت مل گئی تھی۔ اب وہ آرام سے چل پھر رہی تھی اور دن کا زیادہ وقت وہ چلنے پھرنے میں گزار رہی تھی۔ وہ ہلدا ز جلد خود کو بھاگ دوڑ کے قابل بنا رہی تھی اسے بھی معلوم تھا کہ ابھی سب سے اہم مرحلہ باقی تھا جس میں ہمیں سرحد پار جانا تھا۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد سفر کے قابل ہو جائے۔ وہ تو ایک سرساز بھی کرنا چاہ رہی تھی لیکن نرس نے اسے روک دیا۔ ڈاکٹر نے ابھی ایسی کسی سرگرمی کی اجازت نہیں دی تھی۔

دو دن بعد وہ اسپتال گئی تو اندرونی چوٹ کو مکمل ٹھیک قرار دیا گیا تھا باہر سے بھی زخم بس نشان کی صورت میں باقی تھا کچھ دنوں میں اس کا کھرند اتر جاتا تو نشان بھی باقی نہ رہتا۔ ڈاکٹر نے اسے فضائی سفر کی اجازت دے دی تھی۔ کچھ دوائیں دی تھیں جن سے اندر کی چوٹ کا رہاسہا اثر بھی جاتا رہتا اور یہ دوائیں اسے تین دن تک کھانا تھی۔ اپنی اس پروگریس پر بانو بہت خوش تھی۔ اسپتال سے واپسی پر میں اسے ایک ریسٹوران لے گیا۔ اہم مقصد تو ذرا آؤنگ تھا وہ ایک ہفتے سے کمروں میں بند تھی۔ دو دن پہلے جب اسپتال گئی تھی تو وہاں سے اہلپری اسی گارمنٹ اسٹور سے بانو نے بھی شاپنگ کی۔ اس کے علاوہ وہ باہر نہیں نکلی تھی لیکن اصل مقصد اسے

اپنے آئندہ کے عزائم کے بارے میں بریف کرنا تھا۔ خاص طور سے اوشا کے بارے میں جو سوچا وہ بانو کو بتایا کہ میں اسے یہیں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔

وہ پریشان ہو گئی۔ ”اوشا مان جائے گی؟“

”وہ مجبور ہوگی۔ نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”وہ آپ کے لیے جنونی ہے نہ مانے گی تو دوسرے مشکل میں پڑ جائیں گے۔“

”میرا خیال ہے ہوٹل والے معاملہ سنبھال لیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک منٹ میں ایک کال کر کے آتا ہوں۔“

میں کال کر کے واپس آیا تو بانو کھانے کا آرڈر دے چکی تھی۔ اس نے یہاں اپنی پسند کا حیدر آبادی فرائک اور پاجامہ تلاش کر لیا تھا اور وہی پہنے ہوئے تھی۔ یہ لباس اس پر چلتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ اوشا ہماری منتظر تھی۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے رپن کمار کو اس کا باقی معاوضہ مع ایک دن کے اضافی معاوضے کے دیا تو وہ بہت خوش ہوا اور شکریہ ادا کرتا ہوا رخصت ہوا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں تھی اگر مجھے ضرورت پڑتی تو میں ٹیکسی لے سکتا تھا یا ہوٹل کی طرف سے گاڑی مع ڈرائیور کے مل سکتی تھی۔ بانو کے لیے رکھی جانے والی نرس بھی رخصت کر دی تھی اور اب اس کا کمرہ دوبارہ نارل فرنیچر سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب اوشا سونے چلی گئی تو میں کمرے سے نکل کر نیچے اسٹنٹ منیجر کے پاس آیا۔ منیجر دن میں ہوتا تھا میں نے اس سے تفصیلی بات کی اور اسے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ کسی قدر پریشان ہو گیا۔ ”کیا آپ نے خاتون سے بات کر لی ہے؟“

”آپ سمجھ نہیں رہے ہیں اسے بے خبر رکھنا ہے اور صبح آپ نے میری ہدایت کے مطابق اسے بتانا ہے۔ اس کے بعد بھی سارے انتظامات آپ کے ہوٹل کے توسط سے ہوں گے اور میں تمام اخراجات کے لیے آپ کو پیشگی رقم دوں گا۔“

”رقم کا مسئلہ نہیں وہ سب رانا صاحب کے ذمے ہے۔ مسئلہ ان کی اجازت کا ہے۔“

”فون رکھا ہوا ہے آپ بات کریں اور اجازت لے لیں۔“

اس نے رانا دیاس کے محل کال کی اور چند لمحے بعد رانا دیاس لائن پر آ گیا۔ اسٹنٹ منیجر نے اسے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں پھر اس نے مجھ سے بات کی اور خفگی سے بولا۔ ”مجھ بڑھے کو رات کو کیوں تنگ کرتا ہے پہلے ہی اتنی مشکل سے نیند آتی ہے۔“

”رانا صاحب معذرت خواہ ہوں لیکن یہ بھی ایمر جنسی تھی میں بہر صورت اس معاملے میں آپ کی رضامندی چاہتا ہوں۔“

”فون منیجر کو دو۔“ اس نے کہا تو میں نے ریسیور اسٹنٹ منیجر کی طرف بڑھا دیا۔ رانا دیاس اس سے بات کرنے لگا۔ منیجر نے بات کر کے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے سر جیسا آپ کہیں ہم ویسا ہی کریں گے۔“

”یہ کام ابھی کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ منیجر نے مجھے ایک واکس ریکارڈ فراہم کیا اور پھر مجھے تحلیلہ فراہم

دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ریکارڈنگ کا بین دبایا اور کہنے لگا۔

”اوشا..... تم شاید آخری بار میری آواز سن رہی ہو۔ میری زندگی بہت سی مشکلات کا شکار ہے اور تم مجھے عزیز ہو۔ میں تمہیں ان مشکلات میں مزید شامل نہیں کرنا چاہتا۔ پھر مجھے واپس جانا ہے اور تم میرے ساتھ نہیں جا سکتیں۔ میں تمہیں اکیلا اور بے سہارا چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا اس لیے تمہیں رانا دیاس کو سونپ کر جا رہا ہوں۔ وہ بہت اچھے اور مہربان آدمی ہیں ان کے محل میں تم آرام سے رہو گی اور تمہیں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ تم ملازم نہیں ہو گی لیکن اگر تم چاہو تو اپنی مرضی سے کوئی ذمہ داری سنبھال سکتی ہو۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو میری بات ضرور مانو گی اور میں چاہتا ہوں کہ تم رانا صاحب کے پاس چلی جاؤ۔ جس وقت تم یہ پیغام سنو گی میں اور بانو یہاں سے جا چکے ہوں گے۔ ہوٹل انتظامیہ تمہارے جانے کا بندوبست کر دے گی۔ ان سے تعاون کرنا۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔“

میں نے ریکارڈر بند کیا اور منیجر کو بلایا۔ ”اس میں موجود پیغام صرف اوشا نے اور یہ ریکارڈر اسے دے دیا جائے۔“

”ٹھیک ہے جناب..... آپ کے لیے نئے کمرے سیٹ کر دیئے ہیں اور آپ کا سامان بھی وہاں پہنچا دیا ہے۔ بے بی جا چکی ہیں اور یہ آپ کے کمرے کی چابی ہے۔“

یہ نئے کمرے چوتھے فلور پر تھے اور یہاں آنے سے سانس تھکے۔ بانو آچکی تھی۔ میں نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے پر وہ افسردہ دکھائی دی اس نے کہا۔ ”آپ نے اوشا کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے اسے بہت دھچکا لگے گا۔“

”میں جانتا ہوں لیکن اس کے لیے یہ دھچکا ہی اچھا ہوگا۔ میں اسے ساتھ نہیں رکھ سکتا اور واپس تو ہرگز نہیں لے جا سکتا۔ اگر کسی ہنگامی موقع پر اسے چھوڑنا یا چھوڑنا پڑتا تو وہ بے یار و مددگار رہ جاتی۔ یہ اچھا نہیں ہے کہ میں اسے محفوظ ہاتھوں میں دے کر جا رہا ہوں۔ اب وہ آرام سے رہے گی۔ اسے ہمارے ساتھ دھکے نہیں کھانا پڑیں گے۔ رانا دیاس کا محل کنور خاندان سے کہیں شاندار ہے اور وہ انسانی لحاظ سے بھی اچھا ہے۔ مجھے امید ہے اوشا جلد وہاں سیٹ ہو جائے گی۔“

بانو نے گہری سانس لی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن پھر بھی دکھ ہو رہا ہے۔“

”افسوس تو مجھے بھی ہے۔ اس نے کمزور ہونے کے باوجود پوری طرح ہمارا ساتھ دیا ہے۔“

”اب کیا کرنا ہے؟“

”واپس جانا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس کے لیے راج کنور کو قابو کرنا ہوگا۔“

بانو چونکی۔ ”وہ تو اسپتال میں ہے اور زخمی ہے۔“

”کوئی بات نہیں چند دن میں بہتر ہو جائے گا۔“

”مجھے لگ رہا ہے آپ راسن کے بارے میں کچھ چھپا رہے تھے؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تم بہت ذہین ہو، واقعی میں اوشا کے سامنے نہیں بتانا چاہ رہا تھا میں راسن کو اٹھا کر لے گیا تھا اور اس سے پوچھ گچھ کی لیکن اس نے کچھ خاص نہیں بتایا اور پھر فرار کی کوشش کی میں نے گولی

چلائی اور وہ زخمی بھی ہوا مگر بھاگ نکلنے میں کامیاب رہا۔ مجھے شبہ ہے وہ بچ گیا ہے اور شاید کہیں علاج کرا رہا ہے۔“

بانو تجس میں پڑ گئی تھی اس نے سوالات کیے اور آخر میں وہی بات کی جو میرے ذہن میں تھی۔ ”یہ راج کنور کے اتنے خیر خواہ کب سے ہو گئے کہ اسے علاج کے لیے اسپتال لے آئے۔“

”معلوم تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کنور پیلس میں کوئی تبدیلی آئی ہے اسی کے نتیجے میں راج کنور کو علاج کے لیے اسپتال بھیجا گیا ہے۔“

”کیسی تبدیلی؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا بڑے کنور نے ٹیک اور کر لیا ہے؟“

”اس کا امکان ہے۔ نشی جی کے ساتھ چند ہی آدمی تھے اور وہ بھی لالچ میں اس کے ساتھ آئے ہوں گے جب کہ پیلس میں کنور خاندان کے لاقعداد وفادار ہیں۔ ممکن ہے بڑے کنور کو کسی طرح ان سے رابطے کا موقع مل گیا ہو اور انہوں نے بازی پلٹ دی ہو۔“

”بڑا کنور ہی بھائی کا کسی حد تک فیور کر سکتا ہے ورنہ نشی جی اور رامن اسے ہر قیمت پر مار ڈالنا چاہتے تھے۔“

”لیکن ایک ابہام ہے۔ اگر بازی پلٹ گئی تو رامن نہ صرف معاف کر دیا گیا بلکہ اس پر اتنا اعتماد کیسے کر لیا گیا کہ اسے راج کنور کو اسپتال لے جانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔“

”ممکن ہے اسی کی وجہ سے بڑے کنور کو آزادی ملی ہو۔“ بانو نے خیال ظاہر کیا۔ ”اس صورت میں وہ معتد بن سکتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ مجبوراً نشی جی کے ساتھ شامل ہوا تھا مگر اس نے ہمیں مارنے کی پوری کوشش تو کی تھی۔“

”تب اس کی اصل وفاداری بڑے کنور کے ساتھ ہوگی اور وہ راج کنور بھی کو بھی اسی کے حکم پر بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

ہم سوچ کے تنکے لگا رہے تھے اور حقیقت کا علم نہیں تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی اس لیے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ نیند دیر سے آئی اور پھر آنکھ فون تیل سے کھلی۔ یہ انظر کام تھا میں نے ریسیوا اٹھایا۔ ”لیس۔“

”سر یہ آپ نے کتنی خطرناک لڑکی ہماری سپرد کی ہے۔“ دوسری طرف سے اسٹنٹ نیچر کی بوکھلائی آواز آئی۔ ”جب اسے آپ کا پیسج دیا گیا تو وہ پاگل ہو گئی۔ میرے آدمیوں پر چڑھ دوڑی اور جب اسے قابو کرنے کی کوشش کی گئی تو اس نے ایک آدمی کو کاٹ لیا۔ اس کی حالت خراب ہو گئی اور اسے اسپتال بھیجا ہے۔“

”مائی گاڈ۔“ میں نے کہا۔ ”نیچر وہ زہریلی ہے، دش کنیا ہے۔ اپنے آدمی کو فوراً کسی اچھے اسپتال بھیجو ورنہ وہ مری بھی سکتا ہے۔“

”آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ بولا۔

”میرا نہیں خیال تھا کہ اس کا رول یہاں تک پہنچ جائے گا۔ اب وہ کسی ہے؟“

”آدمی کو کاٹنے کے بعد اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے لیکن سب ڈرے ہوئے ہیں۔ کوئی اس کے پاس

جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

میری نیند اڑ گئی تھی اور ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ”مجھے ایک موبائل فون مہیا کریں اور اپنے موبائل فون سے اس پر کال کر کے اوشا سے میری بات کرائیں۔ ظاہر یہ کریں کہ میں کہیں اور ہوں اور آپ نے بڑی مشکل سے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔“

پانچ منٹ بعد ایک ویڈیو دروازے پر دستک دے کر ایک موبائل فون دے گیا اور چند منٹ بعد اس کی بیل بجی میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اسٹنٹ منیجر تھا۔ ”جناب آپ کہاں ہیں؟“ اس نے اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی ساتھی نے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے انہوں نے مزاحمت کر کے ہمارے ایک آدمی کو کاٹ لیا ہے اور وہ اسپتال میں داخل ہے۔“

”میری اوشا سے بات کراؤ۔“ میں نے کہا چند لمحے بعد اوشا کی آواز آئی۔

”شہباز یہ ٹو ہے؟“

”اوشا یہ کیا کر رہی ہو کیا تم نے میری بات نہیں سنی تھی۔“

”تو ہمیں کیوں چھوڑ گیا ہے رے۔“ وہ رونے لگی۔ ”ہم تیرے بنائیں رہ سکتے۔“

”اوشا..... اوشا میری بات سنو.....“ میں نے کہا اور بڑی مشکل سے اسے رونے سے روکا۔ ”میری مجبوری سمجھو..... میں یہاں نہیں رہ سکتا..... مجھے واپس جانا ہے اور اب تو میں بہت دور آ گیا ہوں آج یا کل تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”تو پھر کبھی نہیں آئے گا؟“

”اؤں گا جب حالات بہتر ہوں گے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ ”لیکن ابھی یہاں کے حالات میرے لیے ٹھیک نہیں ہیں۔ ٹو کیا چاہتی ہے میں راج خاندان یا حکومت کے ہاتھ لگ جاؤں وہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔“

”نہیں رے۔“

”تب میری بات مانو اور رانا دیاس کے پاس چلی جاؤ اور وہاں میرا انتظار کرو۔“

”اگر ٹو کہتا ہے تو چلے جاتے ہیں ورنہ ہم کسی رانا کو نہیں جانتی۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

”وہ میرے بڑے ہیں ان سے احترام سے پیش آنا۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں تمہیں کنٹرول سے بالکل

عطف ماحول ملے گا۔ مجھے امید ہے تم وہاں خوش رہو گی۔“

اسے خوش کرنے کے لیے میں کچھ دیر اس سے بات کرتا پھر منیجر سے بات کی۔ ”اب یہ مزاحمت نہیں

کرے گی۔ اس کی روانگی کا کیا بندوبست ہے؟“

”دو پہر دو بجے کی فلائیٹ میں سیٹ ہے۔ یہ دہلی اور گلگت سے ہوتی مرشد آباد جائے گی اور وہاں رانا

صاحب کا آدمی اسے ریسیو کرے گا۔“

میں فکرمند ہو گیا۔ ”یہ باہر کی دنیا کے بارے میں بہت کم جانتی ہے اس کے لیے اکیلے سفر کرنا مشکل ہو گا۔“

بہتر ہے کسی کو اس کے ساتھ بھیجا جائے۔“

”ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔“ اسٹنٹ منیجر نے کہا۔

منیجر سے بات کر کے میں داش روم میں آیا اور نہادھو کر ناشتہ طلب کیا۔ بانو بھی اٹھ گئی تھی اور اس نے بتایا کہ اس نے ہلکی پھلکی ایکمر سائز بھی کی تھی اور اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ زخم کا کھر نڈکا ہو گیا تھا اس لیے احتیاط سے نہانے کی اجازت بھی مل گئی۔ ناشتے کے دوران اسے ادشا کی ہنگامہ آرائی کے بارے میں بتایا وہ پریشان ہو گئی۔ ”یہ اچھا نہیں ہوا..... اس آدمی کا کیا حال ہے۔“

”زہر کا اثر ہوا ہے لیکن امید ہے کہ بچ جائے گا۔“

اسٹنٹ منیجر کے انداز سے بھی لگ رہا تھا کہ آدمی کی حالت اتنی خراب نہیں ہے۔ مگر معاملہ زہر کا تھا اور بعد میں کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو ادشا پھنس جاتی۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے ایک بار وہ رانا دیاس کے پاس چلی جاتی تو وہ سب سنبھال لیتا۔ ایک گھنٹے بعد میں۔ ”مفرم کیا۔ منیجر آگیا تھا اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ ادشا کو پوری ذمہ داری سے مرشد آباد تک پہنچا دیا جائے گا۔ بارہ بجے ادشا کو ہوٹل کی گاڑی لے گئی۔ اس کے ساتھ عملے کی ایک عورت جا رہی تھی جو اسے مرشد آباد پر رانا دیاس کے آدمیوں کے حوالے کر کے واپس آتی۔ یہ طویل فاصلے تھی جو شام ساڑھے سات بجے مرشد آباد پہنچتی۔

لنچ کے بعد میں بانو کو چھوڑ کر ہوٹل سے نکلا۔ سوٹ کے بجائے میں نے ٹراؤزر شرٹ اور اوپر ہلکی جیکٹ کے ساتھ سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے ٹھیلے پر پی کپس بک رہی تھیں میں نے ایک جیکٹ سے بیچ کرتی پی کیپ خرید لی۔ اب میرا حلیہ خاصا بدل گیا تھا اور اگر اسپتال میں مجھے کوئی دیکھتا تو آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ٹیکسی نے مجھے اسپتال پہنچایا۔ میں گیٹ سے اندر آیا لیکن ایمر جنسی میں سامنے سے جانے کے بجائے عقبی حصے میں آیا۔ یہاں سردس ڈور تھا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ میں انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اندر سے نکلا اس نے بڑا سا ڈسٹ بن اٹھا رکھا تھا یہ اس نے دروازے کے ساتھ رکھے لوہے کے کچرے دان میں خالی کیا اور اس سے پہلے وہ واپس جاتا میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

”اے چاچا ایک منٹ رکنا۔“

وہ رک گیا اور خلاف توقع وہ مسکرایا۔ ”اندر کسی سے ملنا چاہتے ہو؟“

”ہاں بس تھوڑی دیر کے لیے۔“ میں نے ایک سو کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دبایا۔ ”سامنے والے جانے

نہیں دے رہے۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”تیرہ نمبر میں۔“ میں نے حکا مارا۔

”اچھا اچھا..... جس میں سندری ناری ہے۔“

میں نے آنکھ دبائی۔ ”تم مجھدار ہو چاچا۔“

”زیادہ دیر مت لگانا۔ اگر پکڑے گئے تو میرا نام مت لینا۔“

”تمہارا نام کیسے لے سکتا ہوں جب کہ تمہارا نام جانتا ہی نہیں ہوں۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ میرے ذہن میں ایمر جنسی والے حصے کا نقشہ تھا اس لیے مجھے راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ میں

روم والے حصے میں آیا۔ راج کنور یہیں کہیں ہو سکتا تھا۔ میں باری باری دروازے کھول کر دیکھنے لگا اور اگر کوئی مریض یا دوسرا فرد نظر آتا تو سوری کہہ کر دروازہ بند کر دیتا۔ پانچویں کمرے میں راج کنور دکھائی دیا وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے اندر آ گیا۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ پر پلاسٹر لپٹا ہوا تھا اور گردن میں کالر تھا۔ سر اور منہ پر بھی چوٹوں کے معدوم ہو جانے والے نشانات تھے۔ اسے یقیناً اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ سر کے بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ صحت بہتر ہو رہی تھی۔ مجموعی طور وہ بہتر لگ رہا تھا۔ بانو پر حملہ کرنے کا صلہ یقیناً اسے مل گیا تھا لیکن ابھی حساب پورا نہیں ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ آہٹ سن کر وہ چونکا اور پھر اس نے آنکھ کھولی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کا ہاتھ سر ہانے لگے ٹہن کی طرف گیا تھا۔ مگر میرے ہاتھ میں موجود پستول پر نظر پڑتے ہی رک گیا اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”شباز تم؟“

”تم یقیناً مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوئے ہو گے۔“ میں نے آہستہ سے کہا اور کرسی کھینچ کر بستر کے پاس بیٹھ گیا۔ احتیاطاً اس کے بیڈ کو ذرا نیچے سر کا کر بن اس کی پہنچ سے دور کر دیا تھا۔ ”تمہارا خیال ہو گا کہ میں پاکستان چاچکا ہوں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ چند دن پہلے تک تم یہاں تھے؟“

”یہ بات رامن نے بتائی ہو گی اس کا مطلب ہے وہ بچ گیا ہے؟“

”اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔“

”مجھے زیادہ تعجب تمہارے بچ جانے پر ہے یہ چٹکار کیسے ہوا، میرے خیال میں تو بڑے کنور سمیت سب ہی تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر میں زندہ ہوں تو یہ ان کی مہربانی نہیں مجبوری ہے۔“

”کیسی مجبوری؟“

”جاگیر اور بزنس سے متعلق بعض اہم دستاویزات میرے پاس ہیں جب تک وہ انہیں حاصل نہیں کر لیتا مجھے نہیں مار سکتا ہے۔“

”وہ کون؟“

”بڑا کنور اور کون؟“

”اس کا مطلب ہے پبلِس میں اس نے اقتدار بھر سے حاصل کر لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل اور اسی وجہ سے میں بچ گیا۔ فحشی دل جی فرار ہو گیا تھا اور جب رامن مجھے وہاں لے گیا تو حالات بے کنور کے قابو میں آ چکے تھے۔“

یعنی میرا اور بانو کا اندازہ درست تھا۔ ”رامن کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم..... وہ کل ملنے آیا تھا اور مجھے دھمکی دے کر گیا ہے اگر میں نے کاغذات بڑے کنور کے

الے نہ کیے تو بات میرے بیوی بچوں تک جاسکتی ہے۔“

”راسن پڑی بدلنے کا مہر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بڑے کنور نے اس پر اعتماد کیسے کر لیا؟“

”میں نہیں جانتا، ویسے بھی میں بے ہوش تھا۔ مجھے یہاں اسپتال میں ہوش آیا تھا۔“

”تب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ اگر راسن تمہارے بیوی بچوں کو اٹھالایا تو تم بالکل مجبور ہو جاؤ گے اور یہ بھی

ممکن ہے کہ کاغذات دے کر بھی تم لوگوں کی جان نہ بچے۔“

راج کنور کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے بھی یہی خدشہ تھا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”میں کیا کر سکتا

ہوں یہاں مجبور اور بے بس ہوں۔ جیسے ہی ذرا ٹھیک ہوں گا یہ مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔“

میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن میرا منصوبہ کیا تھا یہ صرف میرے ذہن میں تھا اور اسی وجہ سے میں یہاں رکا ہوا

تھا۔ اگر میں کامیاب رہتا تو بہت آرام سے پاکستان پہنچ سکتا تھا جیسے وہاں سے لایا گیا تھا۔ میں نے ذرا آگے

جھک کر کہا۔ ”راج کنور نشی جی کا پتا صاف ہو گیا ہے اور اب راسن رہ گیا ہے اگر وہ بھی نہ رہے تو تم دونوں

بھائیوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے والا کون رہ جائے گا؟“

”کوئی بھی نہیں..... اصل سازشی نشی جی تھا۔ مگر بڑا کنور مجھ سے پوری طرح بدظن ہو گیا ہے وہ مجھے

معاف نہیں کرے گا۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”اگر راسن نہیں رہے گا تو اس کا رویہ بھی چھینچ ہوگا۔ ہر ایک تمہارے ساتھ وہ نہیں کر سکتا ہے جو راسن کر

سکتا ہے۔ ابھی وہ کسی وجہ سے مجبور ہے لیکن موقع پاتے ہی تمہیں مار ڈالے گا کیونکہ موقع پاتے ہی تم بھی اس کے

ساتھ یہی کرو گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ بولا۔ ”تمہارا مقصد کیا ہے اگر تم مجھے قتل کرنے آئے ہو تو اتنی بات کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔“

”میں تمہیں قتل کرنے نہیں آیا ہوں میری ایک پیشکش ہے۔“

”کیسی پیشکش؟“

”میں راسن کا پتا صاف کر دیتا ہوں اور تم مجھے واپس پاکستان چھوڑ کر آؤ گے۔“

”وہ کیسے؟“

”اپنے ہیلی کاپٹر کی مدد سے، تم نے مجھے بتایا نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ بھارت سرکار کی طرف سے اس

ہیلی کاپٹر کو سرحد پار کرنے اور واپس آنے کی کلیرنس دی جاتی ہے ورنہ اتنی حساس سرحد پر یوں دن کی روشنی میں آنا

جاننا ممکن نہیں ہے۔“

”تم نے ٹھیک کہا ہے میں نے خصوصی اجازت لی ہوئی ہے۔“

”تم اب بھی پوری بات نہیں بتا رہے ہو۔ یہ اجازت تمہیں بھگوان واسطے نہیں ملی ہے اس کے بدلے تم

سرکار کا کوئی نہ کوئی کام کرتے ہو گے۔ سامان اور بندے لاتے لے جاتے ہو گے۔“

اس کے تاثرات نے پھر تصدیق کی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز کیا تم مجھ پر اعتبار کر

رہے ہو؟“

”نہیں اس کے برعکس تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارا اشارہ اس طرف ہے نا کہ میں

راسن کا کام تمام کر دوں۔ اس کے بعد تم مجھ سے تعاون سے مکر جاؤ تو میں کیا کر لوں گا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میرا یہی مطلب ہے؟“

”راج کنور اگر تم بڑے کنور کے چنگل سے نکلنا چاہتے ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ اگر تم میرا ساتھ دو گے تو میں تمہیں موقع دوں گا تم واپس آ کر نکل جاؤ۔ تم بڑے کنور کو دھوکے میں رکھ سکتے ہو کہ تم صحت یاب ہوتے ہی دستاویزات اس کے حوالے کر دو گے۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”تم مجھے اس کے چنگل سے کیسے نکالو گے؟“

”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا پہلے راسن سے نمٹ لوں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تمہارے ساتھ کیا ہوا

تھا؟“

”تم بد قسمتی کہہ سکتے ہو جب تک میرے پاس جوتے نہیں تھے میں ایک بار بھی نہیں گرا اور جب بانو سے جوتے حاصل کیے تو کچھ دیر بعد ہی پاؤں پھسلا اور میں لڑھک کر نیچے مڑک تک آگرا اور اسی وجہ سے بچ گیا۔ ورنہ کسی ویران جگہ ہوتا تو وہیں پڑے پڑے مر جاتا۔ اتفاق سے اسی وقت راسن وہاں سے گزرا اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔“

راسن یقیناً ہماری ناکام تلاش کے بعد واپس آ رہا ہوگا جب اس نے راج کنور کو مڑک کے کنارے پڑے پایا۔ ”ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں تمہیں کب تک ڈسچارج کیا جاسکتا ہے؟“

”مزید دو دن لگ سکتے ہیں، میری گردن میں چوٹ آئی ہے اور ریزہ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے اس کی طرف سے اطمینان کے بعد ہی ڈاکٹر مجھے جانے دیں گے۔“

”یہاں تمہاری نگرانی کے لیے کوئی نہیں ہے؟“

”سنٹوش ہے، وہ راسن کا خاص آدمی ہے لیکن وہ کمرے میں نہیں آسکتا وینٹک روم میں رہتا ہے۔“

اچھا ہوا میں سامنے کی طرف سے نہیں آیا ورنہ سنٹوش سے سامنا ہوتا۔ ”وہ مجھے پہچانتا ہے؟“

”میں نہیں جانتا مگر راسن کا آدمی ہے اور اس نے یقیناً تمہارے بارے میں بتایا ہوگا خاص طور سے جب

تم نے اس پر حملہ کیا ہے۔“

”تمہارے پاس رابطے کے لیے کچھ ہے؟“

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس معاملے میں انہوں نے مجھے بالکل بے دست و پا کر دیا ہے حد

یہ کہ انتظامیہ کو بھی منع کر دیا ہے کہ مجھے کسی سے رابطے کا موقع نہ دیا جائے۔“

مجھے تعجب ہوا۔ ”انتظامیہ مان گئی؟“

”ان کو پیسے سے مطلب ہے۔“ وہ تخی سے بولا۔ ”جو پیسہ دیتا ہے اس کی ہر بات مانی جاتی ہے۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ ”راج کنور یہ ہمارا آخری معاملہ ہے امید ہے تم کسی چالاکی سے گریز کرو گے جس کا

نقصان مجھے اور تمہیں بھی ہو۔ تم نے دیکھ لیا کہ میں نے کبھی خود سے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اب بھی میں نیک نیتی سے پیش کر رہا ہوں۔“

راج کنور نے کچھ کہا نہیں وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں باہر آیا آتے وقت بھی مجھے کسی نے نہیں روکا۔ میں

عقبنی دروازے سے باہر نکلتا تھا اور باہر آتے ہی سرد دھات میری گردن سے لگ گئی اور راسن کی سرگوشی سنائی دی۔ ”بس ہلنا مت شہباز..... مجھے معلوم تھا تم راج کنور کے چکر میں یہاں آؤ گے۔“



جس وقت راسن نے پستول میری گردن سے لگایا میں دروازہ بند کر رہا تھا۔ میں اور دروازہ دونوں حرکت میں تھے۔ یہ دھاتی سونگ ڈور تھا جو اندر باہر یکساں کھلتا تھا اور بند ہونے کے بعد خود بہ خود لاک ہو جاتا تھا۔ اندر سے یہ صرف پینڈل گھمانے سے کھلتا تھا مگر باہر سے کھولنے کے لیے چابی کی ضرورت پڑتی تھی۔ میں اسے باہر کی طرف کھولتے ہوئے نکل رہا تھا جب راسن نے پستول کی نال میری گردن سے لگائی۔ میں نے کنور پیلس میں قید کے دن بہت مبر سے اس امید پر گزارے کہ قدرت مجھے موقع دے گی اور میں آزادی حاصل کر سکوں گا۔ میری امید پوری ہوئی اور میں کنوروں کے جنگل سے نکلنے میں کامیاب رہا۔ ایک بار آزاد ہونے کے بعد میرے ذہن کے گوشوں میں یہ بات تھی کہ یہ شاید آخری موقع ہے اور میں دوبارہ کسی صورت ان لوگوں کی قید میں نہیں جانا چاہتا تھا جو دونوں لحاظ سے میرے لہو کے پیاسے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسا کوئی موقع آیا تو میں آخری حد تک لڑوں گا۔ ایک فیصد زندگی کے چانس پر بھی رسک لوں گا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ ابھی راسن کا جملہ منہ میں تھا کہ میں نے شاید اپنی زندگی کا سب سے بڑا رسک لیا۔ باہر آتے آتے میں اسپرنگ کی سی تیزی سے واپس گیا اور ساتھ ہی دروازہ پوری قوت سے کھولا۔ راسن دروازے کے پیچھے تھا۔ ٹھک کی ہلکی سی آواز آئی اور دروازہ پوری قوت سے راسن کو لگا تھا۔ گولی میرے چہرے کے پاس سے گزری تھی اور اس کی تپش اور رفتار میں نے اپنے چہرے پر محسوس کی تھی۔ آڑ میں آتے ہی میں نے واپس آنے والے دروازے کو پھردھکیلا اور اس بار اپنے جسم کی پوری قوت کو استعمال کیا۔ راسن دیوار سے ٹکرایا اور کسی مرتے پھینسنے کی طرح ڈکرایا۔ دوسری بار دروازہ اسے لگا تو وہ چلا اٹھا تھا۔ اب وہ دروازے اور دیوار کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ مگر وہ مسلح تھا اور دروازے کے دوسری طرف سے بھی فائر کر سکتا تھا۔ کسی قدر مونے المونیم سے بنایا یہ دروازہ یقیناً گولی نہیں روک سکتا تھا اس لیے میں راسن کو دروازے اور دیوار کے درمیان دبائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا ساتھ ہی اپنا پستول بھی نکالنا چاہتا تھا۔

راسن نے اچانک اپنی طاقت کو استعمال کیا اور دروازے کو اتنی قوت سے دھکیلا کہ میں لڑکھڑا کر پیچھے آیا اور سنبھلنے کی کوشش میں گر گیا۔ مگر اس دوران میں پستول نکال چکا تھا۔ دروازے کی رکاوٹ بچنے ہی راسن نے اپنا پستول میری طرف کیا تھا۔ یہ چھوٹا پستول تھا جس کی نال پر بڑا سا ٹلنسر عجیب لگ رہا تھا اور شاید اسی وجہ سے راسن دروازے کے پیچھے سے اسے استعمال نہیں کر سکا تھا۔ اس کی لمبائی قریب پون فٹ ہو گئی تھی دوسری صورت میں پستول صرف چار انچ لمبا تھا اور آسانی سے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ میرے پستول کا رخ اس کی طرف تھا اور میری نظر راسن کے پستول پر جمی ہوئی تھی۔ اگر وہ فائر کرنے کے لیے لمبی دباتا تو میں بھی پوری طرح تیار تھا۔ ہمارے درمیان مشکل سے سات آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ کسی کا نشانہ مشکل سے ہی خطا ہوتا۔ یہ بات راسن نے بھی محسوس کر لی اور فوری گولی چلانے سے گریز کیا۔ اس کی نظر بھی یقیناً میرے پستول پر تھی۔ اس نے سر دلچے میں کہا۔

”شہباز پستول پھینک دو۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں۔“

”یہی پیکش میری بھی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم بچ نہیں سکتے میرے اور آدمی بھی ہیں یہاں۔“

”ضرور ان کو بھی بلا لو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تمہیں کوئی بچا نہیں سکے گا۔“

اس کے چہرے پر فکر کے آثار دکھائی دیئے۔ ”شہباز تم کیا چاہتے ہو؟“

”ایک موقع.....“ میں نے کہا۔ ”ہم دونوں کے لیے برابر کا۔“

”کیا مطلب؟“

”اگر تم پستول استعمال کرنا چاہتے ہو تو میرا جواب بھی گولی ہوگی۔ اس تبادلہ خیال میں نہ جانے کون بچے

اور کون مارا جائے ہو سکتا ہے دونوں مارے جائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ زندگی و موت کا فیصلہ کیوں نہ ہم اپنے زور بازو پر کر لیں۔“

راسن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ”تم مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو؟“

”ایک بار تم نے کہا تھا کہ تم سے واسطہ پڑا تو تم بتا دو کہ تم ٹانگ نہیں ہو۔ اگر تمہارا چیلنج برقرار ہے تو.....“

ہم دونوں ہی ایک ہنگامی میں پھنس گئے تھے اور اس سے نکلنے کا یہ خیال الہام کی طرح میرے ذہن میں

نازل ہوا تھا۔ راسن بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا اور بالآخر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، تم پستول پھینک دو۔“

”پہلے تم۔“

اس کے تیور خطرناک ہوئے ایسا لگا کہ وہ گولی چلا دے گا مگر پھر اس نے اپنا پستول ایک طرف پھینک

دیا۔ میں کھڑا ہو گیا اور اپنا پستول مخالف سمت میں تقریباً اتنے ہی فاصلے پر پھینک دیا جتنا راسن نے پھینکا تھا۔ اس

نے ہتھکڑی کے ساتھ خاک شرت پہن رکھی تھی اور اس کے بازو پر زخم تھا۔ اگرچہ اس بات کو کئی دن گزر گئے تھے مگر

مجھے امید تھی کہ اس کا زخم ابھی بھرا نہیں ہوگا۔ یہ ایک کمزور پہلو تھا اس کا۔ اس نے بیروں میں سخت لیدر شوز پہن

رکھے تھے جب کہ میرے بیروں میں جو گرز تھے۔ موومنٹ کے لحاظ سے میں بہتر پوزیشن میں تھا لیکن اس کے

جوتے زیادہ سخت ہتھیار ثابت ہو سکتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ بہتر پوزیشن میں تھا۔ میں نے پی کیپ بھی اتار کر

ایک طرف اچھال دی۔

”راسن تم نے اتنی تیزی سے قلا بازیاں کھائی ہیں کہ کیا کوئی لنگور کھاتا ہوگا۔“

”تمہارا اشارہ وفاداریاں بدلنے کی طرف ہے تو یہ سارا مفاد کا کھیل ہے۔“ وہ نیم دائرے میں گھومنے

لگا۔ میں فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ گھومنا پڑ رہا تھا۔

”پیسل میں پانا کیسے پلانا؟“

”یہ مٹی کی محافت تھی میں نے کہا بھی تھا کہ سانپ قابو میں ہے اس کا پھن کچل دو۔“ وہ صاف گولی سے

لاغا لٹا اسے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ اس کی گفتگو بڑے کنور تک پہنچ سکے گی اس کا اشارہ یقیناً بڑے کنور کی طرف ہی

سا۔ ”مگر مٹی لیے پکر میں تھا۔“

”جاگیر پر قبضے کے۔“

اس نے حیرت سے کہا۔ ”تم جاننے ہو؟“
 ”میں اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔“

”تمہیں راج نے بتایا ہو۔“ اس نے کہا اور اچانک تیزی سے آگے آیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھ پر کھونے بازی کی مشق کرنا چاہتا ہو لیکن یہ دھوکا تھا اس نے میرے گھٹنے پر ٹھوکر ماری تھی اور اگر یہ ضرب صحیح جگہ لگ جاتی تو میرا گھٹنا بھی ٹوٹ سکتا تھا مگر میں نے بروقت پاؤں موڑتے ہوئے یہ وار پنڈلی پر روکا۔ وار سخت تھا اور رد کی لہر اٹھی تھی لیکن میں نے برداشت کرتے ہوئے جوابی ٹھوکر ماری۔ وہ آرام سے میری زد سے نکل گیا۔ وہ یقیناً مارشل آرٹ کا ماہر تھا۔

”راج نے بھی بتایا ہے اور میری معلومات کے کچھ ذرائع اور بھی ہیں۔“ میں نے پیچھے ہوتے ہوئے کہا۔
 ”بڑے کنور نے اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کے بعد تمہیں کیوں بخش دیا۔ بغاوت میں تم برابر کے شریک تھے۔“
 اس نے بھیڑیے کی طرح دانت نکالے۔ ”میں صرف ان لوگوں کا نمک خوار نہیں ہوں میری ایک حیثیت اور بھی ہے۔“

”را کے ایجنٹ کی۔“

اس بار اس نے سچ بچ دانت پیسے تھے۔ ”راج کنور.....“

میں ہنسا۔ ”وہ بے چارہ مجبور تھا۔ جیسے اب مجبور ہے۔“

”بس کچھ دن کی بات ہے پھر میں اس شخص کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔“

”یہ شاید اتنا آسان نہ ہو۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف بڑھا۔ وہ وار روکنے کے لیے ہوشیار ہو گیا۔ میں نے اچانک گھوم کر لات چلائی۔ وہ مار کھا گیا۔ لات اوپر سے نیچے آئی تھی۔ کنور ہیلس میں بانو سے لڑائی کی مشق میں، میں نے اس وار کی بہت پریکٹس کی تھی۔ راؤڈ کک کے مقابلے میں یہ زیادہ خطرناک وار ہے کیونکہ اوپر سے نیچے آتی جسم کے کسی نہ کسی حصے پر لگتی ہے اور اس کی قوت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ راسن کے پاس پیچھے ہٹنے کا وقت نہیں تھا اس نے بمشکل ہاتھ اوپر کرتے ہوئے وار روکا اور لڑکھڑا کر پیچھے گیا تھا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں حیرت دکھائی دی جیسے وہ مجھ سے اس وار کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کے لڑکھڑانے کے دوران میں نے سینے پر ایڑی مارنا چاہی لیکن اس نے ہاتھ سے روک کر یہ وار بھی ناکام بنادیا مگر میرا پاؤں پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

اب تک وہ محتاط تھا لیکن اس بار اس نے احتیاط بالائے طاق رکھ کر مجھ پر کئی حملے کیے۔ وہ جس طرح سے ہاتھوں، ٹھوکروں اور کھینچوں کا استعمال کر رہا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کنگ فو جانتا ہے۔ اس میں دشمن کے پاس رہتے ہوئے مہلک وار کیے جاتے ہیں۔ مگر ماہر فن ہونا شرط ہے ورنہ دشمن اس قربت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے جیسا کہ میں نے اٹھایا اور ایک گھونٹے سے اس کا جیز اہلا دیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ وہ اشتعال میں آئے اور اندھا دھند کارروائی کرے لیکن گھونٹہ کھا کر وہ پیچھے گیا اور اس نے دوبارہ فاصلہ کر لیا تھا۔ اس دوران میں اس کی ایک کہنی میری پسلیوں میں اور ایک شانے پر لگی تھی۔ دونوں وار مہلک تھے لیکن میں نے ناکام بنائے اس کے باوجود اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔ راسن خطرناک لڑاکا تھا اور یقیناً ان چند اچھے لڑنے والوں میں سے تھا جن سے میرا

مقابلہ ہوا تھا۔ مجھے جسمانی مقابلوں کے موقع کم ہی ملتے تھے اور ان میں زیادہ تر میرا بلہ بھاری رہا تھا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ڈبوڈشا کے گرگے مارشل نے مجھے اپنی مہارت سے شکست ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ صبح معنوں میں لڑا کا تھا۔ رامن اس کے پائے کا نہیں تھا مگر وہ بھی اسی میدان کا مرد تھا۔ اس نے پیچھے ہو کر تھوکا تو منہ سے خون نکلا تھا۔ یک لخت اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور چہرے سے وحیانشانہ تاثرات جھلکنے لگے تھے۔

”بڑے کنور نے میرے بارے میں کیا حکم دیا ہے؟“

”تمہیں تلاش کرنے کا۔“

”تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں یہاں ہوں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بتایا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ تم بدستور یہاں ہو۔ میں نے خیال ظاہر کیا کہ تم یہاں سے جا چکے ہو۔“

”بڑے کنور نے تمہاری بات کا یقین کر لیا؟“

اس سوال کے جواب میں اس نے حملہ کیا اور اس کا انداز غضب ناک تھا اس لیے میں نے آسانی سے اس کا حملہ ناکام بنادیا اور اس کے ماتھے پر ایک عدد نیل کا اضافہ ہو گیا۔ وہ پیچھے گیا اور دانت پیسنے لگا پھر اس نے کہا۔ ”بڑا کنور جائے نہ کہ میں، تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”کیوں نہیں۔“ میں ہنسا۔ ”ویسے تم نائیک کی نقل کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

اس طعنے نے اسے آتش زیر پا کر دیا۔ اس بار اس نے سچ بچ بہت خطرناک حملے کیے میں نے بمشکل خود کو بچایا اور جوٹیں کھائیں۔ اس بار میرا ہونٹ پھٹ گیا اور بازو پر لگنے والی ضرب نے تڑپا دیا تھا۔ پیروں اور سینے پر بھی کئی ضربیں لگیں۔ مگر اس کا ناک منہ بھی برابر ہو گیا تھا۔ وہ یوں پیچھے ہٹا جیسے مجھ پر دوبارہ حملے کی تیاری کر رہا ہو لیکن یہ اس کی عیاری تھی۔ وہ اچانک اپنے پستول کی طرف جھپٹا۔ اتفاق سے میں بھی اپنے پستول سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ اپنے ہتھیار اٹھا سکتے تھے لیکن اس کے بعد کون کا میاب ہوتا اور کون ناکام یہ کہنا مشکل تھا۔ میں نے چانس مول لیا اور پستول کے بجائے رامن کی طرف جھپٹا۔ وہ پستول اٹھا چکا تھا اور میری طرف گھوم رہا تھا کہ میں نے بلا تکلف لات ماری اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس کے ہاتھ پر سخت چوٹ آئی تھی اس نے گالی دی۔ جواب میں اسے دوسری ٹھوک کو لہے پر لگی اس نے بچنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا توازن بگڑا تھا۔ اگلی ضرب اس کے گھٹنے کے جوڑ پر اندر کی طرف سے لگی اور وہ زمین پر گرا۔ پھر میرے پاؤں مشینی انداز میں چلنے لگے۔ چند ٹھوکروں تک اس نے مزاحمت کی اس کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے بازو کا زخم ہرا گیا تھا جہاں گولی لگی تھی اور ری سہی کسر اب میں پوری کر رہا تھا۔ آخری ٹھوک اس کے منہ پر ماری اور وہ الٹ کر دیوار سے ٹکرایا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا سر خاصی آواز سے لگا تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ کئی گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئے گا۔ میں مطمئن ہو کر پیچھے ہٹا اور اس کا گرا پستول اٹھا لیا۔ یہ اچھا ہتھیار تھا ساٹنلر لگا ہوا۔ جب رامن نے گولی چلائی تو بہت معمولی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔

جس دوران میں یہ سب ہوا اور یہاں کوئی اور نہیں آیا تھا اس لیے کسی نے یہ منظر نہیں دیکھا۔ مگر اس بات کا خطرہ تھا کہ اچانک اندر سے اسپتال کا کوئی فرد آجائے۔ دروازہ بند ہو گیا تھا اور اب اسے اندر سے ہی کھولا جا

سکتا تھا۔ حفظِ ماتقدم میں نے وہاں موجود ایک دائرہ اٹھا کر دروازے کے ہینڈل کے نیچے رکھ دیا اب اسے اندر سے بھی کوئی کھول نہیں سکتا تھا جب تک دائرہ ہٹایا جاتا دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ میں نے رامن کا پستول اس کی طرف کیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب اس شخص پر قابو پایا اسے دنیا سے رخصت کر دوں گا۔ بہت کم لوگوں کے لیے میرے دل میں قطعی رحم نہیں تھا اور رامن ان میں سے ایک تھا۔ مگر جب میں نے گولی چلانے کا ارادہ کیا تو اندر سے کمزور پڑنے لگا۔ میرا ضمیر مجھے ایک بے بس اور بے ہوش پڑے دشمن کو مارنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ضمیر کو یاد دلایا کہ یہ شخص ایک موذی سانپ ہے اور اس کی ڈسنے کی فطرت اور زہر کبھی ختم نہیں ہوگا اس لیے اس کا ختم ہو جانا لازمی ہے۔ بالآخر ضمیر کمزور پڑ گیا اور میرا ارادہ جیتنے لگا۔

مگر جو چند لمحے میں نے ضمیر سے بحث میں ضائع کیے وہی رامن کی زندگی کی وجہ بن گئے۔ اچانک اسپتال کے آگے کی طرف سے آنے والے راستے سے سنتوش نمودار ہوا۔ اس نے پستول اٹھا رکھا تھا اور اس پر بھی سائنسز تھا اس لیے اس نے بلا تکلف فائر کیا مگر اسے دیکھتے ہی میں حرکت میں آچکا تھا۔ میں شیڈ کی طرف بھاگا جہاں اسپتال کا عملہ صفائی کا سامان اور دوسری فالتو چیزیں رکھتا تھا۔ کچرہ بھی یہیں بیک کر کے رکھا جاتا تھا تاکہ بدبو نہ پھیلے۔ سنتوش نے دو تین فائر کیے اور تمام گولیاں میرے آس پاس سے گزر گئیں۔ میں نے جوابی فائر کیا تو وہ بدحواس ہو کر جلدی سے عمارت کی آڑ میں ہو گیا۔ میں شیڈ میں گھسیا خاصا بڑا شیڈ تھا اور مجھے امید تھی کہ یہاں کوئی راستہ عقبی سمت میں نکلتا ہوگا۔ جہاں سے کچرہ لینے والی گاڑی یہاں سے کچرہ لے جاتی ہوگی۔ میرا اندازہ درست نکلا عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا لیکن وہ بند تھا۔ اس پر اندر کی طرف تالا لگا تھا۔

یقیناً سنتوش کو علم تھا کہ رامن یہاں کیا کر رہا ہے اور شاید اسے آگے کی طرف لگایا تھا کہ میں وہاں سے فرار کی کوشش کروں تو وہ مجھے روکے لیکن جب رامن نے آنے میں دیر کی تو وہ خود صورتِ حال دیکھنے کے لیے چلا آیا۔ اس کی بروقت آمد سے رامن بچ گیا۔ اب وہ میری تاک میں تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا سنتوش شیڈ کے باہر کہیں موجود تھا لیکن اس نے اندر گھسنے کی جرأت نہیں کی تھی یہاں نیم تاریکی تھی اور میں آسانی سے اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ غالباً اسے علم نہیں تھا کہ یہاں ایک دروازہ ہے۔ درنہ شاید وہ اندر آ جاتا اور شاید نہ آتا کیونکہ اس کی اور میری کوئی ذاتی دشمنی تو تھی نہیں اور کچھ رقم کی خاطر اپنی جان کو داؤ پر کیوں لگا تا؟ میں نے تالے پر فائر کیا اور اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ اگر سنتوش نے یہ آواز سنی بھی تھی تو یہاں آئے بغیر وہ حقیقت حال سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے لمحے میں باہر تھا۔ یہ عقبی گلی تھی جسے عرف عام میں گندی گلی کہتے ہیں۔

سنتوش کی آمد کے علاوہ رامن کی جان بچنے کی ایک اور وجہ اور بھی تھی۔ میں لاشعوری طور پر محسوس کر رہا تھا مگر اس وقت سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جب اسپتال سے نکلنے لگا تب سمجھ میں آیا کہ اگر رامن مارا جاتا تو بڑا کنور شاید راج کنور کو فوری بلا لیتا یا اس پر ایسے پہرے لگا دیتا کہ میرے لیے اس تک رسائی بہت مشکل ہو جاتی اور میرا پلان فیل ہو سکتا تھا۔ اس لیے رامن کافی الحال زندہ رہنا ضروری تھا۔ وہ دو ہرا کھیل کھیل رہا تھا اس نے یقیناً بڑے کنور کو میرے بارے میں غلط بتایا ہوگا کیونکہ بڑے کنور کا پہلا حکم یہ تھا کہ مجھے زندہ رکھ کر اس نے پاس لایا جائے اور رامن پہلی فرصت میں مجھے دنیا سے رخصت کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے گھوم کر اسپتال کے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی بلکہ گلیوں اور چھوٹی سڑکوں سے ہوتا اسپتال سے دور نکل گیا تھا۔ رامن کا سائنسز لگا پستول کا آمد چیز تھی

اس کی مہربانی سے میرے اسلحہ خانے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پہلے بھی دو عدد پستول ہاتھ لگے تھے اور یہ تیسرا تھا۔ ایک جگہ سے ٹیکسی لی اور ہوٹل پہنچا۔

پہلے اپنے کمرے میں آیا۔ گرم پانی سے غسل کیا تو چوٹوں کو خاصا آرام ملا تھا۔ کوئی چوٹ ایسی نہیں تھی جس کا ظاہری اثر نظر آتا۔ بس کسی قدر ہونٹ کا گوشہ سوجا ہوا تھا اور وہ بھی غور سے دیکھنے پر پتا چل رہا تھا۔ غسل سے فارغ ہو کر روم سروس کو کافی اور کسی نارمل پین کٹر کا کہا۔ دونوں چیزیں کچھ دیر میں پہنچ گئیں۔ اس دوران میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے پاکستان والوں سے رابطے کے لیے کوئی محفوظ ذریعہ تلاش کرنا چاہیے اور اس کا سب سے محفوظ ذریعہ انٹرنیٹ ہو سکتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ خود مارکیٹ میں گھومنے کے بجائے یہ کام ہوٹل والوں سے لوں جو رانا دیاس کی وجہ سے میرے خادم بنے ہوئے تھے۔ میں نیچے منیجر کے پاس آیا اس نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ”کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟“

”آپ پہلے ہی بہت خدمت کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ایک اچھا لیپ ٹاپ انٹرنیٹ کے ساتھ چاہیے۔“

”یعنی آپ کو صرف لیپ ٹاپ چاہیے کیونکہ ہوٹل میں ہمارے کسٹمرز کے لیے وائی فائی ہے۔“

”نہیں مجھے الگ سے انٹرنیٹ چاہیے۔ اگر یو ایس بی ڈیو آئس ہو تو سب سے بہتر ہے۔“

”ویسے ہمارا وائی فائی بھی سو فیصد محفوظ ہے لیکن جیسے آپ حکم کریں۔ آپ ماڈل بتا دیں میں ابھی منگوادیتا ہوں۔“

”ماڈل کیسے بتاؤں؟“

منیجر نے اپنے کمپیوٹر پر لیپ ٹاپ سے متعلق ایک سائٹ کھولی اس میں وہ سارے ماڈلز تھے جو انڈیا میں دستیاب تھے۔ میں نے سوئی کا ایک چھوٹا لیپ ٹاپ پسند کیا۔ اس کا سائز مختصر تھا اور وزن بھی کم تھا اسے با آسانی کہیں بھی لے جایا جا سکتا تھا اور یہ کارکردگی کسی دوسرے لیپ ٹاپ سے کم نہیں تھا۔ مہنگا تھا مگر رقم کا مسئلہ نہیں تھا میں نے انڈین روپے میں اس کی قیمت دیکھی اور رقم منیجر کے سامنے رکھی۔ ”یہ منگوادیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پلیز ہمیں رانا صاحب کی طرف سے سختی سے حکم ہے کہ آپ سے کوئی چارج نہ کیا جائے اور آپ جو سہولت چاہیں وہ آپ کو فراہم کی جائے۔“

”یہ میری ذاتی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا لیکن منیجر نہیں مانا تھا مجبوراً مجھے رقم واپس اٹھانا پڑی۔ اس نے کہا۔

”ایک گھنٹے کے اندر دونوں چیزیں آپ کے پاس پہنچ جائیں گی اور اگر کوئی مدد درکار ہوگی تو ہمارا آئی ٹی

کا آدمی موجود ہے۔“

اس کا شکریہ ادا کر کے میں اوپر آیا۔ بانو شاید میری منتظر تھی کیونکہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا ادھر

اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر بولی۔ ”آپ آگئے ہیں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تمہارا بھی کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔“

وہ ہنسی اور دروازہ بند کر کے میرے کمرے میں آگئی۔ ”مجھ سے آپ اتنی آسانی سے جان نہیں چھڑا سکتے

جیسے اوشا سے چھڑائی ہے۔“

”تمہارے ساتھ مجھے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”تم جانتی ہو اوشا کس پکڑ میں تھی اور میں اسے ساری عمر کے لیے گلے کا طوق نہیں بنا سکتا ہوں۔ دوسرے وہ اسی ملک کی رہنے والی ہے جب کہ تم میری ہم وطن اور ہم مذہب ہو۔ اوشا میری عارضی ذمے داری تھی لیکن تم میری مستقل ذمے داری ہو جب تک تم سیٹل نہ جاؤ۔“

”میں نے آج ہوٹل کے جم میں ایکسرسائز کی ہے۔ وہاں لیڈیز کے لیے الگ جگہ ہے۔“

”ابھی تمہیں احتیاط کی ضرورت ہے۔“

”میں نے رک رک کر ایکسرسائز کی اور زیادہ مشکل والی نہیں۔ اصل میں، میں ایکسرسائز کی عادی ہو گئی

ہوں جب تک نہ کر لوں بے چینی رہتی ہے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔ ویسے تم فٹ ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ مکمل فٹ ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”اسپتال میں کیا رہا..... راج کنور سے ملاقات ہوئی؟“

”راج کنور سے بھی ہوئی اور اس کے سابق گرے راسن سے بھی ہوئی۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا جب مجھ

سے ملتا ہے کچھ ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اس کی۔“

بانو فکر مند ہو گئی۔ ”آپ کا اس سے جھگڑا ہوا۔“

”اس نے تو مارنے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے کہا اور بانو کو تفصیل سے اسپتال میں پیش آنے والا واقعہ

سنایا۔ اس نے جھرجھری لی۔

”آپ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا۔“

”اب تو عادت ہو گئی ہے اور بہت مواقعوں پر اس طرح بچا ہوں کہ اس معاملے میں یقین پکا ہو گیا ہے کہ

موت سے پہلے مروں گا نہیں اور جب وقت آئے گا تو جی نہیں سکوں گا۔“

”آپ نے اسے زندہ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا اس جیسے موذی کا سر فوراً پکچل دینا چاہیے تھا۔ آپ نے دیر کی

اور اس کا آدمی آ گیا۔“

”سوچا تو میں نے بھی یہی تھا لیکن ایک تو بے بس آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھا۔ دوسرے اس کے مرنے سے

میرے آئندہ کا پلان متاثر ہوتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اچھا ہی ہوا۔“

”کیسا پلان؟“

”یہاں سے واپسی کا۔“

بانو سنجیدہ ہو گئی۔ ”شہباز صاحب، کیا ہمیں یہاں سے فوراً نہیں چلے جانا چاہیے۔ ہمارے لیے خطرات

بڑھتے جا رہے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں لیکن یہاں ہم محفوظ ہیں اور اگر تم سمجھ رہی ہو کہ واپس جانا آسان ہے تو تم غلطی پر ہو۔

انڈیا کی طرف سے چھپ کر سرحد عبور کرنا مشکل ترین کام ہے۔ اس پوری سرحد پر انڈین سیورٹی فورس اور پولیس

نے اس طرح پہرہ لگا رکھا ہے کہ پتہ بھی ان سے چھپ کر نہیں جاسکتا۔“

”لیکن سرحد کے دونوں طرف اسمگلنگ تو ہوتی ہے۔“

”وہ باہمی رضا مندی سے ہوتی ہے لیکن میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں بھارت کو مطلوب ہوں اور یقیناً بھارت نے اسمگلروں میں اپنے ایجنٹ چھوڑ رکھے ہوں گے۔ حکومت کو اسمگلنگ پر اعتراض نہیں ہوگا لیکن اگر اس کی آڑ میں ملک کے خلاف کچھ ہو یا ان کے مطلوبہ افراد سرحد پار آئیں جائیں تو وہ اس سے منہنے کے لیے یقیناً تیار ہوں گے۔ فرض کرو ہم کسی اسمگلر سے رابطہ کرتے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ بھارتی ایجنٹ نہیں ہو گا۔ اول تو ایسا اسمگلر تلاش کرنا بھی آسانی نہیں ہے۔ ہم یہاں کسی کو نہیں جانتے ہیں اور اپنے بل بوتے پر سرحد پار کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ خاص طور سے تمہارے ہوتے ہوئے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔“

”آپ رانا دیاس سے مدد نہیں لے سکتے؟“

”رانا دیاس کا حلقہ اثر بنگال ہے۔ یہ جگہ وہاں سے بہت دور ہے وہ اپنا سرکاری اثر و رسوخ بھی استعمال نہیں کر سکتا ہے پچھلی بار وہ میری وجہ سے حکومت کے نزدیک مشکوک بن گیا تھا۔ جب اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو پناہ دی تھی۔ وہ اس طرح سے مدد کر سکتا ہے لیکن سرحد پار کرنا دوسرا مسئلہ ہے۔ اس میں وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے۔“

”پھر بھی آپ اس سے بات تو کر کے دیکھیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ جب میری اس سے بات ہوئی اور اسے پتا چلا کہ میں انڈیا کی سرزمین پر ہوں تو اس نے مجھے اپنے پاس بلانے یا واپسی میں مدد کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ وہ اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اتنا تو رانا دیاس بھی سمجھتا ہوگا کہ آپ کا سب سے بڑا مسئلہ انڈیا سے واپس جانا ہے اور اس نے کوئی پیشکش نہیں کی۔“ وہ قائل ہو گئی۔

”میرا سب سے بڑا سہارا اللہ ہے اور مجھے بھروسہ ہے کہ میں واپس جا سکتا ہوں۔“

شام قریب تھی بانو نے روم سروس کو کال کر کے چائے اور ریفریشمنٹ کا کہا۔ بیس منٹ بعد ان چیزوں کے ساتھ منیجر کا آدمی لیپ ٹاپ اور یو ایس بی انٹرنیٹ ڈیوائس بھی لے آیا۔ اس نے تعارف کرایا۔ ”میں سومتر گنجی ہوں، سر، نوٹ بک میں تمام ضروری سوفٹ ویئر انسٹال ہیں پھر بھی کسی سافٹ ویئر کی ضرورت ہو تو مجھے طلب کر لیجئے گا۔ انٹرنیٹ ڈیوائس بھی ریڈی ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ بانو چائے تیار کر رہی تھی اس نے دلچسپی سے دیکھا۔ ”اس سے آپ پاکستان رابطہ کریں گے؟“

”ہاں ارادہ تو یہی ہے۔“ میں نے کہا۔ میں نے ایڈاپٹر لگا کر لیپ ٹاپ کھول کر آن کیا اور اسے چیک کرنے لگا۔ ابھی اس کی بیٹری پوری طرح چارج نہیں تھی۔ اس میں واقعی کام کے سارے سافٹ ویئر انسٹال تھے۔ میں نے یو ایس بی لگائی۔ یہ پلگ اینڈ پلے تھی۔ انٹرنیٹ اسپید بھی اچھی تھی۔ اس دوران میں چیزوں کے ساتھ چائے بھی لیتا رہا۔ مجھے مانی کا انٹرنیٹ اکاؤنٹ یاد تھا جس سے کسی موبائل یا فکسڈ فون پر کال کی جاسکتی۔ میں نے اسے آن کیا۔ مگر جب میں نے پوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ ڈالا تو سرور نے اسے مسترد کر دیا۔ میں نے

دوبارہ کوشش کی اس بار بھی یہی نتیجہ نکلا۔ اس کا مطلب تھا کہ مانی نے پاس ورڈ چنچ کر دیا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر سائٹ بند کر دی۔ اس مسئلے کا حل تھا۔ میں نے نیٹ پر سرچ کیا اور کچھ ایسے میسجر نکال لیے جن پر کریڈٹ کی مدد سے دنیا میں کسی بھی فون نمبر پر کال کی جاسکتی تھی۔ ان میسجز کی تعداد درجنوں میں تھی میں نے بہتر سمجھا کہ خود آزمانے کے بجائے سوئٹز فجن سے مشورہ کر لوں۔ میں نے آپریٹر سے اسے ملانے کو کہا۔ وہ لائن پر آیا تو میں نے میسجرز کے بارے میں مشورہ کیا اس نے کہا۔

”آپ اسکا پ کر لیں یہ نیا آیا ہے لیکن اس کی کارکردگی بہت اچھی ہے۔“

”مجھے فون پر کال کرنی ہے۔“

”آپ اس کا کریڈٹ لے کر کال کر سکتے ہیں۔“

”کریڈٹ کہاں سے ملے گا؟“

”آپ کی اجازت ہو تو میں آکر کر دیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیوں نہیں فوراً آ جاؤ۔“ میں نے جواب دیا۔ وہ چند منٹ بعد آیا۔ اس وقت تک میں نے اپنی آئی ڈی بنائی تھی۔ اس نے آکر کسی ایسے اکاؤنٹ کی مدد سے مجھے اسکا پ کریڈٹ دیا جو انٹرنیٹ کے ذریعے ادائیگی کر سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

”میں نے ہزار منٹ کر دیئے ہیں اگر آپ کو مزید ضرورت ہو تو مجھے طلب کر لیجئے گا۔“

سوئٹز فجن کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اسکا پ کی مدد سے عبد اللہ کا نمبر ملایا۔ اپنے ساتھیوں میں مجھے اسی کا نمبر یاد تھا۔ یا پھر حویلی کا اور سویرا کا نمبر یاد تھا۔ عبد اللہ نے کچھ دیر بعد کال ریسپونڈ کی اور محتاط انداز میں بولا۔ ”ہیلو.....“

”عبد اللہ۔“ میں نے کہا تو وہ چلا اٹھا تھا۔

”شہباز صاحب آپ؟“ نوٹ بک کے اٹیکر سے عبد اللہ کی تیز آواز آئی۔ ”میرے خدا آپ کہاں

ہیں؟“

”اسی دنیا میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں چند دن پہلے تم کو کال کر رہا تھا لیکن تم اٹھا نہیں رہے تھے اس لیے پھر میں نے سویرا کو کال کی۔“

”جی انہوں نے بتا دیا تھا۔ یہاں سگنل پر اب ہم تھی اس لیے مجھے پتا نہیں چلا۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”ہم سب

آپ کے لیے پریشان تھے وہ تو بیٹو میاں ممتاز کی قید سے بھاگ کر آیا تو ہمیں پتا چلا کہ آپ کہاں تھے؟ وسیم او

سفیر لاہور گئے تھے۔ مگر پتا چلا کہ آپ وہاں بھی نہیں ہیں۔“

”میاں ممتاز نے کیا جواب دیا؟“

”اس کا کہنا ہے کہ آپ اس کے گھر دو افراد کو قتل کر کے فرار ہو گئے۔“

”وہ ٹھیک کہتا ہے، کیونکہ اصل حقیقت اسے بھی نہیں معلوم ہے۔ مگر مجھے قید رکھنے کا ذمہ دار وہی تھا۔“

میں نے کہا اور مختصر عبد اللہ کو اپنی سرگزشت سنائی۔ وہ دنگ رہ گیا تھا۔

”حرامزادہ..... معصوم بن رہا تھا۔“ اس نے میاں ممتاز کی شان میں گستاخی کی۔ ”وسیم ٹھیک کہہ رہا تھا کہ

آپ کی آگسٹگی میں اسی کا ہاتھ ہے۔ وہ تو مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا بڑی مشکل سے میں نے اور سفیر نے اسے روکا۔“

”تم لوگوں نے ٹھیک کیا۔“ میں نے کہا۔ ”میاں ممتاز ایک طاقتور سیاست دان ہے اور اس سے محاصمت ہمارے لیے مشکلات کھڑی کر سکتی۔ کبھی فرصت ملی تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔“

”آپ کہاں ہیں؟“

”انڈیا کے شمال میں ایک ریاست ہے ہما چل پردیش میں اس کے دارالحکومت شملہ میں ہوں۔ بڑی خوب صورت جگہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اسکاپ پر آ سکتے ہو۔ میں باقی سب سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں آ سکتا ہوں، سفیر اور بیٹو باہر گئے ہیں۔ دسم ہے۔“

”بس تو اسکاپ پر آ جاؤ۔ میں دس منٹ میں لاگ ان ہوتا ہوں۔“ میں نے عبداللہ کو اپنی اسکاپ آئی ڈی بتائی اور کال کاٹ دی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں اس قسم کی کالز بھی چیک نہ ہوتی ہوں کیونکہ ان کی تعداد محدود ہوتی ہے اس کے مقابلے میں میسجز پر بات کرنا زیادہ محفوظ تھا اس پر بیک وقت لاکھوں کروڑوں لوگ بات کرتے ہیں اور سب کی مگرانی بہت مشکل کام ہے۔ میں نے کال کاٹ کر سو مٹر جنجن سے رابطہ کیا۔ ”مجھے ایک اچھا ہیڈ فون مائیک درکار ہے۔“

”میں بھجواتا ہوں سر۔“

بانو خاموشی سے سن اور دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ ”آپ اپنے ساتھیوں کو میرے بارے میں کیا بتائیں گے؟“

”جو ج ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ جھپٹی۔“ کہیں وہ غلط نہ سمجھیں۔“

”اگر انہوں نے غلط سمجھا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے ان کو غلط سمجھا تھا ویسے فکر مت کر وہ بالکل بھی غلط نہیں سمجھیں گے۔“

چند منٹ بعد ایک ویٹرز باپک ہیڈ فون مائیک دے گیا۔ میں نے اسے لگا کر اسکاپ پر لاگ ان کیا۔ عبداللہ کی ریکورڈنگ آگئی تھی اسے قبول کیا۔ وہ آن لائن تھا۔ میں نے ویڈیو کال کی۔ فوراً ہی اسکرین پر عبداللہ اور اس کے ساتھ سرگھسائے دسم کی تصویر آئی اسی طرح بانو میرے عقب میں تھی اور وہ بھی ویب کیم میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتا عبداللہ نے دلچسپی سے کہا۔ ”یہ آپ کے پیچھے کون ہیں۔“

”بانو۔“ میں نے تعارف کرایا۔ ”میاں ممتاز کی بیٹی بنی کی سیکرٹری تھی۔“

عبداللہ اور دسم اچھل پڑے۔ ”اور یہ آپ کے ساتھ ہے؟“

”ہاں کیونکہ اب یہ ہمارے ساتھ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ویسے میرا خیال تھا کہ پہلے تم لوگ میرا

حال احوال دریافت کرو گے۔“

”سوری۔“ دسم شرمندہ ہو گیا۔ ”آپ کیسے ہیں؟“

”تمہارے سامنے ہوں۔“ میں نے کہا۔ وہ دونوں بے چین تھے کہ میں جلد از جلد انہیں اپنی روداد

سناؤں لیکن میں چاہتا تھا کہ بیٹو اور سفیر بھی آجائیں تو ایک ساتھ ہی سنا دوں ورنہ دوبارہ سنانی پڑتی۔ عبداللہ نے سفیر کو کال کر دی تھی اور وہ گھر کی طرف آرہے تھے۔ کیونکہ ہیڈ فون سے صرف میں سن سکتا تھا اس لیے میں نے ہیڈ فون اتار دیا تاکہ بانو بھی سن سکے ویسے بھی لیپ ٹاپ کے اسپیکر خاصے طاقتور تھے۔ وقت گزاری کے لیے پہلے عبداللہ نے بتایا۔

”آپ نے جب لاہور سے رابطہ نہیں کیا تو میں پریشان ہو گیا۔ آپ سب کے نمبر بند جا رہے تھے۔“

”بس یار میاں ممتاز کی دختر نے ایسے چکر دیئے کہ اب تک چکر آرہے ہیں۔ وہ مجھے مہمان بنا کر لے گئی تھی لیکن اس کے باپ نے قیدی بنا لیا۔ کنور خاندان سے اس کے کچھ تعلقات ہیں انہوں نے میاں ممتاز سے درخواست کی تھی کہ مجھے تلاش کیا جائے۔ میاں ممتاز ایک لحاظ سے میرا احسان مند تھا کہ میں نے اسے بدنامی سے بچایا تھا۔ یہ قصہ تو تم لوگوں کے علم میں ہے۔“ میں نے بانو کی موجودگی میں تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔

”اس لیے اس نے قید تو کر لیا لیکن مجھے کنوروں کے حوالے نہیں کیا۔“ میں نے بتایا کہ میاں ممتاز نے کیا درمیانی راستہ نکالا تھا۔

”پھر آپ انڈیا کیسے پہنچے؟“

”بدقسمتی سے یہاں ایک ملازم انڈین اور کنور خاندان کا ایجنٹ تھا اسی نے سازش کی۔ پہلے میرا خون بہت زیادہ مقدار میں لیا جانے لگا جب مجھے شک ہوا اور میں نے طریقہ واہات پکڑ لیا تو مجھے بے ہوش کر کے انڈیا منتقل کر دیا۔ اس وقت بھی مجھے علم نہیں ہوا تھا کہ میں انڈیا میں ہوں۔ جب سکموں کو دیکھا تو پتا چلا۔“ باتوں باتوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی میں خاصا کچھ بتا گیا تھا۔ ”تم لوگ اس دوران میں کیا کرتے رہے؟“

”جب مجھے پتا چلا تو میں حویلی سے یہاں آ گیا۔“

”اس کا زخم ٹھیک نہیں تھا لیکن یہ رکسنے کے لیے تیار نہیں تھا۔“ عبداللہ نے انکشاف کیا۔ ”بڑی مشکل سے سفیر کے واپس آنے تک روکا۔“

”پھر میں اور سفیر لاہور روانہ ہوئے۔ ہمیں ایک خطرہ یہ تھا کہ کہیں آپ پرانے دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہوں جن میں شاہنواز کے گروہ کے لوگ تھے۔ وہ ابھی سرگرم ہیں لیکن جب میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو ان میں سے کوئی بھی ملوث نہیں نکلا۔ پھر ہم نے تھانوں میں معلوم کیا، ہر اس جگہ گئے جہاں آپ کے اور بیٹو کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا۔ مگر آپ کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔“

”تم لوگوں نے اس گاڑی والے کو نہیں تلاش کیا جسے ہم لے گئے تھے۔“

”وہ بہت مشکل سے ملا۔ اتفاق سے اس کا نمبر بھی سفیر سے مس ہو گیا تھا۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ ایک لڑکی نما عورت آپ کو لے گئی تھی اور وہ بہت دولت مند اور اونچے خاندان کی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد ہم اس کھوج میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی بہت دولت مند اور اونچے خاندان کی لڑکی نما خاتون ہے جس کے ساتھ آپ راضی بہ رضا اور خوش خوش چلے جائیں اور پھر غائب ہو جائیں۔“

”دوسرے لفظوں میں تم لوگ ٹاک ٹوئیاں مارتے رہے۔“

”جب تک بیٹو نہیں ملا۔“ وسیم نے اعتراف کیا۔

”کارنامہ تو اس کے بعد بھی کوئی انجام نہیں دیا تھا۔“ عبد اللہ نے دبے لفظوں میں کہا تو دسم بھنا گیا۔
 ”تم لوگوں نے میری ٹانگ پکڑ رکھی تھی ورنہ میں میاں ممتاز کو اس کی اوقات بتاتا۔“
 ”عبد اللہ نے ٹھیک کیا میاں ممتاز سے الجھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس سے مجھ پر کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ یہ
 چکر ہی دوسرا تھا میرے سرحد پار دشمن پوری طرح حرکت میں آ گئے ہیں۔“
 دسم فکر مند ہو گیا۔ ”یہ تو پرانی صورت حال ہو گئی ہے۔ پہلے بھی ہم کتنی مشکلات سے نکلے تھے۔“
 ”مشکلات اب بھی ہیں۔“

اسی اثنا میں سفیر اور بیٹو آ گئے۔ بیٹو آگے تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ویب یکم سے گھس کر میرے
 پاس پہنچ جائے۔ وہ جذباتی ہو کر تقریباً رونے لگا تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں تو اس نے کہا۔ ”ہم
 بھی وہاں آئے گا۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”میں خود یہاں سے نکلنے کی فکر میں ہوں۔“
 سفیر نے حسب معمول گالیاں دیں اور پھر میرے عقب میں موجود بانو کو دیکھ کر اس کی زبان کو بریک لگ
 گئی۔ میں نے کہا۔ ”بیٹے تم گئے تھے دعویٰ مزے کرنے اور ہمیں دشمن لے گئے۔“
 ”مزے تو تمہارے بھی کم نہیں تھے۔“ اس نے بھنا کر کہا۔ ”ملاقات ان خاتون سے..... وہ کسی کو بھی اغوا
 کر کے لے جا سکتی ہے۔“ اس کا اشارہ بھنی کی طرف تھا۔ ”میں نے دسم سے کہا کہ اسے اٹھا لیتے ہیں اس کا باپ
 بھی شہباز کو واپس کرے گا۔“
 ”یہ تجویز مونا نے دیو کر دی ہوگی۔“

”مونا سے پہلے سادی نے۔“ دسم نے کہا۔ ”شادی کے بعد یہ خواتین ہمارے پیشہ ورانہ امور میں بھی
 مداخلت کرتی ہیں۔“

”شوبی ان کا باتوں میں مت آتا۔“ بیٹو نے خبردار کیا۔ ”یہ آپ کو شادی کے خلاف بہکا تا ہے۔“
 ”بھکاتے نہیں خبردار کرتے ہیں کہ بعد میں نہ پچھتائے۔“ سفیر بولا۔
 ”تم فکر مت کرو یا، میں بھی شادی کے بعد پچھتاؤں گا۔“

”سویرا دیدی بہت اچھا ہے ان کی بیویوں کی طرح نہیں ہے۔“ بیٹو نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ سفیر نے اس
 کی گردن دبوچی اور دسم نے اس کا ساتھ دیا بڑی مشکل سے عبد اللہ نے اسے چمڑایا۔ ایک منٹ کے لیے اچھا
 خاصا ہنگامہ ہوا تھا۔ بیٹو نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے خفگی سے کہا۔ ”آپ لوگ خود صبح سے شام تک ان کے
 بارے میں کیا کیا بولتا ہے میں نے کبھی گردن پکڑا۔“

”وہ ہماری بیویاں ہیں۔“ سفیر غرایا۔ ”کسی کے منہ سے ہم ان کے بارے میں ایک لفظ نہیں سن سکتے۔“
 ”ہاں ایک لفظ تو ان کے لیے بہت کم ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کم سے کم ایک پیرا گراف تو
 ہو۔“

”بیٹے تم دور بیٹھے ہو اس لیے بول سکتے ہو۔“ سفیر نے کھورا۔ بانو مسلسل ہنس رہی تھی۔ ”ان خاتون کو
 ات نہی آ رہی ہے۔“

”حالانکہ رونے کا مقام ہے۔“

”میرا نام بانو ہے۔“ بانو بولی۔ ”آپ بار بار خاتون نہ کہیں۔“

”ٹھیک ہے نہیں کہتے۔“ سفیر نے سرد آہ بھری۔ ”یہ شہباز بھی قسمت کا دشمن ہے۔“

”کوئی فضول بات نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”بانو نے یہاں بہت کڑے وقت میں میرا جس طرح

ساتھ دیا ہے شاید تم لوگ بھی نہ دے پاتے۔“

”ظاہر ہے ہم کیسے دے سکتے ہیں۔“ سفیر بد معاشی پر آمادہ تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اب اصل

موضوع پر آ جاؤں۔

”اگر تم لوگ شرافت سے سننے کے موڈ میں ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں اسکاٹپ بند کر رہا ہوں۔“

اس پر وہ فوراً شریف بن گیا۔ بانو نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ ”یہ چمچھرے آدمی ہیں۔“

”ٹھیک پہچانا تم نے۔“ میں ہنسا تو وہ سب چونک گئے۔

”میرے بارے میں کچھ کہا ہے۔“ سفیر نے شک سے کہا۔

”نہیں تمہارے کان بج رہے ہیں۔“ میں بولا۔ اتنے عرصے بعد اپنوں سے ہلکی پھلکی باتوں نے مجھے تازہ

دم کر دیا تھا۔ میرے اندر ایک کبھری جم گئی تھی اس مختصر سی گفتگو نے وہ کبھر پکھلا دی تھی۔ بانو نے کیتلی میں موجود

چائے نکالی۔ یہ مخصوص میٹرل سے بنی کیتلی تھی جس میں چائے بہت دیر تک گرم رہتی تھی اور میں نے اپنی داستان

شروع کی۔ وہ سب ہمدن گوش ہو گئے تھے۔ درمیان میں سوالات بھی ہوتے رہے۔ پھر بات سے بات نکلتی رہی

اور اکثر داستان ٹریک سے اتر کر آس پاس گھومنے لگتی تھی اسے دوبارہ ٹریک پر لانا پڑتا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ

یہ جلد ختم ہو جائے مگر بات مکمل ہوتے ہوتے بھی تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ اس دوران میں بانو اپنے کمرے

میں چلی گئی وہ یہ سب جانتی تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ ایسی باتیں کیں جو اس کی موجودگی میں نہیں

کر سکتا تھا خاص طور سے سفیر کو خبردار کیا۔

”یار یہ بالکل مختلف مزاج کی لڑکی ہے۔ آج کا دور ایسا ہے کہ صرف لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی جنس زدہ

ہو گئی ہیں جہاں انہیں کسی مرد کے نزدیک آنے کا موقع ملتا ہے وہ خود کو اس سے وابستہ کر لیتی ہیں۔ مگر بانو اس

معاملے میں بہت پختہ کردار کی لڑکی ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں نے اسے بہن بنا لیا ہے یا وہ مجھے بھائی سمجھتی

ہے لیکن ہمارے درمیان بہت صاف اور شفاف تعلق ہے۔ بہت سے دنوں سے وہ میرے ساتھ ہے لیکن

ساتھ اس کے رویے میں روزِ اول جیسی احتیاط ہے۔“

”سمجھ گیا یار میں مذاق کر رہا تھا۔“ سفیر بولا۔

”یار تیرا مذاق میں سمجھتا ہوں ہر ایک نہیں۔“

”شہباز صاحب یہاں آنے کے بعد وہ ہمارے ساتھ رہے کی؟“ عبداللہ نے سوال کیا۔

”یا اسے بھی پناہ گزین کیپ بھیج دیا جائے گا؟“ وسیم نے لقمہ دیا اس کا اشارہ حویلی کی طرف تھا۔

”پہلے واپس تو آ لینے دو۔“ میں نے کہا۔

”وہاں کے حالت سمجھ میں آ گئے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن آپ ایسی کے بارے میں کیا سوچ رہے

ہیں آپ نے بتایا نہیں۔“

”میں راج کتور کو استہمال کرنے کا سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے پاس ذریعہ ہے وہ بلی کا پٹر میں سرحد پار آتا جاتا رہا ہے۔“

”اس پر بھروسہ کرنا خطرناک ہوگا۔“ سفیر نے اعتراض کیا۔ ”وسیم کا سالاحت ناقابل اعتبار شخص ہے۔“

”وہ میرا سالانہ نہیں ہے۔“ وسیم بولا۔

”جور و کا بھائی اور کیا کہلائے گا۔“ سفیر نے وسیم کا اعتراض مسترد کر دیا۔

”وسیم بھائی کا سالانہ صرف ہم ہے۔“ بیٹو نے صرف سفیر کی بات کی نفی کے لیے سالانہ ہونے کا دعویٰ کیا۔

”ہاں بیٹے تم شکل سے پیدا انٹی سالے لگتے ہو۔“ سفیر نے اسے گھورا۔

”میز فائر..... بہت دیر ہو گئی ہے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”ابھی مجھے فائینا اشارہ ڈنر بھی کرنا ہے۔“

”عرے ہیں تیرے۔“ سفیر نے رشک سے کہا۔ ”کمرہ تو بڑا شاندار نظر آ رہا ہے۔“

”یہ شاید سیون اشار ہوٹل ہے لیکن رانا دیاس کی مہربانی ہے۔“

وسیم نے کہا۔ ”شہباز صاحب میرا خیال ہے کہ آپ کسی پر زیادہ بھروسہ نہ کریں۔ رانا دیاس مخلص آدمی ہے لیکن اس کے آس پاس دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے ان میں سے کوئی سرکاری ایجنٹ ہوا تو آپ مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کوشش کر رہا ہوں جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک دو

دن میں اپنے پلان کو حتمی صورت دے کر میں تمہیں بتاتا ہوں۔“

”شہباز صاحب لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ آپ کا ہے؟“ عبداللہ نے سوال کیا۔

”ہاں میرا ہے۔“

”تب آپ اسکاپ آن رکھیں اس سے رابطے میں آسانی رہے گی۔“

”ٹھیک ہے میں آن رکھوں گا۔“

”کاش میں آپ کے پاس آسکتا۔“ وسیم نے سر آہ بھری۔

”ہم بھی جائے گا۔“ بیٹو نے فوراً مطالبہ کیا۔

”بیٹے یہ کسی اور چکر میں جا رہا ہے۔“ سفیر نے حسب معمول شرارت کی۔ ”شہباز کا تو صرف بہانہ

ہے۔“

”بچے کو مس گا ہیڈ مت کرو۔“ وسیم نے اسے گھورا۔

”ہم مس کیسے ہو سکتا ہے۔“ بیٹو نے اعتراض کیا۔ ”ہم کو معلوم ہے مس لڑکی کو کہتے ہیں۔“

”مانی، ایاز اور دوسرے لوگ کہاں ہیں؟“

”مانی اور ایاز بھگوال والی حویلی میں ہیں۔“ عبداللہ نے بتایا۔ ”مانی ہاں کام کر رہا ہے۔“

”یہاں کوئی دوسرا ٹھکانہ دیکھا؟“

”نہیں فی الحال اسی کوٹھی میں ہیں لیکن مانی نے یہاں بہت اچھی ای سیوریٹی کر دی ہے۔“

”یعنی کام جاری ہے دشمنوں کا کیا احوال ہے۔ مرشد نے مزید کوئی گند تو نہیں کی؟“

”نہیں ان دنوں بالکل سدھرا ہوا ہے۔ تیرے کیسز پر کام جاری ہے پرسوں پیشی ہے شاید اس میں کوئی پیش رفت ہو لیکن ندیم مطمئن ہے۔ وہ تیرے یہاں جانے سے خوش ہے۔ اس کا کہنا ہے تو بے شک جہنم میں رہ لیکن ابھی یہاں مت آنا۔“

”اس کی خواہش تقریباً پوری ہوئی یہ سارا عرصہ میں نے جہنم جیسی قید میں ہی گزارا ہے۔“

کچھ دیر ان لوگوں سے بات کر کے میں کال ختم کرنے والا تھا کہ سفیر کو خیال آیا۔ ”یار اب حویلی میں بھی انٹرنیٹ لگ گیا ہے۔ مانی نے وہاں فون لائن ڈی ایس ایل کرائی تھی اور ایک عدد لیپ ٹاپ بھی چھوڑ آیا ہے۔ ہم لوگ بھی اسکا پربات کر لیتے ہیں۔“

”یہ تو اچھا ہے۔“ میں خوش ہو گیا۔ ”بہت دن ہو گئے سب کو دیکھے ہوئے۔“

”سب کو یا ان کو؟“ سفیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”سنا ہے وہ بھی بہت بے چین ہیں۔“

سفیر کی بات کا جواب میں نے کال کاٹ کر دیا اور بانو کے کمرے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا تو اس کا چہرہ ستا ہوا لگا اور آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی کی جھلک تھی۔ میں اندر آیا۔ ”تم روئی ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں.....“

”سفیر کی بات پر؟“

اس نے پھر سر ہلایا۔ ”ہاں.....“

”بانو میں اس کا دفاع نہیں کروں گا اس کی زبان ایسی ہی بے قابو ہے ورنہ وہ دل کا برا نہیں ہے۔“

”یقیناً ایسا ہی ہو گا لیکن شہباز صاحب آپ کے لیے میرے دل میں جتنی عزت ہے۔ اس کے بعد کوئی

آپ کے اور میرے تعلق کے بارے میں ذرا سی بات کرے تو مجھے بہت فیمل ہو گا۔“

وہ اوپر سے بہت مضبوط ثابت ہوئی تھی اور اس نے حالات کا مقابلہ بھی کیا تھا کسی موقع پر کمزوری نہیں دکھائی تھی لیکن اندر سے وہ کمزوری لڑی ہی تھی جسے ذرا سی بات رلا دیتی ہے۔ ”میں سفیر کی طرف سے سوری کرتا ہوں۔“

”نہیں..... نہیں مجھے ان سے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”پلیز آپ ایسا نہ کہیں۔ آپ

مجھے ڈانٹ سکتے ہیں مار سکتے ہیں لیکن سوری نہیں کہہ سکتے۔“

”اچھا بابا نہیں کہوں گا لیکن اب مسکراؤ۔ مجھ سے تمہاری سنجیدہ صورت برداشت نہیں ہو رہی۔“

وہ مسکرانے لگی پھر سنجیدہ ہو گئی۔ ”شہباز صاحب میں اللہ کا شکر نہیں ادا کر سکتی کہ اس نے مجھے آپ سے

ملوایا اور آپ نے مجھے سہارا دیا۔“

”سب اللہ کا احسان ہے۔“ میں نے کہا۔ ”صرف میں تمہارا سہارا نہیں بنا بلکہ تم بھی میرا سہارا بنی ہو۔

اگر تم نہ ہوتیں تو شاید میں کنوروں کی قید سے آزاد نہ ہو پاتا۔“

”اس کے برعکس مجھے لگتا ہے جیسے آپ کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے اور آپ اکیلے ہی سب کر سکتے

ہیں۔“

”ایسا نہیں ہے میں ایک عام انسان ہوں اور ہر انسان کو دوسرے انسان کی مدد کی ضرورت رہتی ہے۔“
میں نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ ”ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”نیک خیال ہے کیونکہ مجھے زور سے بھوک لگی ہے آج بہت دنوں بعد ایسی بھوک لگ رہی ہے۔“
”یہ جم جانے کا نتیجہ ہے اور بی بی اب ذرا احتیاط کرو۔ بعد میں تمہارا ہونے والا مجازی خدا مجھے کوئے گا کہ گل بانو کو گل خان بنا دیا۔“

وہ شرابی۔ ”اب ایسا بھی نہیں ہے۔“
”اس کا پتا تو مجھے اس وقت چلا جب تمہیں پہاڑ کے اوپر سے اٹھا کر نیچے لایا تھا۔ یقین کرو آخر میں میری ٹانگیں لڑکھڑاہی تھیں اور سانس قابو میں نہیں رہا تھا۔“

”سچ میں بہت وزن ہو گئی ہوں؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”مجھے تو اپنا وزن زیادہ نہیں لگتا ہے۔“
”کل جم میں ویٹ کرنا، میرا اندازہ ہے تمہارا وزن سینٹھ کے جی کے آس پاس ہوگا۔“

”لیکن اب مجھے ایسے اچھا لگتا ہے۔“ وہ انٹرکام اٹھاتے ہوئے بولی اس نے روم سروس سے رابطہ کیا اور پھر مجھ سے پوچھ کر ڈشز لکھوائی رہی۔ انٹرکام رکھ کر اس نے کہا۔ ”بلکہ میں سوچتی ہوں کہ مزید مضبوط ہو جاؤں۔ جب ہم واپس جائیں گے اور میں اپنے بل بوتے پر زندگی گزاروں گی تب مجھے آسانی رہے گی۔“
”وہ بعد کی بات ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا تعاون ہمیشہ تمہیں حاصل رہے گا۔“

”شہباز صاحب میں جانتی ہوں اپنے ملک میں بھی آپ کی زندگی آسان نہیں ہے وہاں بھی آپ کو دشمنوں سے اسی طرح چھپ کر رہنا پڑتا ہے۔ جب تک آپ اپنی معمول کی زندگی کی طرف نہیں آجاتے میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔“

میں نے انکار کیا۔ ”میں تمہیں مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

”پلیز۔“ اس نے اصرار کیا۔

”اچھا اسے دیکھیں گے۔ میں بھی تمہیں ایسے ہی نہیں چھوڑ دوں گا جب تک مجھے اطمینان نہیں ہوگا تم میری ذمہ داری رہو گی۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”یہ تو میں کہہ رہی ہوں میں آپ کی ذمہ داری ہوں گی اور مددگار بھی۔“

روم سروس کے ویٹرز ڈنر لے آئے تھے میں نے ویٹ سے ایسے ہی کہا تھا کہ ڈنر فائینڈ اسٹار ہو گا یہ سچ سچ تقریباً فائینڈ اسٹار ڈنر ہی تھا۔ اس میں سترہ تو نہیں لیکن اچھی خاصی ڈشز ضرور تھیں۔ ویٹرز کے جانے کے بعد میں نے بانو کو گھورا۔ ”مال مفت دل بے رحم۔۔۔۔۔“

”رانا صاحب جتنے دولت مند ہیں ان کو کیا فرق پڑے گا۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ کھانے کے دوران میں اسے بتاتا رہا کہ اس کا پپر مزید کیا کھنگو ہوئی۔ حویلی کے ذکر پر اس نے تجسس سے پوچھا کہ وہاں کون کون تھا۔ اسے حویلی اور اس کے موجودہ کمینوں کے بارے میں بتایا۔ سویرا کے نام پر اس نے پوچھا۔ ”یہ کون ہیں؟“

”میرے بھائی کی بیوہ اور جب میں واپس جاؤں گا تو اس سے شادی کروں گا۔“

وہ تجسس میں پڑ گئی۔ ”کیا یہ آپ کی روایت ہے؟“

میں ہچکچایا۔ ”نہیں..... میں سویرا کو پسند کرتا ہوں۔“

”پہلے سے؟“ وہ سمجھ گئی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور پھر اسے اپنے سویرا کے تعلق کے بارے میں

بتایا۔ وہ افسردہ ہو گئی۔ ”بہت سیڈ اسٹوری ہے۔ پہلے آپ کی محبت نہ مل سکی اور پھر بھائی نہ رہا۔“

”انسان کے مقدر میں جو ہوتا ہے وہی اسے ملتا ہے۔“ میں نے ہاتھ سمجھ لیا۔ میری بھوک ختم ہو گئی تھی۔

”کھائیں نا؟“

”نہیں بس کھالیا۔“ میں نے نشو سے ہاتھ صاف کیا اور پھر وائش روم کا رخ کیا۔ وائش آیا تو بانو بھی کھا

بجلی تھی اس نے روم سردس کو برتن لے جانے اور چائے کافی لانے کو کہا۔ میں نے اپنے لیے کافی کا کہا تھا۔ بانو

نے سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”اگر سویرا کو پتا چلے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں تو وہ قیل نہیں کریں گی۔“

”وہ شک نہیں کرے گی کیونکہ مجھ پر اعتماد کرتی ہے لیکن تم خود عورت ہو اور اچھی طرح جانتی ہو عورت

حاسد ہوتی ہے۔ جسے چاہتی ہے اس کے آس پاس کسی کو برداشت نہیں کرتی ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

کافی کے بعد میں آرام کا کمرہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ بانو خود بھی آرام کے موڈ میں تھی۔ میرا ارادہ

حویلی بات کرنے کا تھا۔ میں نے اسکاٹپ آن کیا اور سویرا کا موبائل نمبر ملا یا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے

اور اس وقت حویلی میں سناٹا ہو جاتا تھا سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ پھر جس نے جاگنا ہوتا تھا وہ

اپنے کمرے میں جاگتا لیکن محفل لگا کر رت جگا نہیں کیا جاتا تھا۔ سویرا اپنے کمرے میں تھی لیکن اکیلی نہیں تھی۔

اس کے ساتھ پورا گینگ تھا۔ یعنی مونا، سادی، شمی اور شازیہ۔ سویرا نے مختاط انداز میں ہیلو کہا اور پھر میری آواز سن

کر ڈرنا رمل لہجے میں خیر خیریت پوچھی تو میں سمجھ گیا۔ ”تم اکیلی نہیں ہو؟“

”ہاں سب ہیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ ایسا کرو اسکاٹپ پر آ جاؤ۔“ میں نے کہا اور اسے اپنی آئی ڈی بتائی۔ اس نے کہا۔

”میں آپ کو ایڈ کرتی ہوں۔“

اس دوران میں پیچھے سے مونا شمی اور سادی کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ کون

ہے ویسے انہیں شک ہو گیا تھا کہ میں ہی ہوں۔ میں نے کال کاٹ دی۔ چند منٹ بعد مجھے سویرا کی طرف سے

رکسٹ آئی۔ میں نے اسے قبول کیا اور پھر ویڈیو کال کرنے لگا۔ اس بار میں اکیلا تھا اس لیے ہیڈ فون مائیک لگا

لیا۔ جیسے ہی اسکرین آئی۔ بیک وقت مونا، سادی اور شمی کے چہرے نمودار ہوئے۔ میں نے ہڑبڑانے کی

اداکاری کی۔ ”لا حول ولا..... کیا صورتیں ہیں۔“

”اچھا جی ہماری صورتیں پسند نہیں ہیں۔“ مونا چلائی۔

”ظاہر ہے انہیں تو ایک ہی صورت پسند ہوگی۔“ سادی بولی۔

”شوبلی آپ کیسے ہیں۔“ شمی نے پوچھا۔ ”اللہ کتنا خوب صورت کرہ ہے۔ آپ کہاں ہیں؟“

”ایک پراسرار ہوٹل میں جس کا سارا عملہ میرے آگے پیچھے ہوتا ہے۔ ان چڑیلوں سے بولو پیچھے نہیں۔ ان کی صورتیں دیکھنے والے آگئے ہیں اس لیے دوسروں کو نہ ڈرائیں۔“

”ہم تو نہیں نہیں گے۔“ مونانے ڈھٹائی سے کہا۔

”ہم چڑیلیں ہیں۔“ سادی خفا ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے جارہے ہیں۔“

”کوئی نہیں جائے گا۔“ شی نے اسے ڈانٹا۔ ”یاد نہیں کیا طے ہوا تھا؟“

کچھ دیر کی چیخیں چھاڑ کے بعد وہ سب نارمل ہو گئیں اور پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابھی میں ایک سوال کا جواب دے رہا ہوتا تھا کہ دوسرا سوال سامنے آ جاتا۔ خدا خدا کر کے سوالات کا یہ سلسلہ ختم ہوا۔ پھر شاز یہ نے مجھ سے سلام دعا کی میں نے اس کے باپ کی تعزیت کی۔ وہ افسردگی سے بولی۔ ”پاپانے جو کیا اس کا خمیازہ ہم نے بھی بھگتا اور انہوں نے بھی۔“

سویرانے کہا۔ ”ماضی میں جو ہوا اسے بھول جاؤ، آنے والا کل اللہ نے چاہا تو ضرور اچھا ہوگا۔“

”اب تم ہماری ذمہ داری ہو۔“

”سنا ہے ایک ذمہ داری وہاں بھی ہے۔“ مونانے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔ وہ بانو کا ذکر کر رہی تھی اور یقیناً سفیر نے اسے بتا دیا تھا وہ پیٹ کا ہلکا تھا اور مونانے کوئی بات نہیں چھپا سکتا تھا۔ میں نے ان کو بانو کے بارے میں بتایا۔ سادی نے اعتراض کیا۔

”پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟“

”تاکہ تم لوگ میرا ناک میں دم نہ کر سکو۔ ایک ساتھ لاکر پیش کر دیتا تو تم لوگ خود ہی سب پوچھ لیتے اس سے۔“

”سن رہی ہوں تم حویلی تک لانے کا ارادہ ہے۔“ مونانے سویرا سے کہا۔ وہ مسکرائی۔

”حویلی تک تو تم سب بھی آئی ہو۔“

”جی نہیں ہماری بات دوسری ہے۔“ سادی ترخ کر بولی۔ ”ہم شوبی کے کچھ لگتے ہیں۔“

”اپنی باتوں سے تو دشمن لگ رہے ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”وہ کیا کہا ہے شاعر نے..... ہوئے تم جس کے دوست.....“

”آپ باتیں نالیں نہیں ان صاحبہ کے بارے میں بتائیں۔“ مونا بولی۔

”تم لوگ بولنے کا موقع دو تو بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور انہیں بانو کے بارے میں بتایا۔ جیسے جیسے میں

بتا رہا تھا ان کا رویہ اور انداز بدلتا جا رہا تھا اور آخر میں وہ بڑبڑبڑ جوش ہو گئی تھیں کہ جلد از جلد بانو سے بات کریں۔

”ابھی میں اپنے کمرے میں ہوں وہ بھی سو گئی ہوگی صبح بات کر لینا۔“

مونا کی صحت ٹھیک تھی اور سادی ڈراحت مند ہو رہی تھی۔ وہ جس مرحلے سے گزر رہی تھی اس میں صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ شاز یہ بھی ٹھیک تھی۔ سب سے پہلے وہ رخصت ہوئی۔ اس کے بعد شی گئی۔ وہ بابا، ماں جی اور دوسروں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ آپابھی سو رہی تھیں اس لیے طے ہوا کہ ان سے صبح بات کی جائے گی۔ سویرا مہنگو میں شریک تھی لیکن اکا دکا باتیں کر رہی تھی۔ بالآخر ان دونوں کو بھی خیال آیا اور وٹانے کہا۔ ”چلو جی اب

ان سے ہم برداشت نہیں ہو رہے ہیں۔“

”کہا تو تم نے ٹھیک ہے لیکن میں مروت میں خاموش ہوں۔“

سادی کچھ دیر سے چپ چپ تھی اس نے مونا کی بات سنی تھی لیکن اٹھنے کے بجائے جھپکتے ہوئے بولی۔

”شہباز بھائی..... بڑے کنور کیسے ہیں؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ان کی حالت پہلے سے خراب ہوئی ہے میں نے بتایا نا کہ یہاں سازشیں چل

رہی ہیں۔ صرف راج کنور ہی نہیں بلکہ فشی دل جی بھی سازش کر رہے ہیں۔ میری اطلاعات کے مطابق بڑے

کنور نے فی الحال سب پر قابو پا لیا ہے اور راج کنور اسپتال میں ہے۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے؟“

”بڑے کنور راج بھیا کو جاگیر سے نکال دیں اس مسئلے کا بھی حل ہے۔“

”ہو سکتا ہے لیکن مجھے یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگتا ہے۔ شروع میں ایسا لگ رہا تھا کہ دونوں بھائی ایک

دوسرے کے جانی دشمن بن گئے ہیں مگر پہلے راج نے بڑے کنور کو رعایت دی اور اس کے بعد بڑے کنور نے راج

کنور کو چھوٹ دی اگر وہ نہ چاہتا تو راج کنور اس حادثے میں مر بھی سکتا تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اسے

دوبارہ پٹیل لے جایا جائے گا۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ راج کنور کے پاس جاگیر اور اس سے وابستہ کاروبار کے کچھ

اہم کاغذات ہیں۔“

سادی نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ”میں سب جانتی ہوں لیکن شہباز بھائی آپ سب چیزوں پر لعنت

بھج کر وہاں سے نکل آئیں۔ آپ جانتے ہیں اب آپ ہی میرے باپ بھائی ہیں۔ میں ماضی سے سارے

ناطے تو ذکر آئی ہوں۔“

”میں جانتا ہوں، لیکن کبھی کبھی ماضی انسان کا بچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جتنی جلد ہو

سکے یہاں سے نکل جاؤں۔“ میں نے کہا لیکن سادی یا ان میں سے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں کس طرح سے یہاں

سے نکلنا چاہتا تھا۔ مونا اور سادی بھی اٹھ گئیں۔ ان کے جاتے ہی سویرا لپک کر لپٹاپ کے پاس آئی تھی۔ اس

نے دعائی رنگ کی لان کا شلوار سوٹ پہن رکھا اور اس پر اچھا لگ رہا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں اس کی صحت بھی

بہتر ہوئی تھی جب میں نے اسے شاہد بھائی کے انتقال کے بعد دیکھا تھا تو وہ کمزور ہو رہی تھی۔ اس نے بے تاب

سے پوچھا۔

”آپ کیسے ہیں؟“

میں نے شرارت کی۔ ”ایسے نہیں ویسے ہی پوچھو جیسے فون پر پوچھا تھا۔“

”تب کیسے پوچھ سکتی تھی۔“ وہ مجھ پر ہونٹیں۔ ”تب سب یہاں موجود تھے۔“

”میں کیسا لگ رہا ہوں؟“

”بیچھے ہٹ کر دکھائیں۔“ اس نے فرمائش کی اور میں نے قہقہے کی۔ ”صحت تو ٹھیک لگ رہی ہے لیکن یہ

ہونٹ کے گوشے پر سو جن کیوں ہے۔“

کسی نے نوٹ نہیں کیا لیکن اس نے کر لیا تھا۔ ”چوٹ لگی تھی؟“

”کسی سے لڑائی ہوئی تھی؟“

”تم جانتی ہو میری زندگی ہی مار دھاڑ میں گزر رہی ہے۔“

”پلیز آپ جلد واپس آ جائیں انڈیا پاکستانوں کے لیے بہت خطرناک ملک ہے وہاں تو بے گناہ پاکستانی بھی سالوں جیل میں سڑتے رہتے ہیں۔“

”میں کوشش کر رہا ہوں۔“

وہ خود پر قابو پانے لگی پھر آہستہ سے پوچھا۔ ”مجھے یاد کرتے ہیں؟“

”سویرا تمہاری یاد میرے وجود میں سانس اور دل کی دھڑکن کی طرح ہے۔ کوئی انسان ان دونوں چیزوں کے بغیر رہ سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ وہ شرمائی تو اس کے چہرے پر رنگ بکھر گئے تھے۔ میں دنگ رہ گیا کیا کوئی اتنا خوب صورت بھی ہو سکتا ہے؟ شاید میرا خیال غلط تھا اصل خیال یہ ہونا چاہیے تھا کہ کیا اتنا خوب صورت بھی لگ سکتا ہے۔ وہ آج بھی ویسی ہی معصوم اور شفاف سی سویرا تھی۔ میں نے شوق سے کہا۔

”تم بھی تو خود کو کھاؤ کیسی ہو رہی ہو آج کل۔“

”جی نہیں۔“

”پلیز۔“ میں نے التجائی تو وہ شرماتے ہوئے پیچھے ہوئی اور دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر جلدی سے واپس آ گئی۔ ”بھئی مجھے شرم آ رہی ہے ایسی فرمائشیں مت کیا کریں۔“

”پہلے کب کی ہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش وہ وقت جلدی سے آئے جب تم میری کسی فرمائش سے انکار نہ کر سکو۔“

اس کے چہرے پر پھر گلاں بکھرا تھا۔ اس نے جلدی سے موضوع بدل دیا اور حویلی کے حالات بتانے لگی۔ شجاع بھائی اور بھائی بچھلے دنوں آئے تھے اور دو دن حویلی میں رک کر گئے تھے۔ مانی حویلی کی سکیورٹی کر گیا تھا اور اب تین گارڈز بہت آسانی سے پوری حویلی اور اس کے آس پاس کی نگرانی کر سکتے تھے۔ گارڈز کے لیے علیحدہ سیٹ اپ بنادیا گیا تھا۔ بابا نے نئی زمین پر جن لوگوں کو آباد کیا تھا وہ بھی حویلی کے محافظوں میں شامل تھے۔ کسی بھی ناگہانی حملے کی صورت میں درجن بمسلاح افراد پانچ منٹ سے پہلے مدد کو آ سکتے تھے۔ سویرا یہ سب بتا رہی تھی کہ اچانک اس نے کہا۔ ”اوہ میں ایک اہم بات بتانا بھول گئی۔ حویلی کے نمبر پر فتح خان کی کال آئی تھی وہ آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ بابا نے بتایا کہ آپ لا پتا ہیں لیکن وہ نہیں مانا۔ اس نے ذرا دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ بہتر ہو گا آپ اس سے رابطہ کر لیں ورنہ آپ کا بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ فتح خان ایسا شخص نہیں تھا جسے آسانی سے نظر انداز کیا جاتا۔ ”اور کیا کہا اس نے؟“

”بس یہی بات کی۔“ سویرا بولی۔ ”ممکن ہے کچھ اور بھی کہا ہو تو آپ بابا سے پوچھ لیجئے گا۔ انہوں نے

انتہائی بتایا ہے۔“

”اس نے دوبارہ کال کی؟“

”یہ بھی نہیں معلوم، لیکن بابا نے اس کال کے بعد گارڈز کو چوکس کر دیا تھا اب وہ رات کو کئی بار خود بھی چکر

لگاتے ہیں۔“

”میں بابا سے بات کروں گا۔“

ابھی میں سویرا سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ ہچکچا رہی تھی۔ ”کیا بات ہے کوئی مسئلہ

تم ٹھیک سے بات نہیں کر رہی ہو؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”شہباز آپ میرا حراج سمجھتے ہیں اور میری پوزیشن بھی جانتے ہیں۔ مجھے

مناسب نہیں لگ رہا ہے کہ اس طرح آپ سے بات کروں جب کہ دوسروں کو بھی پتا ہو۔“

”یہ لپ ٹاپ کس کے پاس ہوتا ہے۔“

”ہوتا تو میرے پاس ہی ہے لیکن کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے۔“

”تب تم مجھ سے بات نہیں کرو گی تب بھی دوسرے ایسا ہی سمجھیں گے۔“

”نہیں میں ٹی کے پاس جاؤں گی۔ اسے مہندی لگوانی تھی۔ وہ لگاؤں گی۔“

”مہندی خیریت؟“

”کل عتیق آ رہا ہے صحت یاب ہونے کے بعد وہ پہلی بار حویلی آئے گا۔“

”اچھا تو اس کی تیاری ہو رہی ہے۔“ میں ہنسا۔ ”لیکن دیکھو اسے تو کوئی خوف نہیں ہے کہ وہ عتیق کے

آنے پر مہندی لگا رہی ہے اور اسے کوئی کچھ کہے گا۔“

”ٹھی کا حق ہے۔“

”حق تو تمہارا بھی ہے۔“

”ہاں لیکن میں اسے ایک بار استعمال کر چکی ہوں۔ پھر میرا حراج بھی اس سے مختلف ہے۔“

”چلو پھر ٹھیک ہے تم جا کر اسے مہندی لگاؤ۔“

”آپ ناراض تو نہیں ہیں نا۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”تم پاگل ہو..... بھلا کوئی خود سے بھی ناراض ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا اللہ حافظ میں صبح دس بجے

کے بعد کسی وقت کال کروں گا۔ اسکا ٹپ آن رکھنا۔“

رات کے دو بج رہے تھے جب میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو حیران ہوا تھا اتنی لمبی بات ہوئی تھی اور

وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ مجھے اوشا کا خیال آیا کہ وہ اب تک رانا دیاس کے محل میں پہنچ گئی ہوگی لیکن

ہوٹل نیجر کی طرف سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ میں نے نیجر کو کال کی وہ ڈیوٹی سے آف ہو گیا تھا لیکن اس

کا نائب موجود تھا میں نے اس سے پوچھا۔ ”میری ساتھی اپنی منزل پر پہنچ گئی ہے؟“

”مجھے معلوم نہیں ہے میں کنفرم کر کے بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ اس نے پانچ منٹ بعد کال کی۔ ”جی سر

وہ اپنی منزل پر پہنچ گئی ہیں۔“

میں نے شکریہ ادا کیا اور پھر آپریٹر سے رانا دیاس کے ایک نمبر پر کال ملانے کو کہا۔ اس کے سیکرٹری نے

کال ریسیو کی۔ رانا دیاس کا پہلا سیکرٹری جو مسلمان تھا اور میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے مارا گیا تھا اس کے بعد رانا

نے دوسرا سیکرٹری بھی مسلمان ہی رکھا تھا۔ وہ غیر متعصب اور کھلے ذہن کا شخص تھا۔ راجا عمر دراز سے دوستی اس

بات کا ثبوت تھی۔ میں نے اپنا نام لیے بغیر سیکرٹری سے اوشا کے بارے میں پوچھا اس نے مختاطا انداز میں بتایا کہ

ادشا خیریت سے وہاں پہنچ گئی تھی اور اس کا مکمل خیال رکھا جا رہا تھا۔ رانا صاحب اسے میرے لحاظ سے ٹریٹ کریں گے۔ میں نے اطمینان محسوس کیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے فون رکھنے لگا تھا کہ اس نے کہا۔

”آپ کے لیے ایک مشورہ ہے اب محل کے کسی نمبر پر کال مت کیجئے گا۔“

میں چونکا۔ ”اگر رابطہ کرنا ہوتو؟“

”نمبر سے بات کر لیجئے گا وہ گاؤں پر کڑے گا۔“

یقیناً کسی وجہ سے رانا دیاس بہت محتاط ہو رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے محل کی طرف سے مجھ سے براہ راست رابطہ نہیں کیا جا رہا تھا اب میں نے بھی محتاط رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا اور پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں نے صبح چھ بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ الارم سے ہی آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے ایکسرسائز کی اور نہا کر کپڑے بدلے۔ بانو سو رہی تھی میں نیچے ہوٹل کے اسٹنٹ منیجر کے پاس آیا۔ یہ رات کو موجود ہوتا تھا وہ مجھے دیکھ کر مستعد ہو گیا۔ ”مجھے طلب کر لیا ہوتا سر۔“

”کوئی بات نہیں میں آ گیا۔“

”حکم کریں اور کیا پیش کروں؟“

”کافی منگوا لیں آپ کے ہوٹل کی کافی لا جواب ہے۔“

وہ خوش ہو گیا۔ ”بrazیل کے ایک خاص فارم سے براہ راست ہمارے پاس آتی ہے اور یہ کافی صرف ہالیوڈ ہوٹل چین کے لیے مخصوص ہے۔“

”مجھے کرائے پر ہیلی کاپٹر درکار ہے۔“

وہ حیران ہوا شاید یہ فرمائش اس کے لیے کچھ زیادہ تھی۔ مگر فوراً اس نے اپنے تاثرات پر قابو پا لیا۔ ”کیوں نہیں سر..... یہاں شملہ میں کئی فلائنگ کلب ہیں جہاں سے ہیلی کاپٹر اور چھوٹے طیارے چارٹرڈ کرائے جا سکتے ہیں۔“

”میں کسی ایسے ہیلی کاپٹر کو ترجیح دوں گا جو لمبی پرواز کرنے کی سکت رکھتا ہو اور کسی کمپنی کی ملکیت نہ ہو۔ کسی ایک فرد سے معاملہ طے ہو جائے۔“

”اس کے لیے معلومات حاصل کرنا پڑیں گی۔“ اس نے کہا۔

”جب آپ معلومات حاصل کریں لیکن بغیر کسی ریفرنس کے، میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”جی سر بالکل سمجھ رہا ہوں۔ ہالیوڈ ہوٹل یا آپ کا نام نہیں آئے گا۔“

”آپ مناسب دو تین نام ریفرنس کر دیں میں ان سے خود بات کر لوں گا۔“

”ابھی ارلی مورننگ ہے میرا خیال ہے میں دس بجے تک معلومات حاصل کر لوں گا۔“

”مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں ایک کام اور ہے۔ نند درما ہاسپتال میں ایک

ڈاکٹر امرتسر ہے مجھے اس کا پرائیویٹ کونٹیکٹ نمبر چاہیے۔“

وہ پھر حیران ہوا مگر مستعدی سے کہا۔ ”یہ بھی مل جائے گا سر۔“

اس دوران میں کافی آگئی تھی میں نے کافی نوشی کے دوران ہالیوڈ ہوٹل کے معیار اور یہاں کی سروس کی

تقریف کی وہ خوش ہو گیا۔ ”سر ہم آپ کی خدمت کے لیے بیٹھے ہیں۔“

وہ خدمت کے لیے نہیں بلکہ کمانے کے لیے بیٹھے تھے۔ یقیناً وہ رانا دیاس سے لاکھوں کا بل وصول کرتے اور کوئی تعجب نہیں ہوتا اگر بل کی رقم سات ہندسوں میں چلی جاتی۔ میں نے جو کافی پی تھی اس کی قیمت میں کسی اچھے ریٹورینٹ میں فیملی ڈنر کیا جاسکتا ہوگا۔ اس سے بات کر کے میں اوپر آیا۔ آٹھ بج رہے تھے میں نے بانو کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ جاگ گئی تھی اور ایک سرساز کر رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کی سانس تیز تھی اور چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”بس کرو بی بی اور تیار ہو کر میرے کمرے میں آ جاؤ ناشتے کے لیے۔“

”آپ کہہ دیں میں بیس منٹ میں آتی ہوں اور ہاں ناشتہ دیسی اسٹائل کا ہو۔“

”یعنی اغڑہ پر اغڑا، حلوہ پوری بھاجی اور چنوں کا سالن۔“

”بالکل۔“

”یہ ہالیوے ہوٹل ہے۔“

”اگر یہ سب نہ ملا تو پھر کیا فائدہ ہالیوے ہوٹل کا اس سے اچھا تو لاہور کا کمالیہ ہوٹل ہے وہاں یہ سب ملتا

ہے۔“

”کیا یاد دلا دیا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”کبھی ہم بھی لاہور جاتے تھے اور وہاں کے پکوان

کھاتے تھے۔ اچھا کوشش کرتا ہوں۔“

میں حیران ہوا جب روم سروس نے بلا جھٹ میرا آرڈر نوٹ کر لیا اور جب تک بانو تیار ہو کر آئی ناشتہ آچکا تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ ہمیں نہ صرف اپنی پسند کا ملا تھا بلکہ اسی معیار تھا۔ ڈٹ کر ناشتے کے بعد بانو کی فرمائش پر چائے یا کافی کے بجائے تسی نوش کی گئی۔ میں نے بانو کو بتایا کہ گزشتہ رات میں نے حویلی بات کی تھی اور تمام خواتین اس سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔ اس نے سر ہلایا۔ ”مجھے خیال تھا کہ آپ حویلی بات کریں گے۔“

”تمہیں اس لیے شامل نہیں کیا کہ پھر کوئی ایسی بات نہ ہو جو تمہارے دل کو لگے۔ تمہارے بارے میں بتایا

ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ تم واپس جا کر ان کے پاس حویلی میں رکو۔“

وہ ہچکچائی۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“

”کیوں نہیں..... دیکھو میرا مونا اور سادی کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن ہمارے درمیان تعلق بہت

مضبوط ہے۔ ایک حیران کن حقیقت تو میں نے تمہیں بتائی نہیں۔ کنور پبلش میں منہ سے نہیں نکال سکتا تھا اور وہاں سے نکلنے کے بعد حالات تیزی سے بدلتے رہے۔ کبھی وقت نہیں ہوتا تھا اور کبھی ذہن میں نہیں ہوتا تھا سچی بات ہے خود میرے ذہن میں بھی یہ بات تھوڑی تھوڑی ٹھوہتی جا رہی ہے۔“

”کون سی بات؟“

”مجھی کہ سحد یہ عرف سادی اور سابق سادھنا کنوروں کی بہن ہے۔“

بانو عج حیران رہ گئی تھی۔ ”رنیلی..... میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔“

”کنور برادرز اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ جب قبائلیوں نے پبلز پر حملہ کیا تو افراتفری میں وہ لوگ سعدیہ کو نہیں لے جاسکے اور قبائلی اسے بھی عام ملازمہ سمجھ کر ساتھ لے گئے۔ میں اسے جانتا تھا پھر میں نے اسے تحفظ دیا کیونکہ وہ سچ منہ بہت معصوم لڑکی تھی اپنے بھائیوں کے جرائم سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ قبائلیوں کے سردار کمار سے وابستہ ہو گئی انہوں نے شادی کر لی تھی مگر پھر کمار ہپاٹائش کا شکار ہو گیا اور سعدیہ دوبارہ میری ذمہ داری بن گئی۔ میں اسے یہاں سے نکال کر لے گیا۔ پھر میرے ساتھی ویم نے سعدیہ کے زخم پر مرہم رکھا اور اسے اپنا لیا۔ اب وہ سعدیہ ہے۔ اگر کنور برادران کو اس کی بھنگ بھی پڑ گئی تو وہ سعدیہ کو واپس حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”اب میری سمجھ میں آیا کہ آپ ان لوگوں کو چھوٹ کیوں دیتے رہے ہیں یقیناً اس کی ایک وجہ سعدیہ بھی ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس نے ماضی سے سارے تعلق توڑ لیے ہیں مگر وہ اس کے بھائی ہیں اسے یاد آتے ہوں گے۔“

”آپ نے اچھا کیا بتا دیا اب میں گفتگو میں کنوروں کو برا بھلا نہیں کہوں گی۔“

ناشتے کے بعد گپ شپ میں دس بج گئے تھے میں نے اسکاٹپ آن کیا اور کال کی۔ ٹی لیپ ٹاپ لے کر ماں جی کے پاس بیٹھی تھی۔ اسکرین پر میری ویڈیو نمودار ہوتے ہی وہ تڑپ کر پاس آئی تھیں۔ ”شہباز..... پتر۔“

”ماں جی۔“ میری آواز بھی گلے میں چھننے لگی۔ وہ رو رہی تھیں اور میں انہیں دالاسہ دے رہا تھا وہ اسکرین چھو چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ بات کرنے کے قابل ہوئیں۔ ان کی گفتگو کا ہر دوسرا جملہ یہی ہوتا تھا کہ پتر شہباز واپس آجا۔ اس دوران میں دوسرے بھی آگئے تھے۔ بانو نے ماں جی اور دوسروں سے سلام دعا کی پھر بابا آگئے تو سب پیچھے ہٹ گئے۔ خلاف توقع بابا سلام دعا کے بعد لیپ ٹاپ اپنے کمرے میں لے گئے وہ مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو وہ سب کے سامنے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد انہوں نے کہا۔

”شہباز حالات ٹھیک نہیں ہیں تمہیں پتا چل گیا ہو گا فتح خان کی کال آئی تھی۔“

”جی بابا۔“

”میں نے گھر میں پوری بات نہیں بتائی۔“ بابا ٹھکرا میز لہجے میں بولے۔ ”پہلی بات تو یہ کہ فتح خان جانتا ہے کہ تم انڈیا میں ہو۔“

میں حیران ہوا۔ ”اس نے اپنی سوریس بتائی؟“

”میرا خیال ہے ڈیوڈ شائنامی بندہ ہے۔ کیونکہ فتح خان نے اس کے حوالے سے بھی بات کی تھی۔“

یک لخت میرے چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں اور میں جو خود کو اس عالی شان ہوٹل میں محفوظ و مامون سمجھ رہا تھا۔ یہ احساس آن و واحد میں اڑ گیا۔ ”بابا مجھے تفصیل سے بتائیں فتح خان نے کیا کہا تھا؟“

”اس نے پہلے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں تم سے بات کراؤں لیکن جب میں نے کہا کہ تم لاہور ہو تو اس نے

کہا کہ وہ جانتا ہے کہ تم انڈیا میں ہو اور شہباز کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ ڈیوڈ شا سے رابطہ کر لے ورنہ وہ بہت بڑے خسارے میں رہے گا۔“

”اس نے کوئی دھمکی بھی دی؟“

”نہیں بس یہی دھمکی تھی۔“

”میں ڈیوڈ شا سے کیسے رابطہ کر سکتا ہوں۔“

”اس نے کچھ نمبرز دیئے ہیں جن پر تم رابطہ کر سکتے ہو۔ میں نے نوٹ کر لیے تھے۔“ بابا نے کہا۔ ”تم لکھ

لو۔“

میں نے نوٹ پڑھ کر پتہ لگایا۔ بابا نے تین نمبرز لکھوائے جو میں نے کاغذ پر اتار لیے۔ ”بابا آپ بہت محتاط رہیں فتح خان بہت موذی شخص ہے۔ وہ مسلسل میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“

”میں محتاط ہوں بیٹا، لیکن ایسا کب تک چلے گا؟“

میں نے سرد آہ بھری۔ ”بابا اگر یہ سب میرے اختیار میں ہوتا تو کب کا ختم کر چکا ہوتا۔ آپ جانتے ہیں

میں بے بس ہوں۔“

بابا کچھ دیر خاموش رہے پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز میں اور تمہاری ماں اپنی زندگی گزار چکے

ہیں اب ہمیں تمہاری اور سویرا کی فکر ہے۔“

”میں جانتا ہوں بابا لیکن میرے لیے اصل اہمیت آپ کی اور ماں جی کی ہے آپ کے بغیر ہم اور ہماری

ہر خوشی ادھوری ہے۔“

”شہباز کیا ڈیوڈ شا سے بات کر کے تم دشمنی کے اس چکر کو ختم کر سکتے ہو؟“

”ڈیوڈ شا ایک ناقابل اعتبار آدمی ہے۔ وہ اثر و رسوخ کا حامل ہے اور بہ ظاہر مرشد جیسا شخص بھی اس کی

جی حضوری کرتا ہے۔ اسی طرح فتح خان اس کا ملازم ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے مرشد کے معاملے میں اس کی ضمانت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہے؟“

”بالکل اور ایک بار ایسا ہو بھی چکا ہے جب مرشد نے ڈیوڈ شا کی ضمانت کے باوجود میرے خلاف

کارروائی کی تھی۔“

”ڈیوڈ شا تم سے کیا چاہتا ہے؟“

”وہ مالیائی وادی تک کے سفر میں مجھے لے جانا چاہتا ہے کیونکہ اسے اور راجا عمر دراز دونوں کو یقین ہے

کہ اس وادی میں میرے بغیر داخلہ ممکن نہیں ہے۔“

”یہ احمقانہ بات ہے۔“ بابا نے ناگواری سے کہا۔

”میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن یہ دونوں اسے پوری طرح حقیقت سمجھتے ہیں۔“

”اب تم کیا کرو گے ڈیوڈ شا سے رابطہ؟“

”ابھی سوچا نہیں ہے فی الحال تو میں واپس آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں تم نے جو کرتا ہے واپس آ کر کرو ہاں تمہارے لیے خطرات بہت زیادہ ہیں۔“

”گلتا ہے آپ کو میرے بارے میں بری فکری ملی ہے؟“ میں نے دہی زبان میں کہا تو بابا نے سر ہلایا۔

”شجاع نے بہت کچھ بتایا ہے اس کے پاس تمہاری فائل آئی تھی۔“

”بابا کیا شجاع بھائی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔“

”وہ کوشش کر رہا ہے لیکن اس کی ایک حد ہے۔ معاملات دونوں طرف سے ہی سیشنل ہو سکتے ہیں۔“

”نہیم کوشش کر رہا ہے کہ میرے خلاف کیمرہ ختم کر دیئے جائیں۔“

”مجھے معلوم ہے تمہاری مرشد سے کوئی ڈیل چل رہی ہے۔“

”جی بابا یہ اسی کا نتیجہ ہے۔“ میں نے کہا اور اس سے مجھے خیال آیا کہ میں نے عبداللہ اور وسیم سے نادر

کے بارے میں پوچھا نہیں تھا کہ اس کی کیا حالت تھی۔ یقیناً وہ پہلے جیسا تھا اگر کوئی تبدیلی آتی تو وہ خود مجھے مانتے۔ کچھ دیر بابا سے بات ہوئی پھر انہوں نے لیپ ٹاپ شی کے حوالے کر دیا۔ خواتین سے میری بات ہو چکی تھی اس لیے میں نے اب ہیڈ فون بانو کے سپرد کر دیا۔ گیارہ بج رہے تھے اور اسٹنٹ منیجر نے دس بجے تک کا وقت دیا تھا ابھی میں اسے کال کرنے کا سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا ایک ویٹر سنہری طشتری میں ایک سیل لفافہ لیے کھڑا تھا میں نے لفافہ لیا اور اسے ٹپ دے کر اندر آیا۔ لفافے پر ہوٹل کا مونو گرام تھا۔ یہ خود بہ خود بند ہو جانے والا لفافہ تھا جسے پھر پھاڑ کر ہی کھولا جاسکتا تھا۔ میں نے اسے پھاڑا اندر سے ایک چھوٹا سا پرنٹ آؤٹ نکلا۔ اس پر تین افراد کے نام اور ان کے کوئی نمبرز لکھے تھے۔ دو نام اجنبی تھے البتہ تیسرا نام ڈاکٹر امرتسرنگ تھا۔ میں نے ہوٹل کے آپریٹر سے اس کا نمبر ملوایا۔ کچھ دیر بعد وہ لائن پر تھا۔

”سر دار جی میں شیم بات کر رہا ہوں۔ ریٹا کا بھائی۔“ میں نے آہستہ سے کہا بانو کمرے کے دوسرے کونے میں تھی اور مجھے امید تھی کہ وہاں تک میری آواز نہیں جائے گی۔

”حکم کر دیجی، گا کی لوں کوئی مسئلہ ہے؟“

”گا کی ٹھیک ہے پر ایک بندہ اور ہے آپ کے اسپتال میں مجھے آپ سے اس کے بارے میں بات کرنی ہے اگر آپ میرے لیے تھوڑا وقت نکالیں تو.....“

”وقت ہی وقت ہے جی آپ جب چاہے آجاؤ۔ پر ابھی میں گھر پر ہوں۔ آپ کو یہاں آنا ہوگا۔“

میں نے اس سے پتہ لیا اور بانو کو اشاروں میں اپنی روانگی کا کہہ کر نکل آیا۔ ایک ٹیکسی نے مجھے شہر کے نچلے حصے میں اس متوسط کالونی تک پہنچایا میں چاہتا تو ہوٹل کی کار میں آسکتا تھا لیکن اس پر ہوٹل کا نام اور مونو گرام تھا ادھر تبسمہ ہوتی۔ میں نے ٹیکسی والے کو روک لیا اور خود اتار کر ڈاکٹر امرتسرنگ کے مکان کی طرف بڑھا، یہ خوبصورت بولدار بیلوں اور پودوں سے سجھا ہوا مکان تھا۔ سامنے برآمدے میں ایک چھوٹا سا کتا بہ طور کال بیل موجود تھا میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تھا کہ اس نے بھونکن شروع کر دیا فوراً ہی اندر سے ڈاکٹر امرتسرنگ نکل آیا اس نے گاؤن ان رکھا تھا۔ وہ مجھے چھوٹے سے لان پر موجود چیئر تک لایا۔ ”معاف کرنا شیم جی میری بی بی میکے گئی ہوئی ہے مایہ لیے جانے کافی نہیں کر سکوں گا ہاں سافٹ اور ہارڈ ڈریک ہے۔“

”فی الحال کچھ نہیں۔“ میں نے شکریے کے ساتھ کہا۔

”حکم کر دیجی۔“

”سردار جی آپ کے اسپتال میں راج کنورتا می ایک بندہ داخل ہے۔“
اس نے دائرہ میں خال کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ”وی آئی پی بندہ ہے اس پر دو بندے لگے ہوئے ہیں۔“

”وہ زیر نگرانی ہے۔“ میں نے کہا تو امرتسر جیران ہوا۔
”وہ کیوں جی؟“

”یہ خاندانی جاگیر اور دولت کا چکر ہے۔ بہر حال امرتسر جی بات یہ ہے کہ اس پر نگرانی میری وجہ سے ہے کہ میں اس سے ملاقات نہ کر سکوں۔“
”آپ سے کیوں نہ ملے جی؟“

”سردار جی کچھ معاملات ہیں ایسے، قصہ مختصر میں راج کنور سے ملنا چاہتا ہوں لیکن ہاسپٹل جائے بغیر۔“
وہ بھونچکا رہ گیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”بالکل ممکن ہے اگر آپ میری اس سے موبائل پر بات کرادیں۔“
امرتسر سکھ سادہ آدمی تھا لیکن اتنا سادہ بھی نہیں تھا کہ معاملے کو شریفانہ سمجھ لیتا اس نے گڑبڑ محسوس کر لی تھی اور انکار کی تمہید باندھنے لگا۔ ”دیکھیں شیام جی..... بات یہ ہے کہ.....“

میں تیار ہو کر آیا تھا میں نے پانچ سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دی اور اس کا جملہ منہ میں ادھورا رہ گیا اس کی نظریں گڈی پر جم گئی تھیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”سردار جی یہ پچاس ہزار ہیں، آپ کو بہت چھوٹا سا کام کرنا ہے کہ جب میں کہوں اس سے میری موبائل پر بات کرادیں۔ بے شک اپنے موبائل سے کرادیں اس طرح آپ پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔“
”الزام تو آئے گا۔“

”میرا مطلب ہے کہ آپ اسے کوئی موبائل دیں گے تو آپ پر الزام آئے گا۔ اپنا موبائل تو آدمی دس لوگوں کو استعمال کے لیے دیتا ہے۔“

”میں نہیں دیتا۔“ اس نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔ ”اپنی بیوی کو بھی نہیں دیتا۔“

”کوئی بات نہیں اب دے دیں اور پچاس ہزار کے بدلے یہ سودا برا نہیں ہے۔“

وہ لالچ میں پڑ گیا تھا۔ ”کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟“

”سردار جی کوئی گڑبڑ والا کام ہوتا تو میں ہاسپٹل کے کسی معمولی ملازم کو پکڑتا اور دو ہزار روپے میں یہ کام کر دیتا۔“

”تو آپ نے کیوں نہیں کرایا؟“

”بات ساری رازداری کی ہے۔ معمولی ملازم نہ تو عقل استعمال کرتا اور نہ اتنی احتیاط کرتا۔ راج کنور کی نگرانی کرنے والے اسے پکڑ لیتے تو پھر میں اس سے بات نہیں کر پاتا۔ اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ ہوشیار آدمی ہیں اور پھر ڈاکٹر ہیں جتنی بار بھی جا ہیں راج کنور کے کمرے میں جاسکتے ہیں۔“
سکھ عقل مندی کی سند پا کر خوش ہوا تھا۔ وہ جج سادہ آدمی تھا اسی لیے میری حد درجے سادہ و ضابطہ

سے مطمئن ہو گیا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو دس سوال کرتا اور پھر بھی مطمئن نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی آمدگی میں زیادہ زور پچاس ہزار روپے کا ہو۔ اس نے گڈی اٹھالی۔ ”آپ کا کام ہو جائے گا۔ میری ڈیوٹی شام سات سے صبح سات تک ہے۔“

”بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہے تو پر کیا کریں۔“ اچھی ملتی ہے اور کام بھی زیادہ نہیں ہے۔“

”سر دراجی آپ نے ایک چیز کا خیال اور رکھنا ہے اگر راج کنور کو اچانک ڈسچارج کرایا جائے تو اس کی اطلاع مجھے فوراً دیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کا گھنٹے کا جوڑ ہلا ہوا ہے اور کم سے کم دو دن اور رکنا ہوگا۔ ایکسپریس کے بعد دیکھا جائے گا کہ جو ٹھیک ہو رہا ہے تبھی اسے جانے کی اجازت دی جائے گی۔“

”یہ تو آپ کی رائے ہے ہو سکتا ہے اس کے گھرانوں کی رائے کچھ اور ہو اگر گھر والے اپنے بندے کو لے جانے پر اصرار کریں تو آپ زبردستی تو نہیں روک سکتے۔“

”ایہہ ٹھیک کہا۔“ امرتسرنگ نے سر ہلایا۔ ”پر میں آپ کو بتاؤں گا کیسے؟“

”میں ہمالیہ ہوٹل میں مقیم ہوں آپ کمرہ نمبر چار سو بارہ کہہ کر ٹوالینا مگر نام مت لینا۔“

میری بات پر وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا لیکن کچھ کہا نہیں۔ راسن والا واقعہ شاید کسی کے علم میں نہیں تھا اس لیے امرتسرنگ نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ راسن اور سنتوش کو راج کنور کے گھرانوں کی حیثیت سے جانتا ہوگا۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا کہ راج کنور کی گھرانی پر کتنے لوگ ہیں اس نے بتایا کہ فی الحال ایک ہے دوسرا کل سے غائب ہے۔ راسن کہیں اپنی مرہم پٹی کر رہا ہوگا۔ میں نے امرتسرنگ سے اس کا موبائل نمبر لیا اور وہاں سے نکل آیا۔ ٹیکسی والا منتظر تھا میرے بیٹھنے پر اس نے کہا۔ ”اب کدھر جانا ہے سر؟“

”کسی اچھے لی سی او چلو مجھے کچھ کالز کرنی ہیں۔“

ٹیکسی والا لوڑ شملہ کی ایک کمرشل اسٹریٹ پر لے آیا۔ یہاں سیاحوں اور خریداروں کا خاصا رش تھا۔ یہاں ایک بڑا لی سی او تھا جس میں رازداری سے بات کرنے کے لیے کیمین بنے ہوئے تھے۔ میں نے بی اے سنگاری نامی پائلٹ کا نمبر آپریٹر کو دیا اور اس نے کیمین نمبر نو کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”جب ریڈلائٹ آن ہو تو ریسیوا اٹھالینا۔“

میں کیمین میں داخل ہوا۔ یہ چاروں طرف سے بند تھا اور اوپر ایک چھوٹا سا ایگزاسٹ فین لگا تھا تاکہ اندر ٹھن نہ ہو۔ جیسے ہی ریڈلائٹ آن ہوئی میں نے ریسیوا اٹھالیا۔ ”بی اے سنگاری۔“

”بات کرتا ہے۔“ دوسری طرف سے گوراشانی اردو میں کہا گیا۔

”میرا نام شام لال ہے اور مجھے بجلی کا پڑ چارٹرڈ کرانا ہے۔“

”کدھر کے لیے؟“

”اوپر ہمالیہ کا نظارہ کرتا ہے۔“

”ایسا کرو میرا دفتر آجاؤ۔“ اس نے کہا اور بتاتا جاو میں نے ذہن نشین کر لیا۔

”میں ابھی آ رہا ہوں۔“

”آ جاؤ میں بیٹھا ہے۔“

میں نے دوسری کال ہالیا۔ ہوٹل کی اور آپریٹر سے بانو کو ملانے کو کہا۔ وہ ابھی تک اسکا پپر لگی ہوئی تھی اور بہت خوش تھی وہ ان کو ہولڈ کر کے آئی میری آواز سن کر چمکی۔ ”آپ کہاں ہیں مجھے ان سے بات کر کے بہت مزہ آ رہا ہے۔“

”مرے لپٹی رہو میں نے یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ میں کچھ دیر سے آؤں گا پریشان مت ہونا۔“

”ٹھیک ہے۔“

میں پی سی او سے نکلا اور ٹیکسی والے کو بی اے سنکاری کا دیا پتا بتایا۔ اس کا منہ لنگ گیا۔ ”یہ تو شہر سے باہر ہے سر۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے ایک پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ”مجھ لو تمہارا میٹر چل رہا ہے اگر اوپر نہیں تو لے لینا ورنہ باقی تمہارا ہوگا۔“

اس کا منہ صحیح پوزیشن میں آ گیا اور اس نے مستعدی سے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ قدم قدم پر مشاہدہ ہوتا تھا کہ روپیہ انسانی رویوں میں کس طرح تبدیلی لاتا ہے۔ فرض کی ادائیگی سے زیادہ اہم لوگوں کے نزدیک اضافی آمدنی تھی۔ ہم مزید نیچے کی طرف آئے اور اس جگہ کسی قدر گرمی تھی۔ ایک چھوٹا سا ایر کلب ہائی وے سے کچھ دور تھا بلندی سے وہاں کھڑے کوئی درجن بھر طیارے اور ہیلی کاپٹر دکھائی دیئے تھے۔ دو منزلہ عمارت میں کنٹرول ٹاور اور آپریٹرز کے دفتر تھے۔ میں نے بی اے سنکاری کا نام لیا تھا کہ ایک شخص نے کونے میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ادھر عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ نکا دیسی تھا یعنی رنگ و روپ قطعی انڈین تھا مگر لہجے سے اینگلو انڈین بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب انگریز بوریا ستر باندھ کر یہاں سے رخصت ہوا تو ایسے مقامی افراد کی کمی نہیں تھی جو خالص ہندوستانی تھے مگر ان کی مائیں انگریزوں کے گھر کام کرتی تھیں اور انہوں نے نہایت بے غیرتی سے دعویٰ کیا کہ وہ اپنے باپ کے بجائے اصل میں اس انگریز کی اولاد ہیں۔ اس وقت معاشرے میں مقام حاصل کرنے کا یہ شارٹ کٹ طریقہ تھا۔ انڈیا کا شکر ہے کہ یہ بے حیا رواج انڈیا تک محدود رہا۔ البتہ ہمارے ہاں ایک طبقہ ہے جو اپنی معنوی دل دیت انگریزوں سے جوڑتا ہے۔ قارئین میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں۔ بے حیائی میں یہ ان نام نہاد اینگلو انڈین لوگوں سے کم نہیں ہے۔ میں بی اے سنکاری کی طرف بڑھا جو کاکولا کی بوتل میں یقیناً دیسی ٹھرا پی رہا تھا اس سے نہایت ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔

”شیام لال۔“ میں نے اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی۔

”بدری آئندہ سنکاری۔“ اس نے کسی قدر خمار آلود لہجے میں کہا۔ ”کتنا آدمی ہے اور کب جانا ہے؟“

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”تین سے چار آدمی ہوں گے اور وقت کا تعین نہیں ہے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے اعتراض کیا۔ ”کنٹرول والوں سے اجازت لینا پڑتا ہے فلائٹ پلان

بتانا ہوتا ہے۔“

”اس کام میں کتنی دیر لگتی ہے؟“

”ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ۔“ اس نے جواب دیا اور بوتل سے ایک گھونٹ بھرا۔
 ”ٹھیک ہے تمہیں وقت ملے گا۔ مگر تمہیں چوبیس گھنٹے اسٹینڈ بائی پر رہنا ہوگا۔“
 ”فلائٹ ٹائم صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک ہے اگر موسم صاف ہو رات کو فلائٹ نہیں ہوتا۔“
 ”ہمیں دن میں جانا ہے رات کو کیا نظر آئے گا۔ میں وقت کا خیال رکھوں گا۔ اگر میں تم کو چوبیس گھنٹے
 انچنگ رکھوں تو تمہارے چار جز کیا ہوں گے؟“

اس نے اپنی سفید ہو جانے والی داڑھی کھجائی۔ ”کتنا انچنگ رکھے گا؟“
 ”آٹے والے دو دن۔“

”ایک دن کا دس ہزار روپیہ ہوگا اور فلائٹ چار جز ایک گھنٹے کا دس ہزار روپیہ ہوگا۔“
 میں نے اسے بیس ہزار دیئے۔ ”یہ تمہارے دو دن کے ہو گئے اب تم مجھے صبح سات سے شام چھ بجے تک
 ملو گے۔ تمہارا فون بند نہ ہو اور تم ٹن نہ ہو۔“ میں نے بوتل کی طرف دیکھا۔ ”اسے پی کر تم بغیر ہیلی کاپٹر کے بھی
 پرواز کر سکتے ہو لیکن مسئلہ ہمارا ہے۔“
 ”یہ.....“ اس نے کھسکا کر کہا۔ ”میرے لیے پانی ہے۔“
 ”شراب پی پی کر مرنے والے سارے شرابی یہی کہتے ہیں۔ بہر حال یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ میں کھڑا ہو
 گیا۔

”تمہارا نام اور کوئی آئی ڈی؟“
 ”نام بتا دیا ہے اوسا کی ڈی کی کیا ضرورت ہے تم جو چاہے لکھوا دیتا۔“ میں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا
 پھر اس نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے میں منٹ لے گا۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ایک مرحلہ اور طے ہو گیا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ راج کنور کا ہیلی کاپٹر
 ہی استعمال کروں گا لیکن اب وہ یقیناً بڑے کنور کے اشارے کا غلام تھا اور راج کنور خود سے اسے نہیں بلا سکتا تھا۔
 اس پائلٹ کا فائدہ یہ ہوتا کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سرحد کہاں سے پار کرنی ہے۔ مگر کوئی بھی تجربے کا ر پائلٹ
 یہ کام کر سکتا تھا اگر راضی خوشی نہیں کرتا تو اس سے کرایا جاسکتا تھا۔ بی اے سنکاری نے اپنا ہیلی کاپٹر دکھایا۔ یہ پانچ
 نشستوں والا ہلکا ہیلی کاپٹر تھا لیکن ایک بار فلول لے کر دو گھنٹے سے زیادہ پرواز کر سکتا تھا۔ اتنا وقت کافی تھا کیونکہ
 ہمیں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ پرواز نہیں کرنی تھی اور اس دوران میں ہم لازمی سرحد عبور کر جاتے۔ ہیلی کاپٹر کسی قدر
 پرانا تھا مگر اس کی دیکھ بھال ہوتی تھی اس لیے نیا لگ رہا تھا۔ سنکاری نے مجھے بتا کر حیران کر دیا۔
 ”میں اسے دس سال سے اڑا رہا ہے۔“

”یہ دس سال پرانا تو نہیں لگتا۔“

”یہ اس سے بھی پرانا ہے لیکن اس کا پراپر مینٹی نینس ہوتا ہے۔ سارا اہم پرزہ چھینچ کیا جاتا ہے۔ فلائنگ
 مشین میں ایک پرزہ بھی ٹھیک نہ ہو تو یہ دھڑام سے نیچے گر سکتا ہے۔“
 اس بار میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”میں تم سے رابطہ کروں گا تم تیار رہنا۔“

ٹیکسی والا منتظر تھا اور اوتھ رہا تھا مجھے دیکھ کر ہوشیار ہو گیا۔ ”اب کدھر جانا ہے سر؟“

”وہیں جہاں سے تم نے مجھے اٹھایا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ میں نے ہمالیہ ہوٹل کا حوالہ نہیں دیا۔ ٹیکسی بھی میں نے ہوٹل سے کچھ فاصلے سے لی تھی۔ میں اب محتاط ہو گیا تھا۔ خاص طور سے جب فتح خان اور ڈیوڈ شا کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ انڈیا میں میری موجودگی سے واقف تھے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ انہیں بالکل درست پتا ہو کہ میں کہاں تھا لیکن یہ بھی کم نہیں تھا کہ وہ انڈیا میں میری موجودگی سے واقف تھے۔ بابا نے جوتین نمبرز دیئے تھے اور ان پر ڈیوڈ شا سے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ مگر میرانی الحال رابطہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جب میں ٹیکسی سے اترا تو دو بج رہے تھے۔ میں ہوٹل کے مخالف سمت کی طرف چل پڑا اور جیسے ہی ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوئی میں نے یوٹرن لیا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بانوا اپنے کمرے میں تھی اور میری منتظر تھی اس نے لچ نہیں کیا تھا۔ اس نے آرڈر کیا۔ ہم نے ملے کیا ہوا تھا کہ کھانا اپنے کمرے میں کھایا کریں گے اور غیر ضروری طور پر باہر جانے سے گریز کریں گے۔ تاکہ کسی کی نظروں میں آنے کا امکان کم سے کم ہو۔ کھانے کے دوران میں نے اسے اپنی کارگراریوں سے آگاہ کیا۔ وہ غور سے سن رہی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے سوال کیا۔

”شہباز صاحب کیا یہ خطرناک نہیں ہے؟“

”ہاں ہے تو۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”لیکن خطرات تو تمام طریقوں میں ہیں۔“

”اگر پہلی کا پٹر کوہٹ کیا گیا تو بچنے کا امکان بہت کم ہوگا۔“

”رامن اسی طریقے سے آتا جاتا رہا ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”جب وہ ہمارے ساتھ ہوگا تو انڈیا کی طرف سے کوئی مشکل نہیں ہوگی اور میرا اندازہ ہے کہ دوسری طرف اس مقام پر شاید ریڈار کی نگرانی اتنی اچھی نہیں ہے اس لیے ان کو پہلی کا پٹر کی آمدورفت کا پتا نہیں چلتا ہے۔“

بانو محبت وطن پاکستانی کی طرح فکرمند ہو گئی۔ ”یہ تو اچھی بات نہیں ہے اس طرح سے ہمارے ملک کا دفاع کمزور ہو جائے گا۔“

”تم فکرمند کرو واپس جا کر ہم متعلقہ اتھارٹیز کو خبردار کر سکتے ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”فی الحال تو یہ ہمارے لیے موقع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ہم واپس جاسکتے ہیں۔“

”راج کنور کیسے ہمارے ہاتھ آئے گا؟“

”اس کا بندوبست بھی کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر امرت سنگھ سے اسی لیے رابطہ کیا ہے۔“

اس کا نام سن کر بانو کا چہرہ ڈاسر خ ہوا تھا۔ ”ٹھہری آدی ہے۔ بلاوجہ میرے سر پر سوار ہوتا تھا اور فری ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر اتھوئی سے شکایت کی تو اس کے بعد سیدھا ہو گیا تھا۔“

”تم نے پہلے بتانا تھا۔ خیر ابھی اس سے سلام دعا ہے اللہ نے چاہا تو جاتے جاتے اسے بھی کوئی جھٹکا دے جائیں گے۔“

”آپ کو یقین ہے کہ اس طرح ہم راج کنور کو حاصل کر لیں گے۔“

”یقین تو نہیں ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔ خود مجھے بھی لگ رہا تھا کہ میں نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ کوئی اتنا اچھا نہیں ہے اور اس کی کامیابی میں بہت سے اگر مگر حائل تھے۔

”شہباز صاحب ہمیں کوئی ایسا پلان بنانا چاہیے جس میں کامیابی کا امکان زیادہ ہو اور معاملات ہمارے ہاتھ میں ہوں۔“

میں نے غور کیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ ہمیں راج کنور کو خود قابو کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“
 ”بالکل..... اس معاملے کو بڑے کنور کی طرف سے کارروائی پر مت چھوڑیں۔“

”کیا ایک اسپتال میں اس قسم کا کام آسان ہوگا۔“
 ”بالکل ہوگا وہاں ہمیں مسلح افراد کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جب کہ راج کنور کو مختل کیا گیا تو یقیناً اس کے ساتھ زیادہ پہریدار ہوں گے۔“

”یہاں بھی رامن اور سنٹوش ہیں۔“
 ”یہ دو ہیں اور مجھے امید ہے رامن کہیں پڑا اپنے زخموں کی سکاکی کر رہا ہوگا۔ ہمیں صرف سنٹوش سے نمٹنا پڑے گا۔“

بانو کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ ”سنو اگر ہم ڈاکٹر اور نرس بن کر چلیں تو اسپتال میں کوئی ہمیں نہیں روکے گا۔“

بانو اچھل پڑی۔ ”یہ آئیڈیا بہترین ہے۔ وہاں کوئی کسی پر توجہ بھی نہیں دیتا ہے۔ بہت بڑا اسپتال ہے میرا خیال ہے درجنوں ڈاکٹر اور نرسیں کام کرتی ہوں گی سب کی صورتیں کسی کو یاد نہیں ہوں گی۔“
 ”اس کے لیے ہمیں ڈاکٹر اور نرس کا لباس درکار ہوگا اور حلے میں بھی تبدیلی کرنا ہوگی۔“

”میرا مشورہ ہے آپ اس کام کے لیے ہوٹل کے منیجر سے بات کریں وہ سب کر لے گا۔“ بانو نے دوسرا بہترین مشورہ دیا۔ میں نے پُر تحسین نظروں سے اسے دیکھا۔

”شاندار..... کاش کہ تم لڑکا ہوتیں۔“

”کیوں؟“

”میں تمہاری پشت چھکتا۔“

وہ ہنسی۔ ”آپ مجھے لڑکا سمجھ سکتے ہیں۔“

”نہیں سمجھ سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”سمجھ لو میں نے تمہاری پٹینٹ چھپک دی ہے۔“

”میرا خیال ہے آپ فوری عمل کریں اور اس سے پہلے طے کر لیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟“

میں نے غور کیا۔ ”سب سے پہلے ہمیں اسپتال میں آمد و رفت کے راستوں کے بارے میں جاننا ہے۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے ویٹنگ روم میں دیوار پر ایک نقشہ لگا ہوا ہے جس میں پورے اسپتال کی وضاحت کی گئی ہے۔“

”لیکن وہاں راج کنور کا کوئی نہ کوئی آدمی ہوگا۔“

”جب آپ ڈاکٹر امرتسر سے بات کریں۔ میرا خیال ہے وہ نقشہ لادے گا آپ یہی کہیں گے گا کہ راج کنور

سے ملتا ہے اور اس کے مگرانوں سے بچتا ہے۔“

میں نے آپریٹر سے امرتسر سٹھ کو کال ملوائی وہ سورہا تھا۔ اس نے فریادی۔ ”اوہ بھائی مینوں سونے دی۔“

شام ڈیوٹی بھی دیتی ہے۔“

”سردار جی مجھے اسپتال کا نقشہ چاہیے۔“

”کوئی ای میل ہو تو بتاؤ میں ابھی بھیج دیتا ہوں۔“ خلاف توقع اس نے فوراً مسئلہ حل کر دیا اور میں نے اسے اپنا ای میل دے دیا۔ اس نے سچ سچ دونٹ میں نقشہ ای میل کر دیا پتا نہیں اس کے پاس کہاں سے آیا تھا لیکن اس سے میرا کام بن گیا۔ میں نے سوستر نجن کو کال کی اور اس سے ایک پرنٹر مانگا۔ وہ بھی آگیا اور نقشہ پرنٹ کر لیا گیا لیپ ٹاپ کی چھوٹی اسکرین پر یہ فٹ نہیں آ رہا تھا۔ مگر کاغذ پر اب اسپتال کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے تھا۔ میں دو راستوں سے واقف تھا لیکن ایک تیسرا راستہ اسٹاف کے لیے تھا یہ براہ راست ان کے لیے مخصوص پارکنگ میں کھلتا تھا۔ یہاں سے اندر داخل ہونے کے بعد دو راستوں سے پرائیویٹ رومز تک پہنچا جاسکتا تھا۔ ایک ڈاکٹروں کے امیر یا سے گزرتا تھا اور دوسرا اسپتال کے کینے لیر یا اور میس سے گزرتا تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔

”یہ کام تو آسان ہو گیا۔“

”ہم پارکنگ والے راستے سے اندر داخل ہوں گے۔“ بانو خوش ہو گئی۔ ”سردار نے بڑا کام کیا ہے اس پر اس کا ٹھکر کی پن معاف کیا جاتا ہے۔“

میں نقشہ دیکھ رہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ ”بانو تمہارا ایک چیک آپ اور ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمہیں فضائی سفر کے لیے کسٹر کیا جائے گا۔ میرا مشورہ ہے تم چیک آپ کے لیے جاؤ میں کہیں سے ڈاکٹر کا سفید کوٹ حاصل کر کے پارکنگ والی جگہ سے اندر داخل ہوں گا اور راج کنور کو لے کر نکل جاؤں گا۔“

”اس کے لیے ایسوی لینس کرنا پڑے گی۔“

”یہاں پرائیویٹ ایسوی لینس سروس ہوگی۔ وہاں سے ایسوی لینس منگوائی جاسکتی ہے۔ وہ اسی پارکنگ میں آجائے گی۔ تم چیک آپ کراؤ گی اور جیسے ہی تم باہر جانے لگو گی میں بھی راج کنور کو لے کر نکل جاؤں گا۔“

”لیکن مجھے سنے سے جانا پڑے گا اور وہاں رامن یا اس کا آدمی ہوگا۔“

”اس عمل ہے تم ~~میں~~ جھنڈ جاؤ گی۔ اس طرح ہمیں کچھ سے کم لوگوں کو ملوث کرنا پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ ہوٹل انتظامیہ تک نہ پہنچے ورنہ وہ رانا دیاس کی نشان دہی پر مجبور ہو جائیں گے اور یہ اس کی نیکی کا اچھا صلہ نہیں ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس وقت بلاوجہ مجھے لڑکا بنا رہے تھے۔“

”اب جھینپ گیا۔“ اس وقت یہ تجویز بہترین لگی تھی۔“

”گویا اب ہمیں ایک ڈاکٹر والا کوٹ، ایک عبا یا اور ایک ایسوی لینس کا بندوبست کرنا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اچھا ہوا کہ اب ہمیں زس کے لباس کا بندوبست نہیں کرنا ہوگا ڈاکٹر بننے کے لیے ایک سفید کوٹ سے کام چل جاتا لیکن زس کے لیے تو مکمل یونیفارم درکار ہوتا۔“

”بالکل، لیکن پہلے ڈاکٹر انتھونی کو کال کر کے چیک آپ کا وقت لیتے ہیں۔“

ڈاکٹر انتھونی ڈیوٹی پر تھا اس نے کہا کہ ہم کسی بھی وقت آجائیں اس کا چیک آپ ہو جائے گا اور اس میں تقریباً دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ پھر میں نے آپریٹر سے کسی پرائیویٹ ایسوی لینس سروس کا پوچھا۔ اس نے مجھے چار

عدد دسویں کے نمبر مہیا کر دیئے۔ وہ رابطہ کر کے دے رہا تھا لیکن میں نے منع کر دیا کہ میں خود رابطہ کر لوں گا۔ اب مجھے ایک موبائل فون کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ورنہ کال کرنے کے لیے میں ہوٹل آپریٹر اور پی سی او کا محتاج ہو رہا تھا۔ جب پہلی بار انڈیا آیا تب میں نے یہاں کی بار موبائل لیے اور سبز بھی حاصل کیں لیکن اب حالات مختلف تھے اور میں زیادہ محتاط تھا۔ اس لیے خود سے موبائل اور سم لینے کے بجائے میں نے منیجر سے کہا کہ وہ میرے لیے ایک سیل فون کا بندوبست کرے لیکن اس کا تعلق ہوٹل یا مجھ سے نہ ہو۔ منیجر سمجھ گیا اور اس نے کہا کہ وہ کچھ دیر سیل فون بھجوا رہا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہوٹل کا ایک آدمی ڈبے میں بند سیل فون دے گیا۔ اس میں سم بھی تھی اور اس کا نمبر ڈبے کے اندر لکھا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہوٹل والوں نے یہ سیل فون کیسے حاصل کیا تھا۔ میرا کام ہو گیا تھا۔ میں نے ایسویٹس سرس کو کال کی اور ان میں سے ایک سرس کا انتخاب کیا کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے کے لیے ایسویٹس دینے کو تیار تھے اور ان کا سرگز بھی ہوٹل ہالیہ کے نزدیک تھا۔ ان چکروں میں شام ہو گئی تھی۔ اس لیے یہ کام آج ممکن نہیں تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ بانو کا چیک آپ کرا لیا جائے۔ ہم باہر نکلے۔ بانو کے لیے چاہایا تو آسانی سے مل گیا تھا لیکن مجھے ڈاکٹر کا کوٹ بڑی مشکل سے ملا۔ یہاں سے ایک ٹیکسی کر کے ہم اسپتال روانہ ہوئے۔ بانو نے گارمنٹ اسٹور میں ہی عبا یا پکین لیا تھا اور چہرہ نقاب سے ڈھک لیا۔ میں نے اسے اسپتال کے سامنے اتارا۔

”میں انتظار کروں گا۔“

”نہیں بہت دیر لگ سکتی ہے آپ واپس چلے جائیں میں خود آ جاؤں گی۔“ بانو نے اصرار کیا لیکن میں نے انتظار کو ترجیح دی۔ اگرچہ وہ عباے میں تھی اس کے باوجود اسپتال میں راسن اور اس کے آدمیوں کی موجودگی کے خیال سے مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ اگر بانو شناخت کر لی جاتی اور وہ اسے قبضے میں کر لیتے تو یہ ان کی بڑی کامیابی ہوتی۔ کچھ دیر بعد میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دوسروں پر دینے اور کہا۔

”تم رکو میں آتا ہوں اگر میری صاحب آئے تو اسے لے کر فوراً چلے جانا میرا انتظار مت کرنا۔“

”ٹھیک سر، پر وہ میری بات مانیں گی؟“ ٹیکسی ڈرائیور نے دہلی زبان میں کہا۔

”اسے کہنا کہ یہ فالکن نے کہا ہے۔“ میں نے کہا تو اسے تعجب ہوا تھا مگر بانو اشارے سے سمجھ جاتی کہ یہ بات فالکن یعنی شہباز یعنی میں نے کی ہے۔ میں نے ڈرائیور کو زیادہ رقم نہیں دی کہ وہ لے کر دو دو گیارہ نہ ہو جائے اور پھر ہمیں ٹیکسی کے لیے خاصا آگے جانا پڑتا۔ میں نے سڑک پار کر کے اسپتال کی دیوار کے ساتھ رکھتے ہوئے موبائل سے ڈاکٹر انھونی کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”ڈاکٹر صاحب میں شام بات کر رہا ہوں رینا آگئی ہے۔“

”لیس شی از میئر۔“ اس نے تصدیق کی۔

”تھینک یو ڈاکٹر، جب اس کا چیک آپ ہو جائے تو آپ پلیز مجھے اسی نمبر پر کال کر دیجئے گا میں اسے

لینے آ جاؤں گا۔“

”وائے ناٹ۔“ اس نے جواب دیا۔ یہ تصدیق ہو جانے کے بعد کہ بانو خیریت سے اندر پہنچ گئی ہے اصولاً مجھے شرافت سے واپس ٹیکسی کی طرف آ جانا چاہیے تھا مگر میں نے سوچا کہ جب یہاں تک آگیا ہوں تو ذرا

وہ راستہ بھی دیکھ لوں جس سے گزر کر راج کنور تک رسائی حاصل کرنی تھی اور پھر اسے نکال کر لے جاتا تھا۔ نقشے اور حقیقت میں کچھ نہ کچھ فرق تو ہوتا ہے۔ اتفاق سے کوٹ میرے پاس تھا۔ یہ شاہنگ والے شاہ پر میں تھا۔ میں گیٹ سے اندر آیا اور اس بار بائیں طرف مڑا۔ محلے کے لیے مخصوص پارکنگ اسی طرف تھی اور اس کی نشان دہی کے لیے ایک بورڈ بھی لگا ہوا تھا تاکہ عام افراد اسی طرف جانے سے گریز کریں۔ یہاں سناٹا تھا اور کسی نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں آرام سے اس دروازے تک پہنچ گیا جس سے ڈاکٹر اور دوسرا اسٹاف اندر آتا جاتا تھا۔ اس کے سامنے پارکنگ میں جگہ تھی۔ اندر جانے سے پہلے میں نے ڈاکٹر والا کوٹ پہن لیا اور اس کا شاہر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے اندر قدم رکھا۔ اس میں رسک تھا اگر کسی جان پہچان والے سے سامنا ہو جاتا اور وہ پہچان جاتا تو میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میرے لیے وضاحت مشکل ہو جاتی کہ میں ڈاکٹر جیسے کوٹ میں یہاں کیا کر رہا تھا۔ اندر سے دو زبیں اپنی ہائی ہیل کی ایڑیاں بجاتی ہوئی باہر جا رہی تھیں اور آپس میں بات کر رہی تھیں انہوں نے میری طرف توجہ نہیں دی اور برابر سے گزر گئیں۔ راہداری کے کونے پر پہنچ کر میں نے نقشہ ذہن میں تازہ کیا اس کے مطابق مجھے دائیں طرف مڑنا تھا اور پھر بائیں طرف مڑنا تو پرائیویٹ روم ایریا تک پہنچ جاتا۔ راج کنور کا کمرہ اسی جگہ تھا لیکن جیسے ہی میں دائیں طرف مڑا مجھے ڈاکٹر انتونی دکھائی دیا وہ ایک نرس سے بات کرتا اور ایک چارٹ دیکھتا اسی طرف آ رہا تھا اس سے پہلے اس کی نظر مجھ پر پڑتی میں تیزی سے واپس آیا اور جو پہلا دروازہ دکھائی دیا اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ کسی ڈاکٹر کا کمرہ تھا اور خوش قسمتی سے خالی تھا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھلا رکھا۔ ڈاکٹر انتونی نرس سے بات کرتا ہوا راہداری میں سیدھا نکل گیا تھا اس نے مڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نرس اس کے ساتھ تھی۔ ان کے جاتے ہی میں باہر نکل آیا اور دبے قدموں دائیں طرف مڑا۔ اس بار کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور میں با آسانی راج کنور کے کمرے تک پہنچ گیا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا تھا کہ میرے کانوں نے بڑے کنور کی دھیمی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”راج تم بلا وجہ شک کر رہے ہو۔ اگر تم کاغذات میرے حوالے کر دو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ ورنہ میرے لیے کیا مشکل ہے کہ تمہارے بیوی بچوں کو بلا لوں۔“

”مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔“ راج کنور نے کہا۔ ”وہ کاغذات میری زندگی کی ضمانت ہیں۔“

”نہیں ہماری زندگیوں کی ضمانت وہ اُن لکھا معاہدہ ہے جو خاندان میں آپس میں خون بہانے سے منع کرتا ہے اسی وجہ سے تم نے مجھے نہیں مارا اور میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اگر تم مجھے کاغذات دے دو تو سب پہلے کی طرح ہو جائے گا۔“

”تم مجھے معاف کر کے جاگیر کا انتظام میرے ہاتھ میں دے دو گے۔“ راج کنور نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”نہیں یہ ممکن نہیں ہے لیکن شہر کا بزنس میں تمہارے حوالے کر دوں گا اور میرا حصہ دے کر تم اس سے کما

کتے ہو۔“

”اس سے کیا ملے گا مبینے کے دس پندرہ لاکھ۔ اس میں میرا گزارا کیسے ہوگا۔“

”تم نے پہلے بھی بہت کمایا اور بچایا ہوگا۔“ بڑے کنور کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”اسے بھی برنس میں لگا سکتے ہو۔ پھر میرے بعد سب تمہیں ہی ملے گا۔“

”میں سوچوں گا۔“ راج کنور نے عیاری سے کہا۔

”تمہارے پاس کل تک کی مہلت ہے۔“ بڑے کنور نے خبردار کیا۔ ”میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے کل تمہیں یہاں سے شفٹ کیا جاسکتا ہے اگر تم کاغذات دے دو تو تمہیں پیلس نہیں جانا پڑے گا تم یہیں سے اپنے بیوی بچوں کے پاس جاسکتے ہو۔“

”میں پیلس نہیں جاؤں گا۔“ راج کنور کے لہجے میں پہلی بار خوف آیا۔ میں نے دروازہ ڈرا سا کھلا رہنے دیا تھا اور کان اندر کی طرف لگائے ہوئے تھے لیکن نظریں اس پاس مرکوز تھیں کوئی اچانک میرے سر پر آجاتا تو میں رکتے ہاتھوں پکڑا جاتا اور اگر رامن یا سنتوش آجاتا تو پھر جان بچانے کی کوشش کرنا پڑتی۔

”راج تم بے بس ہو اسے اپنے لیے آخری وارننگ سمجھو۔“

”تم مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتے۔“

”میں جانتا ہوں تم کس کے بل پر اکڑ رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ شہباز ملک تمہیں بچالے گا لیکن یہ تمہاری اور اس کی بھول ہے۔ وہ بہت جلد خود میرے پاس آئے گا۔“

”وہ کیسے؟“ راج کنور نے حیرت سے پوچھا۔ ”میرا تو خیال ہے وہ اب تک انڈیا سے نکل چکا ہوگا۔“

”بے شک وہ انڈیا سے بھی نکل جائے اس کے باوجود خود میرے پاس آئے گا۔ تم اس پر تکیہ مت کرو۔ میری پیکش کا فائدہ اٹھاؤ۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ بڑا کنور بہت پُر اعتماد لہجے میں یہ بات کہہ رہا تھا اور اس کے پیچھے کوئی چکر تھا۔ آخر میں خود کیوں اس کے پاس آنے پر مجبور ہوتا؟ ایسا میں صرف اپنے کسی ساتھی کے لیے کر سکتا تھا لیکن میرے تمام ساتھی اس کی دسترس سے باہر تھے۔ اچانک مجھے بانو کا خیال آیا۔ میں تیزی سے وہاں سے ہٹا اور دروازے کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ دو کمروں میں مجھے مریض ملے اور میں نے سوری کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ تیسرا کمرہ خالی ملا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور موبائل نکال کر ڈاکٹر انتھونی کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”لیں۔“

”ڈاکٹر! از شیام۔“ میں نے کہا۔ ”رینا کا چیک آپ کس مرحلے میں ہے؟“

”ایم آئی آر ہو رہا ہے۔“ وہ بولا۔

”ڈاکٹر! میں اس کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔“

”وائے ناٹ..... آپ آجائیں، کسی سے ایم آئی آر سیکشن کا پوچھ لینا۔“

ڈاکٹر انتھونی کی بات سے لگ رہا تھا کہ وہ فی الحال بانو سے دور تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور راج کنور کے کمرے تک آیا۔ بڑا کنور جا چکا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اکیلے یہاں تک کیسے آ گیا تھا۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ میں یہاں تھا۔ شاید اس کے محافطوں کو اندر آنے نہیں دیا گیا تھا اور اسے یہ ظاہر یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ الٹا اس کی بات نے مجھے پریشان کر دیا تھا اور میں ممکنہ خطرے کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک نرس نے مجھے ایم آئی آر سیکشن کے بارے میں بتایا اس نے پوچھا۔ ”آپ نئے آئے ہیں؟“

”نہیں میں ایک دوسرے ہاسپٹل سے وزٹ پر آیا ہوں۔“ میں نے کہا اور اس کی بتائی ہوئی ست مڑ گیا۔ یہ لیب ایکسرے کا ایریا تھا اس لیے یہاں معمول سے زیادہ سناٹا تھا۔ ایم آئی آر روم کے باہر سختی لگی تھی اور میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو نیلے یونیفارم میں ملبوس میں چینی نقوش والا اسٹینڈنٹ حیران پریشان کھڑا تھا اور اس کی پریشانی کی وجہ بھی نظر آگئی۔ وہ ٹرے جس پر لٹا کر آدمی کو ایم آئی آر مشین میں ڈالا جاتا ہے۔ وہ خالی تھی اور بانو وہاں کہیں نہیں تھی۔ میرا خدشہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے نو جوان کا گریبان پکڑ کر کھینچا اور خونخوار لہجے میں بولا۔ ”لڑکی کہاں ہے؟“

”مم..... مجھے ناہی معلوم۔“ اس نے ہکلا کر کہا۔

”بکواس مت کرو وہ یہیں تھی۔“ میں نے لہجے کو مزید خونخوار کیا۔

اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ ”وہ یہیں تھی لیکن میں ٹرے میں کر کے اسے لٹا کر میا تاکہ مشین آپریٹ کر سکوں۔ جب واپس آیا تو وہ ناہی تھی۔“

وہ نہیں ذرا کھینچ کر بول رہا تھا۔ میں اسے کھینچ کر مشین تک لے گیا۔ ”تم کہاں گئے تھے؟“

اس نے مشین کا آپریٹنگ سیکشن دکھایا۔ یہ سچ مچ ایسی جگہ تھا جہاں سے ٹرے والا حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”کوئی اندر آیا تھا؟“

”نہیں میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔“

میں پریشان ہو گیا۔ اگر بانو اپنی مرضی سے نہیں مگنی تھی تو اسے لے جانے والے نہایت ماہر تھے انہوں نے ذرا بھی آہٹ پیدا نہیں کی تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”تم نے کسی کو بتایا؟“

”میں ڈاکٹر انھونی کو کال کرنے جا رہا تھا کہ آپ آگئے۔“

”اسے کال کرو اور لڑکی کے غائب ہونے کا بتاؤ۔ میں لڑکی کا بھائی ہوں لیکن ڈاکٹر سے کہنا جب تک میں اس سے رابطہ نہ کروں کوئی کارروائی نہ کرے مطلب پولیس وغیرہ کو کال نہ کرے۔ ورنہ یہ کال خود اس کے گلے پڑ جائے گی۔ میری بات سمجھ لی ہے؟“

”جی سر۔“ نو جوان نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”اسے لفظ بہ لفظ بتا دینا اور کہنا میری کال کا انتظار کرے۔“ میں کہہ کر باہر نکل آیا۔ میں نے پتلون کی بیلٹ سے پستول نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا اور اس کا دستہ میری گرفت میں تھا۔ میرا رخ ویننگ روم کی طرف تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہاں سنٹوش یا راسن کے کسی اور آدمی کو ہوتا چاہیے تھا لیکن کسی کو بھی وہاں نہ پا کر میرے اندر خطرے کا دھمکتا احساس مزید بڑھ گیا تھا۔ یقیناً بڑا کنور میری نقل و حرکت سے باخبر تھا اور وہی بانو کو لے گیا تھا۔ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا اور اب میں خود اس کے پاس حاضر ہو جاتا۔ وہ راج کنور سے یہی کہہ رہا تھا۔ میں واپس راج کنور کے کمرے کی طرف آیا ایک خدشہ یہ تھا کہ وہ اسے بھی نہ لے گیا ہو لیکن راج کنور کو بستر پر پا کر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ میں نے جھانک کر اسے دیکھا تھا۔ اس وقت میں بہت چوکنا تھا اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر مار دھاڑ کے لیے تیار تھا۔ میں نے سامنے سے نکلنے کے بجائے اسٹاف والے دروازے کا رخ کیا اور وہاں سے نکل رہا تھا کہ ڈاکٹر انھونی کی کال آگئی۔

”مسٹر شام واٹ ازدس۔“ وہ کسی قدر تیز لہجے میں بولا۔ ”ریتا یہاں سے کہاں گئی؟“

”میں نہیں جانتا ڈاکٹر اور میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اصل میں یہاں ہمارے کچھ دشمن بھی ہیں۔ مجھے شبہ ہے وہ ریتا کو کڈنیپ کر کے لے گئے ہیں۔“

”ہا سہل سے.....؟ یہ ناممکن ہے۔“

”ڈاکٹر یہ ممکن ہو گیا ہے اور لڑکی تمہارے آدمی کے سامنے سے غائب ہوئی ہے لیکن فی الحال تم پولیس کو اطلاع نہیں دو گے۔ جب تک میں اوکے نہ کروں۔ دوسری صورت میں تم خود پولیس کے سوالوں کے جواب دیتے رہنا۔ میں اور ریتا یہاں واپس نہیں آئیں گے۔“

ڈاکٹر اتھوئی سمجھ رہا تھا کہ اس صورت میں اس کی کیا پوزیشن ہو جائے گی۔ اس نے کہا۔ ”اوکے میں پولیس کو کال نہیں کروں گا۔“

میں باہر آیا اور اسپتال سے باہر نکل کر ٹیکسی کو تلاش کیا مگر ٹیکسی وہاں نہیں تھی جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میں حیران پریشان سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ مشکل سے آدھے گھنٹے کے اندر ہی سب پلٹ کر رہ گیا تھا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں اس طرح یہاں کھڑا ہو کر دشمن کے لیے ایک آسانی اور پیدا کر رہا تھا۔ کوٹ اتارتے ہوئے میں تیز قدموں سے جانے لگا۔ میری نگاہیں آس پاس کسی ممکنہ دشمن یا مشکوک شخص کو تلاش کر رہی تھیں لیکن وہاں نہ تو کوئی مشکوک شخص دکھائی دیا تھا اور نہ کوئی جانا پہچانا دشمن۔ مگر دشمن وہاں موجود تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے بانو کو کیسے لے جاتا۔ اس کا مطلب میں شروع سے ان کی نظروں میں تھا اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ بڑے کنور اور رامن کے آدمی ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے چالاکی سے کام لیا۔ بڑا کنور جانتا تھا کہ اگر مجھے براہ راست چھیڑا گیا تو میں مرنے مارنے پر تل جاؤں گا اور اس میں مجھے نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ مرکز اس کی مشائیں تھی اسے میری جان نہیں میرا خون درکار تھا۔ اس لیے اس نے حکمت عملی سے کام لیا۔ بڑے کنور نے بانو کو قابو کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ کام ہوٹل میں ممکن نہیں تھا کیونکہ وہاں کی سیورٹی بہت سخت تھی اور وہاں کیمرے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ کام اسپتال میں ممکن تھا اور جیسے ہی بانو اسپتال آئی وہ اسے وہاں سے لے گئے۔

ایک سوال یہ تھا کہ اگر بڑا کنور کسی وجہ سے شروع سے شملہ میں میری اور بانو کی موجودگی سے واقف تھا تو اس نے پہلے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ اس کا ممکنہ جواب یہ تھا۔ شاید اس لیے کہ بانو زخمی تھی اور اسے علاج کی ضرورت تھی اگر بڑے کنور اسے پہلے اٹھوا لیتا تو اس کا علاج ادھورا رہ جاتا اور وہ مر بھی سکتی تھی اس لیے اس نے صبر سے انتظار کیا جب بانو تقریباً ٹھیک ہو گئی تو اس نے اپنا کام کر لیا۔ راج کنور کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی اس لیے اس نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ اپنے آدمیوں کو میرے ممکنہ غیض و غضب سے بچانے کے لیے انہیں اسپتال سے ہٹا لیا تھا لیکن وہ اسپتال کے آس پاس موجود تھے اور کسی نامحسوس طریقے سے راج کنور کی نگرانی بھی جاری ہو گئی ویسے وہ بستر کا قیدی تھا اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاسکتا تھا مگر اسے لے جایا تو جاسکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بڑے کنور نے اس کا بندوبست بھی کر رکھا ہو گا کہ راج کنور اسپتال سے اپنی مرضی سے نہ جاسکے۔ چلنے کے دوران میں آس پاس دیکھ رہا تھا۔ کسی نگرانی کے معاملے میں میری چھٹی حس خاموش تھی لیکن

عقل کہہ رہی تھی کہ ان حالات میں نگرانی نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک سامنے سے ایک رکشہ نمودار ہوا۔ پہاڑی شہر ہونے کی وجہ سے یہاں رکشے کم تھے مگر اکا دکا نظر آتے تھے۔ میں نے سامنے آکر اسے روکا اور اس سے پہلے رکشے والا کچھ کہتا میں اس میں سوار ہو گیا۔ ڈرائیور مقامی تھا اس نے گزرگزاتی زبان میں کچھ کہا جو میرے سر سے گزر گیا میں نے کہا۔ ”ہندی یا انگریزی بولو میں ٹورسٹ ہوں۔“

میں نے اپنی بات انگریزی میں بھی دہرائی اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ڈرائیور مناسب انگریزی میں بولا۔ ”کہاں جانا ہے سر؟“

”رئز ہوٹل کے پاس اتار دینا۔“ میں نے جواب دیا یہ ہوٹل ہمالیہ ہوٹل سے کچھ ہی دور تھا۔ شام تیزی سے اتر رہی تھی اور کچھ دیر میں رات کا تاریکی چھا جاتی۔ اس کم ہوتی روشنی میں مجھے کوئی گاڑی رکشے کے تعاقب میں نظر نہیں آئی۔ رکشہ کچھ چھوٹی گلیوں اور سڑکوں سے گزرا تھا۔ اگر کوئی تعاقب میں ہوتا تو لازمی نظروں میں آتا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ہمالیہ ہوٹل کے پاس اترا اور اب میں تذبذب میں تھا اگر دشمن پیچھے نہیں تھا تو میری تھیوری غلط تھی۔ دوسری صورت میں مجھے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر بڑا کنور بانو کو اپنے قبضے میں کر چکا تھا تو اتنی دیر میں اسے مجھ سے رابطہ کر لینا چاہیے۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کیا چارہ ہوتا۔ میں پیدل ہمالیہ ہوٹل کی طرف چل پڑا اور ایک امید کے ساتھ ریسپشن پر موجود لڑکی سے پوچھا۔ ”میری ساتھی یہاں آئی ہے؟“

”میں سر وہ کچھ دیر پہلے پہنچیں اور آپ کے لیے پیغام ہے کہ ان کی آمد سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے۔“

میں نے سکون کا طویل سانس لیا تھا کہ موبائل کی بیل بجی میں نے دیکھا۔ ہوٹل کے نمبر سے کال آرہی تھی میں لڑکی کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے بھا اور کال ریسپونسی۔ دوسری طرف بانو تھی۔ ”آپ کہاں ہیں میں وہاں سے نکل آئی ہوں۔“

”ہوٹل میں ہوں اوپر آ رہا ہوں۔“

میں نے بہت دیر بعد سکون محسوس کیا تھا میرا خیال سراسر غلط نکلا تھا اور میں خوش تھا کہ غلط نکلا۔ بڑا کنور ہماری وجہ سے نہیں بلکہ راج کنور کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔ میں اوپر آیا جہاں بانو بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی لپک کر پاس آئی۔ ”شکر ہے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ورنہ میں تو ڈر گئی تھی۔“

”وہاں کیا ہوا تھا؟“ میں نے صوفے پر گرتے ہوئے پوچھا۔ ویسے میں کسی حد تک سمجھ گیا تھا لیکن بانو کے منہ سے سننا چاہ رہا تھا۔

”میں اندر داخل ہوئی تو بڑا کنور وہاں موجود تھا اور وہ ڈاکٹر انتھونی سے بات کر رہا تھا میں سن گن لینے کے لیے وہیں رک گئی۔ بڑا کنور اپنا چیک اپ کرانے آیا تھا۔ ڈاکٹر انتھونی اسے بتا رہا تھا کہ اس کے کچھ نئے ٹیسٹ ہوں گے اور اسے دو دن بعد دوبارہ آنا ہوگا۔ پھر وہ راج کنور کے بارے میں پوچھنے لگا۔ جب بڑا کنور وہاں سے چلا گیا تو میں ڈاکٹر انتھونی کے پاس آئی۔ وہ مجھے ایم آئی آر روم میں لے آیا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر میں بڑے کنور یا اس کے کسی آدمی کی نظر میں آجاتی تو وہ آپ کو مجبور کرنے کے لیے مجھے ہر صورت قابو کرنے کی کوشش کرتے۔“

”بالکل یہی خدشہ میرے ذہن میں تھا۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”بلکہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بڑا کنور میری یہاں موجودگی سے واقف تھا اور ہماری نگرانی کر رہا تھا موقع پاتے ہی اس نے تمہیں اغوا کر لیا ہے۔ یہ سوچ کر میرا برا حال ہو گیا کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا اور میرے منصوبے سے واقف تھا۔ میں تو اس سے رابطے کا سوچ رہا تھا مگر ایک چیز سے ٹھنک گیا جب میں نے دیکھا کہ کوئی میری نگرانی نہیں کر رہا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ایک بار میں اس کی نظروں میں آ جاتا اور وہ میری نگرانی نہ کراتا۔ شکر ہے میں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔“

”انہی خدشات کی بنا پر میں نے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی انٹینڈنٹ مشین کے پیچھے گیا میں دبے قدموں اٹھی۔ اپنا عبایا اور سینڈلز اٹھائے اور وہاں سے نکل گئی۔ اتفاق سے پیچھے کا راستہ میرے ذہن میں تھا اور میں وہیں سے نکلی۔“

”اس وقت میں بڑے کنور اور راج کنور کی جاسوسی کر رہا تھا۔“

”باہر نکلی تو ٹیکسی والے نے آپ کا پیغام دیا اور جب اس نے کہا کہ یہ فالکن کا حکم ہے تو میں سمجھ گئی اور اس کے ساتھ ہوئی آگئی۔ میں نے ٹھیک کیا نا؟“

”سو فیصلہ۔“ میں نے کہا۔ ”اگرچہ تمہارا چیک آپ ادھورا رہ گیا لیکن تم محفوظ رہیں یہ زیادہ اہم ہے۔ مجھے بڑے کنور کی ایک بات نے پریشان کر دیا۔ وہ میرے لیے بے فکر ہے اس کا کہنا ہے کہ میں اس ملک سے نکل بھی جاؤں تب بھی خود اس کے پاس واپس آؤں گا اور ایسا صرف ایک صورت میں ممکن ہے۔“

”جب وہ آپ کے کسی ساتھی کو پکڑ لے۔“

”بالکل میں اسی لیے تمہاری طرف سے بہت زیادہ فکرمند ہو گیا تھا۔“

”شہباز صاحب۔“ بانو سنجیدہ ہو گئی۔ ”میری درخواست ہے اگر ایسی کوئی بات ہو تب بھی آپ خود کو بڑے کنور کے حوالے نہیں کریں گے۔ مجھے آزاد کرانے کی کوشش کریں گے لیکن ایسا نہ ہو سکے تو مجھے میری تقدیر پر چھوڑ دیجئے گا۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہر حال اللہ کا شکر ہے میرا خدشہ غلط نکلا۔“

اس نے موضوع بدل دیا۔ ”اب کیا کرتا ہے؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ کل شام کے وقت ہم یہاں سے نکلتے ہیں۔ اگر ہم سورج ڈوبنے کے بعد سرحد پار کریں تو رات کی تاریکی پر دے کا کام کرے گی اور نہچنے کا امکان بڑھ جائے گا۔“

”ہاں دن میں تو ہم آرام سے نظر میں آجائیں گے۔“ بانو بولی۔ ”لیکن سرحد کہاں سے پار کریں گے؟“

”میاں ممتاز کی زمین اور حویلی کس علاقے میں ہے؟“

”پکھیا لائیں۔“ بانو نے جواب دیا۔ ”فیروز پور سے ذرا پہلے جی ٹی روڈ سے ایک لنک روڈ پکھیا لائی طرف آتا ہے۔ ہم لاہور آمدورفت کے لیے اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔“

میں نے انٹرنیٹ پر اس علاقے کا تفصیلی نقشہ نکال کر دیکھا۔ سرحد یہاں سے تین چار کلومیٹر ز دور تھی۔ اس مقام پر دریائے راوی کچھ زیادہ ہی بل کھا رہا تھا اور کبھی ایک ملک کی حد میں جا رہا تھا تو کبھی دوسرے ملک کی حد میں گھس رہا تھا۔ بعض مقامات پر بیک وقت دونوں ملکوں میں بہہ رہا تھا۔ اگرچہ اب راوی بہتا نہیں ہے۔ مگر

سیلاب کے دنوں میں جب انڈیا پانی کھولتا ہے تو یہ اپنے پرانے دنوں کی جھلک دکھاتا ہے۔ مگر عام دنوں میں راوی خشک اور ضعیف رہتا ہے۔ اب تو اس میں باقاعدہ مچی آبادیاں بن گئی ہیں۔ بانو نے انگلی سے رکھ کر بتایا۔ ”یہاں کئی جگہوں پر زمین بہت نشیبی ہے اور سیلاب کے وقت پانی تلے آ جاتی ہے۔“

میرا اندازہ تھا کہ یہیں وہ رخنہ تھا جو ہمارے ریڈار کی نظروں سے اوجھل تھا اور جس سے فائدہ اٹھا کر راج کنور ہیلی کاپٹر میں میاں ممتاز کے پاس آتا تھا۔ انڈیا کی طرف سے اسے چھوٹ تھی کیونکہ وہ ان کی خدمت انجام دیتا تھا اور اپنا کام بھی نکالتا تھا۔ کسی ہیلی کاپٹر کے لیے یہ تین چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا ایک ڈیڑھ منٹ سے زیادہ کا کام نہیں تھا۔ اگر ایئر ڈیفنس سسٹم ہیلی کاپٹر کا سراغ لگا بھی لیتا تو یہ وقت کارروائی کے لیے کم تھا۔ راج کنور کہاں سے سرحد پار کرتا تھا یہ بات وہی جانتا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ امکان تھا کہ امرتسرنگھ ڈیوٹی پر آگیا ہو گا لیکن میں نے پہلے ڈاکٹر انتھونی کو کال کی۔ ”ڈاکٹر پولیس کو کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ریٹا واپس آگئی ہے۔ اس نے بھی دشمنوں کو دیکھ لیا تھا اور اسپتال میں کسی ممکنہ گڑبڑ کے خیال سے وہاں سے نکل آئی۔“

ڈاکٹر انتھونی نے سکون کا سانس لیا۔ ”جھینکس گاڈ۔“

”میں پھر اسے چیک آپ کے لیے لاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بھول جائیں کہ ریٹا آج چیک آپ کے لیے آئی تھی۔“

”آئی سی اٹ۔“ وہ بولا۔

”تھینک یو ڈاکٹر۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس بار امرتسرنگھ کا نمبر ملایا۔

”ہیلو جی۔“

”ڈاکٹر میں بات کر رہا ہوں۔ میں مریض سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی ذرا مشکل ہے میں موقع دیکھ کر کرتا ہوں۔“

”مجھے اسی نمبر پر کال کرنا۔“

میں نے موبائل رکھا تو بانو نے پوچھا۔ ”آپ راج کنور سے کیا بات کریں گے؟“

”اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں اس سے اس راستے کے بارے میں پوچھوں گا جس سے گزربکر وہ سرحد پار کرتا ہے تو تم غلطی پر ہو میں اس سے بڑے کنور کی آمد کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں اور ہمارے کل کے پلان پر عمل کے لیے کچھ معلومات چاہتا ہوں۔“

بانو نے سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے فون پر اس قسم کی گفتگو بہت خطرناک ہو سکتی ہے۔“

”تم فکر نہ کرو میں محتاط ہوں۔“ میں نے اسکاٹپ آن کیا۔ ”ابھی کھانے کا موڈ نہیں ہے ایسا کرو جائے گا

کہہ دو۔“

”لیکن مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”تب تم اپنے لیے کھانا منگوالو اور میرے لیے چائے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”تب میں کھانا اپنے کمرے میں کھا لیتی ہوں۔“ بانو نے جاتے ہوئے کہا۔ میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا اور

رابطہ ہوتے ہی کہا۔

”عبداللہ..... اسکاپ پر آؤ۔“

”میں باہر ہوں، وسیم سے کہتا ہوں وہ آجائے گا اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو میں بھی دس منٹ میں پہنچ سکتا ہوں۔“

”سب سے بات کرنی ہے اس لیے تم بھی جتنی جلدی ہو سکے پہنچ جاؤ۔ میں اسکاپ پر ہوں۔“

”میں آ رہا ہوں۔“

چند منٹ بعد وسیم اسکاپ پر آ گیا اور اسی اثنا میں چائے بھی آ گئی۔ ویٹر کو رخصت کر کے میں واپس آیا۔ وسیم کے ساتھ سفیر بھی تھا۔ ابھی عبداللہ کے آنے میں وقت تھا اس لیے میں ان سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتا رہا حالانکہ سفیر نے مجھے بہت اکسایا کہ میں اصل بات کروں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ”سب کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں اگر کوئی اور لپ ٹاپ ہے تو وہ بھی لے آؤ اگر نہیں ہے تو اس سے بھی کام چل سکتا ہے۔“

”دوسرا نہیں ہے۔“ سفیر نے آگاہ کیا۔ ”تم نے نادر کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں۔“

”بس یار ان دشمنوں نے اس طرح گھیر رکھا ہے کہ پرانے دشمن ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ اس کا کیا حال ہے؟“

”بہتر ہو گیا ہے۔“ وسیم نے بتایا۔ ”جب سے اسے پتا چلا ہے کہ ہم اسے مرشد کے حوالے کرنے والے ہیں اس کی ہوا خراب ہے اور وہ ہماری منت سماجت کرتا ہے کہ ایسا کرنے سے گریز کریں۔ مگر وہ پہلے کے مقابلے میں سنبھل گیا ہے۔“

”مرشد کی طرف سے کوئی رد عمل ہوا ہے؟“

”وہ مدیم سے رابطے میں ہے۔“ سفیر بولا۔ ”کل تیرے کیمز کے بارے میں اہم پیشی ہے۔ پولیس کیس واپس لینے کی درخواست کرے گی۔“

میں خوش ہو گیا۔ ”یہ بہت اہم پیش رفت ہے۔ تم لوگوں نے بتایا نہیں۔“

”بیٹے زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے اصل مسئلہ مرشد ہے۔ ایک بار نادر اس کے ہاتھ آ گیا تو وہ نئے کیس بنا سکتا ہے اور خود کو بری الذمہ بھی قرار دوا سکتا ہے۔“

”ایک بار تو ان کیسز سے جان چموتے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنی ہی سرزمین پر آزادی سے نہیں گھوم سکتا۔ مرشد کو دوبارہ دیکھ لیں گے لیکن میرا خیال ہے وہ دوبارہ مشکل سے پنگا کرے گا۔“

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے تو وہ کتے کی ذم گلتا ہے اتنی آسانی سے سیدھی نہیں ہوتی۔“

وسیم کا بھی یہی خیال تھا۔ اسی اثنا میں عبداللہ آ گیا۔ ”جی شہباز صاحب.....“

”میں کچھ بتا رہا ہوں تم لوگوں نے درمیان میں سوال نہیں کرتا ہے جب میں اپنی بات مکمل کر لوں تو پھر

جو چاہے پوچھنا۔“

”مجھے ایک بات پوچھنی ہے۔“ حسب توقع سفیر نے ٹانگ اڑائی۔

”پوچھو۔“

”کیا تمہارے ساتھ وہ گل بانو بھی آئے گی؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”اس نے تمہارے بارے میں بالکل درست کہا تھا؟“

”کیا..... کیا کہا تھا اس نے؟“ سفیر چمک کر بولا۔

”یہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا ویسے تم اپنے سوال پر غور کرو تو شاید اس کا جواب مل جائے۔“

وسیم اور عبداللہ ہنس رہے تھے۔ سفیر نے بھنا کر کہا۔ ”تم لوگ کس خوشی میں دانت نکال رہے ہو؟“

”شکر کرو ابھی بیٹو نہیں ہے، ورنہ تمہارا صبح سے ریکارڈ لگتا۔“

وسیم کی بات پر میں نے کہا۔ ”وہ تو بعد میں بھی لگ سکتا ہے واپس آ کر میری بیٹو اور مونا دونوں سے ملاقات ہوگی۔“

”تم تو بلیک میلنگ پر اتر آئے ہو۔“ سفیر گھبرا کر بولا۔

”شہباز صاحب۔“ وسیم بنجیدہ ہو گیا۔ ”میرا خیال ہے آپ دیر کر رہے ہیں آپ کو فوراً وہاں سے نکل آنا

چاہیے۔“

”میں تم سے متفق ہوں اور اسی لیے تم سب سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو

کل میں اور بانو تمہارے پاس ہوں گے۔“

وہ چونکے عبداللہ نے بے تابلی سے کہا۔ ”وہ کیسے؟“

میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا شروع کیا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کس طرح ہم دو گھنٹے سے بھی

پہلے پاکستان پہنچ سکتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو وسیم نے کہا۔ ”شہباز صاحب یہ

بہت خطرناک ہو سکتا ہے دونوں طرف میں سے کسی بھی طرف سے فائر کیا جانے والا ایک میزائل ہیلی کاپٹر تباہ کر

سکتا ہے۔“

”یہ تو ہے لیکن اس کا امکان بہت کم ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”اول تو میرے ساتھ راج کنور ہوگا اور وہ

انڈین حکام سے راہداری لے سکتا ہے۔ پھر دوسری طرف پالیسی اتنی سخت نہیں ہے۔ پہلے وارننگ دی جاتی ہے

اور اگر سرحدی خلاف ورزی کرنے والا واپس نہ جائے تو ایئر ڈیفنس سسٹم حرکت میں آتا ہے لیکن ان سارے

کاموں میں کچھ وقت لگتا ہے اور مجھے امید ہے اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر کم سے کم ہمیں ڈراپ کر دے گا اس کے بعد

وہ واپس جاتا ہے۔ پکڑا جاتا ہے یا گرا لیا جاتا ہے یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے ہمارے سرحدی محافظوں

کو چتا ہی نہ چلے۔“

”وہ کیسے؟“

”راج کنور کا کہنا ہے کہ اس طرف کچھ ایسا رخ نہ ہے جہاں ریڈار نیچے پرواز کرنے والے ہیلی کاپٹر کو ٹریس

نہیں کر سکتا ہے۔ دوسرے سرحد پار کرنے کے دو سے تین منٹ کے اندر میں اس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں تم لوگ

میرے منتظر ہو گے۔“

”یہ جگہ کہاں ہے؟“ عبداللہ نے سوال کیا۔

”تم نیٹ سے واہمہ بارڈر کا نقشہ نکالو۔“

عبداللہ نے نقشہ نکالا۔ ”نکال لیا۔“

میں نے نشان دہی کی۔ ”اس پر دیکھو اوپر پاکستان میں پکھیلایا ہے۔ میاں ممتاز کی جاگیر اسی علاقے میں ہے۔“

”یہ بھی دیکھ لیا۔“

”اس کے اوپر نارنگ منڈی سے آنے والی سڑک چکیاں روڈ سے مل رہی ہے۔“

”بالکل۔“ وسیم بولا کیونکہ انہوں نے ویب پیج کھولا ہوا تھا اس لیے ان کی تصویر نہیں آرہی تھی اور نہ میری تصویر ان کو دکھائی دے رہی تھی البتہ ہم ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے۔

”تم لوگ نارنگ منڈی سے آنے والی سڑک کراس کر کے چکیاں روڈ پر تقریباً ایک کلومیٹر آگے اٹھایا کی طرف آ کر ہمارا انتظار کرو گے۔ یہاں یہ سڑک مقبول پور روڈ کہلاتی ہے۔“

”میں سمجھ گیا جناب۔“ وسیم نے کہا۔ ”ایک زمانے میں، میں یہاں بہت گھوما پھرا ہوں۔ دریائے راوی میں سردیوں کے دنوں میں پرندے آتے تھے میں ان کا شکار کرنے جاتا تھا یہاں دریا کسی قدر چوڑا اور گہرا ہے اور سردیوں میں بھی یہاں پانی ہوتا ہے۔“

”بالکل نقشہ پر یہ سڑک موجود ہے لیکن اس کی اصل صورت حال کیا ہے یہ تم لوگ بتاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں تم کل صبح روانہ ہو جاؤ اور اسی علاقے میں موجود رہو۔ وہاں کی صورت حال سے مجھے آگاہ کرو۔ ہمارے اترتے ہی ہمیں بہت تیزی سے اس علاقے سے نکل جانا ہوگا کیونکہ سیورٹی والوں کی آمد متوقع ہوگی میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”بالکل، آپ کہیں تو ہم ابھی روانہ ہو جاتے ہیں۔“

”نہیں کل صبح نکل کر بھی تم لوگ ڈھائی تین گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے ہو۔ ابھی تم غور کرو کہ تم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔ مجھے ایک خیال آرہا ہے آج کل جی پی ایس عام ہو گیا۔ تم وہاں پہنچ کر کوئی مناسب پوزیشن تلاش کر کے اس کی جی پی ایس لوکیشن بتانا۔ ہیلی کاپٹر ٹھیک وہیں پہنچ جائے گا اور ہمیں بھگتنا نہیں پڑے گا امکان ہے کہ ہمیں اتار تے ہی ہیلی کاپٹر واپس چلا جائے گا۔“

”راج کنور سمیت۔“ وسیم نے معنی خیز سوال کیا۔

”ابھی اس بارے میں سوچا نہیں ہے۔“

”تو سوچ لیں۔“ وسیم نے اصرار کیا۔ ”اسے بھی یہیں اتار لیں گے اور پھر کسی مناسب جگہ ٹھکانے لگا کر ہمیشہ کے لیے زمین میں دبا دیں گے۔“

”میرا خیال ہے اس کا فیصلہ وہاں پہنچ کر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تم ایک بات بھول رہے ہو وہ سعدیہ کا بھائی ہے اور ہمیں اس بات کا خیال بھی رکھنا ہے۔“

”اسے اپنی بہن کا کوئی خیال نہیں ہوگا۔“ وسیم نے تعجب سے کہا۔ ”اسے پتا چل جائے کہ وہ ہمارے ساتھ ہے اور مسلمان ہو چکی ہے تو وہ اس کا بھی دشمن بن جائے گا۔“

”اس میں اور ہم میں فرق ہے یار۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اپنا منصوبہ بتا دیا ہے آگے اب تم لوگوں نے

پلان کرنا ہے کہ کس طرح یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔“

بیٹو آگیا تھا اس نے پوچھا۔ ”کون سا کام شوہنی بھائی؟“

”تمہاری شادی کا۔“ سفیر نے جواب دیا۔ ”کامی تو اب ایک سپر پاور ملک کی شہری بن چکی ہے اور وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالے گی۔ اس لیے شوہنی نے تمہارے لیے ایک لوکل دہن تلاش کی ہے اسے ساتھ لارہا ہے۔“

”شوہنی ج؟“ بیٹو نے لپے پٹینی سے کہا۔

”تم بھی کس کی باتوں میں آرہے ہو۔“ میں ہنسا۔

”ہم کو پہلے ہی شک تھا یہ سفیر بھائی اتنا اچھا کب سے ہو گیا کہ ہمارا شادی کا بات کرے یہ تو خود دوسری

شادی کا فکر میں رہتا ہے۔“

”اوہ میرے دشمن سالے کیوں مونا کو بیوہ کرنا چاہ رہا ہے۔“ سفیر بلبلاتا رہا تھا

”وہ بھی مونا کے اپنے ہاتھوں۔“ میں نے لقمہ دیا۔ ”جھوٹ کی ابتدا تو تم کی تھی۔“

”پر ہم جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ یہ سفیر بھائی ٹی وی پر آنے والی عورتوں کو بہت غور سے دیکھتا ہے۔“

سفیر بھنا گیا۔ ”اس کا مطلب ہے میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”اگر نہیں کرنا چاہتا تو کیوں دیکھتا ہے؟“ بیٹو نے دوسرا سوال کیا۔

”اب بولو پیٹے تمہیں بہت شوق ہے نا سوال کرنے کا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے بیٹو مزہ تو جب آئے گا جب

مونا کے سامنے یہ سوال کیے جائیں۔“

”میں مکر جاؤں گا کہ میں ٹی وی ہی نہیں دیکھتا۔“

”مونا دیدی ہمارا بات کا یقین کرے گا۔“ بیٹو نے دعویٰ کیا۔ ”وہ جانتا ہے ہم جھوٹ نہیں بولتا۔“

”بیٹے بات یہ نہیں ہے۔“ سفیر نے سرد آہ بھری۔ ”بیوی اپنے شوہر کے سوا ہر ایرے غیرے کی بات کا

یقین کرتی ہے۔“

”بشرطیکہ شوہر تیرے جیسا ہو۔“ میں نے لقمہ دیا جس پر سفیر نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا۔

”میرا خیال ہے یہاں کوئی کام کی بات نہیں ہوگی۔“ وسیم نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے

کہیں چل کر ڈسکس کرتے ہیں۔“

”میں بھی چل رہا ہوں۔“ سفیر ان کے پیچھے لپکا۔

ان کے جاتے ہی بیٹو نے لیپ ٹاپ سنبھال لیا۔ ”شوہنی ہم آپ کے بغیر بہت ادا اس ہے۔“

پہلی بار بیٹو سے کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ ”مجھے بھی تمہارا بہت خیال آتا تھا۔“ مجھے فکر تھی کہ میاں

ممتاز تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کرے۔“

”ہم اس کے ساتھ برا سلوک کرتا مگر ہم کو وسیم بھائی نے روک دیا۔ ان کو عبداللہ بھائی نے روکا تھا۔“

”تم وہاں سے فرار کیسے ہوئے؟“

”ایک بار ہنگامہ کیا تو ہم کو مارا تھا اور کمرے میں بند کر دیا تھا ہم شرافت سے مار کھاتا رہا اور روتا رہا۔ اس

پر وہ سمجھا کہ ہم شریف ہے۔ پھر ایک دن ہم کو موقع ملا اور ہم دو آدمیوں کو لٹا کر وہاں سے نکل گیا۔“

مجھے ہنسی آگئی۔ ”تو تم شریف نہیں ہو؟“

”سفیر بھائی کی طرح نہیں۔“ بیٹو نے دانت نکالے۔ ”یہ بانو دیدی کیسا ہے؟“

”بہت اچھی اور پُر غلوں لڑکی ہے۔ اس انجینی جگہ اس نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہے یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔“

”پھر وہ اچھا ہوگا۔“ بیٹو نے فیصلہ دیا۔ ”شوبی جس کو آپ اچھا بولو وہ ضرور اچھا ہوتا ہے۔“

کچھ دیر بیٹو سے بات ہوتی رہی۔ اس نے مجھ سے منوالیا کہ وہ بھی اس پارٹی کا حصہ ہوگا جو مجھے ریسیو کرنے آئے گی۔ اب مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے کھانے کا کہہ دیا اور کھانا آنے تک بیٹو سے بات جاری رکھی۔ اس دوران میں بانو آگئی۔ لیپ ٹاپ اس کے حوالے کر کے میں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ بانو بھی بیٹو سے بات کر کے خوش ہوئی تھی دونوں میں ایک قدر مشترک نکل آئی تھی کہ دونوں سفیر سے خار کھاتے تھے۔ بیٹو کا معاملہ شروع سے تھا اور اب بانو بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ میں ان کی باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ ادھر میں نے کھانا ختم کیا اور ادھر سردار جی کی کال آگئی۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ ”شیام جی، جلدی بات کر لو ادھر بندہ نہیں ہے ورنہ وہ منٹ منٹ پر آکر جھانک رہا تھا۔ ابھی کہیں باہر دفع ہوا ہے۔“

چند لمحوں بعد راج کنور کی آواز آئی۔ ”شہباز..... کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”ڈاکٹر ہے یا جا چکا ہے؟“

”فکرمات کرو میں اس کے سامنے تمہارا نام نہیں لے رہا وہ باہر ہے۔“

”بڑا کنور تمہارے پاس کیوں آیا تھا۔“

وہ حیران ہوا۔ ”تم جانتے ہو، اس کا مطلب ہے تم میری نگرانی کر رہے ہو؟“

”کیا مجھے نہیں کرنی چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”رامن کا کیا حال ہے؟“

”وہ پاگل ہو رہا تھا اگر اسے بڑے کنور کا خوف نہ ہوتا تو وہ مجھے بھی نہ چھوڑتا۔ وہ مجھ سے تمہارے بارے

میں پوچھ رہا تھا۔“

”تم نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے صاف منع کر دیا کہ مجھے تمہارے بارے میں نہیں معلوم ہے اور نہ تم میرے پاس آئے تھے۔“

”اب رامن کہاں ہے؟“

”وہ اکثر یہیں ہوتا ہے اور کبھی کبھی کہیں چلا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جب تک ہوتا ہے ہر دس منٹ بعد میرے

کمرے میں آکر جھانکتا ہے۔“

”اس کے علاوہ کون ہے؟“

”سنٹوش نامی ایک شخص ہے اور ایک پائل نامی بندہ ہے۔ مگر وہ کم ہوتا ہے۔“

”تمہاری کنڈیشن کیسی ہے؟“

”آج میرا ایم آئی آر ہوا۔ اس میں گھٹنے کی پوزیشن صحیح ہے اور بازو کی ہڈی بھی سیٹ ہو گئی ہے۔ اب

مجھے گمر شفٹ کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن تمہیں جہاں شفٹ کیا جائے گا وہ مگر نہیں ہوگا۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں میں مجبور ہوں۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔

”تم نے میری آفر کے بارے میں سوچا۔“

”میں کیسے تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

”تم اس پوائنٹ سے واقف ہو جہاں سے ہیلی کاپٹر سرحد پار کرتا ہے۔“

”ہاں لیکن اس کے لیے میرا ہیلی کاپٹر میں ہونا ضروری ہے۔“

”اگر میں تمہیں لے جاؤں تو.....“

”میں کسی صورت نہیں جاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں نہیں معلوم ہے اس سہولت کا غلط استعمال مجھے کن

مشکلات میں پھنسا سکتا ہے۔“

میں نے دل میں کہا۔ بیٹے تمہیں جانا تو پڑے گا۔ چاہے تم کتنی بڑی مشکل میں کیوں نہ پھنس جاؤ۔ ”راج

کیا اس بات کا امکان ہے کہ کل تمہیں ڈسچارج کر دیا جائے۔“

”نہیں۔“ وہ دھمے لہجے میں بولا۔ ”ڈاکٹر کا کہنا ہے کل میرے ایک زخم کے ٹانگے کٹیں گے اور پھر مجھے

ڈسچارج کیا جائے گا۔“

”راج کنور میری پیشکش پر غور کرنا اگر تمہیں اس مشکل صورت حال سے کوئی نکال سکتا ہے تو وہ میں

ہوں۔ تم غور کرو بڑے کنور کو میں ہر صورت زندہ سلامت درکار ہوں اور وہ میری بات ماننے پر مجبور تھا اس لیے

مجھے اس کی طرف سے جان کا خطرہ نہیں ہے لیکن وہ تمہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ اگر تم ایک بار پیلس واپس پہنچ گئے تو

پھر تم کا غذات بھی دو گے اور اپنی جان بھی۔ اگر بڑے کنور نے تمہیں معاف بھی کر دیا تو ہمیشہ کے لیے کسی قید

خانے میں ڈال دے گا جہاں سے تم اس کے جیتے جی نہیں نکل سکو گے۔ وہ تمہیں معاف نہیں کرے گا۔“

”میں جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ راسن میرے خون کا پیاسا ہے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن میں تمہارا ساتھ نہیں

دے سکتا۔“

اتنے میں ڈاکٹر امرتسر واپس آ گیا اس نے راج کنور سے کہتے ہوئے سو بائیل چھین لیا۔ ”وہ مصیبت آگئی

ہے۔“

اس نے کال کاٹ دی تھی۔ بانو بیٹو سے بات کر رہی تھی پھر اس نے برا سامنہ بنایا اور لیپ ٹاپ کی

اسکرین نیچے کر دی۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ صاحب آگئے ہیں۔“ بانو جیسی آواز میں بولی۔ ”بیٹو کی باتیں سن لی تھیں اور اب دونوں میں جھگڑا

ہورہا ہے۔“

”بیٹو میرا بہت پیارا اور معصوم ساتھی ہے۔ وہ راج کنور کے علاقے کا رہنے والا قبائلی ہے اس کا پورا قبیلہ

ان لوگوں کی ہوس کی جھینٹ چڑھ گیا۔ ان کا قتل عام ہوا اور انہیں علاقے سے نکال دیا گیا۔ بہت کم لوگ زندہ

بچے تھے۔“

بانو نے سر ہلایا۔ ”مجھے بیٹو نے بتایا ہے۔“

”جب سے وہ ہمارے ساتھ ہے۔ درحقیقت ہم میں سے اکثر ایسے ہی دکی اور زمانے کے ستائے لوگ ہیں۔ سعدی کے بارے میں تمہیں معلوم ہوگا۔ پھر وہیم ہے۔ میرا ایک ساتھی ایاز ہے اس کی بیوی شاہین بھی ہمیں اسی طرح ملی تھی۔ سفیر اور مونا شروع سے میرے دوست تھے لیکن وہ بھی دشمنی کی لپیٹ میں آ گئے۔ اب ہم ایک خاندان کی طرح ہیں۔ ہم میں عبداللہ ہے، مانی ہے اور ایک لڑکی شازیہ بھی ہے۔“

”آپ مجھے بھول رہے ہیں۔“ بانو نے یاد دلایا۔

”میں بھولا نہیں ہوں لیکن میں نے کسی کو بھی اپنے ساتھ شامل ہونے کو نہیں کہا۔ بلکہ میری کوشش تھی کہ میرے ساتھی اس دلدل سے نکل جائیں اور میں حالات کا تنہا سامنا کروں۔ مگر مجھ سے پیار کرنے والے مجھے اکیلا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں انہوں نے ہر مشکل میں میرا مجھ سے زیادہ ساتھ دیا اور کسی موقع پیچھے نہیں ہٹے۔ ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے زیادہ مشکلات برداشت کیں اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ وہ خطرے سے دور رہیں۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ مشکلات کا سامنا کرنا چاہتی ہوں۔“ بانو نے پہلی بار مکمل کر کہا۔ ”آپ نے جس طرح مجھ بے سہارا لڑکی کو سہارا دیا اور پھر اس قابل بنایا کہ میں اکیلے بھی دشمنوں سے مقابلہ کر سکوں۔ میں یہ احسان کس طرح بھول سکتی ہوں لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اب بھی واپس جا کر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہتی تھی۔“

”اور اب؟“

”اب میں خود کو آپ کے اس خاندان کا ایک حصہ تصور کرتی ہوں اور کوئی اپنے خاندان سے الگ نہیں ہو سکتا ہے۔“

”اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو ہم تمہیں خوش آمدید کہیں گے لیکن بانو ایک بار پھر غور.....“

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ”قطع کلائی معاف، انسان غور وہاں کرتا ہے جہاں اس کے پاس چو اُس ہو اور میرے پاس کوئی دوسری چو اُس نہیں ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے۔ اب میرا کل کا پلان سنو، لیکن ایک منٹ.....“ میں لیپ ٹاپ تک آیا۔ وہاں سفر اور بیٹو آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان کی لڑائی زبانی کلائی ہوتی ہے۔ ابھی ایک منٹ بعد وہ دونوں کہیں بیٹھے ہنس بول رہے ہوں گے۔ میں نے سفیر کو بلایا۔ ”مجھے کل صبح تک تم لوگوں کی طرف سے فائل پلان چاہیے اور دوپہر ایک بجے تک لوکیشن جہاں ہمیں آنا ہے۔“

”تم فکر مت کرو۔ میں اور وہیم صبح سویرے نکل جائیں گے۔ ہمارے ساتھ دو افراد اور ہوں گے۔ بیٹو اور عبداللہ ایک کھنڈے بعد آئیں گے۔ یعنی دو گاڑیاں اور چھ افراد ہوں گے ساز و سامان ہر قسم کا ہوگا۔“

”یہ ضروری ہے بلکہ گاڑیاں تین کر لو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ایاز کہاں ہے؟“

”بھگوال میں لیکن وہ آ سکتا ہے۔“

”بس تو اسے بلالو۔ وہ تیسری گاڑی میں ہوگا۔ بلکہ ایاز کرو وہیم اور عبداللہ کو بھی بلالو میرے ذہن میں

ایک پلان آیا ہے۔“

”وہ دونوں کچھ دیر میں سامنے تھے۔ وسیم نے کہا۔ ”آپ نے کیا سوچا ہے۔“
 ”پک آپ پوائنٹ تک ایک گاڑی آئے گی۔ اس میں تم اور عبد اللہ ہو گے۔“
 ”ہم بھی ہوگا۔“ بیٹو نے مداخلت کی۔
 ”اوکے بیٹو بھی ہوگا لیکن پھر گاڑی بڑی رکھنا کیونکہ تین افراد ہم بھی ہوں گے۔“
 ”باقی دو گاڑیاں کہاں ہوں گی۔“

”وہ نارنگ منڈی روڈ اور چکیاں روڈ کی کراسنگ پر ہوں گی۔ جیسے ہی ہم وہاں پہنچیں گے۔ افراد ان دو گاڑیوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور یہ سب الگ الگ سمتوں میں روانہ ہوں گی۔ نارنگ منڈی جانے والی گاڑی گھوم کر جی ٹی روڈ پر آئے گی اور گوجرانوالہ پہنچے گی۔ باقی دو گاڑیاں بھی اپنے روٹس سے گوجرانوالہ پہنچیں گی اور وہاں سے ہم آگے روانہ ہوں گے۔ کیا خیال ہے؟“

”بہترین تقریباً یہی ہم نے سوچا ہے فرق صرف تین گاڑیوں کا ہے۔ ہم نے دو گاڑیوں کا سوچا تھا۔“
 ”معاہدہ حساس ہے اس لیے امکان ہے کہ مقامی دفاعی اداروں کی طرف سے ہماری تلاش شروع ہو جائے گی۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ احتیاط بہتر ہوگی ہم تین افراد جو باہر سے آئیں گے وہ الگ الگ گاڑیوں میں سفر کریں گے۔“

”اس صورت میں بہتر ہے کہ کم سے کم افراد ہوں اور اسلحہ بھی خطرناک والا نہ ہو۔“ عبد اللہ نے کہا۔
 ”میرے ذہن میں ایک تجویز اور آ رہی ہے۔ اگر ہم پنجاب پولیس کی وردی حاصل کر لیں۔“
 ”اگر اصلی پولیس سے ٹاکرا ہو گیا۔“

”تو کیا جب تک شک والی بات نہیں ہوگی کوئی ہم سے نہیں پوچھے گا۔“
 ”اگر وردی آسانی سے مل سکتی ہے تو ٹھیک ہے لیکن ساتھ ہی ایسا بندوبست بھی کرنا کہ موقع ملے ہی وردیوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔“

”یہ تو آسان ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”ہم لباس پر ہی وردی پہن لیں گے اور جہاں اتارنی ہوگی ایک منٹ میں اتار دیں گے۔“

مزید نصف گھنٹے تک پروگرام کی نوک پلک درست ہوتی رہی۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کیا میں نے اپنا موبائل نمبر دے دیا لیکن ساتھ ہی کہا کہ اس پر صرف اشد ضرورت کے تحت ہی رابطہ کیا جائے۔ بانو خاموشی سے سن رہی تھی۔ جب لیپ ٹاپ بند کیا تو اس نے کہا۔ ”آپ مجھے کچھ بتانے جا رہے تھے؟“

”بانو کل ہمارے لیے بہت اہم دن ہے۔ اس کا امکان ہے اور مجھے اللہ کی ذات سے پوری امید ہے کہ کل ہم شام تک سرحد پار کر کے جا چکے ہوں گے لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اس طرف یا دوسری طرف اجل کا شکار ہو جائیں اور ہمارے جسم ہیلی کاپٹر میں جل کر خاکستر ہو جائیں۔“
 بانو نے جھرجھری لی۔ ”اللہ نہ کرے۔“

”امید تو یہی ہے لیکن ہر صورت کے لیے تیار ہو کر جانا ہوگا۔ اس سے پہلے ہمیں اسپتال سے راج کنور کو انوا کرنا ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“

”میں ایبوسینس لے کر اسپتال جاؤں گا اور ڈاکٹر بن کر راج کنور کو نکال لاؤں گا۔“
 ”اس کے بعد؟“

”اس کے بعد ہم ایئر کلب کا رخ کریں گے جہاں ہیلی کاپٹر موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم ایسے وقت سرحد پار کریں جب تاریکی تقریباً چھانے والی ہو۔ ہلکی روشنی میں ہیلی کاپٹر آرام سے اتر سکے گا اور اس کے بعد تاریکی ہو جائے گی اور اس میں ہماری تلاش آسان کام نہیں ہوگا۔“

بالو نے حساب لگایا۔ ”آج کل سورج سوا سات بجے تک غروب ہو رہا ہے۔ اگر ہم یہاں سے ساڑھے پانچ بجے نکلیں تو ہیلی کاپٹر سرحد تک کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر سکتا ہے۔“

”ہاں ہم ریڈار سے بچنے کے لیے نیچی پرواز کریں گے اس لیے رفتار زیادہ نہیں ہوگی۔ پھر ہم پائلٹ کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس طرح چلے کہ ہم سوا سات بجے کے بعد سرحد عبور کریں۔ میرا خیال ہے فاصلہ دو سو میل بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور تصدیق کے لیے انٹرنیٹ پر نقشہ نکال کر دیکھا۔ واقعی فاصلہ تقریباً دو سو میل بن رہا تھا۔ بالو نے نکتہ اٹھایا۔

”ایئر کلب پہنچ کر ایبوسینس ڈرائیور کے ساتھ کیا کرنا ہے؟“

”کچھ نہیں وہ بھلا کیوں سوچے گا کہ ہم کوئی غلط کام کر رہے ہیں۔“

”جب ہم پائلٹ کو مجبور کریں گے تب تو وہ سوچے گا؟“

”ہم پائلٹ کو اس وقت مجبور کریں گے جب وہ پرواز کر جائے گا اور زمین پر موجود ایبوسینس ڈرائیور کو کیسے پتا چلے گا۔“ میں نے کہا تو بالو قائل نظر آنے لگی۔ پھر اس نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔

”جب ہم راج کو زبردستی لے جائیں گے تو وہ ہنگامہ نہیں کرے گا؟“

”امید تو ہے کہ نہیں کرے گا۔“

”فرض کریں کہ اس نے کیا تو؟“

بالو کے سوال نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے ہنگامہ آرائی یا مزاحمت سے باز رکھنا ضروری تھا۔ میں نے ڈاکٹر امرتسر کو کال کی اور اس سے کسی ایسی دوا کا پوچھا جسے کسی کو دیا جائے تو یہ ظاہر وہ ہوش میں ہو لیکن اس کا ذہن سو جائے اور وہ فرمانبرداری سے دوسرے کی مرضی پر چلے۔ پہلے تو امرتسر نگھ نے غیر متعلقہ سوالات کیے کہ کیوں چاہیے اور کس کے لیے چاہیے لیکن جب میں نے اسے یاد دلایا کہ میں نے اسے پچاس ہزار سوالات کرنے کے لیے نہیں دیئے ہیں تو وہ راہ راست پر آ گیا اور اس نے مجھے ایسی چند دواؤں کے نام بتائے۔ یہ سب انجکشن کی صورت میں ملتی ہیں میں نے پوچھا۔ ”میڈیکل اسٹورز پر مل جائیں گی اور کوئی ڈاکٹر کی پرچی تو نہیں مانگے گا۔“

”بھائی یہ اڑیا ہے یہاں سب ملتا ہے اور سب چلتا ہے۔“

میں نے دواؤں کے نام نوٹ کر لیے تھے پھر میں نے ہوٹل منیجر کو کال کی۔ ”مجھے کچھ دواؤں کی ضرورت

ہے۔“

”میں آدمی بھیج رہا ہوں آپ اسے نام دے دیں۔“

منیجر کا آدمی آکر دواؤں کے نام لے گیا اس نے کہا کہ شاید کچھ دیر لگے کیونکہ رات کے وقت عام میڈیکل اسٹورز بند ہو جاتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں تم آرام سے تلاش کرو اور سپوزیٹل سرنجوں کا ایک سیٹ بھی لیتا۔“

”یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔“ بانو نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

”ویسے تم نے خواتین کے بارے میں میری رائے کسی قدر بدل دی ہے۔“

دہلسی۔ ”یہی کہ ہم عقل سے پیدل ہوتے ہیں۔“

”نہیں عقل مند تو بہت ہوتی ہیں مگر اپنی عقل مندی خاص خاص میدانوں تک محدود رکھتی ہیں اور عام حالات میں اور ہنگامی حالات میں جب آپس کوئی صاحب عقل موجود ہو تو ذاتی عقل کے بے جا استعمال سے گریز کرتی ہیں۔“

رات گہری ہو رہی تھی اور سارا دن بھاگ دوڑ میں گزر گیا تھا مگر آنکھوں میں نیند نہیں تھی بلکہ جوتھی وہ بھی آنے والے کل کا سوچ کر اڑی جا رہی تھی جب یا تو ہم اپنوں کے درمیان ہوتے یا پھر کہیں نہ ہوتے۔ میں نے کافی کی تجویز پیش کی لیکن بانو نے انکار کیا۔ ”اب میں نے چائے بھی پی تو مجھے مشکل سے نیند آئے گی۔ میرے سر میں ہلکا سا درد ہو رہا ہے۔“

”تب بہتر ہے تم سو جاؤ تاکہ کل کے معرکے کے لیے تازہ دم ہو۔“

بانو چلی گئی۔ میں جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ میں خطرہ مول لے رہا تھا۔ اب تک مجھے یہ اتنا زیادہ محسوس نہیں ہوا تھا لیکن وسم اور عبداللہ سے بات کر کے شاید میں اسے زیادہ محسوس کرنے لگا تھا اور وہ یہ خیال آ رہا تھا کہ میں نے اندازے کی غلطی تو نہیں کی ہے۔ جب سوچوں نے زیادہ پریشان کیا تو ٹنگ آکر میں نے سونے کی تیاری شروع کر دی۔ گرم پانی سے غسل کر کے آیا تو ذہن کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ اسی اثنا میں منیجر کا آدمی دوائیاں لے آیا۔ یہ مختلف دوائیاں تھیں جو ایک ہی مقصد کے لیے تھیں۔ ان کے ساتھ چھوٹی سرنجوں کا ایک سیٹ بھی تھا۔ میں نے دواؤں کے ساتھ موجود ہدایات پڑھیں اور انہیں ذہن نشین کر لیا۔ بستر پر لیٹا اور آرام سے سو گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو کھڑکی سے سورج کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ نونج رہے تھے اور میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ بانو بھی جاگ گئی تھی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ہم نے ناشتہ کیا اور اس دوران میں اپنے پلان کی نوک پلک درست کرتے رہے تھے۔ بانو ذہین تھی اور یہ بات اس نے بار بار ثابت بھی کی تھی۔ اب بھی اس کی وجہ سے میں خطرات کو کم سے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ایبویٹنس سروس کو کال کی جہاں سے پہلے ایک ایبویٹنس طویل دورانیے کے لیے بک کرانے کی بات کی تھی۔ دوسری طرف موجود شخص نے بتایا کہ اس کے لیے مجھے خود ان کے سینٹر آنا ہو گا اور ادائیگی کے بعد ہی میں ایبویٹنس حاصل کر سکوں گا۔ یہ کرشل سروس تھی اور انہیں صرف رقم سے غرض تھا۔ میں سروس سینٹر تک گیا اور ادائیگی کر کے ایک ایبویٹنس چوبیس گھنٹے کے لیے حاصل کر لی۔ مجھے بتایا گیا کہ ایبویٹنس شملہ سے سویل کے دائرے سے دور نہیں جائے گی اس صورت میں مجھے مزید ادائیگی کرنا پڑے گی۔

میں نے بتایا کہ مجھے سروس شملہ کی حدود میں چاہیے۔ اب میں ایک گھنٹے کے نوٹس پر ایسویٹس کو کہیں بھی طلب کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے بی اے سنکاری کو کال کی۔

”مجھے دوپہر تین بجے کی فلامیٹ چاہیے۔ ہیلی کاپٹر میں ایندھن فل ہو مگن ہے ہمیں ذرا دیر تک پرواز کرنا پڑے۔“

”میں ٹھیک تین بجے تیار ملوں گا اور فلول میں ہمیشہ فل رکھتا ہوں۔“

”پورے ایندھن کے ساتھ ہیلی کاپٹر کتنی دیر پرواز کر سکتا ہے؟“

”ذو حاکئی سے تین گھنٹے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بلندی اور اسپینڈ پر ڈی پنڈ کرتا ہے۔“

میں نے اطمینان محسوس کیا کیونکہ اتنا وقت کافی تھا اور ہم آرام سے پاکستان پہنچ سکتے تھے اس کے بعد بی اے سنکاری واپس شملہ تک نہیں آ سکتا تھا مگر وہ سرحد پار کر کے واپس جا سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی بھی ایئر فیلڈ پر اتر سکتا تھا۔ امرتسر زیادہ دور نہیں تھا اور وہ یقیناً کچڑا جاتا لیکن میری بلا سے۔ میں ہوٹل واپس آیا تو بانو تیاری کر رہی تھی۔ اس نے میرے اور اپنے کپڑوں کے سوٹ کیس تیار کر لیے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اس میں سے کچھ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔“

”لیکن کیوں؟“

”یہ بلا وجہ کا بوجھ ہے۔ مگر اسے ٹھکانے لگانا ہو گا ورنہ بعد میں تفتیش ہوگی تو یہ لباس ہمارے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔“

بانو کا دل دکھ رہا تھا۔ ”اللہ اتنے اچھے کپڑے ضائع جائیں گے۔“

”اللہ اوروے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی اور اس کا ٹپ آن کر کے عبداللہ کو کال کی۔ کیونکہ وہ نکل چکے تھے اس لیے اب کمپیوٹر سے بات ممکن نہیں تھی مجھے موبائل پر کال کرنا تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ لیپ ٹاپ اور یو ایس انٹرنیٹ ڈیوائس ساتھ رکھوں گا اس سے رابطے میں آسانی رہے گی۔ پھر میں نے منیجر کو کال کی۔ اسے بتایا کہ ہم جا رہے ہیں لیکن کل تک یہ کمرے ہمارے لیے بک رہیں گے۔ میں نے اسے اشاروں میں کہا کہ ہم یہاں آئے ہی نہیں تھے بہتر ہو گا وہ یہاں ہماری موجودگی کے تمام ثبوت ضائع کر دے ان میں سی سی ٹی وی کیمروں کی ریکارڈنگ بھی شامل تھی۔ اس نے یقین دلایا کہ سب ضائع کر دیا جائے گا۔ روائگی سے پہلے ہم نے ہلانچ کیا کیونکہ اب بھاگ دوڑ کا مرحلہ تھا اور اس میں ہماری پیٹ رکاوٹ بن سکتا تھا۔ ہوٹل والے کسی قدر حیران ہوئے کہ ہم بغیر کسی گاڑی کے سامان سمیت پیدل روانہ ہوئے تھے مگر کسی نے اظہار نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد بانو نے تھک کر کہا۔ ”اُف یہ مصیبت لا کر لانا ضروری تھا؟“

”بالکل ضروری تھا۔“

”ہم ٹیکسی بھی کر سکتے ہیں۔“

”بالکل لیکن اس صورت میں ان سوٹ کیمرز کو کہاں ٹھکانے لگاتے اور وہ بھی ڈرائیور کی نظروں سے بچ کر۔“ میں نے کہا تو بانو چپ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ہم نے دونوں سوٹ کیس ایک بڑے ڈسٹ بن کے سپرد کیے۔ جہاں سے انہیں کوئی نکال کر بھی لے جاتا تو اب اسے ہمیں کوئی فرق نہ پڑتا۔ پھر میں نے ایسویٹس سروس کو کال

کی اور ایبولنس آئندہ دراز سٹ ہاسپٹل کے باہر بھیجنے کو کہا۔ ساتھ ہی تاکید کی کہ ڈرائیور باہر رک کر میرا انتظار کرے خود سے اندر جانے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی لی اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی اسپتال سے کچھ پہلے چھوڑ دی تھی۔ اسلحہ اور رقم ہمارے پاس تھی جب کہ لیپ ٹاپ اپنے چھوٹے سے بیگ میں میرے شانے سے لٹک رہا تھا۔ میں نے ایک ہسپتال بانو کے حوالے کر دیا تھا اور انڈین رقم بھی اسے دے دی تھی۔ اگر ہم کسی وجہ سے چھڑ جاتے تب بھی وہ خالی ہاتھ نہ رہتی۔ اسپتال کے سامنے پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ”تم یہیں رہو لیکن نمایاں مت رہنا اور میری واپسی کا انتظار کرنا۔“

”آپ کتنی دیر میں آجائیں گے؟“ وہ کسی قدر فکر مند تھی۔

”کچھ کہنا مشکل ہے لیکن آدھا پون گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“ میں نے کہا اور کوٹ پہن لیا۔

لیپ ٹاپ والا بیگ بانو کے حوالے کر دیا۔ اسی لمحے سڑک پر ایبولنس نمودار ہوئی۔ بانو جلدی سے سڑک کے ساتھ لگی باڑھ کی طرف بڑھ گئی اور میں سڑک کر اس کر کے ایبولنس کی طرف آیا۔ ڈرائیور نے مجھے سرسری نظروں سے دیکھا لیکن جب میں فرنٹ ڈور کھول کر اندر آیا تو وہ چونک گیا۔

”اوہ اچھا یہ آپ ہے آپ ڈاکٹر ہے؟“

”ہاں اندر چلو۔“ میں نے کہا تو اس نے ایبولنس آگے بڑھا دی۔ اسے روکنے یا چیک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم آرام سے اسٹاف پارکنگ ایریا میں پہنچ گئے۔ میں نے ایبولنس دروازے کے سامنے رکوائی اور ڈرائیور سے کہا۔ ”میں مریض کو لینے جا رہا ہوں اگر کوئی کہے کہ یہاں کیوں رکے ہو تو کہنا کہ ڈاکٹر انتہونی نے کہا۔“

”ٹھیک صاحب۔“ وہ بولا میں نیچے اترا اور ایک طرف رکھی وہیل چیئر لیے اندر داخل ہوا۔ راج کنور کو اس پر آسانی سے ایبولنس تک لایا جاسکتا تھا۔ خوش قسمتی سے کسی نے راستے میں نہیں روکا۔ میں نے وہیل چیئر راج کنور کے کمرے کے باہر چھوڑی اور دو اسے بھری سرخ نکالی۔ میرا ارادہ تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی راج کنور کو دوا انجکٹ کر دوں گا۔ جیسے ہی وہ دوا کے زیر اثر آئے گا میں اسے لے کر نکل جاؤں گا لیکن اندر گھستے ہی مجھے جھٹکا لگا۔ راج کنور کا بیڈ خالی تھا۔ اس کے واش روم جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کے سارے کام بیڈ پر ہوتے تھے۔ اچانک عقب سے آواز آئی۔

”کون ہو تم ادھر کیا کر رہے ہو؟“

میں نے مڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر امر سنگھ میرے مقابل تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سرجیکل ٹائف تھی۔



ڈاکٹر امرتسر مجھے دیکھ کر چونکا۔ ”آپ..... یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ڈاکٹر، راج کنور کہاں ہے؟“

”وہ.....؟“ وہ کسی قدر بوکھلایا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“

ڈاکٹر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس سے سوال جواب کا وقت نہیں تھا میں نے سوچا اور پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ ”ڈاکٹر شرافت سے بتا دو کہ راج کنور کہاں ہے؟ ورنہ تمہارے جسم میں ایک سوراخ اور ہو جائے گا۔“

اس نے بوکھلا کر دونوں ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔ مگر سر جیکل ٹائف بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ ”میںوں..... نن..... نہیں معلوم۔“

میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ تمام کراسے آگے کھینچا اور لات مار کر دروازہ بند کر دیا۔ اس نے قطعی مزاحمت نہیں کی اور میں نے اس کا ہاتھ مروڑا تو اس نے بلہلا کر چاقو چھوڑ دیا۔ ”اوائے میرا ہاتھ ٹوٹ جائے گا۔“

میں نے اس کے واہیلے پر توجہ دیئے بغیر اسے کھما کر اونڈھے منہ بستر پر گرایا اور گھٹنا اس کی ریڑھ پر جمایا۔ پھر اس کے ماتھے پر ہاتھ جما کر گردن پیچھے کھینچی تو وہ اس پوزیشن میں آگیا کہ اس کی گردن اور کمر دونوں ٹوٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ اس نے مرتی بکری جیسی آواز نکالی۔ اب آواز نکالنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”سردار، میں نے ذرا زور دیا تو تمہاری گردن یا ریڑھ کی ہڈی میں سے ایک کوئی چیز ٹوٹ جائے گی۔ دونوں صورتوں میں تم مرنے سے بچ گئے تب بھی ہمیشہ کے لیے بستر پر لٹ جاؤ گے اور ڈاکٹر سے مریض بن جاؤ گے۔ کیا تم ایسا چاہتے ہو؟“

”نن..... نہیں“ وہ رد دینے والے انداز میں بولا۔

”جب میرے سوال کا جواب دو۔ راج کنور کو یہاں سے کون اور کیسے لے گیا ہے۔“

”اس کا وہی آدمی جو یہاں نگرانی کرتا تھا۔“ امرتسر نے جواب دیا۔

میری گرفت نرم پڑ گئی۔ ”راسن..... گورا سا جس کے ماتھے پر چوٹ کا نشان ہے۔“

”وہی حرای لے جا رہا تھا۔..... میں آگیا اور پوچھا کہ مریض کو بغیر اجازت کہاں لے جا رہے ہو تو اس

نے میرے منہ پر مکا مارا۔ دانت ہلا دیا۔“

میں نے اسے سیدھا کیا اور ہسپتال اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ”کتنی دیر ہوئی ہے اور وہ کیسے لے گیا ہے؟“
 ”پتا نہیں جی۔ بس لے گیا ہے اس نے مجھ سے زبان بند رکھنے کو کہا۔ پر آپ تو اس سے بھی غالم ہو۔ اس
 نے تو دھمکی دی تھی آپ گولی مار دو گے۔“

”صرف دھمکی دی تھی؟“ میں نے شک سے پوچھا اور اس کی تلاشی لی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن کوٹ کی
 جیب سے نوٹوں کی گلدی نکالنے سے نہ روک سکا تھا۔ ”خبیث آدمی تم نے اس سے بھی رشوت لی ہے۔ میرے
 بارے میں بھی بتایا ہوگا۔“ میں مشتعل ہو گیا۔ میرے تاثرات دیکھ کر وہ کانپنے لگا تھا۔

”نہیں مینوں رب دی سوں..... میرے بچوں دی سوں میں نے تمہارا نہیں بتایا۔“

”یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟“

”مشکل سے دس منٹ کی۔“

بازی پلٹ گئی تھی جیسا میں نے سوچا تھا ویسا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے الٹ ہی ہو گیا تھا۔ آپ نے گھوڑے
 کے پہلے پھونک مارنے والا قصہ تو سنا ہوگا یہاں بھی وہی کیس ہو گیا تھا گھوڑے نے پہلے پھونک مار دی تھی۔
 رامن راج کنور کو نکال کر لے گیا تھا۔ اب پتا نہیں اس نے یہ کام اپنی مرضی سے کیا تھا یا بڑے کنور نے اسے حکم دیا
 تھا۔ میں نے امرتسرنگ سے پوچھا۔ ”وہ ان کا آدمی تھا پھر اس طرح لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”پتا نہیں جی مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ تبھی تو سوال کیا۔“ اس نے داڑھ سہلا کر کہا۔ اب مجھے جانا تھا اور
 سردار کو ایسے ہی چھوڑ جاتا تو اس نے ایک منٹ سے بھی پہلے سارا اسپتال جمع کر لینا تھا۔ میں نے سہلانے کے
 لیے ایک جگہ کا بندوبست اور کیا یعنی اس کی گدی پر ہسپتال کا دستہ رسید کیا۔ سر پر گڑی تھی جو حفاظتی خود سے کم نہیں
 تھی۔ اس کے لیے سردار جی کو پلٹنا پڑا تھا۔ اس کے حلق سے اوق کی آواز نکلی اور وہ بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔ میں
 نے نبض چیک کی جو جیسی لیکن مستقل تھی۔ اس کے دوڑھائی کھنسنے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔
 میں نے اسے بستر کے نیچے دھکیل دیا جہاں سے وہ خود ہی نکلتا کسی کے دیکھ لینے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔
 باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ رامن بازی لے گیا تھا اور اب مجھے جواب دینا تھا۔ باہر ایبویٹنس والا منتظر
 تھا۔ میں نے اس سے گیٹ تک چلنے کو کہا وہ حیرت سے بولا۔ ”صاحب پوچھتے نہیں لایا؟“

”نہیں اسے دوسری ایبویٹنس میں لے جایا گیا ہے۔“

میں نے گیٹ پر ایبویٹنس رکوائی اور گیٹ کیپر کے پاس آیا۔ وہ مجھے ڈاکٹر اور اسپتال سے متعلق سمجھ کر
 مستعد ہو گیا۔ ”لیس سر؟“

”کچھ دیر پہلے کوئی ایبویٹنس یہاں سے نکلی ہے۔“

”لیس سر ایک سفید پرائیویٹ ایبویٹنس نکلی ہے۔“ گیٹ کیپر نے تصدیق کی۔ میں گہری سانس لے کر
 رہ گیا۔ ریکارڈ وقت کے مطابق ایبویٹنس دو بج کر تیس منٹ پر نکلی تھی جب کہ ابھی پونے تین کا وقت تھا یعنی
 ایبویٹنس کو نکلے ہوئے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور وہ یقیناً یہاں ہماری آمد سے پہلے جا چکی تھی۔ پندرہ منٹ کافی
 وقت تھا اور میں اگر جانتا بھی کہ وہ کہاں گئی ہے تب بھی اسے پکڑنا مشکل تھا۔ میں ایبویٹنس کے ہمراہ باہر آیا تو
 بانو باڑھ کے پیچھے سے نکل آئی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں پھر ایبویٹنس سے اتر گیا۔ ڈرائیور کے سامنے

بات ممکن نہیں تھی۔ اس لیے بانو کو ایک طرف لے جا کر بتایا تو وہ مضطرب ہو گئی۔

”اب کیا ہوگا ہمارا سا راجا پلان ہی راج کنور پر منحصر ہے۔“

میں نے خیال ظاہر کیا۔ ”شاید راجا اسے کنور پیلس کی طرف ہی لے گیا ہے۔“

”مجھے تو راج کنور خطرے میں نظر آ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بڑے کنور کو اسے اس طرح بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“

”اور مجھے لگ رہا ہے کہ راجا نے اس طرح مجھے چیلنج کیا ہے۔ اس نے راج کنور کو لے جا کر مجھ سے کہا ہے کہ میں اسے چھڑا دوں۔“

”تب آپ کیا کریں گے؟“

میں نے سر دہا بھری۔ ”میرے پاس اس چیلنج کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”ہم کیا کریں گے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور واپس ہاسپٹل کے گیٹ کیپر کے پاس آیا اور اس سے ایبوی لینس کا رنگ اور سائز پوچھا۔ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا۔ یہ سفید رنگ کی بڑے سائز کی ایبوی لینس تھی۔ اس پر چاروں طرف اور اوپر بھی سرخ رنگ سے کراس کا نشان تھا۔ میں ایبوی لینس تک آیا اور بانو سے کہا۔ ”ہم ایئر کلب جا رہے ہیں۔“

”راج کنور کے بغیر۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا اور ہم روانہ ہو گئے۔ ایبوی لینس ڈرائیور کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ہم بغیر کسی مریض کے جا رہے تھے اور اس کی ایبوی لینس کو ٹیکسی کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ میں ادائیگی کر چکا تھا اس لیے اسے کہیں بھی لے جانے کے لیے آزاد تھا۔ میں نے اسے رفتار تیز رکھنے کو کہا اور سنکاری کو کال کی۔ ”ہم آدھے گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں تم پرواز کے لیے تیار رہو۔“

”میں تیار ہوں گا۔“ اس نے جواب دیا۔ بانو فکرمند تھی لیکن ڈرائیور کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ صورت حال کی اچانک تبدیلی نے ہم دونوں کو ہی پریشان کر دیا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو اس تبدیلی سے آگاہ نہیں کیا ہے وہ یقیناً میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں نے لیپ ٹاپ نکال کر اس میں یو ایس بی ڈیو آؤس لگائی اور آن کر کے دیکھا۔ اس جگہ سٹنل آرہے تھے میں نے ڈرائیور سے ایبوی لینس سڑک کے کنارے روکنے کو کہا۔ وہ حیران ہوا تھا لیکن اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں ایبوی لینس رکھتے ہی نیچے اتر آیا۔ ”تم چند منٹ انتظار کرو میں ابھی آتا ہوں۔“

میں ایبوی لینس سے اتنا دور چلا گیا کہ ڈرائیور میری آواز نہ سن سکے پھر میں نے ویم کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”یہ آپ ہیں؟“ اس نے نام لینے سے گریز کیا۔

”ہاں میں ہوں، ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

”کیسی گڑبڑ؟“

”راج کنور غائب ہے اسے راجا ہسپتال سے نکال کر لے گیا ہے۔ راج کنور کے بغیر ہم سرحد کراس

نہیں کر سکتے ہیں۔“

دیم پریشان ہو گیا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔ اب آپ کیا کریں گے؟“

”میں راج کنور کے پیچھے جا رہا ہوں۔“

”کیسے؟“ اس نے پوچھا۔ ”آپ کو پتا ہے وہ کہاں ہے؟“

”میں ایک چانس لے رہا ہوں۔ میں اسی ہیلی کاپٹر میں نکلوں گا اور کنور ہیلز کی طرف جانے والی سڑک پر ایمبولینس تلاش کروں گا۔ اگر کامیاب رہا تو راج کنور کو واپس حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس میں بھی کامیاب رہا تو پلان مکمل کیا جاسکتا ہے۔“

”آپ فیصلہ کر چکے ہیں؟“

”ہاں تم لوگوں کو آگاہ کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کچھ دیر بعد دوبارہ رابطہ کروں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ واپس ایمبولینس کی طرف آیا بانو نے نیچے اترنے یا میرے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ ”ہر ممکن تیزی سے چلو وقت کم ہے۔“

اس نے ایمبولینس آگے بڑھا دی عقب سے بانو نے پوچھا۔ ”بات ہو گئی۔“

”ہاں میں نے بتا دیا ہے کچھ مسئلہ ہو گیا ہے دیر ہو جائے گی اس لیے پریشان نہ ہوں۔“

ڈرائیور یہی سمجھ رہا تھا کہ مریض کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے اور لواحقین پریشان ہو رہے ہیں اگر اسے ذرا بھی بھٹک لگ جاتی کہ یہ معاملہ کیا ہے تو وہ شاید ایمبولینس چھوڑ کر بھاگ نکلتا۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم ایئر کلب کے پاس تھے۔ ایمبولینس کی وجہ سے گیٹ پر موجود گارڈز نے بغیر تعرض کے جانے دیا ورنہ پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کس سے ملنے آیا ہوں۔ میں نے ایمبولینس کلب کی عمارت کے سامنے روکوائی لیکن پھر مجھے سنکاری نظر آگیا وہ اپنے ہیلی کاپٹر کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”تم یہیں رک کر انتظار کرو گے۔“

”کب تک صاحب؟“

”جب تک ہم واپس نہیں آتے، تم ایمبولینس کو پارکنگ میں لے جاؤ۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں بانو کے ساتھ سنکاری کی طرف بڑھا۔ وہ ہیلی کاپٹر میں ایندھن بھر وارہا تھا اور یہ عمل آخری مراحل میں تھا۔ ایک چھوٹا ٹینکر فیوئلنگ کر رہا تھا۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر کا ٹینک فل ہوا۔ اس نے فیوئلنگ بند کر دی اور پھر ٹینکر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سنکاری نے مجھے اور بانو کو دیکھا۔ ”بس تم دو ہے؟“

”ہاں ہم دونوں نے جانا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وقت کم ہے فوری روٹنگی اختیار کرنی ہے۔“

”تمہارا الگ آج موسم بہت اچھا ہے۔“ اس نے ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ یہ درمیانے سائز کا ہیلی کاپٹر تھا۔ اس میں آگے دو افراد اور پیچھے تین افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ بانو پیچھے چلی گئی اور میں فرنٹ سیٹ پر آگیا۔ ہیلی کاپٹر کا اگلا حصہ تقریباً سارا ہی شیشے کا تھا اس سے نہ صرف سامنے بلکہ نیچے دیکھنے میں بھی آسانی رہتی۔ سنکاری نے ہمیں کانوں کو ڈھانپ لینے والے ہیڈ فون دیے۔ ”یہ پہن لو ورنہ دماغ خراب ہو جائے گا۔“

”کیا ہم بات کر سکیں گے؟“

”ہاں اس سے آسانی رہے گی۔ اس میں ہیڈ فون اور مائیک دونوں ہیں۔“ اس نے بھی ہیڈ فون پہننے ہوئے کہا اور پھر کنٹرول والوں سے پرواز کی اجازت لینے لگا۔ یہ کام کر کے اس نے ریڈیو بند کر دیا۔ پھر اس نے انجن آن کیا۔ پر گھومنے لگے اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ پوری رفتار پر آ گئے۔ کانوں پر ہیڈ فون کے باوجود شور کانوں میں گھسا جا رہا تھا۔ ہم نے سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ سنکاری نے فلائٹ اسٹک کھینچی اور ہیلی کاپٹر ایک ہلکے سے دھچکے سے اوپر اٹھ گیا۔ بلندی پر آنے کے بعد سنکاری نے اس کا رخ شمال کی طرف کر دیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ میں اسے گائیڈ کرتا میں نے بلند آواز سے کہا۔

”ہیلی کاپٹر کو شمال کی طرف جانے والی ہائی وے کے اوپر رکھو۔“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم نے ہالیوڈ نہیں دیکھا ہے؟“

”دیکھا ہے لیکن ہم ہائی وے دیکھتے ہوئے جائیں گے۔“

سنکاری نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے اس میں بہت وقت اور ایندھن لگے گا۔“

”لگنے دو، جیسا کہا ہے ویسا کرو۔“

”یہ فلائٹ پلان کے خلاف ہوگا۔“ اس نے احتجاج کیا۔

سنکاری وقت ضائع کر رہا تھا اس نے ہیلی کاپٹر بلند کر لیا تھا اور اب مجھے شملہ کے شہر کے ساتھ شمال کی طرف جانے والی ہائی وے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ایئربولینس کو روانہ ہونے تقریباً ایک گھنٹہ ہونے والا تھا اور اس سڑک پر وہ تیس پینتیس کلومیٹرز سے زیادہ آگے نہیں جاسکی ہوگی۔ بلیس تک کا سفر کئی گھنٹے پر مشتمل تھا۔ اگر وہ سڑک پر تھی تو ہم اسے روک سکتے تھے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ جلد از جلد اس تک پہنچ جائیں۔ ورنہ وقت ضائع ہوتا اور ہماری سرحد پار روانگی خطرے میں پڑ جاتی۔ جب کہ میں بہر صورت آج کے دن سرحد پار کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ موقع دوبارہ مشکل سے ملتا۔ میں نے پستول نکال لیا اور سنکاری دم بخود رہ گیا۔ ”تم وہیں کے ساتھ ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے پستول اس کی گردن سے لگا دیا اور ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کا پاور بٹن آف کر دیا۔ ”جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔“

”ہم کو مارنا تم ہم ویسا ہی کرے گا۔“ وہ ٹھکیا۔ ”فور گاڈ ہم کو مت مارتا۔“

”گاڈ کے لیے نہیں ماروں گا اپنی جان بچانے کے لیے ماروں گا اس لیے شرافت سے رہو اور زندہ رہو۔“

”بائی گاڈ ہم شریف رہے گا۔ زندہ رہے گا۔“ اس نے کہا اور فوری طور پر ہیلی کاپٹر کو شمال کی طرف جانے

والی شاہراہ کے اوپر لانے لگا۔

”اس شاہراہ پر اس طرح چلو کہ اس کا کوئی حصہ نظر سے اوجھل نہ رہے۔“

وہ ہچکچایا پھر اس نے پوچھا۔ ”تم کو کسی کا تلاش ہے؟“

”ایک بڑی سفید ایئربولینس کا..... اس پر سرخ رنگ سے کراس بنے ہیں۔“

”ایئربولینس میں کون ہے۔“

”میری محبوبہ۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا باپ شادی کے لیے تیار نہیں تھا اور اس کی ٹانگیں توڑ کر اسے اسپتال میں لٹا دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے اسپتال سے لے کر بھاگ جاؤں مگر میرے رقیب نے محبوبہ کے باپ کی آشرwad سے اس منصوبے پر پہلے عمل کر لیا۔“

کیونکہ انڈیا میں فلموں کا رواج ہے اور معاشرہ ان سے متاثر ہے اور اتفاق سے ان فلموں میں کہانیاں بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں اس لیے سنکاری نے اس کہانی پر یقین کر لیا اور فکر مند ہو کر بولا۔ ”تمہارا رقیب بھی وپین والا ہوگا۔“

”بالکل ہوگا۔ وہ میرا ہم پلہ ہے۔“

”تب تم اپنی لوز کو واپس لے گا تو وہ بلت چلائے گا؟“

”اس کا امکان ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔

”تب ہم مارا جائے گا۔“

”تم فکر مت کرو تم کو کچھ نہیں ہوگا۔“

”بابا جب بلت چلتا ہے تو کسی کو نہیں دیکھتا۔“

”پر بلت چلانے والا دیکھتا ہے اور میرا رقیب رقابت میں اندھا ہے لیکن آنکھ سے اندھا نہیں ہے۔ تم میں اور مجھ میں بہت فرق ہے اس لیے فکر نہ کرو وہ دیکھ کر بلت چلائے گا۔“

سنکاری کی حالت خراب تھی۔ مگر وہ مجبور تھا۔ یہاں بھی اس کے سر کے ساتھ پستول لگا ہوا تھا اور اس میں بھی بلت تھا۔ چند منٹ میں ہم شملہ سے آگے نکل گئے تھے اور اب ہیلی کاپٹر ہائی وے کے ساتھ ساتھ پہاڑوں میں گھوم رہا تھا۔ میری نظر ہائی وے پر آتی جاتی گاڑیوں پر مرکوز تھی۔ میں نے سنکاری سے پوچھا۔ ”ہیلی کاپٹر میں کیونٹیکیشن کا کوئی اور سسٹم بھی ہے؟“

”نہیں ریڈیو ہوتا ہے اور ایک ٹرانسپونڈر ہوتا ہے جو چو پر کاٹتا ہے۔“

”اے بھی بند کر دو۔“ میں نے حکم دیا تو اس نے ڈیش بورڈ پر لگا ہوا ایک سوئچ آف کر دیا۔ مجھے طیاروں اور ہیلی کاپٹر میں استعمال ہونے والے آلات کا اتنا علم نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی مواصلاتی آلہ کام کر رہا ہوتا اور مجھے اس کا علم نہ ہوتا۔ بہر حال بہت کچھ انسان کو تقدیر پر بھی چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ اپنے طور پر میں پوری طرح چوکس تھا۔ بانو نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی کیونکہ اس کی سیٹ سیدھی تھی اور اس میں پھسلنے کا خطرہ تھا۔ ہم شملہ سے کوئی دس بارہ کلومیٹر آگے نکل آئے تھے۔ سڑک کے لحاظ سے یہ فاصلہ کوئی بیس بائیس کلومیٹر تھا۔ اب تک ایسویٹس نظر نہیں آئی تھی لیکن اب اس کے نظر آنے کا امکان بڑھ گیا تھا۔ اس لیے میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور سنکاری سے کہا۔ ”اب ہیلی کاپٹر کو ذرا آہستہ کر لو۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اس وقت وہ تقریباً سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا۔ سنکاری نے اسے مزید آہستہ کر لیا۔ اب وہ تقریباً ٹھہل رہا تھا۔ بانو نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اگر ایسویٹس مل گئی تو کیا کرتا ہے؟“

”اے روکنا ہے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”یہ کام میں کروں گا۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“

”نہیں تم ہیلی کاپٹر میں رکو گی۔“ میں نے انکار کیا تو وہ سمجھ گئی کہ میں اسے سنکاری کے سر پر چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔

”جیسے آپ کی مرضی لیکن آپ اکیلے.....“

”فکرمات کرو اس سے پہلے بھی بہت سے معرکے اکیلے ہی سر کیے ہیں۔“ میں نے کہا۔ میرے پاس چار عدد پستول تھے۔ ایک سائلنسر والا تھا اور ان سب کے کئی فاضل میگزین بھی تھے اس لیے اسلحے کے لحاظ سے پوزیشن تسلی بخش تھی۔ مگر دوسری طرف رامن اینڈ کمپنی دانتوں تک مسلح ہوتی اور ان کے پاس خود کار ہتھیاروں کی موجودگی بھی عین ممکن تھی۔ وہ تعداد میں بھی زیادہ ہوتے۔ اس کے باوجود مجھے ان کو روکنا تھا اور راج کنور کو واپس حاصل کرنا تھا۔ میں سوچ میں تھا اور بہ ظاہر نیچے دیکھ رہا تھا مگر نگاہیں فوکس نہیں تھیں اس لیے ایبویلیس سنکاری نے دیکھی اس نے کہا۔

”وہ دیکھو..... نیچے.....“

سڑک پر ایک بڑی سفید ایبویلیس جاری تھی، اس کی چھت پر فلیش پٹی لگی تھی۔ چلیے سے وہی ایبویلیس لگ رہی تھی میں نے سنکاری سے کہا۔ ”ہیلی کاپٹر اس کے قریب لاؤ۔“

وہ ہیلی کاپٹر کو نیچے لانے لگا۔ تقریباً دو سو فٹ کی بلندی سے ایبویلیس کے اطراف میں لگے سرخ رنگ کے کر اس بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ وہی ایبویلیس تھی۔ اس کے آس پاس کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی اس کا مطلب تھا کہ سب ایبویلیس میں تھے۔ اس سے مجھے امید ہوئی کہ شاید رامن ایبویلیس کے ساتھ نہیں تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی گرگیا کر گئے ایبویلیس میں موجود ہوں گے۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے روکا کیسے جائے۔ فضا سے روکنا تو ناممکن تھا۔ الٹا ہمیں لینے کے دینے پڑ سکتے تھے کیونکہ اگر نیچے سے کیا جائے والا فائر ہیلی کاپٹر کے کسی نازک مقام پر لگ جاتا تو یہاں کریش لینڈنگ کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ مجھے جو کرنا تھا کہیں اتر کر کرنا تھا۔ ایک منٹ بعد میں نے سنکاری سے دوبارہ ہیلی کاپٹر اوپر کرنے کو کہا۔ اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”واپس جانے کا ہے؟“

”آگے چلو اور جب ایبویلیس سے دو تین کلومیٹر ز آگے نکل جاؤ تو ہیلی کاپٹر نیچے لے آنا۔“

سنکاری کا منہ لنگ گیا تھا لیکن اس نے حکم کی تعمیل کی۔ بانو نے پوچھا۔ ”اگر آپ نے اترنے کا ارادہ کیا تو اس جگہ ہیلی کاپٹر کیسے اترے گا؟“

سنکاری نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ”سوڈیجرس..... جو پراوہر نہیں اتر سکتا۔“

”ہونے کو سب ہو سکتا ہے۔“ میں نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب ہیلی کاپٹر نیچے لے آؤ۔ سڑک سے سو فٹ اوپر رکھنا۔“

”یہ بھی ڈیئجر.....“

”ڈیئجرس..... جیسی ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بادل نا خواستہ ہیلی کاپٹر نیچے لے آیا۔ سڑک سے صرف سو فٹ کی بلندی پر یہ ہمارا ساتھیوں کے درمیان اڑ رہا تھا۔ اس نے میرے کہنے پر رفتار سست کر لی تھی۔ میری نظریں سڑک کے ساتھ کسی موزوں جگہ کی تلاش میں تھیں۔ میں وقفے وقفے سے سنکاری سے پوچھ رہا تھا کہ ہم

اس جگہ سے کتنی دور نکل آئے تھے جہاں ایسولینس دیکھی تھی۔ وہ فاصلہ بتا رہا تھا۔ تقریباً سات آٹھ کلومیٹر آگے نکلنے کے بعد مجھے ایک جگہ موزوں لگی۔ میں نے سنکاری سے ہیلی کاپٹر اس کے پاس لانے کو کہا۔ وہ چوپر سڑک سے صرف بیس پچیس فٹ کی بلندی پر لے آیا اور مجھے مطلع کیا۔

”اس سے نیچے نہیں آ سکتا ہے۔“

یہاں درخت نہیں تھے مگر ایک طرف ڈھلان تھی اگر ہیلی کاپٹر زیادہ نیچے آتا تو اس کے پچھلے ڈھلان سے نکل سکتے تھے۔ میں نے سڑک کے دوسری طرف ڈھلان والی اس جگہ کو غور سے دیکھا اور یہ مجھے اپنے کام کی لگی تھی۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”آگے چلو اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جہاں ہیلی کاپٹر اتار جا سکے لیکن اس جگہ سے زیادہ دور نہ ہو۔“

”اس جگہ۔“ وہ کراہا۔ ”ادھر اڑانا مشکل ہے تم اتارنے کو بولتا ہے۔“

رودنے کے باوجود اس نے ہیلی کاپٹر آگے بڑھا دیا تھا اب وہ سڑک کے دوسری طرف نیچے کی ڈھلان کی طرف اڑ رہا تھا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں ہیلی کاپٹر اتار جا سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ مناسب جگہ کوئی نصف کلومیٹر کے بعد ملی۔ یہاں سڑک چوڑی تھی اور پہاڑ والی طرف بھی زمین ہموار تھی۔ کسی قدر کوشش سے ہیلی کاپٹر اتار جا سکتا تھا۔ سنکاری نے مجھے آگاہ کیا اور ہیلی کاپٹر نیچے لانے لگا۔ وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر ایسی مشین ہے جو تیز رفتاری میں توازن رکھتی ہے لیکن جب یہ ہوا میں معلق ہو تو بے توازن ہو کر ڈولنے لگتی ہے۔ اس وقت بھی ہیلی کاپٹر ڈول رہا تھا۔ اس کے اسکیور سڑک کے پاس ہونے جا رہے تھے۔ اچانک بانو چیخ اٹھی۔ ”ٹرک.....“

سنکاری نے غلت میں بے اختیار ہیلی کاپٹر اوپر کیا اور مخالف سمت سے آتا ٹرک پریشہارن بجاتا نیچے سے گزر گیا۔ میری اور سنکاری دونوں کی نظر سڑک پر مرکوز تھی اور خوش قسمتی سے بانو نے آتے ٹرک کو دیکھ لیا۔ اس کے ڈرائیور نے بھی بالکل قریب آ کر ہیلی کاپٹر دیکھا تھا۔ سنکاری نے دہشت زدہ ہو کر چیخ ماری۔ ”ڈیم اس..... ابھی ہم سب مرنا..... بانی گاڈ سب مرنا..... تم سب کو مروانا۔“

”مرنا نہیں ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”مرد بنو..... فلائنگ کرتے ہو اتنا سادہ ہے تمہارا؟“

”ہم بال بچے والے ہیں۔“

بانو بولی۔ ”مجھے تو لگ رہا ہے ٹرک چھوٹا ہوا گیا ہے۔“

”بہت ڈنچہ برس جگہ ہے۔“ سنکاری لرزتی آواز میں بولا۔ ”ادھر اترنا تو مارا جائے گا۔“

”ابھی تو تم اترو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ویسے وہ صحیح کہہ رہا تھا اوپر سے سڑک ڈھلان پر گھومتی ہوئی آ رہی تھی۔ یہ پہاڑی کا ایک ڈسک نما حصہ تھا جس پر سڑک گھومتی تھی اسی وجہ سے پہاڑ یہاں کسی قدر ہموار تھا مگر سڑک پر آنے والی گاڑی مشکل سے پچاس گز پہلے سڑک پر موجود کسی چیز کو دیکھ سکتی تھی اور بیس کلومیٹر زنی گھنٹے کی رفتار سے یہ فاصلہ صرف چند سیکنڈ میں طے ہو جاتا۔ اگر ڈرائیور کا دھیان ڈرا بھی مٹا ہوتا تو آنے والی گاڑی ہیلی کاپٹر سے ٹکرا سکتی تھی۔ مگر اس کا حل تھا۔ سنکاری نے چوپر نیچے اتار لیا اور میرے کہنے پر اس کا انجن بند کر دیا۔ فوراً ہی اس کا عذاب ناک شور مدہم پڑ گیا اور ایک منٹ بعد اس کے پچھلے رک گئے تھے۔ میرے اشارے

پر بانو اور سنکاری نیچے اتر آئے۔ بانو نے اپنا پتول نکال کر اس کا معائنہ کیا اور واپس رکھ لیا۔ یہ اشارہ تھا سنکاری کے لیے کہ اسے اکیلا نہ سمجھے۔ ویسے وہ خالی ہاتھ سے بھی سنکاری کو آسانی سے قابو کر سکتی تھی۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”تم اس کے ساتھ دوسری طرف جاؤ اور سڑک پر پتھر رکھ کر اسے بند کر دو اس طرح امکان نہیں رہے گا کہ کوئی گاڑی بے خبری میں تمہارے ٹیلی کا پٹر سے ٹکرا جائے۔“

”آپ جائیں ہم یہ کام کر لیں گے۔“ بانو بولی۔

میں نے سنکاری کو خبردار کیا۔ ”کوئی چالاکی مت کرنا ورنہ میری ساتھی تمہیں بے دریغ شوٹ کر دے گی۔ اگر یہاں سے تم فرار ہو بھی گئے تو ہم تمہارے گھر بھی آ سکتے ہیں تم چھپ نہیں سکو گے۔“

”ہم کیا کر سکتا ہے۔“ اس نے سر اُدھر بھری اور بانو کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں واپس شملہ کی طرف روانہ ہوا۔ چند لمحے بعد میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ کیونکہ جو جگہ میں منتخب کی تھی وہاں تک ایسیوینس چندرہ بیس منٹ میں پہنچ سکتی تھی اور اس میں سے دس بارہ منٹ گزر چکے تھے مجھے جگہ کا معائنہ کرنا تھا اور پھر لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ ایک خیال تو ذہن میں تھا لیکن اس پر عمل کا حتمی فیصلہ میں اس جگہ کو دیکھ کر ہی کر سکتا تھا جو اوپر سے دیکھی تھی۔ اوپر سے دیکھنے اور زمین سے دیکھنے میں خاصا فرق ہو سکتا تھا۔ چند منٹ بعد میں اس مقام پر تھا اور ابھی تک دور پہاڑوں میں مل کھاتی سڑک پر سفید ایسیوینس نمودار نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سڑک کے کنارے اتر کر اس جگہ کو دیکھا۔ یہاں ڈھلان پر تقریباً چالیس درجے کے زاویے سے ہموار جگہ تھی اور کوئی دس گز نیچے پاس پاس بڑے تنوں والے مضبوط درخت لگے تھے۔

میں نے ان کا معائنہ کیا۔ اگر ایسیوینس اس ڈھلان پر اتر جاتی تو یہ درخت اسے مزید نیچے گرنے سے روک سکتے تھے۔ مگر اس کا بھی امکان تھا کہ وزنی اور بہت قوت سے آنے والی ایسیوینس ان درختوں کو بھی گراتی نیچے کھاتی کی طرف نکل جاتی۔ ذرا آگے ڈھلان یک دم بہت زیادہ ہو گئی تھی اور اس صورت میں ایسیوینس تقریباً دو سو فٹ نیچے گرتی اور کسی کے بچنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ واپس اوپر آتا تو ایسیوینس نمودار ہو چکی تھی اور وہ ابھی تقریباً ایک کلومیٹر دور تھی لیکن وہ جس رفتار سے آ رہی تھی اسے یہاں تک آنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھی۔ اور پھر سڑک کے ساتھ ڈھلان پر اس چھوٹے سے پتھر کے ساتھ دبک گیا جو مجھے پوری طرح چھپا تو نہیں سکتا تھا لیکن یہ کسی جوانی حملے سے کسی قدر تحفظ دے سکتا تھا۔

اس پتھر کے پیچھے پوری ڈھلان تھی۔ اس کے فوراً بعد وہ ڈھلان تھی جو میں نے منتخب کی تھی۔ اگر میرا پلان مکمل ہوتا اور سب ٹھیک رہتا تو ایسیوینس اس ڈھلان پر اتر کر معمولی حادثے کا شکار ہوتی۔ اس میں موجود افراد زخمی ہو سکتے تھے لیکن کسی کے مرنے کا امکان نہیں تھا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ ایسیوینس بڑے حادثے کا شکار ہو کر نیچے گر جاتی یا پھر حادثے سے بچ جاتی تو دونوں صورتوں میں میرا منصوبہ تقریباً ناکام ہو جاتا۔ راج کنور ہاتھ نہ آتا، یا آتا تو کسی قابل نہ ہوتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے اور خود میرا یہاں سے صحیح سلامت نکلنا ممکن نہ رہتا۔ یہ تمام امکانات میرے ذہن میں تھے۔ میں نے دو پتول نکال لیے تھے۔ سائلنسر والا چھوڑ دیا تھا اور چوتھا بانو کے پاس تھا۔ سائلنسر والا زیادہ کارآمد لیکن طاقت کے لحاظ سے کم تھا۔ اس وقت مسئلہ رازداری کا نہیں بلکہ دشمن کو کچل دینے کا تھا کہ وہ ذرا بھی مزاحمت کے قابل نہ رہے۔ میرے پاس

وقت اور قوت دونوں کم تھیں۔

ایبولینس اب اس موڑ تک آچکی تھی جہاں سے وہ مستقل میری نظر میں رہتی۔ یہاں سڑک کوئی ڈیڑھ سو گز تک سیدھی تھی اور پھر کے پاس سے یہ تقریباً یوٹرن لے رہی تھی۔ یہاں بیس کلومیٹر زنی گھنٹا کی رفتار بھی زیادہ تھی۔ میرے حساب سے ڈرائیور کو دس سے اوپر نہیں جانا چاہیے تھا۔ مگر ایبولینس خاصی رفتار سے آرہی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر دو افراد تھے۔ دور سے ان کی صورتیں واضح نہیں تھیں پھر سورج ان کے عقب میں چلا گیا تھا اور اس وجہ سے بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں مستعد اور تیار تھا۔ ایبولینس کوئی تیس گز دور تھی کہ میں پتھر کی آڑ سے نکل آیا۔ میرے دونوں ہاتھ سیدھے تھے اور میرا نشانہ ایبولینس کا اگلا بایاں ٹائر تھا۔ میں نے فائرنگ شروع کی۔ میری انگلیاں مشینی انداز میں چل رہی تھیں۔ تیسری یا چوتھی گولی پر ٹائر دھماکے سے پھٹا اور ایبولینس لہرائی۔ اس کا رخ ڈھلان کی طرف ہو گیا۔ اسی وقت ڈرائیور اسٹیرنگ گھما رہا تھا مگر ٹائر کے برست ہونے سے وہ ناکام رہا اور تب میں نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر رامن تھا۔ دوسرا آدمی اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے پاس اتنی سہلت نہیں تھی کہ جوابی کارروائی کر سکتے۔

ایبولینس کا رخ میری طرف ہوا تھا۔ میں نے ذرا پیچھے ہوتے ہوئے اس بار پچھلے بائیں ٹائر کو نشانہ بنایا۔ ایبولینس بری طرح لڑکھڑاہی تھی اور رامن یقیناً اسٹیرنگ سے کشتی لڑ رہا تھا کہ گاڑی کو کھائی میں جانے سے روکے۔ اس کی یہ کوشش میں نے دوسرا ٹائر برست کر کے ناکام بنا دی۔ جیسے ہی ٹائر پھٹا میں نے پیچھے کی طرف جھلانگ لگائی اور ایبولینس تقریباً مجھے چھوتی گزر گئی۔ ایبولینس زندگی کی علامت ہے۔ موت و حیات کی کشمکش میں جتلا انسانوں کو حیات کی طرف لے جاتی ہے لیکن اس دن اگر ایبولینس مجھ سے ٹکرا جاتی تو یہ قاتل بن جاتی۔ میں ڈھلان پر گر کر لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا۔ میں نے ہتھول و ہیں چھوڑ دیئے تھے اور ہاتھ مارتے ہوئے خود کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈھلان زیادہ تھی اور میں زور سے پیچھے آیا تھا۔ پھر ایک پودے نے سہارا دیا میں نے اسے پکڑا اور مگر فوراً ہی وہ جڑ سے اکھڑ گیا۔

البتہ اس ذرا سے سہارے نے میری رفتار کم کی اور میں قلابازی کھا کر پیٹ کے بل ڈھلان پر گر کر اور چھپکلی کی طرح اس سے چٹ گیا۔ مگر چھپکلی لمبی اور ہلکی ہوتی ہے۔ میں انسان ہوں اور وزنی ہوں اس لیے سیدھا گرنے کے باوجود مودیٹ زیادہ تھا۔ کشش ثقل مجھے کھینچ رہی تھی اور حرکت کرتا جسم سر سے اٹھ کر دوبارہ گرنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ اگر ایک بار میں اور قلابازی کھا جاتا تو اس کے بعد اس ڈھلان پر رکنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے آخری کوشش کی اور پورا جسم سخت کر لیا۔ خاص طور سے گھٹنے سیدھے کر لیے اور پیروں پر زور ڈالا۔ میں دباؤ کو اتنا کم کر چکا تھا کہ دوبارہ منہ کے بل ڈھلان پر گرنا۔ منہ بچانے کا وقت نہیں تھا اگر ہاتھ آگے کرتا تو اس کا جھٹکا مجھے دوبارہ پیچھے لے جاتا اس لیے میں نے خود کو سینے کے بل گرنے دیا اور ہاتھ پیچھے کر لیے۔ جھٹکے سے منہ زمین سے ٹکرایا۔ خوش قسمتی سے یہاں پتھر نہیں تھا بلکہ مٹی تھی اس کے باوجود خاصی چوٹ آئی تھی۔ بہر حال اس وقت جان پر بنی تھی اس لیے چوٹ کی پروا کہ تھی۔ زمین پر گر کر اس سے چٹ گیا۔

میں جتنے آسان انداز میں بیان کر رہا ہوں یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اگر میں جسمانی طور پر مضبوط اور فٹ نہ ہوتا تو یہ سب نہیں ہو سکتا تھا۔ گرنے کی قوت اور کشش ثقل مجھے نیچے کھینچ لیتی۔ چند لمحوں میں پڑا ہوا پتھر ہا۔ پھر تیزی

سے اٹھا۔ جب تک میں خود کو گرنے سے بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا میں ارد گرد سے مکمل غافل ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایبولینس کے ساتھ کیا ہوا اور وہ کہاں گئی۔ میں اتنا غافل تھا کہ میں نے کوئی آواز بھی نہیں سنی۔ اوپر آتے ہوئے میں نے اپنے دونوں پستول اٹھائے۔ لڑھکنے کے دوران میں مجھے چوٹیں آئی تھیں لیکن فی الحال ان کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ ایبولینس سڑک پر نہیں تھی میں ڈھلان کی طرف بھاگا اور جب میں نے نیچے دیکھا تو ایبولینس دو درختوں سے اسی طرح ٹکی نظر آئی جیسے میں نے سوچا تھا۔ ایبولینس ساکت تھی اور اس کا انجن بھی بند تھا۔ مزید کوئی سرگرمی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

میں نے پستول سامنے کیے اور محتاط انداز میں ایبولینس کی طرف آیا۔ اچانک اس کا فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نیچے گرا۔ میں نے بے ساختہ فائر کیا۔ اسے گولی لگی مگر وہ پہلے ہی مر چکا تھا کیونکہ اس کی گردن غیر معمولی حد تک پیچھے مڑی ہوئی تھی۔ یہ رامن کا دوسرا ساتھی تھا۔ میں آگے آیا۔ جیسے جیسے میں آگے آ رہا تھا ڈرائیونگ کپارٹ نمایاں ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا کہ رامن ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں تھا۔ ایبولینس اس کی طرف سے درخت کے تنے سے ٹکرائی تھی۔ ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی تھی لیکن کوئی اس سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ خطرے کے احساس نے مجھے چوکنا کر دیا اور میں تیزی سے ایبولینس کے عقبی حصے میں آیا۔ میں نے ایک طرف ہوتے ہوئے اس کا دوپٹ والا دروازہ کھولا تھا کہ رامن کی منحوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”شہباز کوئی حماقت مت کرنا ورنہ میں راج کو مار دوں گا۔“

میں نے احتیاط سے ایک لمحے کے لیے اندر جھانکا تو رامن راج کنور کو جکڑے دکھائی دیا۔ اس نے راج کنور کی گردن کو نیک لاک لگایا ہوا تھا اور وہ ایک سیکنڈ میں اس کی گردن توڑ سکتا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن یہ اس کی مکاری بھی ہو سکتی تھی وہ اس طرح خود کو نہتا شوکر کے مجھے سامنے آنے پر اکسارہا تھا اور میں سامنے آتا تو اچانک مجھے شوٹ کر دیتا۔ اس لیے میں آڑ میں رہا۔ رامن کا چہرہ لہو لہان تھا یقیناً اس حادثے میں اسے خاصے زخم آئے تھے مگر ان میں سے ایسا کوئی زخم نہیں تھا جو اسے ناکارہ کر دیتا۔ راج کنور بہ ظاہر ٹھیک لگ رہا تھا لیکن رامن کی گرفت کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا اور ایبولینس کے نیچے بھی جھانک لیا کہ کہیں رامن کا حریف کوئی ساتھی نہ ہو۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

اگر رامن حادثے میں نہتا ہو گیا تھا تو اس نے حاضر دماغی سے کام لے کر اپنے بچاؤ کا فوری بندوبست کر لیا تھا۔ یعنی راج کنور کو پر غمال بنالیا۔ اسے اندازہ تھا کہ میں اس کے پیچھے آیا ہوں اگر میں نے رامن کو نہتا پایا تو اس بار اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا اور فوراً زکھ روانہ کر دوں گا۔ درحقیقت میں نے سوچا بھی یہی تھا مگر رامن راج کنور پر قابو پا کر عارضی طور پر محفوظ ہو گیا تھا۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میری جنگ رامن کے ساتھ ساتھ وقت سے تھی اور مجھے جلد از جلد راج کنور کو حاصل کر کے واپس جانا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”تم بھی کوئی حماقت مت کرنا۔ ورنہ اس بار تم خود کو ہر رعایت سے محروم کر لو گے۔ راج کنور کو چھوڑ دو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“

”میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر تم نے جھڑانے کی کوشش کی تو یہ میرے کچھوٹے گا۔“

”میرا خیال ہے تم کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو کہ میں راج کنور کا ہمدرد بن گیا ہوں اور ہر قیمت پر اس کی

جان بچانا چاہتا ہوں۔ اگر تم ایسا سوچ رہے ہو تو بہت بڑی غلطی پر ہو۔ میں راج کنور کا دشمن ہوں اور رہوں گا۔ اگر مجھے موقع ملے گا تو میں اسے ضرور مار دوں گا لیکن فی الحال مجھے اس کی ضرورت ہے۔“

وہ تشویش کا شکار ہو گیا۔ ”تمہیں اس کی ضرورت کیوں ہے؟“

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔“ میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ ”رامن، میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے کچھ ہی دیر میں یہاں سے نکل جانا ہے۔ میں یا تو راج کنور کو لے کر جاؤں گا یا پھر تم دونوں کو ختم کر دوں گا۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔“

”اس کے بعد تم تو پ چلا دو گے۔“ رامن نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”اگر تم مجھے گولی مارو گے تو وہ راج کو لگے گی۔“

”نہیں میں تم پر یا راج پر نہیں ایسبیلنس کے پیٹرول ٹینک پر گولی چلاؤں گا اور تم دونوں اندر ہی روٹ ہو جاؤ گے۔ ایک طرف کھائی اور دوسری طرف میں ہوں جس طرف بھی گئے موت استقبالی کرے گی۔ اب ڈیڑھ منٹ رہ گیا ہے۔“

میری بات پر رامن کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ حادثے میں پیٹرول ٹینک کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”ایک منٹ رہ گیا ہے، ویسے جب تم آرام سے راج کنور کو اسپتال سے لے جا سکتے تھے تو اس طرح لانے کی کیا تک تھی؟“

”اس حرامی نے ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن سے مدد مانگ لی تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر اسے ڈسچارج نہ کیا جائے چاہے کوئی بھی کہے۔ معاملہ سرکار تک چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے یہ ہاتھ سے نکل جاتا میں اسے اغوا کر کے نکال لایا۔“

میں راج کنور کی چالاکی پر حیران ہوا تھا۔ اس نے مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ وہ انتظامیہ سے مدد مانگ چکا ہے۔ تو یہ وجہ تھی کہ رامن نے راست اقدام کیا۔ ”اس پر تمہارے خلاف اغوا کا کیس نہیں بنے گا۔ ڈاکٹر امرتسرنگ گواہ ہے۔“

رامن نے سردار جی کو ایک ناقابل بیان گالی دی۔ ”وہ..... کس منہ سے پولیس کو بیان دے گا۔ اس نے لاکھ روپے لے کر میری مدد کی ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ گھما کر نظر آنے والا سکھ تو بہت ہوشیار نکلا دو مخالف پارٹیوں سے پیسے وصول کر لیے۔ اس کے پاس سے صرف دس ہزار برآمد ہوئے تھے یعنی باقی رقم اس نے کہیں چھپا دی تھی۔ وقت پورا ہو گیا تھا۔ میں نے رامن کو مطلع کیا اور کہا۔ ”مجھے جواب چاہیے ہاں یا نہ؟“

”میں راج کنور کو نہیں چھوڑ سکتا دوسری صورت میں تم مجھے نہیں چھوڑو گے۔“

”وہ تو میں تمہیں پہلی صورت میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے واضح کیا۔ ”میرا خیال ہے تم نے جواب دے دیا ہے۔ بہر حال میں پھر بھی تین تک گن کر گولی چلاؤں گا۔ ایک..... دو..... تین.....“

”رک جاؤ۔“ رامن چلایا۔ پہلی بار اس کے لہجے میں خوف کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں سچ سچ گولی چلا دوں گا۔ ”کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو گے۔“

میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”کوئی ضمانت نہیں ہے تمہیں میرے کہے پر بھروسہ کرنا ہوگا۔“

”اگر میں راج کنور کو چھوڑ دوں تو کیا تم مجھے جانے دو گے۔ مجھے شوٹ نہیں کرو گے؟“

میں نے سوچ کر جواب دیا۔ ”میں تمہیں ایک چانس دوں گا۔ تم اس ڈھلان سے اتر جاؤ میں وعدہ کرتا ہوں میں سیکنڈ تک تم پر کوئی فائر نہیں کروں گا۔ بے شک تم سانسے بھی ہو اس کے بعد میں تمہیں شوٹ کر دوں گا تمہیں منظور ہے؟“

”تمیں سیکنڈ کم ہیں؟“

”یہ وقت ایسبولینس سے باہر آنے پر شروع ہوگا۔“ میں نے کہا اسی لمحے مجھے بانو اور سنکاری اپنی طرف آتے دکھائی دیئے میں نے اشارے سے بانو کو وہیں رکنے کو کہا۔ وہ رک گئی۔ ”بولو کیا کہتے ہو؟“

”مجھے منظور ہے۔“ راسن نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”جب راج کو چھوڑ کر ایسبولینس سے باہر نکل جاؤ۔ تمہارے باہر آتے ہی میں بلند آواز سے گننا شروع کروں گا۔ تمیں تک تم جتنی دور جا سکتے ہو چلے جانا۔“

”تم میرے پیچھے آؤ گے؟“

”نہیں میں ڈھلان پر قدم نہیں رکھوں گا میں نے کہا تم میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا کہ تمہارے پاس وقت کم ہے۔“

”کس بات کا جواب؟“

”ہمارے اوپر اڑنے والے ہیلی کاپٹر میں تم تھے؟“

میں راسن کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ اس نے بہت جلدی میں درست نتیجہ نکالا تھا۔ ”اگر میں مان لوں تو اترے میری بات کی تصدیق کیسے ہوگی؟“

”اس کا مطلب ہے تم راج کنور کو لے کر سرحد پار جانا چاہتے ہو۔ صرف راج کنور جانتا ہے کہ سرحدی حکام سے کیسے ڈیل کرنا ہے۔“

میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ راسن کچھ زیادہ ہی ذہین ثابت ہو رہا تھا بلکہ چند لمحے بعد مجھے پتا چلا کہ اس کے سر میں شیطان کا دماغ فٹ تھا، جب اچانک راج کنور کے چلانے کی آواز آئی۔ ”بچاؤ اس نے آگ لگا دی ہے۔“

مجھے ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ راسن ٹوٹی وڈ اسکرین سے نکلا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن وہ فوراً ہی ڈھلان پر غائب ہو گیا۔ جب میں کنارے پہنچا تو وہ قلابازیاں کھا کھا دکھائی دیا تھا اور چند لمحوں میں کوئی بیس گز نیچے جا چکا تھا میں نے اس پر لگا تار فائر کیے مگر کوئی گولی نشانے پر نہیں بیٹھی اور وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ جس رفتار سے نیچے جا رہا تھا اس کے بجٹے یا کم سے کم صحیح سلامت رہنے کے امکانات بہت کم نظر آرہے تھے۔ میں واپس آیا کیونکہ راج کنور دہشت سے مسلسل چلا رہا تھا۔ وہ جس اسٹریچر پر لیٹا ہوا تھا اس کے ساتھ ہی فرش پر شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اور یہ جھیل رہے تھے۔ مکار راسن نے کسی آگ پکڑنے والے محلوں کی بوتل توڑ کر اسے آگ دکھا دی تھی۔ اگر راج کنور کو فوری نہ نکالا جاتا تو شعلے اسے لپیٹ میں لے لیتے۔

راج کنور اسٹریچر پر نیم دراز تھا اور رامن نے اس کے پیچھے بیٹھ کر اسے قابو کیا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں اور سینہ بھی بیلٹوں سے بندھا ہوا تھا اسی وجہ سے وہ حادثے کے باوجود اپنی جگہ موجود رہا تھا۔ اگر وہ بندھانہ ہوتا تو اسے مزید زخم لگ سکتے تھے اور وہ وفات بھی پاسکتا تھا۔ میں نے اسٹریچر کھینچا مگر وہ کسی میکینزم سے فٹ تھا۔ میں نے جبک کر دیکھا تو ایک فولادی کلپ اسے پکڑے ہوئے تھا۔ اسے کھولا تو اسٹریچر آرام سے باہر نکل آیا تھا اس دوران میں شعلے اور دھواں بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ میں اسٹریچر کو کھینچتا ہوا سڑک تک لایا اور پھر اسے سڑک پر چڑھاتے ہوئے ایمبولینس سے دور بھاگا۔ اسٹریچر اوپر نیچے بھی ہو جاتا تھا۔ اس کے پیسے بڑے اور رواں تھے اس لیے مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بانو اور سنکاری میری طرف آئے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچا تھا کہ ایمبولینس کی طرف سے دھماکہ ہوا اور شعلہ بلند ہوا تھا اس کا پیٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا۔ سنکاری نے دہشت زدہ ہو کر سینے پر کر اس بتایا۔ ”گاڈ..... گاڈ واٹ از دس۔“

”بلاسٹ۔“ میں نے بدستور بھاگتے ہوئے کہا۔ ”میری مدد کرو اس مردے کو کھینچنے میں ورنہ دوسرا بلاسٹ ہم سب کو اوپر پہنچا دے گا۔“

سنکاری دم بخود رہ گیا تھا۔ اول تو میری مہینہ محبوبہ کے بجائے اسٹریچر پر حرام صورت راج کنور تھا دوسرے وہ بالکل بھی مردہ نہیں تھا۔ سنکاری نے شک سے کہا۔ ”یہ تمہارا محبوبہ ہے؟“

”تمہارا داغ درست ہے یہ اس کا باپ ہے۔“

”پر تم نے تو کہا تھا.....“

ڈھلان پر اسٹریچر ریس نے مجھے تھکا دیا تھا اس لیے میں رک گیا اور دقت گزاری کے لیے پستول سنکاری کی طرف سیدھا کیا۔ ”لگتا ہے تم یہیں رہنا چاہتے ہو، ٹھیک ہے ہیلی کاپٹر ہم خود لے جائیں گے۔“

وہ گڑبڑایا۔ ”میں نے کب انکار کیا؟“

اس نے جلدی سے آگے سے اسٹریچر پکڑ لیا اور اسے کھینچنے لگا۔ میں پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔ بانو ساتھ دوڑ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا آپ کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں زخمی ہیں۔“

”معمولی زخم ہیں۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”پلان کامیاب رہا لیکن رامن نکلنے میں کامیاب رہا۔“

بانو تشویش زدہ ہو گئی۔ ”یہ برا ہوا۔“

”اس سے بھی زیادہ برا یہ ہے کہ وہ اصل پلان سے واقف ہو گیا ہے کہ ہم کس طرح راج کنور کو استعمال کریں گے۔“

بانو مزید فکر مند ہو گئی۔ ”کیا اس صورت میں پلان پر عمل کرنا مناسب ہو گا؟“

میں نے موبائل پر وقت دیکھا۔ ”ابھی سوا چار ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے کافی وقت ہے ہمارے پاس۔ رامن ڈھلان پر لڑھک رہا تھا۔ اگر بچ بھی گیا تو اس کی بڑی بھلی ایک ہو چکی ہوگی اور اگر ٹھیک رہا تب بھی یہاں سے نکل کسی ایسی جگہ پہنچنے میں اسے خاصا وقت لگے گا کہ وہ کسی سے رابطہ کر کے ہمارا راستہ کوا سکے۔“

راج کنور ہماری گفتگو سن رہا تھا اس نے مداخلت کی۔ ”یہ بہت خطرناک ہو گا۔ اگر رامن نے رابطہ کر لیا تو ہم مارے جائیں گے۔ درحقیقت اسی نے ہمارے لیے یہ سہولت حاصل کی تھی۔ وہ اس کے طریقہ کار سے پوری

طرح واقف ہے۔“

”مجھے یقین ہے وہ اس قابل نہیں ہوگا کہ اعلیٰ حکام سے رابطہ کر سکے۔“

”یہ رسک ہے۔“ راج کنور نے کوشش جاری رکھی۔ ”فرض کرو اس نے کر لیا تو.....“

”جب تم ہمارے ساتھ ہی پر لوک سدھارو گے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایسا ہوگا نہیں، رامن گولی کی رفتار سے تقریباً تین سو فٹ گہری کھائی میں جا رہا تھا تم خود سوچو وہ زندہ بچ بھی گیا تو کیا چوٹیں اسے کچھ کرنے کے قابل چھوڑیں گی۔ اس لیے تم رامن کو اپنے ذہن سے نکال دو اور یہ سوچو کہ تم نے زندہ رہنا ہے اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔“

راج کنور نے سر ہلایا اور رو دینے والے لہجے میں بولا۔ ”اس کے بعد یہاں والے مجھے کہاں چھوڑیں گے؟“

”تم سے تفتیش ہوگی لیکن جہیں پھانسی نہیں چڑھا دیا جائے گا۔ تم بچنا جانتے ہو اس لیے فضول کی بحث سے گریز کرو۔“ کہتے ہوئے میرا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ یہ شٹ آپ کا حکم تھا اور راج کنور شٹ آپ ہو گیا۔ سنکاری کے کان بھی ہماری گفتگو پر لگے ہوئے تھے اور وہ سخت متوجہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس نے سوالات سے گریز کیا اور ہم ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچ گئے جس کے دوسری طرف کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اور حیران پریشان لوگ ہیلی کاپٹر کے پاس جمع تھے کہ یہ کہاں سے سڑک پر آن پڑا اور اس کا عملہ کہاں ہے؟ ہمیں دیکھ کر کچھ لوگ آگے آئے مگر جب انہوں نے بانو کو مسلح دیکھا تو اُلٹے قدموں پیچھے لوٹ گئے۔ وہ خوفزدہ تھے اور مجھے بھی مسلح پانکران کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا۔ ”لیڈیز اینڈ جنٹلمین پیچھے ہٹ جائیں ابھی یہ ہیلی کاپٹر یہاں سے اڑے گا اور آپ کو راستہ مل جائے گا مگر ابھی پیچھے ہٹ جائیں۔“

یہ سنتے ہی لوگ غلت میں پیچھے ہٹنے لگے۔ بلکہ آگے والے تو اپنی گاڑیاں بھی پیچھے لے جانے لگے اور یہ اچھی بات تھی کیونکہ پرواز کے وقت ہیلی کاپٹر کچھ ڈولتا بھی ہے۔ اس کے سیکھے کسی گاڑی سے نکلے تو ہمارا مشن بارڈر کر اس میں ختم ہو جاتا۔ میں نے سنکاری کی مدد سے راج کنور کو اٹھا کر عقبی نشست پر بٹھایا۔ اس کے بازو کا پلاسٹر کھول دیا تھا اور اب صرف سیلنگ باندھی ہوئی تھی البتہ ٹانگ پر گھٹنے کا پلاسٹر برقرار تھا۔ اسے بٹھا کر سیٹ بیلٹ سے جکڑ دیا تھا۔ بانو اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ وہ دنیا میں جس فرد سے سب سے زیادہ نفرت کر سکتی تھی وہ راج کنور ہی تھا۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ مجھے آگے بیٹھنا تھا تا کہ سنکاری پر پوری نظر رکھ سکوں۔ وہ بانو سے چھپا کر کوئی حرکت کر سکتا تھا لیکن مجھ سے چھپانا مشکل تھا۔ اب ایک ہیڈ فون راج کنور کو بھی دے دیا گیا۔ سرحد پار کرانے کے لیے اسے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ سنکاری نے پائلٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے پوچھا۔ ”اب کدھر جانے کا ہے؟“

”ہمیں امرتسر تک جانا ہے کیا چو پرکا اینڈھن کافی ہوگا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی فیول کم ہے۔ لینا پڑے گا۔“

”ہم نے مشکل سے پندرہ منٹ کی پرواز کی ہے؟“

”ہاں پر یہ لویلول اور لوکروز تھا اس میں فیول بہت خرچ ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے فیول کہاں سے لو گے؟“

”اپنے انٹرکلب سے.....“ اس نے جواب دیا۔ ”ادھر سستا پڑتا ہے۔“

”تم سستے کے چکر میں مت پڑو۔ وہاں تمہارے بہت سے جانے والے ہوں گے بلاوجہ آجائیں گے۔ کسی ایسی جگہ سے لے لو جہاں زیادہ لوگ نہ ہوں اور کام آسانی سے ہو جائے۔“ میں نے کہا۔ ”ادائیگی میں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے پھر ادھر ہوشیار پور سے لے سکتا ہے۔ ادھر کئی چھوٹا انٹر فیلڈ ہے اور کوئی زیادہ بات بھی نہیں کرتا ہے۔“

میں نے نقشے پر پہلے ہوشیار پور دیکھا۔ یہ تقریباً روٹ کی سیدھ میں آتا تھا۔ جب کہ سنکاری امرتسر منزل سمجھ رہا تھا۔ ہمیں اس سے اوپر جانا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ہوشیار پور ہی چلو مگر کوئی ہوشیاری مت دکھانا۔ تم بار بار گاڑی کہتا ہے اس کا مطلب ہے گاڑی پر اور اس کے بنائے ہیل پر یقین رکھتا ہے۔ غلط حرکت کر کے ہیل جانے کی کوشش مت کرنا۔“

اس نے پستول کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”اس کے ہوتے ہم کیا ہوشیاری دکھا سکتا ہے۔“

”بس ایک خیال رکھنا کہ تم نے زندہ رہنا ہے اور اپنا انعام حاصل کرنا ہے۔“

وہ چونکا۔ ”انعام.....؟“

میں نے جیب سے ہزار کے نوٹ والی گڈی نکالی۔ ”یہ ایک لاکھ روپے ہیں، اگر تم نے ہمیں منزل پر پہنچا دیا تو یہ تمہارے ہوں گے معاوضے کے علاوہ۔“

پہلی بار وہ خوش نظر آیا۔ ”ہم پہنچائے گا..... کیوں نہیں پہنچائے گا۔“

سنکاری نے انجن اشارت کرنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں بعد ہیلی کاپٹر کے پچھے گردش میں آگئے تھے اور ایک منٹ سے بھی پہلے انہوں نے پوری طاقت پکڑ لی۔ سنکاری نے اسٹک کھینچی اور ہیلی کاپٹر ایک ہلکے سے دھچکے سے اوپر اٹھ گیا تھا۔ لوگ اپنی گاڑیوں سمیت پیچھے ہٹ گئے تھے۔ چند لمحوں میں ہم خاصی بلندی پر آگئے تھے۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”اس بار رفتار ہر ممکن تیز رکھنا۔“

”مجھے ٹرانسپونڈر آن کرنے دو، ورنہ چوپڑا آئی ڈی نہیں آئے گا ریڈار پر مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے آن کرلو۔ مگر کیا یہ ضروری ہے؟“

”ہاں..... تیزی کے لیے اوپر جانا ہوگا چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ادھر اڑتھک نہیں کم ہوتا ہے اس لیے چوپڑا

تیزی سے چلتا ہے۔“

مغرب کی طرف جاتے ہوئے بتدریج ہیلی کاپٹر کی بلندی بھی بڑھ رہی تھی۔ ہم دیے ہی چار ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ میں سنکاری کا مطلب سمجھ گیا تھا کہ بلندی پر اڑنے کی وجہ سے ہم ریڈار پر نظر آتے اور اگر ہیلی کاپٹر کی طرف سے ایک مخصوص آئی ڈی نہیں ملتی تو انٹر ٹریفک کنٹرولر کوئی کارروائی بھی کر سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ انڈیا میں بے پناہ غربت کے باوجود ایک خاص طبقے میں دولت کی ریل پیل تقریباً مغرب جیسی ہو گئی تھی

اور اب یہ طبقہ مغربی ارب چنیوں کے انداز میں زندگی گزار رہا تھا۔ بے انتہا عالی شان محلات، قیمتی گاڑیاں اور نجی ہیلی کاپٹر و طیاروں کا استعمال۔ شملہ جیسی چھوٹی جگہ پر کئی ایئر کلب تھے اور ہر ایئر کلب میں درجنوں طیارے اور ہیلی کاپٹر موجود تھے۔ راج کنور جیسے لوگوں کے ذاتی ہیلی پیڈ تھے۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ میدانی علاقوں میں بے شمار ہیلی کاپٹر اور نجی طیارے ہمہ وقت محو پرواز رہتے ہوں گے۔ ایسے میں ہمارا ہیلی کاپٹر کسی خاص توجہ کا مستحق نہیں رہے گا۔ بشرطیکہ اس کا ٹرانسپونڈر آن رہے۔

چھ ہزار فٹ کی بلندی پر آنے کے بعد ہیلی کاپٹر کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ اب یہ تقریباً دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا۔ ہوشیار پور شملہ اور پاکستان کے تقریباً وسط میں تھا۔ مجھے ایک اطمینان اور ہو گیا۔ پہلے مجھے غلط تھی کہ میں سنکاری کو استعمال کروں گا اور اسے پاکستان تک لے جاؤں گا اور پھر اسے واپس جانا ہوگا۔ اس کے پاس ایندھن اتنا نہیں ہوگا اور ممکن ہے اسے راستے میں کریش لینڈنگ کرنا پڑتی اور ممکن ہے وہ مارا جاتا۔ اب ہوشیار پور سے پورا فوٹول ٹینک بھر لینے کے بعد وہ آرام سے واپس ہوشیار پور تک آسکتا تھا بشرطیکہ بھارتی دفاعی حکام اسے پکڑ نہ لیتے۔ راج کنور کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ شوٹ ڈاؤن کر دیتے۔ مگر بعد میں یقیناً اس کی کم سختی آتی اور اسے تقویت کے گڑے سے گزرنا پڑتا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”ہم کتنی دیر میں ہوشیار پور پہنچ جائیں گے؟“

”اب آدھا گھنٹہ لگے گا۔“ اس نے کنٹرول پینل دیکھتے ہوئے کہا۔

میرا ارادہ تھا کہ ہوشیار پور میں جب سنکاری ایندھن لے رہا ہوگا تو راج کنور سے بات کروں گا۔ اس سے مکمل تفصیل لوں گا کہ وہ سرحد کس طرح پار کرتا ہے۔ اگر مجھے محسوس ہوگا کہ اس طرح کوئی خطرہ ہے تو پھر بھارتی حکام سے بات نہیں ہوگی۔ مجھے امید تھی جب تک ان کا ایئر ڈیفنس سسٹم حرکت میں آئے گا ہم سرحد پار کر جائیں گے لیکن اس کے لیے راج کنور سے بات کرنا ضروری تھی۔ میں سیٹ پر بچھل کر بیٹھ گیا۔ دھلان پر گرنے کے دوران جسم پر لگنے والی چوٹیں اب ڈکھ رہی تھیں اور یوں آرام کرنے سے مزہ آ رہا تھا۔ لیکن میری نظریں پوری طرح چوکس تھیں اور سنکاری کی ایک ایک حرکت پر نظر تھی۔ عقب میں بانو اور راج کنور بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ بانو اس سے شدید نفرت کرتی تھی اور بہت مجبوری کے عالم میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی ایک بار میں نے مزکر دیکھا تو وہ سیٹ کے انتہائی کونے میں راج کنور سے مکمل حد تک دور بیٹھی تھی۔ اسی لمحے اس نے راج کنور کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نفرت چمکی تھی۔ راج کنور اس سے بے خبر اپنی خیریت کے بارے میں فکر مند لگ رہا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”شہباز تم بہت خطرناک کام کرنے جا رہے ہو۔“

سنکاری چونکا۔ ”تم مسلم ہے پر تم نے تو.....“

”میں نے غلط بتایا تھا۔“ میں نے غرا کر کہا۔ ”انہما منہ بند کر کے اپنا کام کرو۔“

”تم سرحد پار نہیں کر سکو گے۔“ راج کنور نے شراٹگیزی جاری رکھی۔

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”بس اتنا یاد رکھو کہ اگر تم زندہ رہے تو اس کا مطلب

ہے میں سرحد پار چاکا ہوں دوسری صورت میں تمہارے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے، میں نے راس سے

غلط نہیں کہا تھا۔ اگر تم میری ضرورت نہ ہوتے تو میں تم دونوں کو ایک ساتھ ہی دنیا سے رخصت کرتا۔“

قتل و خون سے بھرپور یہ گفتگو سن کر سنکاڑھی کے چہرے پر تشویش کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے مگر وہ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ راج کنور کو دوا دینے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور پھر میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس خیال نے بھی مجھے باز رکھا کہ کہیں وہ ٹن نہ ہو جائے اور بہ وقت ضرورت کسی کام کا نہ رہے۔ مگر اب وہ شرارت پر آمادہ تھا۔ فی الحال میں اسے چپ نہیں کر سکتا تھا اس لیے صبر سے کام لے رہا تھا مگر بانو سے صبر نہیں ہو سکا۔ اچانک وہ کراہا تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ بانو نے پستول سے اس کے شانے پر ضرب لگائی تھی۔ بانو اس سے کہہ رہی تھی۔ ”اپنا منہ بند رکھ کتے..... اب آواز نکالی تو زبان کاٹ دوں گی۔“

وہ تکلیف کے باوجود خباثت سے باز نہیں آیا تھا۔ ”کاٹ دو پھر میں بات کیسے کروں گا۔“ بانو نے دوسری ضرب لگائی۔ ”وہ تمہارا باپ بھی کرے گا زبان میں بعد میں کاٹ سکتی ہوں اور زبان کیا میں تمہارے کلوے کلوے بھی کر سکتی ہوں مجھے پہلے والی بانو مت سمجھنا۔“

بانو کا یہ روپ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا جب وہ اپنے عشرت کدے میں اسے بھگت چکا تھا۔ بانو نے اس کا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ راج کنور خوفزدہ ہو گیا۔ ”شہباز نے مجھے زبان دی ہے؟“

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم جو چاہے بکواس کرتے رہو۔“ میں نے کہا۔ ”اگر عتاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی کوشش کرو ورنہ تمہارے ساتھ یہی ہوتا رہے گا۔“

”آپ فکر نہ کریں یہ آپ کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اسے کتے کی ڈم کی طرح سیدھا کر دوں گی۔“

”حالانکہ کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”میں کر سکتی ہوں۔“ بانو نے دعویٰ کیا۔

سنکاڑھی نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ”تھینک گاڈ میں نے کوئی غلط بات نہیں کیا، یہ جھوٹری تو بہت ڈنچرس

ہے۔ زبان کاٹ دیتا ہے۔“

بیلی کا پٹر میں ذرا سکون ہوا تو مجھے راسن کا خیال آیا۔ اس نے بہت چالاکی سے کام لیا۔ مجھے باتوں میں لگایا اور پھر ایسا کام کیا کہ میں اس کے پیچھے نہ جا سکوں۔ وہ بہت تیز ذہن شخص تھا اس نے باتوں کے دوران طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے دوا یا محلول کی شیشی توڑی اور اسے آگ دکھادی۔ پھر وہ وڈا سکرین کے راسے نکل گیا، اس طرح وہ میرے سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ تقریباً خودکشی کے انداز میں نیچے گیا تھا۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مارا جائے گا۔ اس جیسی ڈھیٹ ہڈی اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔ مگر مجھے بڑی حد تک امید تھی کہ وہ اوپر والوں سے رابطہ نہیں کر سکے گا۔ ہاں اگر اس نے کر لیا تو ہم مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ پھر بھی اس کا امکان بہت کم تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے سنکاڑھی سے پوچھا۔ ”تمہاری فیملی ہے؟“

اس نے سر ہلایا اور اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھادی۔ ایک تقریباً سیاہ فام عورت ایک بچے کو گود میں اٹھائے مسکرا رہی تھی۔ اس کی اصل خوب صورتی اس کی منہ تھی۔ بچے میں ماں باپ کی خصوصیات جھلک رہی تھیں مگر اس کے چہرے پر دلفریب معصومیت تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”اچھی ہے۔“

”مجھ کو رونا دیر سے ملا پر اب میں خوش ہے۔“

”تم خوش ہو اور دیسی نظریاں کراپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔“ میں نے ملامت کی تو وہ کھسیا گیا۔

”کیا کرے بارہ سال کی عمر سے منہ کو لگا ہوا ہے۔ فادر مر گیا تو ہم آزاد ہو گیا۔“

”اگر تم اسی طرح پیتے رہے تو تمہارا بیٹا تم سے بھی پہلے آزاد ہو جائے گا۔“ میں نے اسے خبردار کیا تو وہ

چپ ہو گیا۔ میرے خیال میں اتنی فصاحت کافی تھی۔ اس مشکل وقت میں میرا ساج سدھار مہم چلانے کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی بیوی بچے کی تصویر واپس جیب میں رکھ لی۔ میں نے گھڑی دیکھی پانچ بجنے میں دس منٹ تھے۔ سورج مغرب کی طرف آگیا تھا اور اس کی کرنیں اب سامنے سے پڑ رہی تھیں۔ ہیلی کا پٹر کا کیمین پریشاں نہیں تھا اس لیے بلندی کی وجہ سے سردی لگ رہی تھی لیکن میدانی علاقوں میں یقیناً شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ خاص طور سے پنجاب یقیناً دکھ رہا ہوگا۔ میں نے اسلحہ کی وجہ سے ہلکی جیکٹ لی ہوئی تھی کیونکہ صرف شرٹ تلے اتنا اسلحہ چھپانا ممکن نہیں تھا۔ سنکاری سے پردہ نہیں رہا تھا لیکن ہوشیار پور میں ایئر فیلڈ پر کسی کی نظر پڑ جاتی تو ہم مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ میں جیکٹ نہیں اتار سکتا تھا اور اس گرمی میں جیکٹ سے مٹھکو ہو جاتا۔ بہر حال ضروری نہیں تھا کہ ایسا ہی ہوتا۔ میں ہیلی کا پٹر کے اندر رہتا اور بانو سنکاری کے ساتھ باہر جاتی یہ بات میں نے اسے بتادی۔ اس نے اعتماد سے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں میں ہینڈل کر لوں گی۔“

”ہم بچنے والے ہیں۔“ سنکاری نے پانچ بجے اعلان کیا۔ ”بس پانچ منٹ کا راستہ اور ہے اب ریڈیو آن کر کے اجازت لینا ہوگا۔“

”کیا فلائٹ پلان بتانا ہوگا؟“

”نہیں بس فیول کے لیے اترتا ہے اس کے لیے فلائٹ پلان بتانا ضروری نہیں ہوتا ہے۔“

”دوبارہ پرواز کے لیے بھی ضروری نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ سنکاری نے نفی میں سر ہلایا۔ اس دوران میں وہ ہیلی کا پٹر نیچے لا رہا تھا۔ ”صرف ایک آف

کا بلونا ہوگا۔“

زمین اب واضح ہو رہی تھی، پہاڑ تو شیلے کے فوراً بعد ختم ہو گئے تھے۔ پھر کہیں جنگل کہیں کھیت اور کہیں آبادیاں نظر آنے لگی تھیں۔ شملہ اور ہوشیار پور ایک ہی عرض البلد پر ہیں لیکن بلندی اور پہاڑوں کی قربت سے دونوں کے موسم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کا اندازہ مجھے ہیلی کا پٹر اترنے کے بعد ہوا تھا۔ وہاں شام کے وقت بھی خاصی گرمی تھی۔ کچھ دیر بعد ایئر فیلڈ نمایاں ہونے لگی تھی۔ سنکاری ریڈیو آن کر کے اترنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اسے اجازت مل گئی اور کچھ دیر بعد ایک سرخ ریکٹ تھاے شخص ہیلی کا پٹر کو اشارہ کرنے لگا۔ وہ ہلکے تار رہا تھا جہاں ہیلی کا پٹر کو اترتا تھا۔ سنکاری ہیلی کا پٹر مخصوص پوزیشن میں لانے لگا۔ چند لمحے بعد ہیلی کا پٹر نیچے اترنے لگا۔ میں نے راج کنور کو خبردار کیا۔ ”کوئی احتیاط حرکت مت کرنا تم پہلے ہی برے حالات میں و۔ اگر مزید فریچر ز سے محفوظ رہنا ہے تو زبان بند کر کے بیٹھنا۔“

سنکاری سچ سچ بہت اچھا پائلٹ تھا۔ اس نے ہیلی کا پٹر یوں اتارا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ جب انجن کی آواز ہم ہوئی تو پتا چلا کہ ہم لینڈ کر گئے ہیں۔ انجن بند ہوتے ہی پنکھوں کی گردش کم ہو گئی تھی۔ سنکاری اپنی سیٹ بٹ کھولنے لگا۔ ”ابھی فیول کے لیے چانا پڑے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”فیول لینے میں کتنی دیر لگے گی؟“

”آدھا سے پون گھنٹا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے اترنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے تم بانو کے ساتھ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”یاد رکھنا یہ ہمارے لیے زندگی و موت کا مسئلہ ہے اگر کوئی ہمارے راستے میں آیا تو مارا جائے گا۔“

اس نے سر ہلایا اور نیچے اتر گیا۔ بانو بھی اتر گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر راج کنور کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور تکلیف زدہ لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”شہباز تم بہت خطرناک کام کرنے جا رہے ہو۔“

”اگر تم میرے بارے میں جانتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے میں نے اکثر کام بہت خطرناک کیے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ خطرناک جسے تم خطرناک سمجھ رہے ہو۔“

”شہباز پلیز میں بہت بڑی مشکل میں پھنس جاؤں گا۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔ ”مجھ پر غداری کا کس بن جائے گا۔“

”پھر تو تم معتبر ہو جاؤ گے۔“ میں ہنسا۔ ”غداری کا الزام تو اس خطے کی روایات میں شامل ہے۔ ویسے تمہارے پاس مگن پوائنٹ کا جینوین عذر ہوگا۔“

”میری کوئی نہیں سنے گا اب مجھے بڑے کنور کی سپورٹ بھی حاصل نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”ممکن ہے اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ تم آتے جاتے رہتے تھے اور مجھ کو ایک بار پھر جا رہے ہو۔ اسی طرح واپس بھی آ جاؤ گے۔“

”تم نہیں سمجھ رہے ہو، رامن اس کھیل کا ایک اہم مہرہ ہے اس کے بغیر میں سرحد پار نہیں کر سکتا ہوں اگر میں نے ایسا کیا تو فوراً گرفت میں آ جاؤں گا۔“

”اگر تم گرفت میں آ گئے تب بھی تمہارے پاس بچاؤ کے راستے ہوں گے۔ پاکستان انڈیا میں اوپری طے کو سزا دینے کی روایت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے بڑا کنور ہی تمہیں بچالے گا۔“

میں صرف اسے قائل کرنے کے لیے اتنی بحث کر رہا تھا اور اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کے خدشات سرحد کے اس پار نہیں تھے بلکہ اُس پار تھے یعنی اسے خطرہ تھا کہ میں ایک بار اسے پاکستان لے گیا تو واپس نہیں جانے دوں گا اور سچی بات ہے میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ میں اسے وہاں اتار لیتا اور پھر فیصلہ کرتا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ وہ مکاری سے یہاں کی بات کر رہا تھا اور جانے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا تھا اگر وہ واپس آ جاتا تو سزا سے بچ سکتا تھا۔ بڑا کنور بھی اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتا کیونکہ راج کنور کو سزا ہونے کی صورت میں ان کے خاندان کی بدنامی ہوتی۔ راج کنور کی مکاری کے جواب میں، میں بھی مکاری سے کام لے رہا تھا اور اسے بہلا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میری وجہ سے تمہیں ایک چانس ملے گا۔ رامن تمہیں تقریباً اغوا کر کے لے جا رہا تھا اور اس کا بھی امکان تھا کہ وہ تمہیں شملہ کے پہاڑوں میں کہیں دفن کر کے بڑے کنور سے کہہ دیتا کہ شہباز تمہیں اغوا کر کے لے گیا ہے۔ بڑا کنور اس کی بات ماننے سے انکار کر سکتا تھا؟“

”نہیں۔“ راج کنور نے اعتراف کیا۔ ”وہ ایک طرح سے بڑے کنور کا کام کرتا کیونکہ بڑا کنور مکمل کر میرے خاتے کا حکم نہیں دے سکتا ہے البتہ میں مر جاؤں تو اسے بہت خوشی ہوگی ایک مستقل بوجھ سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔“

”اس صورت میں واپسی کے بعد تم اپنی مرضی سے کہیں جانے کے لیے آزاد ہو گے۔“

”ہاں اگر میں واپس آسکا۔“ راج کنور نے سرد آہ بھری۔ ”اگر رامن نے اوپر والوں سے رابطہ کر لیا تو اس کے بعد سرحد پار کرنا تمہارا خواب بن جائے گا۔ اس سے پہلے ہی کوئی میزائل فضا میں اس ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے کر دے گا۔“

”میرا نہیں خیال کہ انٹریڈیفنس سسٹم اتنی تیزی سے حرکت میں آئے گا۔“ میں نے تردید کی۔

”یہ تمہارا خیال ہے، انڈیا نے اپنا ڈیفنس بجٹ بہت بڑھا دیا ہے اور اس نے اپنا انٹریڈیفنس سسٹم سب سے زیادہ اہم قرار دیا ہے کیونکہ ہمیں سب سے زیادہ خطرہ پاکستان کی فضائیہ اور اس کے میزائلوں سے ہے۔“

”حالانکہ انڈیا کی فضائیہ بھی ہم سے دوگنی بڑی ہے۔“

”ہاں لیکن ہمارے پاس زیادہ تر روسی ساختہ طیارے ہیں جب کہ پاکستان کے پاس مغربی طیارے بھی ہیں جو روس سے بہتر ٹیکنالوجی رکھتے ہیں۔“

ایک انڈین کے منہ سے یہ اعتراف سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہماری فضائیہ انڈیا سے بہتر ہے، اور انڈیا اس سے خوف کھاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنی فضائی قوت میں تیزی سے اضافہ کر رہا ہے جیسے کہ وہ بحری قوت میں پہلے ہی بہت زیادہ اضافہ کر چکا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”سرحد پار کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟“

وہ ہنسی بھرا ہوا کہہ کر۔ ”ہوشیار پور سے تو مجھے نہیں معلوم لیکن امرتسر سے پرواز کے بعد ہم سرحد سے پانچ کلومیٹر پہلے صرف سو فٹ کی بلندی پر آجاتے ہیں۔ اس وقت پاکستانی ریڈار ہمیں ٹریک نہیں کر سکتا ہے۔ صرف انڈین ہماری مودمنٹ سے واقف ہوں گے۔ سرحد پار کرنے سے پہلے فوجی حکام ریڈیو پر رابطہ کرتے ہیں اور انہیں مخصوص پاس ورڈ بتانا پڑتا ہے۔ تب گزرنے کی اجازت ملتی ہے۔“

”کیا یہ نشریات کہیں اور نہیں سنی جا رہی ہوتی ہے؟“

”نہیں..... فوجی ریڈیو مخصوص فریکوئنسی پر کام کرتا ہے۔“

”لیکن یہ عام ہیلی کاپٹر ہے۔ اس کا ریڈیو اس فریکوئنسی کو کیچ کر لے گا؟“

”ہاں جب میں پائلٹ کو مخصوص فریکوئنسی بتاؤں گا تو وہ رابطہ کر سکے گا بلکہ وہ صرف ٹیون کرے گا رابطہ حکام خود کریں گے۔“

”فرض کرو انہوں نے رابطہ نہ کیا تو اور تم نے پھر بھی سرحد پار کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟“

”کسی خفیہ میزائل میٹری سے ایک میزائل نکلے گا اور اس ہیلی کاپٹر کے پرزے اڑ جائیں گے۔“

”بغیر کسی وارننگ کے؟“

اس نے سر ہلایا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”یہ ہائی سیوریٹی زون ہے گزشتہ پانچ سال میں کم سے کم ایک

درجن طیاروں اور ہیلی کاپٹر کو اسی سسٹم نے ہٹ کیا ہے ان میں سے ایک یاد پاکستانی بھی تھے جو غلطی سے سرحد پار کر گئے تھے۔ یہ آٹو میک سسٹم ہے جو پہلے سے دی ہوئی ہدایات کے مطابق کام کرتا ہے۔“

”یہ درندگی ہے..... کسی مہذب ملک میں ایسا نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر کبھی اس سسٹم کو کوئی مسافر بردار طیارہ مشکوک لگا تو کیا اسے بھی ہٹ کر دیا جائے گا؟“

راج کنور نے سر ہلایا۔ ”ایک چھوٹا مسافر بردار طیارہ امرتسر ایئر پورٹ سے پرواز کے بعد نشانہ بنا تھا۔ وہ غلطی سے اوپر جاتے ہوئے ریڈ زون میں آ گیا تھا۔ بعد میں اسے حادثہ قرار دے دیا گیا تھا۔“

”تم لوگ اتنی ذہناتی سے اپنی فاش غلطیوں پر پردے ڈالتے ہو۔“ میں نے فحشی سے کہا۔ ”انسانی جانوں کی تم لوگوں کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے؟“

”صرف ہم نہیں ساری دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ امریکا نے ایران کا طیارہ گرا دیا۔ روس نے جنوبی کوریا کا طیارہ مار گرایا۔ کس نے اپنی غلطی تسلیم کی؟“

وہ درست کہہ رہا تھا ایسے ہی کئی پُر اسرار فضائی حادثے میرے ملک میں ہو چکے تھے اور ان کا کچھ نہیں پتا چلا تھا کہ ان کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ ایک مسافر بردار طیارہ تو سرے سے غائب تھا اور اس کا آج تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ راج کنور سے باتوں میں مجھے خیال آیا کہ وقت خاصا ہو گیا تھا اور ابھی تک نہ تو سنکاری اور بانو واپس آئے تھے اور نہ ہی ہیلی کاپٹر میں فیول بھرنے کے آثار دکھائی دیئے تھے۔ میں نے وقت دیکھا۔ پانچ بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے یعنی سنکاری اور بانو کو گھمے ہوئے بیس منٹ ہونے کو آئے تھے اور اتنی دیر میں انہیں واپس آ جانا چاہیے تھا۔ اگر فیولنگ میں کچھ دیر تھی تب بھی وہ واپس تو آ سکتے تھے۔ یہ کوئی بہت بڑا ایئر کلب نہیں تھا جہاں کہیں آنے جانے میں زیادہ وقت لگے جب کہ ایئر کلب کی عمارت بھی مشکل سے سو گز کے فاصلے پر تھی۔ راج کنور نے میرے چہرے سے بھانپ لیا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کوئی گز بڑے؟“

”ہاں لیکن تم اس گز بڑ کا حصہ مت بننا۔“ میں نے اسے خبردار کیا اور نیچے اتر آیا۔ دروازے کے شیشے کے پیچھے سے راج کنور مجھے دیکھ رہا تھا وہ بھاگ نہیں سکتا تھا مگر کیا کہا جاسکتا ہے کہ جب انسان کی جان پر بنی ہو تو وہ کیا حرکت کر گزرے۔ کم سے کم وہ چیخ چلا کر مدد تو طلب کر سکتا تھا۔ یہاں قطار میں کئی ہیلی کاپٹر کھڑے تھے۔ چھوٹے طیارے ذرا فاصلے پر تھے۔ یہ چھوٹائی فحشی یا سرکاری ایئر پورٹ تھا۔ خاموشی اور نہ ہونے کے برابر جھل پہل تھی۔ ایئر پورٹ کی عمارت اور دوسری تنصیبات ذرا فاصلے پر تھیں۔ جہاں تک نظر جاتی تھی سنکاری اور بانو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یہاں دھوپ تیز تھی اور شام کے وقت بھی اچھی خاصی تیز روشنی تھی۔ اس میں سب صاف نظر آ رہا تھا ایک کونے میں دو افراد ایک چھوٹے طیارے کے انجن کے ساتھ لگے تھے۔ ایک سو بھر جگہ اڑ کر آنے والے کاغذ کے ٹکڑے اور شاپر جمع کر رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے خود جا کر دیکھنا ہو گا مگر سوال یہ تھا کہ میں راج کنور کو کس پر چھوڑ کر جاتا۔ وہ لازماً اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ اسے ساتھ لے جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ اسی لمحے مرکزی عمارت کے پیچھے سے بانو اور سنکاری دو افراد کے ساتھ نکلتے نظر آئے میں فوری طور پر ہیلی کاپٹر کی آڑ میں ہو گیا۔ بانو اور سنکاری آگے تھے اور وہ دونوں افراد پیچھے چل رہے تھے۔ نقوش اور رنگت سے مقامی نظر

آنے والے یہ دو افراد چہرے سے جرائم پیشہ اور سفاک دکھائی دے رہے تھے اور ساتھ ہی بہت چوکنا تھے۔ ان کی نظریں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں اور وہ یوں بانو اور سنکاری کو آگے رکھے ہوئے تھے جیسے انہیں گمن پوائنٹ پر لیا ہوا ہو۔ سنکاری کی حالت تو خراب تھی ہی بانو بھی بادل نا خواستہ چل رہی تھی۔

میں تشویش زدہ ہو گیا۔ یہ کیا چکر تھا؟ میرا ذہن راسن کی طرف گیا کہ کیا اس نے کوئی حرکت کی تھی؟ لیکن اس صورت میں یہاں فورس ہوتی۔ صرف دو افراد نہ ہوتے۔ وہ بھی اپنے انداز سے کسی فورس سے متعلق نہیں لگ رہے تھے۔ سنکاری خوفزدہ تھا۔ بانو کے ہاتھ خالی تھے شاید اس کا پستول چھین لیا گیا تھا۔ دونوں افراد نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھ پتلونوں کی جیبوں میں تھے۔ جیبوں کے ابھار بتا رہے تھے کہ انہوں نے ہتھیار تھام رکھے تھے۔ جیسے جیسے وہ ہیلی کاپٹر کی طرف آرہے تھے میں نیم دائرے میں گھومتا ہوا ہیلی کاپٹر کے دوسری طرف جا رہا تھا پھر مجھے نہ صرف آڑ میں ہونا پڑا بلکہ برابر میں کھڑے ہیلی کاپٹر تک جانا پڑا۔ کیونکہ وہ ذرا اور آگے آتے تو لازمی مجھے دیکھ لیتے اور اس کے بعد مجھے کارروائی کرنا پڑتی تو یہاں ایک کھلی جنگ چھڑ جاتی اور فی الحال میں کسی جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس ہیلی کاپٹر کے شیشے سیاہ تھے۔ میں نے دروازہ چیک کیا اتفاق وہ کھلا تھا اور میں اندر گھس گیا۔ فوراً ہی وہ لوگ آچپچے۔ اب انہوں نے اپنے ہتھیار نکال لیے تھے۔ ایک آدمی نے چھوٹے سائز کا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ دونوں چالیں کے آس پاس تھے۔ رنگ سیاہی مائل اور چہرے پر جرم کی چھاپ تھی جسمانی طور پر مضبوط تھے اور ان کا پستول پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ انہیں استعمال کرنے میں ماہر تھے۔ انہوں نے آتے ہی ہیلی کاپٹر میں جھانکا اور دوسرے کو اطلاع دی۔ ”ادھر ایک ہی آدمی ہے۔“

دوسرے نے سنکاری کی گردن پکڑ لی۔ ”بول کہاں ہے تیری ماں کا یار؟“

یقیناً وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میری تشویش ایک بار پھر بڑھ گئی اگر وہ خاص طور سے میرے لیے آئے تھے تو یقیناً ان کے پیچھے اور لوگ بھی تھے۔ میں نے ہیلی کاپٹر کا دروازہ ذرا سا کھلا رکھا تھا اس لیے مجھے ساری آوازیں آرہی تھیں۔ سیاہیشوں کے پیچھے دیکھنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا البتہ مجھے وہ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سنکاری نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”میرے کو کیا معلوم وہ کدھر ہے۔ لڑکی سے پوچھو یہ اسی کا ساتھی ہے۔ میں تو گمن کے آگے مجبور ہے۔“

”لڑکی وہ کہاں ہے؟“ دوسرے نے بانو کا ہاتھ پکڑا تو اس نے ہاتھ جھڑالیا اور پھر کر بولی۔

”مجھے دوبارہ ہاتھ مت لگانا۔“

”اچھا بڑا جور ہے دیکھیں گے تیرا جور بھی۔“ اس کے انداز میں خباثت نمایاں تھی۔

”رکھو یہاں سے نکلو پولیس نہ آجائے۔ اس پر لپٹ بھیجو۔“ دوسرے نے کہا۔ ”وہ لوگ پیچھے ہیں۔ ادھر آگئے تو ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“

”اس جھوکری کو بھی لے جانا ہے۔“ رگھو نے لپٹائے لیے میں کہا۔ ”کیا چیز ہے یہ.....؟“

جواباً چیز نے اس کے ساتھ جو کیا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بانو نے اچانک گھوم کر اسے رائڈنگ کک ماری۔ اس کا نشانہ پستول والا ہاتھ تھا اور ضرب نے پستول اڑا دیا۔ وہ کزدور نہیں تھا مگر اچانک کیے

جانے والے دار کے آگے مدافعت نہ کر سکا۔ دوسرا سنکاری کو چھوڑ کر مضطرب لہجے میں بولا۔ ”اے..... اے گولی مار دوں گا۔“

”نہیں گرج۔“ رکھو بولا۔ ”اسے میں ٹھیک کر دوں گا اسے ساتھ۔“

اس کا جملہ احوال وارہ گیا کیونکہ بانو کی کلک اس بار اس کے منہ پر پڑی تھی اور اس لات نے اسے دن میں تارے دکھا دیئے تھے۔ وہ پلٹ کر نیچے گرا۔ اس بار گرج نے فیصلہ کن انداز میں بانو کی طرف پستول سیدھا کیا لیکن اس سے پہلے وہ گولی چلا تا میرے سالنکسر لگے پستول سے شعلہ نکلا اور اس کی کھوپڑی میں اتر گیا۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ میں نے کھوپڑی کا نشانہ ہی لیا تھا اسے ایک لمحے کی مہلت دینا بانو کی زندگی سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ وہ سب ہیلی کاپٹر کی اس والی طرف تھے۔ گرج کے گرتے ہی رکھو بہت جی سے حرکت میں آیا تھا اس نے جھپٹ کر اپنا پستول اٹھایا اور اسے مہلت دینا کسی زہریلے سانپ کو مہلت دینے کے برابر تھا۔ میں نے اسے شوٹ کر دیا ایک گولی اس کی گردن پر لگی وہ نیچے گرا اور غرغراتا ہوا اٹھا تھا کہ دوسری گولی نے اسے ہمیشہ کے لیے لٹا دیا۔ یہ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی۔ سنکاری یہ سب دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بانو مجھے تلاش کر رہی تھی۔ پہلے وہ نہیں دیکھ سکی تھی کہ میں کہاں تھا۔ پھر وہ ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑی میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

”مجھے یقین تھا آپ کچھ کریں گے۔“ بانو نے میرا بازو تھام لیا۔ وہ بہت پُر جوش ہو رہی تھی۔

”ہوش کرو ان کا کچھ کرنا ہے اس سے پہلے کہ کوئی یہاں آجائے اور ہم پکڑے جائیں۔“

سنکاری سکتے میں کھڑا تھا۔ مجھے فوری طور پر یہی خیال سوجھا کہ لاشوں کو سیاہ شمشے والے ہیلی کاپٹر میں ڈال دیا جائے۔ میں نے رکھو کو ناگوں سے پکڑ کر کھینچا اس کے سر سے زیادہ خون نہیں نکلا تھا اور اسے ہیلی کاپٹر میں ڈال دیا۔ البتہ منحوس گرج نے زمین خون خون کر دی تھی۔ اسے بھی اندر ڈال کر میں نے کسی ایسی چیز کی تلاش کی جس سے زمین کا خون صاف کیا جاسکے۔ اسی ہیلی کاپٹر سے ایک تولیہ نما کپڑا لے لیا اور اس نے خون خاصی حد تک صاف کر دیا تھا مگر فرش پر اب بھی سرفی موجود تھی۔ میں نے کچھ دور ایک واش روم سے تولیہ دوبارہ دھو کر باقی خون صاف کیا اب وہاں پر گہرے رنگ کا دھبہ تھا جسے آئل بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ شکر ہے اس دوران میں کوئی اس طرف نہیں آیا دیسے بھی شام کا وقت تھا اور رات کے وقت یہاں سے پرواز نہیں ہوتی تھی۔ پانچ بجے اکثر عملہ چھٹی کر کے چلا جاتا تھا۔ یہ سب سنکاری نے بتایا۔ بانو آس پاس اور ان دونوں کی گھرائی کر رہی تھی۔ میں نے خون صاف کر کے بانو سے پوچھا۔ ”یہ کیا چکر تھا تم لوگ فیول لینے گئے تھے اور ان کو لے آئے؟“

”یہ خود ہمارے سر ہو گئے تھے۔ ابھی سنکاری فیول کی بات کر رہا تھا کہ یہ دونوں آگئے اور غیر محسوس انداز میں ہمیں پینڈز آپ کرا کے ایک طرف لے گئے۔ پھر وہ اس سے پوچھتے رہے۔“ بانو نے سنکاری کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے سب پھوٹ دیا۔“

”ہم کیا کرتا؟“ وہ بلبلا کر بولا۔ ”ادھر بھی وہیں ادھر بھی وہیں درمیان میں ہم۔“

”یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟“ میں نے بریف کیس کا معائنہ کیا۔ رکھو کے ہاتھ سے گرنے کے بعد وہ فرش پر پڑا تھا اور کسی نے اس پر توجہ نہیں دی تھی میں نے اسے اٹھایا۔ یہ خاصا ذہنی تھا۔ جیسے اس میں کوئی بھاری چیز

ہو۔

”انداز سے تو مجرم لگ رہے تھے جو پولیس سے بھاگ رہے ہوں۔“ بانو نے کہا اور دلچسپی سے بریف کیس دیکھا۔

”اے کھولیں؟“

میں نے کھولا اور حیران ہوا تھا۔ اس میں سلیپے سے تہہ لگائی ہوئی پلانٹیم کی اینٹیں رکھی تھیں۔ چند انچ سائز کی ان اینٹوں کا وزن ایک کے جی تھا اور بریف کیس میں ان کی تعداد سولہ تھی یعنی اس بریف کیس میں سولہ کلو گرام پلانٹیم تھی۔ اس کی مالیت سونے سے دو گنی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کم سے کم بیس لاکھ ڈالرز مالیت کی تھی۔ میں نے بانو کو بتایا تو وہ حیران ہوئی۔ یہ قیمتی دھات اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ ممتاز ہاؤس میں پلی بڑھی تھی جہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ یہ جرائم پیشہ نہ جانے کہاں سے یہ بریف کیس لے کر آئے تھے اور پولیس سے بچنے کے لیے فضائی راستے سے نکل جانا چاہتے تھے۔ بانو اور سنکاری کو پرغمال بنانے کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا۔ میں نے صفائی کی زحمت اسی لیے کی تھی کہ ابھی یہاں فیول ٹینکر آتا تھا اور ممکن ہے اس دوران میں کوئی اور بھی آ جاتا مگر اب میں محسوس کر رہا تھا کہ یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”ہمیں کہیں اور سے فیول لینا ہوگا۔ آس پاس کوئی اور جگہ ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”دوسرا ایئر کلب یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔“

”تو بس وہاں چلو..... یہاں ان کے اور ساتھی ہوئے تو ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔“

سنکاری کی حالت خراب تھی وہ خود بھی یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے قتل و خون کہاں دیکھا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش شروع کی تو میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”پہلے کنٹرول والوں سے اجازت لو۔“

اس نے سر ہلایا اور خود پر قابو پاتے ہوئے کنٹرول سے رابطہ کرنے لگا۔ اس نے پرواز کی اطلاع دی اور اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک بوتل نکال کر منہ سے لگانے لگا تھا کہ میں نے اس سے بوتل چھین لی۔ ”یہ کیا حرکت ہے تم بھائی کر بلی کا ہڑاڑ اڑاؤ گے۔“

”اچھے کو اس کا ضرورت ہے۔“ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ ”اس کے بغیر فلائٹ نہیں کر سکے گا۔“

غلاف توقع بانو نے اس کی تائید کی۔ ”شوہنی اسے دے دیں، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے ضرورت ہے۔“

بادل ناخواستہ میں نے بوتل اسے واپس کر دی۔ یہ ذرا بہتر قسم کی شراب تھی۔ تیز والا دلیسی خرا نہیں تھا جو اسے ٹن کر دیتا ویسے ٹن وہ دلیسی خرا پیٹے ہوئے بھی نظر نہیں آیا تھا جب میں نے اسے ہار کرنے کے لیے اس سے بات کی تھی۔ چند گھنٹے لے کر وہ پُر سکون نظر آنے لگا اس نے بوتل بند کر کے واپس سیٹ کے نیچے خانے میں رکھی اور پھر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اسی لمحے چند افراد اسی طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ ذرا پیچھے ہوئے اور یوں آس پاس دیکھ رہے تھے جیسے انہیں کسی کی تلاش ہو۔ ان کے ہاتھ اپنی جیبوں میں تھے۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ ”سنکاری جلدی کرو..... میرا خیال ہے ان کے ساتھی آگئے ہیں۔“

سنکاری نے انجن کو اسپینڈ دی اور یک لخت پنکھوں کی رفتار میں تیزی آئی لیکن یہ ابھی اتنے تیز نہیں ہوئے

تھے کہ ہیلی کا پٹر اڑ سکتا۔ آنے والے تین افراد تھے۔ ہیلی کا پٹر کے انجن کی آواز نے انہیں چونکا دیا اور اب وہ دوڑتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ انہوں نے ہتھیار نکال لیے تھے اگر وہ پاس آجاتے تو خطرہ بن سکتے تھے۔ میں نے پستول نکالا اور دروازہ کھولتے ہوئے سنکاری سے کہا۔ ”جلدی کرو.....“

میں نے اچانک فائرنگ کی تو وہ بھڑک کر منتشر ہو گئے اور دوسرے ہیلی کا پٹر کی آڑ میں چھپنے لگے۔ اسی لمحے ہیلی کا پٹر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ اگر میں نے سیٹ تلے پاؤں نہ پھنسا رکھا ہوتا تو میں باہر گرتا۔ پھر بھی میرا جسم جھٹکے سے باہر گیا۔ بانو نے چیخ ماری اور آگے ہو کر میرا بازو پکڑ کر اندر کھینچنے لگی۔ اس کی مدد سے میں اندر آ گیا۔ اس وقت تک ہیلی کا پٹر زمین سے کوئی دس بارہ فٹ اوپر آچکا تھا۔ وہ لوگ دوبارہ آرہے تھے اور اب ہیلی کا پٹر کا نشانہ لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ بہت خطرناک تھا۔ ہیلی کا پٹر کوئی پرندہ نہیں ہوتا ہے اس کا ساز کسی درمیانے ٹرک کے برابر تھا اور کسی حساس حصے پر گولی لگنے کی صورت میں وہ تباہ ہو سکتا تھا۔ دس بارہ فٹ کے فاصلے سے اسے نشانہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اوپر سے اکیلا فائرنگ کر کے انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ وہ پھیلے ہوئے تھے۔ اسی لمحے ایک خیال الہام کی طرح نازل ہوا اور میں نے بریف کیس اٹھا کر کھولتے ہوئے اسے ہیلی کا پٹر کے باہر اچھال دیا۔ وہ ہوا میں گیا اور اس میں موجود پلانٹیم کی اینٹیں کھڑکڑیک پر گریں۔ نتیجہ حسبِ منشا نکلا وہ لوگ فائرنگ بھول گئے اور اینٹوں کی طرف چھپنے اور جلدی جلدی انہیں سینٹے لگے۔

”تھینک گاڈ“ سنکاری کانپتے لہجے میں بولا۔ ”ابھی کوئی گولی فلول ٹینک پر لگتا اور ہم سب مارا جاتا۔ چوپر کا فلول بہت تیزی سے برن کرتا ہے۔“

جب تک وہ لوگ دوبارہ ہیلی کا پٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہم فائرنگ کی حد سے نکل آئے تھے۔ عقب سے بانو نے داد دی۔ ”واہ کیا ترکیب کی آپ نے..... اگر ان کتوں کے آگے ہڈی نہ ڈالتے تو کتا ہی لیتے۔“

”بالکل درست فرمایا تم نے۔“ میں نے پستول کا میگزین بدلتے ہوئے کہا۔

سنکاری نے تائیدی کی۔ ”آپ ہم سب کو بچا لیا۔“

”نہیں بچانے والی اللہ کی ذات ہے۔ اسی نے عقل دی اور میں نے اسے استعمال کیا۔“ میں نے جواب دیا اور نیچے دیکھا۔ ہم زمین سے خاصا اوپر آگئے تھے۔ سنکاری نے ہیلی کا پٹر کو اب ایک طرف موڑ دیا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ جوشٹ آؤٹ ہوا ہے اس کی اطلاع پر پولیس ہمیں تلاش نہیں کرے گی۔“

”ہمارا اس سے کیا تعلق ہے۔“ سنکاری نے جواب دیا۔ ”ہم کچھ دیر اترادو دوبارہ فلائی کر گیا۔“

”مطلب یہ کہ اگر تلاش کیا تو دوسرے ایئر کلب تک تو نہیں آجائے گی؟“

”اسے کیا پتا ہم کدھر گیا ہے۔“ سنکاری نے کہا اور دوبارہ ہیلی کا پٹر نیچے کرنے لگا۔ جب ہم اس دوسری ایئر فیلڈ پر اترے تو پونے چھن رہے تھے۔ اس بار بھی بانو سنکاری کے ساتھ گئی۔ راج کنور خاموش بیٹھا تھا اس نے ہیلی بارز بان کھولی۔

”اگر وہ لاشیں دریافت ہو گئیں تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”جب تک پولیس جائے وقوع پر آئے گی میں سرحد پار کر چکا ہوں گا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”یہ امریکا یا

یورپ نہیں ہے جہاں پولیس دس منٹ میں پہنچ جائے۔ دس منٹ تو اسے کرسی سے ہلنے میں لگتے ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ ایئر پورٹ کا معاملہ ہے۔“

”تم فکر مت کرو تمہاری دلی آرزو پوری نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا اور بیگ سے لیپ ٹاپ اور یو ایس بی نکالی۔ میں ہیلی کاپٹر سے باہر نکل آیا تھا تا کہ راج کنور میری گفتگو نہ سن سکے۔ توقع کے عین مطابق یہاں سگنل تھے۔ یہ یو ایس بی اغڑیا کی حد میں کہیں بھی استعمال کی جاسکتی تھی۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔

”تم لوگ کہاں ہو؟“

”اپنی جگہ پہنچ گئے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پلان کے مطابق سب نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی

ہے۔“

”میں آ رہا ہوں۔ شاید سات کے آس پاس میں وہاں پہنچ جاؤں۔ جی پی ایس لوکیشن بتاؤ۔“

عبداللہ نے جی پی ایس کی ریڈنگ بتائی جو میں نے موبائل میں محفوظ کر لی۔ عبداللہ نے ڈھکے چھپے انداز میں پوچھا۔ ”مسئلہ حل ہو گیا؟“

”ہاں ایک شاندار ایڈجنر کے بعد عزت مآب راج کنور صاحب دوبارہ میری کشتی میں ہیں۔“

”ہم ان کے استقبال کے لیے بے تاب ہیں نادر کے ساتھ والا کمران کے لیے مخصوص ہوگا۔“

”بس میں نے یہی اطلاع دینی تھی۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ کر واپس ہیلی کاپٹر میں آ گیا کیونکہ یہاں رن وے پر خاصی چہل پہل تھی۔ میں غیر ضروری طور پر کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس بار میں نے سویرا کا نمبر ملایا۔ وہ موبائل ہر وقت ساتھ رکھنے لگی تھی کہ نہ جانے کب میری کال آجائے۔ مگر اس نے ذرا تاخیر سے کال وصول کی۔ وہ پھولی سانسوں کے درمیان بولی۔

”آپ..... آپ ہیں نا؟“

”ہاں میری جان میں ہوں۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”آپ کہاں ہیں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے آپ کب واپس آئیں گے؟“ سویرا کی آواز بھرا گئی۔

”بس میں آ رہا ہوں کچھ دیر بعد اپنے ملک میں ہوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن سویرا میں دشمنوں کے درمیان میں ہوں۔ پتا نہیں اللہ نے میرے لیے کیا لکھا ہے۔“

”ایسا نہ کہیں۔“ وہ رودی۔ ”میں آپ کے لیے بہت دعا کر رہی ہوں آپ ضرور آئیں گے۔“

”مجھے بھی یہی امید ہے لیکن سویرا بعض اوقات انسان جیسا سوچتا ہے ویسا نہیں ہوتا ہے اس لیے میں نے سوچا تم سے بات کر لوں۔“

اس بار وہ جذباتی نہیں ہوئی اور اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ”شہباز میرا دل کہتا ہے آپ کو کچھ نہیں ہوگا

آپ کا میاں واپس آئیں گے۔ پھر آپ میرے ہوں گے۔“

”ہاں میری زندگی۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”سویرا میرے لیے دعا کرنا میرے لیے آنے والی مشکل

آسان ہو۔“

راج کنور پیچھے بیٹھا میری بات سن رہا تھا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی اس وقت تو میں ہجوم میں بھی اکیلا

ہوتا۔ سو پر احوصلہ کرتے کرتے بکھر جاتی اور میں اسے پیار سے سینٹا پھردہ بچتے ہو جاتی تو میں بکھرنے لگتا۔ وہ مجھے سمیٹتی۔ اس نے بتایا کہ وہ موبائل کو سائلنس پر کر کے اپنے وجود سے لگا کر رکھتی ہے کیونکہ اس نمبر پر صرف میں کال کرتا ہوں اس لیے وہ ایک لمحے کو بھی موبائل خود سے جدا نہیں کرتی ہے۔ اس نے بتایا نہیں کہ موبائل کہاں رکھتی ہے لیکن میں سمجھ گیا تھا۔ ابھی موبائل واہیریت ہوا تو وہ ماں جی اور آپا صغراں کے ساتھ بیٹھی تھی جلدی سے بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ میں نے فحشی، سحد یہ اور مونٹا کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ حویلی سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ بابا نے جو نیا باغ بنایا تھا وہاں تھیں۔ جب سے موسم گرم ہوا تھا وہ اکثر شام کے وقت حویلی کے صحن یا باغ میں چلی جاتی تھیں۔

جس وقت میں بات کر رہا تھا ایک فیول ٹینکر ہیلی کاپٹر تک آیا اور اس میں فیول بھرنے لگا۔ سنکاری اور بانو کچھ دیر بعد آئے لیکن وہ باہر ہی رہے۔ سنکاری معائنہ کرتا رہا کہ فیول کتنا جا رہا ہے۔ بانو اس کی نگرانی کرتی رہی۔ اگرچہ سنکاری نے اب تک کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی مگر بانو اس کی نگرانی میں ذرا بھی غفلت نہیں برت رہی تھی شاید اس وجہ سے بھی وہ اب تک راہ راست پر تھا۔ تقریباً بیس منٹ فیول بھرتا رہا اور میں نے ان بیس منٹوں کے ایک ایک سیکنڈ سے فائدہ اٹھایا۔ سویرا کی آواز اور اس کے جذبات اپنی سماعتوں میں محفوظ کیے جا رہے۔ بالآخر مجھے کال ختم کرنا پڑی کیونکہ فیول بھر گیا تھا اور سنکاری ادا نیگی کر کے ہیلی کاپٹر میں آ گیا۔ میں نے اسے بیس ہزار دیئے تھے اس کے بعد اسے کوئی رقم نہیں دی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا معاوضہ اسے دے دوں۔ میں نے ایک لاکھ بھارتی روپیہ اسے دینا چاہا تو اس نے لا پرواہی سے کہا۔

”ابھی نہیں، بیچ گیا تو لوں گا ورنہ ابھی کیا فائدہ؟“

”سنکاری مجھے اہٹا پتا تاؤ، اگر ہم نہ بیچ سکے تو بھی تمہارے گھراتی رقم پہنچ جائے گی کہ تمہاری بیوی کچھ عرصے آرام سے گزارا کر سکے اس میں یہ رقم بھی شامل ہوگی۔“

وہ ہچکچایا لیکن پھر اپنا پتا بتادیا۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔ اسے پتا نوٹ کرایا اور کہا کہ اگر ہم سرحد پار نہ آسکیں اور مارے جائیں تو وہ پائلٹ کے گھر پہنچ لاکھ بھارتی روپے کی رقم پہنچائے گا۔ عبداللہ پریشان ہو گیا۔

”خدا نہ کرے کہ ایسی کوئی بات ہو لیکن میں نے سب نوٹ کر لیا ہے۔“

”بس یہی کہنا تھا، ہم یہاں سے نکلنے والے ہیں۔“

”اللہ آپ کو حفظ و امان میں رکھے۔“ عبداللہ نے دعا کی۔

”آمین۔“ میں نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی اور سنکاری کو ہیلی کاپٹر بلند کرنے کو کہا۔ وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جوابی نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے ہچکچا کر کہا۔

”میں اب تک نہیں سمجھ سکا آپ کیسا آدمی ہے۔ ہم کو کنڈ نیپ کر کے لایا۔ اور دو بندہ کتنے کی طرح مار دیا اور اب میرا بیوی بچہ کا خیال کر رہا ہے۔“

”تم اس چکر میں مت پڑو ورنہ ہو جاؤ کیونکہ وقت کم ہے۔ سمجھ لو آج تمہاری صلاحیتوں کا امتحان ہے، یہ بتاؤ ہیلی کاپٹر میں جی پی ایس ہے؟“

”بالکل ہے اس کے بغیر اب کوئی مشین فلائی نہیں کر سکتی ہے۔“ اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے موبائل پر جی پی ایس لوکیشن دکھائی۔

”ہمیں یہاں جانا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”آپ کو بالکل اسی جگہ لے جائے گا۔“

ہیلی کاپٹر ایک دھچکے سے اوپر اٹھا تو میں خاص قسم کی سنسنی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس سارے منصوبے کا اہم ترین مرحلہ آگیا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی پہلے ہم سرحد پار ہو جاتے یا زندگی کی سرحد پار کر جاتے۔ ”کتنا وقت لگے گا؟“

”تقریباً پون سے ایک گھنٹا۔“ سنکاری نے جواب دیا۔ وہ انسٹرومنٹل ہینڈل کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ایک ایک چیز چیک کر رہا ہو۔ ظاہر ہے اس کے لیے بھی یہ اہم ترین پرواز تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ امرتسر کے بعد بلندی پانچ سو فٹ سے کم کرنی ہے اور سرحد کے پاس سو فٹ سے کم۔ وہ چونکا۔ ”اتنی کم بلندی کیوں؟“

”اس بلندی پر مین پورٹیل میزائل بیکار ہو جاتے ہیں۔“ میرے بجائے راج کنور نے جواب دیا۔ ”وہ حدت پر لپکتے ہیں اور کم بلندی کی وجہ سے زمین کی حدت ان کے سینسر کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ صرف بہت جدید میزائل دھوکا نہیں کھاتے ہیں لیکن وہ پاکستان کے پاس نہیں ہیں۔“

میں نے اسے یاد دلایا۔ ”ابھی پچھلی جنگ میں پاکستان نے ایسے ہی میزائلوں سے دو بھارتی جنگی طیارے مار گرائے تھے۔“

”وہ طیارے تھے، اتنی کم بلندی پر پرواز نہیں کر سکتے ہیں اور پھر وہ مقام بھی پہاڑی تھا۔ یہ میدان ہے اور ہم ہیلی کاپٹر میں ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سنکاری نے راج کنور کی تائید کی۔ ”میں پچاس فٹ کی بلندی پر بھی اڑا سکتا ہوں۔“

”اظہار کے پاس ایسے میزائل ہیں وہ دس فٹ کی بلندی پر اڑتے ہیلی کاپٹر کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔“ راج کنور نے انکشاف کیا تو سنکاری گھبرا گیا۔

”پھر تو ہم مارا جائے گا۔“

”تم فکر مت کرو یہ اٹارین حکام سے اجازت لے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”ممکن ہے اجازت نہ ملے۔“ راج کنور نے کہا۔

”اس صورت میں تم بھی ہمارے ساتھ مرو گے۔“ میں نے اسے گھورا۔

”یہ ہر صورت مرے گا۔“ ہانو نے نفرت سے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ راج کنور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”میں تم سے تعاون کروں یا نہ کروں، موت میرا مقدر ہے۔“

”ایسا نہیں ہے ممکن ہے تم بچ جاؤ۔“ میں نے ہانو کو گھورا۔ ”یہ جذباتی ہو رہی ہے۔“

”میں اسی معمولی سی امید پر چانس لے رہا ہوں میں تم سے تعاون کروں گا تو شاید میں بچ جاؤں۔“ راج

کنور نے ہیلی کاپٹر کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ مجھے امید نہیں ہے کہ میں بچ سکوں گا۔“

ہیلی کا پٹر چھ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تھا اور اب دوبارہ سردی لگنے لگی تھی جب کہ نیچے گرمی سے برا حال تھا۔ جب تک ہیلی کا پٹر رکا رہا ہم بیسے میں نہائے رہے تھے۔ مگر حالات کی گرمی نے ماحول کی گرمی کو محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ رفتار ایک سو اسی کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔ میں نے کہا۔ ”رفتار تیز نہیں ہو سکتی ہے؟“

”فیول فل ہے اور میدان جگہ پر ہوا بھی جھک ہوتی ہے اس لیے رفتار کم ہے۔ ابھی فیول کم ہو جائے گا چو پر ہلکا ہوئے گا تو رفتار بڑھے گا جب تک تو ہم امرتسر پہنچ جائے گا۔“

سویرا سے بات کر کے دل کچھ بوجھل سا تھا۔ میں بغیر کسی جذبے کے میکا کی انداز میں حرکت میں تھا۔ سیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر پہلے ہونے والا واقعہ اہم تھا اور ہم فوج گئے تھے لیکن اس کی اہمیت آنے والے وقت کی اہمیت کے سامنے دب گئی تھی۔ نہ جانے کیا قسمت تھی جہاں جاتا ہوں وہاں کوئی نہ کوئی چکر شروع ہو جاتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ جب کچھ نہ ہو اور وقت خیر خیریت کے ساتھ گزر جائے۔ بریف کیس میں موجود دو ملین ڈالر کا پلانٹیم بتا رہا تھا کہ وہ لوگ کوئی بڑا ہاتھ مار کر آ رہے تھے۔ شاید پولیس نے ناکہ بندی کی ہوئی تھی اس لیے انہوں نے اس نجی ایئر کلب سے ہیلی کا پٹر یا طیارہ ہائی جیک کر کے نکلنے کا سوچا تھا۔ بد قسمتی سے وہ سنکاری کا انتخاب کر بیٹھے جو پہلے ہی ہمارے ہاتھوں پر غمال بنا ہوا تھا۔ شاید بانو کو دیکھ کر بھی ان کی نیت خراب ہوئی تھی۔ وہ فرار کے ساتھ ساتھ اس کے چکر میں بھی پڑ گئے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ آنے والے دونوں افراد فرار کے لیے بے چین تھے تو پھر وہ کون تھے؟ جو ان کے پیچھے آئے تھے۔ اگر وہ ان کے ساتھی تھے تو ان کو بھی لے کر جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا اس کا امکان تھا کہ وہ دوست کے بجائے وہی لوگ ہوں جن سے وہ یہ خزانہ حاصل کر کے فرار ہوئے تھے اور وہ چھپا کرتے عین اس وقت ایئر فیلڈ پہنچ گئے جب ہم روانہ ہو رہے تھے اور وہ سمجھے کہ ہیلی کا پٹر میں رکھو اور گرج ہیں۔ شکر ہے ان کی کوشش کے باوجود ہیلی کا پٹر کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اگر کوئی گولی لگی بھی تھی تو اس نے نقصان نہیں کیا تھا۔ اب امکان یہ تھا کہ انہوں نے ایئر کلب پر جو شونگ کی تھی اس کے بعد ہیلی کا پٹر سے ملنے والی لاشیں بھی ان کے سر ماری جائیں گی اگر پکڑے گئے تو کیس پکا ہو گا ورنہ پولیس تلاش کرے گی۔ میں نے راج کپور سے پوچھا۔

”رابطہ کب کرتا ہے؟“

”امرتسر کے بعد۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بلندی لازمی کم کر لینا ورنہ نارمل فوجی ریڈار ہیلی کا پٹر کو ٹریک کر لے گا اور وارننگ مل جائے گی کہ ریڈرز ان سے دور رہا جائے۔“

میں نے سنکاری سے کہا۔ ”اب اس معاملے میں تم خود اس سے بات کرو یہ تمہیں مخصوص ریڈیو فریکوئنسی بھی بتائے گا جس سے رابطہ کیا جائے گا۔“

سنکاری اس سے بات کرنے لگا۔ راج کپور اسے بتا رہا تھا کہ سرحد پار کرنے کا طریقہ کار کیا ہے۔ سنکاری سن رہا تھا اور اپنی تسلی کے لیے اس سے سوال بھی کر رہا تھا۔ ہیڈ فون کی وجہ سے ہم با آسانی ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے ورنہ ہیلی کا پٹر کے شور میں گلا بھاڑ کب بات کرنا پڑتی اور دوسرے کو شاید پھر بھی سنائی نہ دیتا۔ چلانا تو اب بھی پڑ رہا تھا لیکن بہر حال بات کی جا سکتی تھی۔ اس کا مائیک خاص نوعیت کا ہوتا ہے صرف پاس کی آواز کچھ کرتا ہے۔ اس کے باوجود بے پناہ شور آرہا تھا۔ سنکاری سمجھ رہا تھا پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں سمجھ گیا ہے۔ نو“

ڈنجرس اینڈ رکی..... ذرا سا ادھر ادھر ہوا..... میزائل آکر لگا۔“

”ادھر ادھر ہونے کی کیا ضرورت ہے صبح جگہ رہو گے تو کوئی میزائل نہیں لگے گا۔“ میں نے کہا اور راج کنور سے پوچھا۔ ”ریڈ زون کتنا بڑا ہے؟“

”مجھے صبح سے نہیں معلوم لیکن شاید سرحد سے پانچ کلومیٹر پہلے ریڈ زون شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں داخل ہونے والے کسی بھی طیارے کو خبردار کیا جاتا ہے اگر وہ پانچ سو فٹ کی بلندی سے اوپر ہو اور اگر وہ اس سے نیچے ہو تو اسے شوٹ ڈاؤن کر دیا جاتا ہے۔“

”بغیر وارنٹک کے؟“ سنکاری دہشت زدہ ہو گیا۔

”ہاں..... اس لیے ریڈ زون سے دور رہ کر کال کا انتظار کرنا ہو گا۔“ راج کنور نے کہا۔ ”کم سے کم بلندی سو فٹ رکھنی ہوگی ورنہ پہلی کاپٹر مینٹھوک ہو جائے گا اور بلا وارنٹک شوٹ کیا جاسکتا ہے۔“

جیسے جیسے راج کنور تفصیلات بتا رہا تھا خطرات اور خدشات بڑھ رہے تھے۔ وہ اتنا شریف نہیں تھا کہ رضا کارانہ بتاتا مگر اس کی جان پر بنی ہوئی تھی، اسے معلوم تھا کہ اگر پہلی کاپٹر کوشانہ بنایا گیا تو وہ بھی مارا جائے گا اس لیے وہ سب کھل کر بتا رہا تھا۔ اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے پاس مجھ سے تعاون کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر وہ کوئی بات چھپاتا تو اس کا نقصان اسے بھی ہوتا۔ دوسری صورت میں اسے امید تھی کہ شاید اس کی جان بچ جائے۔ میں اسے چھوڑ دوں یا اسے قسمت کوئی موقع دے۔ اسی امید پر وہ فرمانبرداری سے تعاون کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد سنکاری نے اعلان کیا۔ ”ہم امرتسر کے پاس ہیں اس کے اوپر سے آگے نکلیں گے۔“

ہم سب سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے اور بانو نے بھی سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ پہلی کاپٹر کا رخ بدلتی بدلتی رہا تھا اور اب یہ شمال مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ پکھیا لاکا علاقہ لاہور سے اوپر پڑتا تھا۔ سنکاری نے کہا۔ ”اب ہم سرحد سے بیس کلومیٹر دور ہے۔“

راج کنور نے کہا۔ ”بلندی کم کرو۔ ہزار فٹ پر آ جاؤ لیکن خیال رکھنا امرتسر سے اڑنے والی فلاحیت بھی اسی علاقے سے گزرتی ہیں۔“

اس وقت بلندی چار ہزار فٹ تھی۔ سنکاری نے رفتار اور بلندی دونوں کم کرنا شروع کر دی تھی۔ چھ بج کر پچاس منٹ پر سورج مغربی افق پر جا نکلا تھا۔ اس کا آتشیں گولہ ذرا بائیں طرف تھا۔ مشکل سے پندرہ منٹ بعد سورج غروب ہو جاتا اور ہمیں اسی دوران میں اپنی منزل تک پہنچ جانا تھا۔ سنکاری اتنی مہارت سے پہلی کاپٹر کو نیچے لا رہا تھا کہ ہمیں احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اعلان کر رہا تھا کہ اب کتنے کلومیٹر دور ہے سرحد۔ آخر جب اس نے دس کلومیٹر کا اعلان کیا تو راج کنور نے کہا۔ ”ریڈ یو آن کر کے فریکوئنسی سیٹ کر لو کوئی غلطی نہ ہو۔ ایک بار پکارنے پر جواب نہ ملے تو دوبارہ نہیں پکارا جاتا ہے۔ دوسری بار میزائل فائر ہوتا ہے۔“

”بار بار کیوں بتاتا ہے۔“ سنکاری نے غصے سے کہا اور کنفرم کر کے ریڈ یو فریکوئنسی سیٹ کر لی۔ اب ہم تیار ہو گئے تھے۔ اس دوران میں پہلی کاپٹر ہزار فٹ سے نیچے آ گیا تھا اور اس کی بلندی میں مزید کمی واقع ہو رہی تھی۔ مزید دو کلومیٹر آگے نکلنے کے بعد سنکاری نے رفتار بہت کم کر دی تھی اور اب پہلی کاپٹر ٹہل رہا تھا۔ میرا دل تیز دھڑک رہا تھا۔ میرا وطن میرے پیادوں کی سرزمین یہاں سے صرف آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اگر پہلی کاپٹر

پوری رفتار سے چلتا تو یہ فاصلہ صرف پانچ منٹ میں طے ہو سکتا تھا۔ مگر یہ آٹھ کلومیٹر اور پانچ منٹ دنیا کے مشکل ترین فاصلے اور وقت تھا۔ ایک آگ و خون کا دریا پار کرنا تھا۔ اب ہیلی کاپٹر پانچ سے سو فٹ سے بھی نیچے آگیا تھا۔ نیچے سبز جھاڑیوں سے بھرا میدان اور کہیں کہیں کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ اب زمین پر سورج کی روشنی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ سائے پھیل رہے تھے۔ سنکاری نے بتایا کہ سرحد اب سات کلومیٹر دور تھی۔ اس نے کہا۔

”اس سے آگے جانے میں خطرہ ہو سکتا ہے۔“

راج کنور نے بلندی پوچھی اور کہا۔ ”اسے ڈیڑھ سو فٹ پر لے آؤ۔ اگر ریڈیو سے پکارا گیا تو میں جواب دے سکوں گا؟“

”ریڈیو کا ہیڈ تم کو دے دیا ہے۔“ سنکاری نے جواب دیا۔ ”اپنے ہیڈ فون پر رائٹ پر لگا بین دبائے گا تو تمہارا مائیک آن ہو جائے گا۔“

کیونکہ یہاں سے آگے بڑھنے میں خطرہ تھا اس لیے سنکاری نے ہیلی کاپٹر کو ایک چھوٹے دائرے میں گھماتا شروع کر دیا تھا۔ ایک ہی جگہ رکے رہنے سے ایندھن کا استعمال بڑھ جاتا۔ ہم سب ٹینشن کے عالم میں انتظار کر رہے تھے کب انڈین سائیڈ سے پکارا جاتا ہے مگر ابھی تک کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ وقت سُست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ میری نظر گھڑی پر مرکوز تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اگر ہمیں انڈین سائیڈ سے نہ پکارا گیا تو کیا میں اپنی اور مزید تین افراد کی جان کی بازی لگا کر سرحد پار کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اسی لمحے گھڑی میں سات بجے اور اس کے ساتھ ہی ریڈیو جاگ اٹھا۔ اس سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی اور پھر کسی نے کہا۔ ”پی ایس کے..... فائیو تھری ٹو..... ہوا ز دیر۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا اور راج کنور کی طرف پستول سیدھا کر لیا تھا اس نے ہیڈ فون پر لگا مائیک کا بین دبا دیا اور بولا۔ ”آئی ایس کے..... ٹائن ٹو فائیو..... ڈو پورٹیٹی؟“

”راجر..... پور آئیڈینٹی پلیز؟“ بولنے والا زرا خشک اور فوجی لگ رہا تھا۔ اس کی آواز میں کڑھکی تھی۔ جواب میں راج کنور نے سنبھل کر ایک طویل نمبر بتایا جس میں انگریزی کے الفا بیٹ بھی آرہے تھے۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔

”راجر..... پرمیشن اپروو..... فائنل نو آؤرز۔“

راج کنور کے اشارے پر سنکاری نے ریڈیو بند کر دیا اور ہم سب نے سکون کا طویل سانس لیا۔ سنکاری نے ریڈیو آف کیا تو راج کنور نے کہا۔ ”مجھے دو گھنٹے کے لیے ریڈیو استعمال کرنے کی اجازت ملی ہے۔“

”یعنی تم دو گھنٹے میں واپس آ جاؤ۔“

”بالکل اگر اس سے دیر لگے گی تو دوبارہ پرمیشن لینا پڑے گی۔“ راج کنور بولا۔ ”لیکن یہ بہت رسکی ہوگا کیونکہ پاکستان کی طرف سے آنے کی صورت میں بعض اوقات وارننگ نہیں ملتی ہے۔ سسٹم آٹو ایک شوٹ کرتا ہے اسے روکنے کے لیے آپریٹر کے پاس صرف چند سیکنڈ کی مہلت ہوتی ہے۔“

سنکاری نے اس سے پوچھا۔ ”اب کیا کرنا ہے؟“

”ہیلی کا پٹر نیچے لاتے ہوئے سرحد کراس کرو۔ سرحد پار کرتے ہوئے بلندی سوٹ سے کم رکھنا۔“ میرے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ اتنی اہم سرحد پر ہماری طرف سے کوئی پہرہ نہیں ہوگا۔ اگر زمینی ساخت کی وجہ سے ریڈار کی نگرانی ممکن نہیں تھی تو دوسرے کئی طریقے تھے جن سے نگرانی کی جاسکتی تھی اور کچھ نہیں تو زمینی فورسز کی موجودگی لازمی تھی جو سرے گزرنے والے ہیلی کا پٹر کو دیکھ سکتی تھی۔ راج کنور اب سنکاری کو گائیڈ کر رہا تھا کہ اسے کہاں سے گزرتا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی راج کنور وہ مخصوص اصطلاحات استعمال کر رہا تھا جو ہیلی کا پٹر اور طیاروں کے نیوی گیلر استعمال کرتے ہیں۔ سنکاری اس زبان کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ ہیلی کا پٹر کو اسی لحاظ سے بڑھا رہا تھا۔ نیچے منظر تاریک ہو رہا تھا کیونکہ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ ہم ایک متروک ہو جانے والی سڑک پر اڑ رہے تھے۔ راج کنور نے کہا۔ ”جب تقسیم نہیں ہوئی تھی تو یہ سڑک راوی کے پار جاتی تھی۔ پھر تقسیم نے اسے ختم کر دیا۔ اس کا ٹیل بھی متروک ہو گیا۔“

”سرحدیں بہت سے راستوں کو ختم کر دیتی ہیں اور نئے راستوں کو جنم دیتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ مشکل سے پچاس فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے ہیلی کا پٹر سرحد کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ سنکاری نے کہا۔ ”ہم چار کلومیٹر ز دور ہے۔“

ہیلی کا پٹر کی رفتار نوے کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔ یعنی پونے تین منٹ میں سرحد عبور کر جاتے۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔ دور ایک نشیب دکھائی دیا جس میں پانی چمک رہا تھا۔ یہی دریا راوی تھا اس کے پار میرا ملک میرا وطن تھا۔ سنکاری نے پوری قوت سے فلائنگ اسٹک تمام رکھی تھی اور اس کے چہرے پر کشیدگی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ شاید ہم سب کے چہرے کشیدہ تھے۔ ہر گزرتے لمحے دلوں کی دھڑکنیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ بانو نے سیٹ پر ہتھیلیاں جمارکھی تھیں جیسے کسی متوقع دھچکے سے بچنا چاہ رہی ہو۔ سنکاری نے کہا۔ ”دو کلومیٹر۔“

”ہم ریڈ زون سے گزرنے والے ہیں۔“ راج کنور نے کہا۔ ”لیکن گزرے نہیں ہیں۔“ میں نے زہرباب کہا۔ اب تقریباً ڈوب جانے والے سورج کی آخری کرنیں دریا کے پانی پر مچل رہی تھیں۔ ہیلی کا پٹر دریا کی وادی میں داخل ہوا اور پانی کے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ سنکاری نے کہا۔

”ہم نے بارڈر کراس کر لیا ہے۔“ یہ سن کر میرا دل ایک لمحے کو ختم گیا۔ راج کنور بولا۔ ”ہم بارڈر پہلے ہی کراس کر چکے تھے۔ دریا پاکستان کی حد میں ہے۔“

دریا کراس کر کے ہیلی کا پٹر آگے آیا تو سڑک کا آغاز ہو گیا۔ سنکاری اب جی پی ایس کی مدد سے بتاتی ہوئی لوکیشن کی طرف جا رہا تھا۔ عبداللہ اور دسٹم اسی مقام پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ تاریک منڈی روڈ کی طرف سے کراسنگ کر کے آنے والی سڑک مشکل سے چار کلومیٹر لمبی تھی۔ میں نے عبداللہ سے بات کی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ خاصی دیر سے یہاں تھا۔ مگر پچاس فٹ کی بلندی سے جہاں تک سڑک نظر آتی تھی اس پر کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ جب کہ دسٹم نے کہا تھا کہ وہ آخری حد تک آجائے گا۔ دونوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا سنکاری نے مجھ سے کہا۔ ”ہم پہنچ گیا ہے جی پی ایس لوکیشن پر۔“

میں نے بے یقینی سے نیچے دیکھا مگر سڑک اور آس پاس زمین دور تک خالی تھی۔ شمال کی طرف دور ایک آبادی کے آثار تھے مگر اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ جنوب میں کچھ قدر اونچی جھاڑیاں تھیں اور ویرانہ تھا۔ عبداللہ اور وسیم کو بالکل اسی جگہ موجود ہونا چاہیے تھا اور اگر وہ کسی وجہ سے سڑک پر موجود نہیں تھے تب بھی آس پاس حد نظر میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ بالکل غائب تھے۔ بانو بھی دوسری طرف سے نیچے دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ ”شربی یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

”انہیں یہیں ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے فکر مندی سے کہا۔ ”کوئی وجہ ہوئی ہے جو وہ یہاں نہیں ہیں ہمیں دیکھنا ہوگا۔“

سنکاری نے کہا۔ ”جلدی بولوا ب کیا کرنا ہے؟ ابھی واپس جانے کا بھی ہے۔“

”ہیلی کاپڑ نیچے اتار دو۔“ میں نے حکم دیا تو سنکاری نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

”ابھی اتارنے کا نہیں ہے۔“ سنکاری بولا۔ ”میں نیچے کرتا ہوں تم کو د جاؤ۔“

”بکومت۔“ میں نے پستول دوبارہ اس کی گردن سے لگا دیا اور گرج کر کہا۔ ”نیچے اتار دو.....جلدی۔“

مجبوراً اس نے ہیلی کاپڑ نیچے کرنا شروع کیا اور میری طرف دیکھا۔ ”یہ اچھا نہیں ہے ابھی کوئی آگیا تو ہم پکڑا جائے گا جاسوسی کے الزام میں بند ہوگا موت کا سزا ہوگا۔“

”یہاں نہیں۔“ میں نے منع کیا وہ سڑک پر اتار رہا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کے درمیان ایک صاف جگہ اشارہ کیا۔ ”وہاں اتار دو۔“

”ادھر جھاڑی ہے۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔ ”چو پر کا بلیٹ نکلے گا۔“

”کچھ نہیں ہوگا یہ نرم جھاڑیاں ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر بلیٹ لگے بھی تو ان کو نقصان نہیں ہوگا۔“

بادل نا خواستہ سنکاری ہیلی کاپڑ کو اس جگہ لایا اور آہستگی سے نیچے اتارنے لگا۔ ہوا کے زور سے جھاڑیاں خود جھک کر ہیلی کاپڑ کے بلیٹ سے دور ہو رہی تھیں۔ زمین ناہموار تھی لیکن ہیلی کاپڑ کے اسکیز نیک گئے۔

”اب ہم مارا جائے گا۔“ سنکاری نے فریاد کی۔ ”بائی گاڈ ہم کبھی ایسا کام کرنے کا سوچا بھی نہیں۔“

”کچھ نہیں ہوگا انجن بند کرو۔“ میں نے اگلا حکم دیا تو وہ اچھل پڑا۔

”ابھی انجن بند کر دیا تو دوبارہ اشارت ہو کر فلائنگ میں ایک منٹ لگے گا۔ ابھی پاکستانی اپنی تلاش شروع کر چکا ہوگا۔ ریلوے سٹی آگے سے دیکھتا ہوگا۔“

وہ درست کہہ رہا تھا اس کا تقریباً سو فیصد امکان تھا کہ یہاں زمین سے مگرانی کی جارہی ہوگی اور ہیلی کاپڑ کی تلاش شروع کی جا چکی ہوگی اسی لیے میں نے اسے یہاں جھاڑیوں کے درمیان اتروایا تھا۔

”انجن بند کرو۔“ میں نے پہلے والے لہجے میں کہا تو حکم کی تعمیل کرتے بنی۔ ہیلی کاپڑ کا انجن بند ہوا اور پٹکے رکنے لگے۔ اس کا شور زمین پر یقیناً بہت دور سے سنا جاسکتا تھا۔ راج کتور بھی مضطرب ہو گیا اس نے کہا۔

”شہباز تمہارا کام ہو گیا ہے اب ہمیں جانے دو۔ جتنا وقت گزرے گا ہمارے لیے خطرہ اتنا بڑھتا جائے گا۔“

”فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور بانو کی طرف دیکھا۔ ”بانو ان دونوں پر

نظر رکھنا اگر کوئی غلط حرکت کرے تو اسے بلا جھجک شوٹ کر دینا۔“

میں کہتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ ہم پاکستانی سرحد میں چار کلومیٹر زاندر آگئے تھے اور ابھی نارنگ منڈی روڈ کراسنگ سے دو کلومیٹر دور تھے۔ میں فکر مند تھا میرے ساتھیوں کو یہیں ہونا چاہیے تھا اور وہ غائب تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ میں ان سے رابطہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انٹرنیٹ ڈیوائس انڈیا میں کام کرتی تھی یہاں اس کے سگنل مشکل سے ہی ملتے پھر بھی میں نے اسے لیپ ٹاپ سے لگا کر دیکھا۔ مگر کنکشن نہیں ہوا تھا۔ انٹرنیٹ کنکشن پر کراس آ رہا تھا۔ پھر میں نے موبائل چیک کیا اور حسب توقع اس پر بھی سگنل غائب تھے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کا انجن بند ہونے کے بعد یہاں ناقابل بیان قسم کا سکوت چھا گیا تھا۔ میں نے جھک کر مٹی اٹھائی اور اسے سونگھا۔ اس کی مہک نے مجھے یقین دلایا کہ میں اپنے وطن میں ہوں۔ وہ تینوں ہیلی کاپٹر میں بیٹھے تھے۔ اصولاً تو مجھے یہ کرنا چاہیے تھا کہ بانو اور راج کنور کو اتار کر سنکاری کو واپس جانے دیتا۔

لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے اور سنکاری کو یہاں روکنا ضروری تھا۔ ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ میرے ساتھی یہاں موجود نہ ہوں جب تک اس کی کوئی بہت سنگین وجہ نہ ہو۔ اس کا امکان تھا کہ پولیس یا رنجیز ان لوگوں کو لے گئی ہو۔ بہر حال یہ سرحد کے پاس حساس علاقہ تھا اگرچہ اسے سیکورٹی زون قرار نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ کچھ ہی دور ایک گاؤں آباد تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ گاؤں کی طرف جانا چاہیے یا پھر اسی سڑک پر آگے جا کر دیکھنا چاہیے تھا کہ میرے ساتھی کہیں آگے تو نہیں تھے؟ میں سوچتے ہوئے سڑک تک آ گیا تھا۔ دوبارہ واپس ہیلی کاپٹر کی طرف آیا اور بانو کو نیچے آنے کا اشارہ کیا وہ بھی مضطرب تھی اس نے نیچے آتے ہی کہا۔ ”ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میرے ساتھی غائب ہیں اور ایسا کسی بہت بڑی وجہ کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔“

”اگر وہ کسی وجہ سے یہاں نہیں ہیں تب بھی ہمیں رکتا نہیں چاہیے۔ راج کو اتار لیتے ہیں اور اسے جانے دیں۔ اس کی وجہ سے ہم دوسرے خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ اگر ہمارے سیکورٹی والے آگئے تو سوچ سکتے ہیں کیا ہوگا؟ کون مانے گا کہ ہم انڈیا کے جاسوس نہیں ہیں۔ شوبی مشکل میں پڑ جائیں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے اس معاملے میں جلدی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہیلی کاپٹر یہاں محفوظ ہے۔ جب تک کوئی اوپر سے نہیں دیکھے گا یہ نظر نہیں آئے گا۔ میں سوچ رہا ہوں سڑک پر آگے جا کر دیکھوں ہو سکتا ہے وہ مل جائیں۔“

”تب تک یہ ہیلی کاپٹر یہیں کھڑا ہے گا؟“

”ہاں..... ویسے بھی تاریکی چھا رہی ہے اور چند منٹ میں مکمل تاریکی ہو جائے گی تب یہ فضا سے بھی نظر نہیں آئے گا۔ زمین سے بھی پاس آنے پر دکھائی دے گا۔ تم یہیں روکو اور اگر کوئی خطرہ دیکھو تو خود کو بچانے کی کوشش کرنا ان کی پروا مت کرنا۔“ میرا اشارہ سنکاری اور راج کنور کی طرف تھا۔ ”اگر الگ ہو جاؤ تو اسی سڑک کے ساتھ آگے پہنچنا تمہارے پاس پستول بھی ہے اور تم بھی ہے ان سے کام لینا۔“

ہم دونوں ہیلی کاپٹر سے دور تھے اور وہی آواز میں گفتگو کر رہے تھے اس لیے امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں

ہماری گفتگو سن سکیں۔ بانو نے سر ہلایا اور پوچھا۔ ”اس صورت میں راج کنور کا کیا کرنا ہے؟“
 ”اسے بھی چھوڑ دینا جو اس کی قسمت میں ہوگا بھگتے گا۔“

بانو ذرا مایوس ہوئی تھی اس کا خیال تھا کہ میں راج کنور کو شوٹ کرنے کا حکم دوں گا۔ مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ”میں بیس منٹ میں آنے کی کوشش کروں گا اگر آدھے گھنٹے زیادہ دیر ہو جائے تو تم اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے آپ جانتیں۔“

میں وقت ضائع کیے بغیر سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ چند لمبے بعد میں پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ جس زمانے میں جا منگ کا شوق تھا تو میرا اسٹیمنا اتنا اچھا ہو گیا تھا کہ میں ایک کلومیٹر کا فاصلہ چار منٹ میں طے کر لیتا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے آٹھ منٹ میں کرا سنگ تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ چند منٹ بعد تارکی چھا گئی۔ آسمان پر ہادل تھے اس لیے ستارے اور اگر چاند تھا تو اس کی روشنی بھی غائب تھی۔ مجھے یاد تھا کہ آسمان پر چاند تھا یہ شاید آدھا یا اس سے کچھ بڑا تھا۔ مگر بادلوں نے سب چھپا لیا تھا اور ایک طرح سے یہ اچھی پردہ پوشی تھی لیکن میں جس رفتار سے دوڑ رہا تھا اگر کوئی گڑھا یا رکاوٹ آ جاتی تو ٹھیک ٹھاک چوٹ لگتی۔ میں خطرہ مول لے کر دوڑ رہا تھا پھر مجھے یاد آیا کہ موہا بل میں ٹارچ بھی تھی میں نے وہ آن کر لی لیپ ٹاپ والا بیگ بانو کو دے آیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں کام آسان ہو گیا تھا۔ اس کا فائدہ بھی ہوا آگے سڑک بہت خراب تھی اور اس میں گڑھے تھے۔ اگر میں اندھا دھند بھاگتا تو امکان تھا کہ کسی گڑھے میں میرا پیر آ جاتا۔ اب میں ان سے بچ کر بھاگ رہا تھا۔

آٹھ تو نہیں دس منٹ بعد میں کرا سنگ پر پہنچ گیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ یہ تاریک منڈی روڈ تھی اور اس پر دو رنگ کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اب میں صحیح معنوں میں فکر مند ہو گیا تھا میرے سارے ساتھی محاورے کے مطابق سینکڑوں کی طرح غائب تھے۔ یہاں تین گاڑیاں معہ چھ افراد کے ہونی چاہیے تھیں۔ مگر نہ کوئی گاڑی تھی اور نہ ہی کوئی فرد۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں واپس جاؤں یا پھر دائیں بائیں میں سے کسی طرف کا رخ کروں۔ یہ خیال کچھ اچھا نہیں لگا میرے ساتھیوں کے ساتھ جو ہوتا تھا وہ ہو چکا تھا۔ پیچھے بانو تھی میں اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر ایک فیصد بھی امکان ہوتا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی یہاں موجود ہوتا۔ اگر میں دیر کرتا اور بانو بھی چل پڑتی تو اس کو بھی تلاش کرنا پڑتا۔

اس لیے میں واپس چل پڑا میرا سانس کسی قدر بے ترتیب تھا لیکن مجھے امید تھی کہ میں اسی رفتار سے دوڑتا ہوا بد وقت ہیلی کاپٹر تک پہنچ جاؤں گا اس سے پہلے کہ بانو اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر سکے۔ مگر ابھی میں نے نصف راستہ طے کیا تھا کہ عقب سے روشنی محسوس ہوئی جو چند لمبے بعد ہی تیز ہو گئی تھی یہ کوئی گاڑی تھی جو تیزی سے قریب آرہی تھی لیکن میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر دوڑنا جاری رکھا۔ مجھے خطرہ صرف سکیورٹی ادارے کے افراد سے تھا اور اگر میں مڑ کر دیکھتا تب بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آنے والے کون ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ گاڑی میں کون تھا؟ شاید وہ کوئی عام فرد ہو یا پھر میرا کوئی ساتھی ہو سکتا تھا مگر میں رک کر وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی بالآخر مجھ تک آئی جاتی میں اس سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اس طرح ہیلی کاپٹر سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاتا۔

گاڑی آکر میرے پاس سے گزری پھر زوردار انداز میں بریکیں گونجیں۔ گاڑی رک گئی۔ یہ چھوٹے ماڈل کی مگر طاقتور جیپ تھی۔ جیپ رکتے ہی اس سے عبداللہ چلا نکلا مار کر برآمد ہوا۔ بیٹو اس کے پیچھے تھا۔ عبداللہ نے حفظ مراتب کا خیال رکھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ ”شکر ہے آپ آگئے..... یہاں.....“

ابھی عبداللہ کا جملہ منہ میں تھا کہ بیٹو بلا تکلف مجھ سے چٹ گیا۔ ”شوہی آپ آگیا..... لیکن یہاں بڑا گھونٹا لا ہو گیا ہے۔“

”تم لوگ کو غائب دیکھ کر مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا۔“ میں نے عبداللہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور بیٹو کو ایسے ہی کھینچ کر گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ ”لیکن تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ فوراً آگے چلو دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔“

عبداللہ نے سمجھداری کا ثبوت دیا اور بغیر کوئی سوال کیے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور میں اس کے برابر میں آگیا۔ بیٹو اس چھوٹی جیپ کے پچھلے حصے میں کھس گیا۔ میں نے بیٹھتے ہی کہا۔ ”عبداللہ تیز چلاؤ اور مجھے مختصر الفاظ میں بتاؤ مسئلہ کیا ہوا ہے؟“

عبداللہ نے جیپ دوڑا دی اور ساتھ ہی بولنے لگا۔ ”مسئلہ حویلی میں ہوا ہے۔ کچھ افراد سعدیہ کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔“

میں اچھل پڑا۔ ”سعدیہ کو..... کیسے اور کہاں سے؟“

”وہ، مونا اور شمی باہر باغ میں تھے۔ شمی اور مونا کا کہنا ہے کہ کچھ افراد اچانک وہاں آگئے۔ انہوں نے شمی اور مونا کو بے ہوش کیا۔ شمی کا کہنا ہے انہوں نے کوئی گیس سی اسپرے کی اور وہ تینوں ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ سعدیہ سب سے پہلے بے ہوش ہوئی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد گارڈ نے شمی اور مونا کو باغ میں بے ہوش پڑے دیکھ لیا تھا۔ مگر سعدیہ غائب تھی۔“

عبداللہ بہت خوفناک خبر سنا رہا تھا۔ میں صبح معنوں میں دہل گیا تھا۔ سعدیہ امید سے تھی۔ ”میرے خدا وسم کا کیا رد عمل ہوا؟“

”اسی نے تو ساری گڑبڑ کی تھی۔“ عبداللہ بولا اس گفتگو کے دوران ہم ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ جیپ رکتے ہی میں نیچے اتر آیا۔ عبداللہ اور بیٹو بھی نیچے آگئے۔ میں جھاڑیوں میں آیا اور وہاں ہیلی کاپٹر بانوسیت تینوں کو موجود پا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے جانے کے بعد بانو ہیلی کاپٹر میں آگئی تھی۔ یہاں وہ راج کنور اور سنگاری کی کمرانی بھی کر سکتی تھی۔ میں نے تعارف کرایا اگرچہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسکا پپر سب ایک دوسرے کو دیکھ چکے تھے اور تعارف بھی ہو گیا تھا مگر ہم پاکستانیوں کو بہت سے کام غیر ضروری کرنے کی عادت ہے۔ ان میں سے ایک بلاوجہ تعارف کرانا بھی ہے۔ بانو سے سلام دعا کے بعد عبداللہ نے آگے بات شروع کی۔ ”وسیم پاگل ہو گیا۔ وہ گاڑی لے کر بھاگا، میں اس کے پیچھے گیا۔ پھر ایاز بھی ہمارے پیچھے آگیا۔ ہم نے ایمین آباد تک جانے والی سڑک تک اس کا تعاقب کیا اس کے بعد وہ گھوم گیا۔ ہمیں آپ کا خیال بھی پریشان کر رہا تھا۔ وہاں معاملات دیکھنے والا کوئی نہیں تھا جب وسیم کو گویا اور اس نے کال بھی ریسپونڈ نہیں کی تو ہم واپس آگئے۔ میں ایاز اور سفیر کے ذمے لگا کر آیا ہوں کہ وہ وسیم سے رابطے کی کوشش کرتا رہے۔ یہاں سکنل نہیں ہیں

وہیں میں نے سفیر کو کال کر کے صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے وہ بھی دسیم سے رابطے کی کوشش کر رہا ہوگا۔
”سفیر بھی آیا ہے۔“

”ہاں میں اسے اسلام آباد چھوڑ رہا تھا مگر وہ ضد کر کے آگیا۔ یہاں ہم پانچ اور دسیم کے دو آدمی آئے ہیں۔ وہ دسیم والی گاڑی میں تھے۔ ایاز اور سفیر الگ گاڑی میں ہیں اور بیٹو میرے ساتھ ہے۔“
میں عبداللہ سے بات کر رہا تھا اور میرے ذہن میں بڑے کنور کی آواز گونج رہی تھی۔ ”بے شک شہباز سرحد پار بھی چلا جائے تب بھی وہ واپس آئے گا۔“

اس وقت میں نہیں سمجھا تھا کہ بڑا کنور کیوں اتنا بڑا دعویٰ کر رہا تھا لیکن اب میں کسی حد تک سمجھ گیا تھا کہ اس نے یہ دعویٰ کیوں کیا تھا۔ اگر سعدیہ کے ساتھ شی اور مونا بھی غائب ہوتے تو میرا ذہن اس طرف نہ جاتا مگر صرف سعدیہ کے غائب ہونے سے واضح تھا کہ یہ کام کس کا ہے۔ بڑا کنور یقیناً اتنی قدرت رکھتا تھا کہ پاکستان سے کسی کو اٹھوا سکتا تھا۔ اس کے پاس بے حساب دولت تھی اور دولت ہر مشکل کام کو آسان بنا دیتی ہے۔ ممتاز جیسے طاقتور سیاست دان سے اس کے روابط سامنے کی بات تھی مزید نہ جانے کہاں کہاں اس کی ڈوریں موجود تھیں۔ جس انداز میں سعدیہ کو اغوا کیا گیا تھا اس سے ظاہر تھا یہ بہت منظم اور تربیت یافتہ لوگوں کا کام تھا۔ عبداللہ نے زور سے آواز دی تو میں چونکا۔ ”شہباز صاحب آپ کہاں کم ہیں فودا چلیں ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“
”ہاں وقت نہیں ہے تم بانو اور بیٹو کو لے جاؤ۔ راج کنور بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔“

عبداللہ حیران ہوا تھا۔ ”راج کنور آپ کے ساتھ ہے؟“
”ہاں وہ بجلی کا پٹر میں موجود ہے اسی کی مدد سے ہم نے اتنی آسانی سے سرحد پار کی ہے۔“
بیٹو نے یہ قرار ہو کر کہا۔ ”شوٹی آپ کیوں نہیں چلے گا؟“
”مجھے واپس جانا ہوگا۔“ میں نے کہا تو بیٹو اور بانو ایک ساتھ چلائے تھے۔

”کیوں.....؟“

”شہباز صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“ عبداللہ مضطرب لہجے میں بولا۔ ”آپ ٹھیک ہیں نا؟“ بہ صد احترام اس نے میری دماغی حالت پر مہذب حیرائے میں سوال کیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اور میرا دماغ نہیں چلا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے سعدیہ کہاں ہے؟“
”کہاں ہے؟“ بانو بولی پھر وہ چونک گئی۔ ”میرے خدا کہیں بڑے کنور نے.....“

”مجھے یقین ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”اسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ سعدیہ ہمارے پاس ہے اور وہ خاموشی سے اسے واپس حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا رہا۔ جب میں اس کے ہاتھ سے نکلا تو اس نے اپنے مہرے ہلائے اور سعدیہ کو حاصل کر لیا۔“

”شہباز صاحب یہ صرف ایک مفروضہ ہے ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے ممکن ہے یہ مرشد.....“

میں نے نفی نے سر ہلایا۔ ”اس صورت میں وہ تینوں کو لے جاتا۔ صرف سعدیہ کو لے جانا بیوقوفی ہوتی۔ یہ کام صرف بڑے کنور کا ہے مجھے یقین ہے اگر مجھ سے اس کا مقصد پورا ہو جاتا تو وہ کبھی سعدیہ کو نہ چھیڑتا وہ اس سے محبت کرتا ہے۔“

”یہ محبت ہے؟“ بانو نے تلخی سے کہا۔

”تم اسے اپنے پیانے پر مت ناپو ہر شخص مختلف انداز میں محبت کرتا ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”مجھے واپس جانا ہوگا۔“

”نہیں آپ نہیں جائے گا۔“ بیٹو بولا۔

”بیٹو مجھے جانا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ مجھ سے پلٹ گیا۔

”اگر آپ جائے گا تو ہم بھی جائے گا۔“

”تم نہیں جاؤ گے۔“

”کیوں نہیں جائے گا سادی دیدی ہمارا دیدی ہے ہم بھی جائے گا۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ

سعدیہ دیدی کے لیے نہ جاتا تب بھی ہم آپ کے ساتھ جاتا۔ آپ کو اکیلا جانے نہ دیتا۔“

سنگاری ہیلی کا پٹر سے اتر کر ہمارے پاس چلا آیا۔ ”شہباز صاحب جو کرنا ہے جلدی کرو اگر ادھر رکنے کا ہے تو ہم کو اجازت دو ہم بھاگ جائے۔“

”میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔“

”ہم بھی.....“ بیٹو بولا۔

”بیٹو.....“ میں نے کہنا چاہا تو وہ پاؤں پیچ کر بولا۔

”ہم نہیں سنے گا آپ کے ساتھ جائے گا ضرور جائے گا اگر آپ ایسے نہیں لے گیا تو ہم پیدل آجائے

گا۔“

بیٹو میری کہانی کا ایسا کردار ہے جو میرے سائے کی طرح ہے۔ وہ میرا ہم وطن نہیں ہے ہم مذہب ہی نہیں ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے جو اس کے لوگوں کے لیے کیا تھا وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھی کیا تھا اس میں خالص مدد کا عنصر کم تھا۔ لیکن جب بیٹو میرے ساتھ ہوا تو بس میرے لیے ہو گیا۔ میرے ہر ساتھی کی اپنی زندگی تھی اپنی ذمے داریاں تھیں۔ مجھ سے ہٹ کر بھی ان کی مکمل لائف تھی بلکہ میرے ساتھ وہ خطرات میں پڑے ہوئے تھے۔ اگر مجھ سے الگ ہوتے تو سکون سے زندگی گزارتے لیکن بیٹو بس مجھ سے متعلق تھا میری ہر ذمے داری اس کی تھی۔ وہ خود کو میرے ساتھ محفوظ سمجھتا تھا اور مجھ سے الگ ہونے کے خیال سے ہراساں ہو جاتا تھا۔ ایسی محبت اور اتنا خلوص تو آج کل بھائیوں سے نہیں ملتا ہے جو بیٹو میرے لیے رکھتا تھا۔ میں کچھ دیر تاریکی میں اسے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر سمجھانے کی کوشش کی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں سمجھے گا۔ ”بیٹو وہاں خطرہ ہی خطرہ ہے اور میرے کسی ساتھی پر آج آئے مجھے بالکل گوارہ نہیں ہے۔“

جواب میں بیٹو گاڑی کی طرف گیا اس نے عقبی نشست سے دو خود کار دراز نکلیں اور ان کے میگزین نکالے اور سنگاری سے بولا۔ ”ہیلی کا پٹر اڑاؤ۔“

”یہ نہیں مانے گا۔“ عبداللہ نے دبے لہجے میں کہا۔ ”آپ پر گیا ہے۔“

”یعنی میری طرح ضدی ہے۔“ میں نے پھکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”عبداللہ میں واپس جا رہا ہوں۔“

لیکن دشمن کی قید میں نہیں جا رہا ہوں اللہ نے چاہا تو سعدیہ کو لے کر واپس آؤں گا۔“

عبداللہ سمجھ گیا تھا کہ میں نہیں رکوں گا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں بانو بی بی اور راج کنور کو لے کر واپس جاتا ہوں۔“

اچانک بانو بولی۔ ”شوہن پلڑا اتنی غلت میں ایسا فیصلہ نہ کریں۔ آپ پہلے تصدیق تو کر لیں۔“
 ”تصدیق؟“ میں نے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔ ”وہ کیسے کر دے؟“
 ”آپ بڑے کنور سے خود بات کریں۔“

بانو اس سے پہلے بھی کئی مواقع پر بہترین مشیر کا کردار ادا کر چکی تھی اور اس نے مجھے بروقت عقل کی بات سچائی تھی اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ جو بات میرے جذباتی ہوتے ذہن میں نہیں آ رہی تھی وہ اس نے سوچ لی۔
 اس حد پار واپس جانا بہت بڑا فیصلہ تھا اور یہ فیصلہ مجھے کسی مفروضے کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہیے تھا، چاہے وہ مفروضہ حقیقت سے کتنا ہی قریب کیوں نہ محسوس ہو بلکہ محسوس حقیقت کی بنیاد پر کرنا چاہیے تھا۔ اب تک میں نے سوچا نہیں تھا مگر بانو نے سوچ دی تو باقی سب خود میرے ذہن میں آنے لگا۔ میں بڑے کنور سے رابطہ رکھتا تھا اور رابطے کا نمبر مجھے راج کنور دیتا۔ میں ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ راج کنور فکر مند سا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔
 ”راج مجھے کوئی ایسا فون نمبر دو جس پر میں بڑے کنور سے براہ راست بات کر سکوں۔“
 وہ خوفزدہ ہوا۔ ”بڑے کنور سے..... کیوں؟“

”راج کنور دیر مت کرو ورنہ ہم پھنسے تو تم بھی پھنسو گے۔ مجھے نمبر دو۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو راج نے مجھے دو نمبر بتائے۔ ایک سیل کا تھا اور دوسرا کنور پبلس کالینڈر لائن فون تھا۔ اس کے دو نمبرز اور بھی تھے وہ میں نے موبائل میں محفوظ کر لیے۔ پھر میں عبداللہ کے پاس آیا۔ ”موبائل سنگل کہاں ملیں گے؟“
 ”ہمیں نارنگ منڈی روڈ کراس کر کے آگے جانا ہوگا۔“ اس نے جواب دیا اور مضطرب لہجے میں بولا۔
 ”لیکن شہباز صاحب اس وقت یہاں رکنا نہایت خطرناک ہے کسی وقت بھی سیوریٹی ادارے کے اہلکار یہاں آ سکتے ہیں اور ہم سب پکڑے جائیں گے۔ ہم ان سے مقابلہ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔“
 ”میرا خیال ہے انہوں نے آنا ہوتا تو اب تک آپکے ہوتے لیکن شاید وہ دفاعی نظام میں اس رخصتے سے بے خبر ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن احتیاطاً سب چلیں گے۔“
 ”راج کنور کو بھی لے جانا ہے؟“ بانو نے پوچھا۔

”نہیں اسے ہیلی کاپٹر میں باندھ دو۔“ میں نے کہا۔ ”سنگاری ہمارے ساتھ جائے گا۔“
 جب سنگاری کو بتایا گیا تو وہ بدک گیا۔ ”ہم کیوں جائے گا؟“
 ”اگر تم یہاں رہے تو بھاگ جاؤ گے یا ر کے اور سیوریٹی والے آگے تو ان کے ہتھے چڑھ جاؤ گے میں یہ دونوں باتیں نہیں چاہتا تھا۔“

”اس لیے ہمارا ساتھ چلو۔“ بیو نے اسے گردن سے پکڑ کر دھکا دیا۔ عبداللہ نے جیب سے ایک ری برآمد کی اور ماہرانہ انداز میں راج کنور کے دونوں ہاتھ جکڑ کر اسے چھت پر لگے ہینڈل سے بھی باندھ دیا اور پھر اس کے منہ میں پکڑا ٹھونس دیا اب وہ چیخ چلا کر کسی کو متوجہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مزاحمت نہیں کر رہا تھا غائب اس نے سمجھ لیا تھا کہ مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے باندھ کر ہم نے ہیلی کاپٹر کے اندر بٹلنے والی ہلکی سی سرخ روشنی

بھی بند کروادی۔ اول تو منی جیب میں راج کنوری جگہ نہیں تھی اور اگر وہ پکڑا جاتا تو میری بلا سے۔ اس لیے اسے چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سنکاری بادل نا خواستہ ہمارے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ میں آگے آیا۔ بانو، بیٹو اور سنکاری پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ بیٹو بانو سے پوچھ رہا تھا۔

”دیدیں تم اسکانپ میں تو اتنا صحت مند نہیں دکھتا تھا پر تمہارا صحت تو ہم سے بھی اچھا ہے۔ ہم کو یاد ہے پہلے تم دبلا سا تھا۔ اب تم کیا کرتا ہے؟“

یہ بیٹو کا کمزور پہلو تھا وہ کھانے میں کسی پہلوان سے کم نہیں تھا لیکن اس کا جسم چھریا سا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کا وزن بڑھے اور اس کے لیے وہ کوشش بھی کرتا تھا مگر تاحال وزن میں بہتری کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ اسی لیے جب اس نے صحت مند بانو کو دیکھا تو اس سے تعجب کرنے لگا۔ بانو اسے بتانے لگی کہ وزن بڑھانے کے لیے اس نے کیا کیا تھا اور کس طرح میں نے اسے عام لڑکی سے ایک خاص لڑکی میں بدل دیا تھا۔ وہ سیلف ڈیفنس کر سکتی تھی اور ہتھیار چلانا بھی جانتی تھی۔ بیٹو ہنسنا۔ ”دیدیں یہ شوبی ایسا ہی آدمی ہے، دوسرے آدمی کو خاص بنا دیتا ہے۔ پہلے ہم بھی عام لڑکا تھا کسی کو چھڑ بھی نہیں مارتا تھا۔“

”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک مہینے میں میرا وزن اتنا بڑھ جائے گا۔ میرے ہاتھ پاؤں مضبوط ہو جائیں گے۔“

بیٹو نے حسرت سے سنا۔ ”کاش، ہم بھی لڑکی ہوتا تو وزن تو بڑھایا لیتا۔“

عبداللہ زور سے ہنسا تو بیٹو کو اپنی بات کا احساس ہوا اور اس نے جلدی سے کھیا کر کہا۔ ”یہ تو ہم ایسے ہی بول رہا ہے۔“

”بانو نے صرف خود کو بہتری نہیں کیا ہے، یہ بہت ذہین بھی ہے ابھی تم لوگوں نے دیکھ لیا اس جذباتی موقع پر جب ہم تجربے کا رابٹی عقلیں بالائے طاق رکھ کر سوچ رہے تھے اس نے درست گائیڈ لائن دی۔“

”ماشا اللہ۔“ عبداللہ نے حلق سے آواز نکالی۔

”ایاز اور سفیر کہاں ہوں گے؟“

”وہ گوجرانوالہ سے پہلے کھالیہ کے پاس جی نو روڈ لنک پوائنٹ پر موجود ہیں۔ یہاں سے کوئی بیس میل دور ہے۔ میں نے کہا ہے جب تک میں نہ کہوں وہ وہاں سے نہ ہٹیں وہاں سے وہ دونوں ستوں میں کسی طرف بھی بہت تیزی سے حرکت کر سکتے ہیں۔“

”یہ تم نے ٹھیک کیا۔“ میں نے کہا۔ جیب اتنی دیر میں تاریک منڈی روڈ تک پہنچ گئی تھی۔ اسے کراس کر کے ہم آگے بڑھے۔ عبداللہ نے اپنا موبائل فون نکال کر دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے رہ رہ کر وہم کا خیال آ رہا تھا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کا آدمی لیکن سعدیہ اور پھر اپنے ہونے والے بچے کے لیے وہ عام آدمی تھا۔ اس کا رد عمل عام آدمی جیسا تھا۔ مجھے سعدیہ کی بھی فکر تھی اور مجھے حیرت ہوئی جب میں نے خود کو خواہش کرتے پایا کہ اسے بڑے کنور کے آدمی لے گئے ہوں۔ مرشد اور اس کے آدمی عورت کے معاملے میں شیطان سے بھی بدتر تھے۔ اگر سعدیہ ان کے بیچ میں تھی تو ہم اس کے لیے کسی اچھائی کی امید مشکل سے رکھ سکتے تھے۔ بڑا کنور سعدیہ کا بھائی تھا اور اس سے محبت کرتا تھا بے شک ایسے نہیں کرتا تھا جیسے عام بھائی اپنی بہنوں سے کرتے ہیں لیکن وہ

کرنا ضرور تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ سعد یہ کہاں ہے اور اس نے صرف ہمیں قبول کر لیا ہے بلکہ مسلمان بھی ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود اس نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ مجھے اشارہ تک نہیں دیا کہ وہ سعد یہ کے بارے میں جان چکا ہے۔ جب اس کی قید میں اس کے ساتھ کھینچا تانی چل رہی تھی اور بعض اوقات میں نے اس کی بات ماننے اور خون دینے سے انکار کیا تھا۔ خاص طور سے جب آخر میں کھانا چنا ترک کر دیا تھا تب بھی اس نے مجھے سعد یہ کے حوالے سے دھمکی نہیں دی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس نے ایسا بندوبست بھی کر لیا تھا کہ اگر میں اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں تو وہ سعد یہ کو اپنے قبضے میں کر سکے۔ اس نے اس پتے کو آخر کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جب بازی اس کے ہاتھ سے نکلنے لگے تو وہ اسے پھینک کر بازی ایک بار پھر اپنے حق میں کر لیتا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

”سگنل آگئے ہیں۔“ عبد اللہ نے کہا تو میں نے چونک کر دیکھا۔

موبائل پر دو سگنل آرہے تھے۔ میرے حساب سے یہ ناکافی تھے میں نے عبد اللہ سے مزید آگے چلنے کو کہا اس نے سر ہلایا۔ ”بہتر سگنل مجھے ذرا آگے ملے تھے۔ شاید ایک کلومیٹر اور آگے جانا پڑے۔“

سڑک کی حالت بہتر نہیں تھی اس کے باوجود عبد اللہ ہر ممکن تیزی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ جیسے ہی سگنل کی تعداد چار ہوئی میں نے عبد اللہ کو روکنے کو کہا اور نیچے اتر آیا۔ میں نے سب سے پہلے وسیم سے رابطہ کیا۔ اس کے موبائل پر کال جاری تھی۔ تیل بکتی رہی اور اس نے ریسپونڈ نہیں کیا۔ میں نے غصے میں دوبارہ ملا یا۔ عبد اللہ بھی اتر آیا بلکہ بانو بھی اتر آئی تھی البتہ بیٹو اندر تھا۔ وہ یقیناً سنکاری کی نگرانی کر رہا تھا۔ بیٹو کی ایک بہترین خوبی یہ تھی کہ وہ ہنگامی حالات میں خود اپنی ذمہ داری کا تعین کر کے مذکورہ کام میں لگ جاتا۔ اسے کہنا نہیں پڑتا تھا۔ اس کا نیچے آنا اور ہماری بات سننا ضروری نہیں تھا اس کے بجائے اس نے سنکاری کی نگرانی ضروری سمجھا۔ جیپ میں اسلحہ بھی تھا اس لیے سنکاری کو اکیلے چھوڑنا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ دوسری بار بھی تیل بج کر بند ہو گئی اور میرا غصے سے برا حال ہو گیا۔ میں نے عبد اللہ سے کہا

”یہ نہایت غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ مجھے وسیم سے ایسی توقع نہیں تھی اس کے خیال میں بس اسے ہی سعد یہ کی لگ رہے ہیں اس کا کوئی خیال نہیں ہے وہ کال تک ریسپونڈ نہیں کر رہا ہے۔“

”اسے ہم دیکھ لیں گے۔“ عبد اللہ نے مجھے ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ راج کنور سے بات کریں۔“

”جی شوبی وقت کم ہے۔“ بانو نے بھی احساس دلایا۔

میں راج کنور کا بتایا ہوا موبائل نمبر ملا یا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ بڑے کنور کا اپنا موبائل تھا اور یہ نمبر بس چند مخصوص لوگوں کے علم میں تھا۔ نمبر سے پہلے انڈیا کا کوڈ ملا یا تھا۔ تیل جانے لگی تو میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ تیسری تیل پر بڑے کنور نے کال ریسپونڈ کی اور اپنے مخصوص نمبر سے انداز میں بولا۔ ”شہباز ملک.....؟“

”تم جانتے تھے کہ میں کال کروں گا؟“

”ہاں مجھے یقین تھا کہ چند گھنٹوں کے اندر تمہاری کال آئے گی۔“

میں نے اس سے براہ راست سعد یہ کے بارے میں پوچھنے سے گریز کیا۔ ”تمہیں یہ یقین کیوں ہے؟“

اس بار وہ ہلکے سے ہنسا۔ ”تم بہت محتاط ہو شاید میرے منہ سے سننا چاہ رہے ہو؟“

”چلو ایسا ہی سمجھ لو۔“

”اوکے میں بتاتا ہوں سادھنا جلد میرے پاس آنے والی ہے۔“ اس نے تصدیق کی تو میرے اندر ایک رہی سہی امید تھی وہ بھی دم توڑ گئی۔ حقیقت پوری طرح عیاں ہو کر سامنے آ گئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو؟“

”نمبر بتا رہا ہے تم پاکستان جا چکے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے تم تقریباً بارہ گھنٹے بعد کال کر دو تو میں سادھنا سے تمہاری بات کر سکتا ہوں۔“

”اوکے میں نے مان لیا لیکن جب تم سعدیہ کے بارے میں جانتے تھے تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں اسی وقت جان گیا تھا جب ایک شخص نے سادھنا کو.....“

”وہ اب سعدیہ ہے۔“ میں نے ٹوکا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میرے لیے وہ سادھنا رہے گی۔“

”جب تم جان گئے تھے تو تم نے اسے واپس حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔“

”اس کی چند وجوہات تھیں۔ اول میں اسے راج سے بچانا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ اپنی زندگی بنا چکی تھی اور اس سے مطمئن تھی۔ مجھے مناسب نہیں لگا کہ اسے چھیڑوں۔ وہ بہر حال میری بہن ہے اور مجھے اس کی خوشی عزیز ہے۔“

”تجھی تم نے اسے اغوا کرایا ہے۔“

”تم کہہ سکتے ہو میں نے اپنی بہن کو واپس حاصل کر لیا ہے لیکن وہ واپس اپنے شوہر کے پاس جاسکتی ہے بشرطیکہ.....“

”میں تمہیں اپنا خون پیش کر دوں۔“ میں نے تجھی سے کہا۔ ”تم جانتے ہو وہ پریکٹسٹ ہے اگر اسے یا اس کے بچے کو کچھ ہوا.....“

”انہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”اسے لانے والے مکمل پروفیشنل ہیں اور جانتے ہیں کون سا کام کس طرح کرنا ہے اسے خراش بھی نہیں آئے گی۔“

”اسے گیس سے بے ہوش کیا گیا ہے اور تم جانتے ہو بے ہوشی کی کوئی گیس غیر مہلک نہیں ہوتی ہے۔“

”بے ہوشی کی گیس بے ضرر ہے اور اسے بھی بہت احتیاط سے استعمال کیا گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں ضمانت دے رہا ہوں سادھنا کو ذرا بھی نقصان نہیں ہوگا۔“

”میں.....“ میں نے کہنا چاہا اسی لمحے لائن کٹ گئی میں نے موبائل دیکھا وہ آن تھا اور بیڑی بھی چارج تھی۔ ”یہ کیا ہوا؟“

”میرا خیال ہے پلینس ختم ہو گیا۔“ عبد اللہ نے معذرت سے کہا۔ اس نے پرس سے اسکرینچ کارڈ نکالا اور اسے اسکرینچ کر رہا تھا کہ موبائل پر کال آنے لگی۔ بڑے کنور کا نمبر تھا میں نے کال ریسیو کی۔

”شہباز اب کیا کہتے ہو؟“

”میں کیا کہوں تم نے میرے لیے اور راستہ ہی کہاں چھوڑا ہے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم جانتے ہو واپس آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے بھی پوچھنا پڑے گا۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے جو لوگ سادھنا کو لارہے ہیں وہ تمہیں بھی آرام سے اٹھایا پہنچا دیں گے۔“ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ راج کنور نے خود بتا دیا تھا کہ سعدیہ کو اس کے پاس پہنچنے میں بارہ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ وہ یہ جان گیا تھا کہ میں پاکستان پہنچ گیا ہوں لیکن اسے یقیناً یہ علم نہیں تھا کہ میں کن حالات میں اور کس وقت یہاں پہنچا ہوں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب مجھے واپس آنے کے لیے کوشش کرنا پڑے گی جب کہ اس وقت واپس جانا میرے اختیار میں تھا۔ میں نے سوچ کر بڑے کنور سے کہا۔ ”مجھے دو دن کی مہلت چاہیے اس وقت تک سعدیہ بھی تمہارے پاس ہوگی اور میں تصدیق کر سکوں گا کہ وہ ٹھیک اور خیریت سے ہے۔“

”مجھے منظور ہے تم دو دن سوچ سکتے ہو اس کے بعد ہاں کرو گے تو اٹھا رو سے چوبیس گھنٹے میں تم میرے پاس آ سکتے ہو۔“ خلاف توقع وہ فوراً مان گیا۔ ”تم نے اچھا کیا جو مجھے سادھنا کی پرکھنسی کے بارے میں بتا دیا۔ میں ان لوگوں کو بریف کر دوں گا اور کنور پبلس میں تو تمام سہولتیں ہیں تم دیکھ چکے ہو۔“

”ہوں“ میں نے ہنکارا بھرا۔

”ٹھیک ہے میں تم سے دو دن رابطہ کروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”اسی نمبر پر۔“

”نہیں یہ کسی اور کا نمبر ہے میں خود کر لوں گا۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ عبداللہ اور بانو سن رہے تھے۔ بانو نے فوراً کہا۔

”آپ واپس نہیں جائیں گے۔“

عبداللہ نے اس کی تائید کی۔ ”بالکل اور اکیلے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں کسی کو نہیں لے جا سکتا۔“

”ہم جائے گا۔“ گاڑی کی طرف سے بیٹو کی آواز آئی۔

”ہاں صرف بیٹو جائے گا۔ اس لیے کہ یہ وہاں سے واقف ہے اگر پکڑا بھی گیا تو اس پر کم سے کم پاکستانی ہونے کا الزام نہیں لگے گا جو اٹلیا میں سب سے سنگین جرم ہے۔“

اس دوران میں عبداللہ نے موبائل میں کارڈ لوڈ کر لیا تھا اس نے سفیر کو کال کی۔ ”تم لوگ کہاں ہو؟“

”ہم جی ٹی روڈ کے قریب اسی جگہ ہیں۔“ سفیر نے کہا۔ ”شبہا آ گیا؟“

”ہاں میرے ساتھ موجود ہیں۔“ عبداللہ نے کہا اور موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ اس نے اسپیکر فون آن کر لیا تھا۔

”سفیر نصہ واپس جانا ہے۔“ میں نے بلا تمہید کہا۔ ”سعدیہ کو بڑے کنور نے اغوا کر لیا ہے وہ اگلے بارہ گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ جائے گی۔“

”ہم آرہے ہیں۔“ سفیر نے کہا۔ ”بات کرتا رہ۔“

میں نے مختصر الفاظ میں سفیر کو بڑے کنور سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ ”اس کی واحد شرط یہ ہے کہ میں واپس جاؤں۔“

”نہیں۔“ سفیر نے مخالفت کی۔ ”یہ سخت ناقابل اعتبار لوگ ہیں، مجھے یقین ہے وہ شرافت سے سعد یہ کو واپس نہیں کرے گا۔“

”میں جانتا ہوں یار، میں بھی مکاری کے جواب میں چالاک سے کام لے رہا ہوں۔ میں نے اس سے دو دن کی مہلت حاصل کی ہے لیکن میں ابھی واپس جا رہا ہوں اور اس سے پہلے سادھنا کنور پبلشنگ کمپنی سے چھڑانے کی کوشش کروں گا۔“

”شہباز یہ سب خطرناک ہے، یار اتنی مشکل سے تو تُو واپس آیا ہے اور پھر اسی دلدل میں اترنا چاہتا ہے۔“

”سفیر مجبوری ہے میں سعد یہ کو واپس لانا چاہتا ہوں۔ وہ صرف دسیم کی بیوی نہیں ہے ہماری بھی بہت کچھ ہے۔“

”میں جانتا ہوں یار وہ مونا اور سویرا جیسی ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”پر ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔“

”میں نے سوچ لیا ہے اور اس سے زیادہ کا وقت نہیں ہے ہیلی کاپٹر تیار ہے اور اس سے پہلے کوئی مسئلہ ہو مجھے واپس جانا ہے۔“

”رک جا یا رہم پہنچنے والے ہیں۔ یہ ایاز میری جان بھٹلی پر رکھ کر ڈرائیونگ کر رہا ہے بس دعا کر خیر خیریت سے پہنچ جائیں۔“

”کتنی دیر لگے گی؟“

سفیر نے ایاز سے پوچھا اور پھر مجھے بتایا۔ ”یہ کہہ رہا ہے دس منٹ لگ سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔“

میں نے موبائل عبداللہ کو واپس کیا تو اس نے پھر کہا۔ ”شہباز صاحب آپ سوچ لیں۔ جہاں تک سعد یہ کا تعلق ہے ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے بعد میں ہم کسی اور طریقے سے اسے واپس حاصل کر سکتے ہیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے بڑے کنور نے یہ انتہائی قدم اس لیے اٹھایا ہے کہ میں واپس نہ جاؤں نہیں اگر میں نے انکار کیا تو سعد یہ وہاں آرام سے نہیں رہ سکے گی۔“

بانو کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ”آپ کا مطلب ہے وہ اپنی سگی بہن کو تشدد کا نشانہ بنا سکتا ہے؟“

”وہ ایسا ہی کرے گا، یہ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں آدمی سوائے اپنی ذات کے اور کسی سے پیار نہیں کرتا ہے۔ بڑا کنور بہر صورت اپنی بیماری سے چھٹکارا چاہتا ہے اور اس کے لیے اسے میرا خون درکار ہے۔ اس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کرے گا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”مجھے فکر آپ کی واپسی کے طریقے کی ہے اس میں خطرہ بہت زیادہ ہے۔“

”ہم جیسے آئے ہیں ایسے ہی واپس جائیں گے۔ انڈیا میں خطرہ نہیں ہے کیونکہ وہاں کے حکام کی باقاعدہ اجازت سے آئے ہیں۔ یہاں خطرہ نہیں ہے کیونکہ ہم بلا روک ٹوک اندر تک پہنچ گئے اسی طرح واپس بھی پہنچ جائیں گے۔“

عبداللہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اسی لمحے سڑک پر روشنی نمودار ہوئی، آنے والی گاڑی بہت تیزی سے آ رہی

تھی مگر قریب آتے ہوئے اس کی رفتار کم ہوئی تھی۔ گاڑی آکر پاس رکی۔ اس سے سفیر اور ایاز نکل کر مجھ سے گلے ملے۔ سفیر یہ جان کر بے چین ہو گیا کہ میں واپس اٹھیا جا رہا ہوں اس نے نگلی سے کہا۔ ”تیرا داغ خراب ہے۔“

”میں سعدیہ کو لینے جا رہا ہوں۔ میں اسے بڑے کنور کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔“
 ”تو اس کی توقع پوری کر رہا ہے۔“

”یار مجبور ہوں، ٹو جانتا ہے سادی ہمارے لیے کیا ہے۔ دسم نے آج تک میرے لیے ہی کیا ہے مجھ سے کچھ لیا نہیں ہے یا آج اس کی بیوی اور ہونے والا بچہ مشکل میں ہیں تو میں کیسے پیچھے ہٹ جاؤں۔“
 ”میں بھی تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔“ سفیر نے کہا۔

”تم لوگوں کا داغ خراب ہے۔“ اس بار میں برہم ہو گیا۔ ”کوئی نہیں جائے گا۔“
 ”بس، ہم جا رہا ہے شوبی کے ساتھ۔“ بیتو نے یوں غر سے کہا جیسے کوئی ثرائی جیت لی ہو۔
 ”تم تو جاؤ گے اٹھیا کے چمچے۔“ سفیر بولا۔

”ہاں ہم اٹھیا کا چمچ ہے اپنے ملک کا ہے۔“ بیتو نے کہا۔ ”آپ پاکستان کا چمچ نہیں ہے۔“
 ”خدا کے لیے۔“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یہ تم لوگوں نے کیا چمچوں کی جنگ شروع کر دی ہے۔“
 عبداللہ ہنسا۔ ”پچھلے دنوں اٹھیا پاکستان کا کرکٹ میچ تھا ویسے تو ان دونوں کو کرکٹ سے خاص دلچسپی نہیں ہے مگر ایک دوسرے کی مخالفت میں پورا میچ دیکھا اور پورے میچ میں لڑتے رہے۔“
 بات مسکرانے والی تھی لیکن اس وقت میرا موڈ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”سفیر..... ایاز تم لوگ واپس جاؤ اور دسم کو سنبھالو۔ اسے کہنا ہی میرا حکم ہے وہ کوئی حرکت نہیں کرے گا اور اٹھیا آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔“
 ”وہ نہیں مانے گا۔“ سفیر بولا۔

”اوکے میں رابطہ کر کے خود اس سے بات کروں گا۔ بانو لیپ ٹاپ والا بیک دو۔“
 بانو نے صرف بیک ہی نہیں بلکہ اپنے پاس موجود ساری رقم نکال کر دے دی۔ ”یہ آپ کے کام آئے گی۔“

”تھینک یو مجھے واقعی اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ میں نے نوٹوں کی گڈیاں بھی لیپ ٹاپ والے بیک میں ڈال لیں اور اسے اسٹریپ سے شانوں پر پہن لیا۔ بانو جذباتی ہو کر میرے بازو سے لگ گئی۔
 ”ایسا کیوں کہتے ہیں میں تو خود آپ کی احسان مند ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے رو پڑی تھی۔
 ”احسان کیسا تم بھول رہی ہو اب تم اس فیملی کا حصہ ہو۔“ میں نے اس کا سر تھک پھر سب سے کہا۔
 ”عبداللہ، سفیر، ایاز اب بانو ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کا ہر ممکن خیال رکھنا ہے۔“
 ”انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ عبداللہ نے یقین سے کہا۔

میں نے بانو سے کہا۔ ”بس اب جاؤ اور دعا کرنا اللہ مجھے کامیاب واپس لائے۔“
 ”میں بہت دعا کروں گی۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے ہوئی۔ ایاز، سفیر اور عبداللہ باری باری میرے گلے لگے تھے۔ یک لخت میرا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ اپنے ملک اور اپنی سرزمین آنے کی جو خوشی ملی تھی وہ کافور ہو گئی

تھی اور اب مجھے دوبارہ اسی سرزمین پر جانا تھا جہاں سوائے دشمنوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ پتا نہیں میرے نصیب میں کیا تھا۔ عبداللہ نے کہا۔

”جب آپ سعدیہ کو واپس حاصل کر لیں تو اس بار یہاں سے آپ کی واپسی کا بندوبست کریں گے۔“
”کوئی سوس ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بھئی تو کہہ رہا ہوں، آپ رابطے میں رہیے گا۔“
ان کو بھی جلد جانا تھا اور مجھے تو یہاں سے جلد نکلنا تھا۔ ابھی ہمیں ہیلی کاپٹر تک جانا تھا۔ وہ سب جانا چاہتے تھے لیکن میں نے منع کر دیا۔ ”ہمیں ایاز چھوڑنے جائے گا۔“

ایاز خوش ہو گیا۔ وہ ایک طاقتور فور و ہیل ڈرائیو لے کر آیا۔ ایک بار پھر عبداللہ اور سفیر سے مکمل کر اور بانو کا سر تھپک کر میں گاڑی میں آ گیا۔ بیوہ بھی سنکاری کو لے آیا تھا۔ ہم روانہ ہوئے عقب میں وہ لوگ کچھ دیر نظر آتے رہے اور پھر تاریکی غالب آ گئی۔ ایاز ہر ممکن تیزی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے ساتھ لانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اگر ہمیں غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تو ایاز ماہر ڈرائیو تھا اور یہ گاڑی بھی بہت شاندار تھی۔ مجھے خیال آیا۔ ”شاہین کیسی ہے؟“

”بہت اچھی ہے اور خوش ہے۔ آپ کو دعائیں دیتی ہے کہ آپ مل گئے۔“
”شاید شاہین جیسے پُر خلوص لوگوں کی دعائیں ایسے وقت میں کام آتی ہیں جب میں بھی بے بس ہو جاتا ہوں۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ آپ کبھی بے بس ہوتے ہوں گے۔“
”نہیں یا میں بھی انسان ہوں بہت بار بے بس ہوا۔ ہاں اتنا ہے کبھی ہار نہیں مانی۔“
”یہی چیز آپ کو دوسروں سے منفرد کرتی ہے۔“

چند منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ میں نے ایاز سے پہلے ہی گاڑی کی لائٹس بند کرادی تھیں۔ ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچ کر گاڑی روکادی۔ ہم نیچے اتر آئے۔ آس پاس تاریکی تھی۔ مجھے لگا کہ وہاں سب ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے سب کو گاڑی کے پاس رکنے کو کہا اور خود بے قدموں جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔ دیو ہیکل پرندہ ساکت کھڑا تھا میں نے پاس جا کر دیکھا راج کنور بدستور بندھا بیٹھا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ہلکی سی سیٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد وہ سب جھاڑیوں سے برآمد ہوئے۔ میں نے ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھولا اور راج کنور کو آزاد کیا۔ منہ سے کپڑا ہٹتے ہی اس نے کہا۔ ”شہباز تم بہت دیر کر رہے ہو مجھے صرف دو گھنٹے کی اجازت ملی ہے۔“

”فکرمٹ کرو اس میں سے صرف ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہے ابھی مہلت ہے اور خبر یہ ہے کہ سنکاری کے ساتھ صرف میں اور میرا ساتھی جائے گا۔ تم یہیں رہو گے۔“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”شہباز تمہیں مجھے واپس لے جانا ہوگا۔“
”فی الحال تو میں نے ایسا نہیں سوچا ہے۔“ میرا لہجہ سرد ہو گیا۔
”تمہیں معلوم ہے واپسی کے لیے بھی ایک پاس ورڈ ہے۔ اگر پوچھنے پر وہ پاس ورڈ نہیں دیا تو ہیلی کاپٹر

مارا گرایا جائے گا۔“

”تم جھوٹ بولتا ہے۔“ بیٹو آگے آیا اور اس نے راج کنور کے منہ پر ہاتھ مارا۔ وہ طیش میں آ گیا تھا۔ راج کنور وہ شخص تھا جس کی ہوس اقتدار و دولت پر بیٹو کا خاندان اور قبیلہ مارا گیا تھا۔ جب تک میں نے بیٹو کو پیچھے کھینچا وہ اسے کئی ہاتھ رسید کر چکا تھا۔ راج کنور چلانے لگا۔

”شہباز اسے روکو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”ایک منٹ شہباز صاحب۔“ ایاز نے مداخلت کی۔ ”وقت نہیں ہے کسی وقت بھی کوئی آ سکتا ہے۔ آپ اسے ساتھ لے جائیں اور اگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ واپسی میں کسی نے پاس ورڈ نہیں مانگا تو اسے ہیلی کاپٹر سے نیچے پھینک دیجئے گا۔“

”تم نے سن لیا راج کنور۔ میں نے اس سے کہا۔“ یہاں تمہارے پاس زندہ رہنے کا ایک چانس ہو گا لیکن اگر ایسا نہیں ہوا جیسا تم کہہ رہے ہو تو میں یہی کروں گا۔“

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”میں نے جھوٹ نہیں کہا ہے تم دیکھ لو گے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے تم ساتھ چلو گے۔“

سنکاری پائلٹ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کے پرزوں کے ساتھ چھپڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ میرے اشارے پر سنکاری نے انجن اشارٹ کیا اور ایاز آخری بار گلے مل کر پیچھے ہوا تو بیٹو نے خشکی سے کہا۔ ”ہم آپ کا کچھ نہیں لگتا ہے بس شوبی سے ملنے جا رہا ہے۔“

”لگتا کیوں نہیں دشمن جان۔“ ایاز نے اسے گلے سے لگایا۔ اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر کے پیچھے حرکت میں آ گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں ان کی رفتار اتنی تیز ہوئی کہ شور اور ہوائ ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ ایاز پیچھے ہٹ گیا اور بیٹو اندر آ گیا۔ دروازہ بند کیا تو ہوا سے نجات ملی لیکن شور کانوں میں گھسا جا رہا تھا۔ ہیڈ فون پہن کر ذرا سکون ملا تھا۔ سنکاری چلا چلا کر بیٹو سے ہیڈ فون پہننے کو کہہ رہا تھا۔ بالآخر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ ہوا کے ساتھ مٹی اڑ رہی تھی اور اب ایاز نظر نہیں آ رہا تھا وہ یقیناً پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں نے اپنے پاس ایک ہسٹول رکھا تھا اور باقی اسلحہ بیٹو والے بیگ میں ڈال دیا تھا جس میں خود کار رائفلیں بھی تھیں۔ سنکاری نے اسلحہ کھینچی تو ہیلی کاپٹر ڈولتا ہوا اہوا میں بلند ہوا تھا۔ ذرا بلند ہوا تو ان لوگوں کے ہیولے دکھائی دیئے تھے۔ میں جانتا تھا وہ مجھے نہیں دیکھ پا رہے تھے لیکن پھر بھی میں نے ہاتھ ہلایا تھا۔ سنکاری نے ریڈیو آف کیا ہوا تھا اس لیے اگر ہمیں پاکستان کے دفاعی حکام کی طرف سے وارننگ دی جا رہی تھی تو ہمیں علم نہیں تھا۔ سنکاری نے پچاس فٹ کی بلندی رکھتے ہوئے انٹرن سرحد کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ایک منٹ بعد سنکاری نے خبردار کیا۔

”ہم بارڈر کے پاس ہے۔“

میں نے نیچے دیکھا۔ نیم تاریکی میں دریا کی وادی نظر آنے لگی تھی اچانک کہیں عقب سے شعلہ چکا۔

میں نے چلا کر سنکاری سے کہا۔ ”میزائل..... بچو۔“

سنکاری نے بے ساختہ انجن کو پاور دی اور ہیلی کاپٹر بہت کم بلندی پر بہت تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ اس نے زمین کی طرف جانے کے بجائے دریا کی وادی کو ترجیح دی تھی کیونکہ یہاں کسی چیز کے اچانک سامنے آنے کا

امکان نہیں تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میری نظر پڑ گئی ورنہ اس بلی کا پٹر میں میزائل وارننگ سسٹم نہیں تھا۔ چند لمحوں میں بلی کا پٹر کی رفتار دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ تک پہنچ گئی تھی مگر پیچھے لپکنے والا میزائل اس سے کہیں تیز رفتار تھا۔ راج کنور کی بات بکواس عایت ہوئی تھی کہ پاکستان کے پاس نیچے اڑنے والے بلی کا پٹر کے خلاف کارروائی کے لیے میزائل نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ خوشی کی بات تھی کہ میرے وطن کے محافظ غافل نہیں تھے مگر ان کی مستعدی سے ہماری جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ یقیناً اس بلی کا پٹر کو مار کر لیا گیا تھا اور جیسے ہی یہ دوبارہ فضا میں بلند ہوا اسے نشانہ بنالیا گیا تھا۔ میں جھک جھک کر دیکھ رہا تھا کہ میزائل کس طرف سے آ رہا تھا اس وقت رات کی تاریکی کام آ رہی تھی ورنہ دن کی روشنی میں اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا جب تک وہ بالکل پاس نہ آ جاتا اور جب وہ پاس آ جاتا تو اس کے بعد صرف اجل کی آمد باقی رہ جاتی۔ میزائل تقریباً ایک کلومیٹر پیچھے بائیں طرف ہے آ رہا تھا۔ یہ لازماً پاکستانی سرزمین سے فائر کیا گیا تھا۔

”میزائل بائیں طرف تقریباً ایک کلومیٹر پیچھے ہے۔“

سنگاری فی الحال بلی کا پٹر کو سیدھا اڑا رہا تھا تاکہ رفتار میں کمی نہ آنے پائے۔ میزائل کہیں تیز رفتار اور کہیں بھرتیلا ہوتا ہے۔ ہم نانوے فیصد خطرے میں تھے اور بچنے کا امکان صرف ایک فیصد تھا۔ میزائل بہت تیزی سے پاس آ رہا تھا۔ جب وہ چند سو گز دور رہ گیا تو میں نے سنگاری کو خبردار کیا اور اس نے بلی کا پٹر لہراتا شروع کر دیا۔ باتوں کا مجھے نہیں معلوم لیکن میرا برا حال تھا۔ ابھی اپنے پیادوں سے مل کر رخصت بھی نہیں ہوا تھا کہ موت پیچھے لگ گئی تھی اور موت بھی اپنوں کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔ نیچے دریا کا پانی چمک رہا تھا۔ جب میں نے سنگاری کو خبردار کیا اس کے مشکل سے آدھے منٹ بعد میزائل بلی کا پٹر کے بہت پاس آ گیا تھا اور بلی کا پٹر کے ساتھ ساتھ وہ بھی لہرا رہا تھا جیسے بین کی لے پر سانپ لہراتا ہے۔ اب سنگاری عقبی طرف خود دیکھ کر میزائل سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بیٹو سے کہا۔

”سیٹ پلٹ باندھ لو۔“

”ہم نے باندھ لیا ہے۔“ اس نے پُر سکون لہجے میں کہا۔ ”شوٹی آپ نیچے کود جاؤ ادھر پانی ہے۔“

میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر عمل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ بلی کا پٹر جس طرح لہرا رہا تھا درست انداز میں کودنا ممکن نہیں تھا اور پانی کے بجائے کہیں اور گرتے تو بڑی پہلی لازمی ایک ہو جاتی۔ لاش کا بھی کچھ مرکل جاتا۔ سنگاری نے بالکل پاس آنے والے میزائل سے بچنے کے لیے بلی کا پٹر لہرایا تھا کہ ایک دھماکہ ہوا۔ فضا شعلے سے روشن ہو گئی۔ ایک لمبے کو ایک ایسا لگا کہ دھماکے سے بلی کا پٹر اور ہمارے بھی پڑے اڑ گئے تھے۔ مگر جب حواس بحال ہوئے تو بلی کا پٹر ٹھیک تھا اور پرواز کر رہا تھا۔ مگر اسی لمحے سنگاری چلایا۔ ”ہم ہٹ ہو گیا ہے۔“

میں نے مڑ کر دیکھا تو بلی کا پٹر کے عقبی حصے سے شعلے نکل رہے تھے اور اس کی ڈم کا ایک حصہ اڑ گیا تھا اب بلی کا پٹر از خود لہرا رہا تھا۔ کبیں میں جیسے زلزلہ آیا ہوا تھا۔ اگر کوئی اور میزائل پیچھے ہوتا تو اس کے لیے درست نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نشست کو تختی سے تمام رکھا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی سیٹ پلٹ نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ بلی کا پٹر جس طرح لہرا رہا تھا صاف لگ رہا تھا وہ جلد کریش ہونے والا ہے۔ میں نے چلا

کر سنکاری سے کہا۔ ”اسے پانی میں اتارنے کی کوشش کرو۔“

”نہیں کر سکتا۔“ وہ اسنک سے کشتی لڑتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرے قابو میں نہیں ہے۔“

زمین تیزی سے نزدیک آ رہی تھی ہم دریا کی وادی میں تھے۔ گرم موسم کے باوجود دریا میں پوری طرح پانی نہیں تھا کہیں یہ چوڑا تھا اور کہیں بس برائے نام پانی تھا۔ سوکھو میٹرز سے اوپر رفتار سے پانی میں گرنے سے بھی بس اتنا فائدہ ہوتا کہ ہیلی کاپٹر میں آگ نہیں لگتی۔ زمین اتنی قریب آ گئی کہ ہیلی کاپٹر بس اب تب میں گرنے والا تھا۔ وہ دائیں طرف کٹ رہا تھا اور پانی بائیں طرف تھا۔ میں نے جھپٹ کر سنکاری کا اسنک والا ہاتھ پکڑا اور اسے پوری قوت سے بائیں طرف کھینچا۔ ہیلی کاپٹر جموم کر مڑا اور اگلے لمبے پانی کی سطح سے جا ٹکرایا تھا۔ ایک دھماکہ ہوا اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔



دھماکے سے ہیلی کاپٹر زمین یا پانی سے ٹکرایا اور چاروں طرف اندھیرا ہوا تھا مگر یہ اندھیرا ذہن کا نہیں تھا، بج بج اندھیرا ہو گیا تھا کیونکہ ہیلی کاپٹر پانی میں اتر گیا تھا۔ تصادم کے فوراً بعد دائیں طرف کی ٹوٹ جانے والی کھڑکی سے پانی کا دھارا اندر داخل ہوا تھا۔ اس وقت تک شورا تھا تھا کہ کچھ اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر جیسے ہی گرنے کے بعد انجن بند ہوا شور بھی کم ہونے لگا اور مجھے بیٹو کی آواز آئی وہ چلا رہا تھا۔ ”شوہی آپ ٹھیک ہے..... شوہی جواب دو.....“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں چلایا۔ ”تم ٹھیک ہو۔“

”ہاں پر یہ سیٹ نہیں کھل رہا۔“

میرے برابر میں سنکاری گھمکھائی آوازیں نکالتے ہوئے اپنی سیٹ سیٹ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سیٹ سیٹ کھولی اور ڈولتے ہیلی کاپٹر میں توازن قائم رکھتے ہوئے پیچھے کی طرف بڑھا۔ اب مجھے راج کنوری کی آواز آئی۔ وہ بھی واویلا مچا رہا تھا اور یہ ایک پرفیکٹ کریش لینڈنگ ثابت ہوئی تھی جس میں سب بچ گئے تھے۔ پانی یہاں خاصا گہرا تھا کیونکہ ڈرائی ویر میں ہماری کمرہ تک پانی آ گیا تھا۔ میں نے ٹوٹ کر بیٹو کی سیٹ سیٹ کھولی اور اس سے کہا۔ ”باہر نکلو۔“

بیٹو نے آزاد ہوتے ہی ہیلی کاپٹر کا اپنی طرف والا سلائیڈنگ ڈور کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ سنکاری فائدے میں رہا تھا اس کا سونگ ڈور تھا مگر اس کے کھلتے ہی پانی کا تازہ ریلہ اندر آیا تھا۔ میں نے سنکاری سے پوچھا۔ ”ہم کہاں ہیں؟“

”آف کورس دریا میں.....“ اس نے کاہلی آواز میں جواب دیا۔

”میں ملک کا پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے سوال واضح کیا۔ ”ہم انڈیا میں ہیں یا پاکستان میں؟“

”پتا نہیں اپنا حواس گم تھا۔ ادھر بھی ہو سکتا ہے اور ادھر بھی۔“

ہیلی کاپٹر اب تک گیا تھا اور مزید نیچے نہیں جا رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ یہاں پانی سات آٹھ فٹ سے زیادہ گہرا نہیں تھا۔ البتہ پانی بہنے سے ڈول رہا تھا۔ راج چلا رہا تھا۔ ”مجھے نکالو یہاں سے میں ڈوب جاؤں گا۔“

”تم اسی قابل ہے۔“ بیٹو نے اسے ڈانٹا۔ ”اپنا منہ بند کرو اور بھگوان سے اپنے باپ کا معافی مانگو، ابھی

”تمہیں اس کے پاس جانا ہے۔“

”یہ چھو کر کیا بولتا۔“ سنکاری نے گھبرا کر کہا اور ہیلی کا پٹر سے باہر نکل گیا۔ مجھے اس کی چیخ سنائی دی تھی۔ اس نے چلا نا شروع کر دیا۔ ”ہم کو بچاؤ بانی گاؤں ہم تیرا نہیں جانتا۔“

میرا لپ ٹاپ والا بیک کسی قدر بھیک گیا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ اس میں لپ ٹاپ محفوظ رہے گا۔ اب میں اسلحے والا بیک تلاش کر رہا تھا۔ مگر وہ نہیں مل رہا تھا۔ بیٹو دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا اور اب چلا چلا کر مجھے بھی باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے کانوں پر چڑھا ہیڈ فون اتار پھینکا اب پتا چلا کہ ہم سب کو کیوں چلا چلا کر بات کرنا پڑ رہی تھی کیونکہ ہیڈ فون کی وجہ سے آواز کانوں تک کم آرہی تھی۔ میں نے بیٹو سے بھی ہیڈ فون اتارنے کو کہا۔ ”میں اسلحے والا بیک تلاش کر رہا ہوں اور اب چلا نا بند کر دو۔“

”شوہنی وہ میرے پاس ہے اسے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔“

اب ہیلی کا پٹر میں چار فٹ تک پانی بھر گیا تھا۔ یہ میرے سینے تک آ گیا تھا۔ راج کنور نہ جانے کہاں تھا۔ اس کی آواز اب نہیں آرہی تھی لیکن میں باہر نکلنے لگا تو اس نے میری ٹانگ پکڑ لی اور بولا۔ ”بھگوان کے لیے شہباز مجھے بھی نکالو میں ڈوب جاؤں گا۔“

پلاسٹر والی ٹانگ کے ساتھ اس کے لیے تیرنا ممکن نہیں تھا مگر اس وقت مجھے اپنی بڑی تھی اسے کہاں سے بچاتا۔ میں ٹانگ جھٹک کر آگے بڑھا۔ بیٹو اسکیز پر کھڑا تھا اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے کھینچا کیونکہ ہیلی کا پٹر دوسری طرف جھک رہا تھا۔ میں نے نیچے دیکھا تو دریا کا پانی چمک رہا تھا۔ یہاں آسان کہیں کہیں صاف تھا مگر چاند نہیں تھا اور ستارے نظر آرہے تھے۔ میں نے دریا کا مشرقی کنارہ دیکھا وہ کوئی سو فٹ دور تھا۔ پانی سُست روی سے بہہ رہا تھا۔ سنکاری بھی ہیلی کا پٹر کی اسکیز سے چمٹا ہوا تھا۔ بیٹو نے اسلحے والا بیک شانے سے ٹانگ لیا تھا۔ وہ بولا۔ ”شوہنی جلدی کرو، اس سے پہلے کوئی ادھر آئے ہم کو نکل جانا چاہیے۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ راج کنور کو نے میں خود کو پانی سے اوپر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا سر اور ایک شانہ پانی سے باہر تھا باقی جسم پانی میں تھا۔ میں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور بیٹو سے کہا۔ ”جلدی نکلو۔۔۔۔۔۔“

بیٹو کے پاس اسلحے والا وزن بیک تھا وہ اسے ہی لے جاتا تو کافی تھا میں نے سنکاری سے کہا۔ ”میرے پاس آ جاؤ۔“

”ہم ڈوب جائے گا۔“ وہ ہیلی کا پٹر سے چمٹے ہوئے بولا۔

جواب میں، میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی اور وہ چیخ مار کر پانی میں گرا۔ میں نے اسے گھما کر اس کی گردن قابو میں کی اور دوسرے ہاتھ سے پانی کاٹتے ہوئے کنارے کی طرف جانے لگا۔ بیٹو مجھ سے آگے تھا۔ یہاں دریا کا پاٹ سو گز سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ درحقیقت ہم بالکل وسط میں گرے تھے۔ پچاس فٹ کے بعد ہمارے پاؤں زمین سے ٹکرانے لگے تھے۔ سنکاری بھی اب سنبھل گیا تھا۔ کنارے سے تیس فٹ پہلے پانی کم ہو گیا تھا اب ہم چل کر کنارے تک جا رہے تھے۔ کہیں کہیں گڑھے آ جاتے تو ہم غوطے کھا جاتے تھے۔ بیٹو مجھ سے پہلے پہنچا۔ اس نے بیک ریت پر پھینکا اور پلٹ کر آیا پھر مجھ سے سنکاری کو لے لیا۔ ہم کنارے پر پہنچے اور ریت لکڑے۔ بیٹو ہانپ رہا تھا اور میری سانس بھی بے ترتیب تھی لیکن سنکاری جسے کچھ نہیں کرنا پڑا تھا اس کی حالت

سب سے بری تھی، وہ یوں منہ کھول کھول سانس لے رہا تھا جیسے سب سے زیادہ مشقت اسی نے کی ہو۔ میں واپس جانے کے لیے پلٹا تھا کہ بیٹے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”شوبی کدھر جاتا ہے۔“

میں راج کنور کو نظر انداز کر کے ہیلی کا پٹر سے نکل آیا تھا اگر میں اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتا تو وہ اس کا مستحق تھا۔ اسے پہچانا مجھ پر بالکل بھی فرض نہیں تھا جب کہ وہ کئی بار مجھے مارنے کی پوری کوشش کر چکا تھا۔ اس وقت ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا کیونکہ ہیلی کا پٹر کریش معمولی واقعہ نہیں تھا اور یہ کریش میزائل کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم جس ملک کی حدود میں گرے تھے اس کے لوگ جلد یا بدیر یہاں پہنچنے والے تھے۔ مگر اس کے باوجود میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ اسے یوں بے بسی سے مرنے کے لیے چھوڑ دوں۔ میں نے بیٹے کو آگاہ کیا۔ ”میں راج کنور کو لینے جا رہا ہوں۔“

”چھوڑو شوبی مرنے دو اس کتے کو۔“

”نہیں وہ آگے ہمارے کام آئے گا۔“ میں نے کہا۔ اگر میں بیٹے کو انسانیت کا بھاشن دیتا اور اس سے بحث کرتا تو اس کا وقت نہیں تھا۔ بیٹے نے میرا بازو چھوڑا تو میں نے لیپ ٹاپ والا بیگ بھی اتار کر اسے دے دیا۔ بیٹے کو بتایا۔ ”اس میں لیپ ٹاپ ہے۔“

میں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور چلنے کے بجائے تیرتے ہوئے ہیلی کا پٹر کی طرف جانے لگا۔ اس سے رفتار تیز ہو جاتی۔ ہیلی کا پٹر رفتہ رفتہ پانی میں ڈوب رہا تھا پانی میں گرنے سے اسے مزید نقصان نہیں ہوا۔ اس کے پر سلامت تھے بس ڈم کا ایک حصہ اڑ گیا تھا اور ایک طرف کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے وزن کی وجہ سے وہ دریا کے کچھڑ میں گھس رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوا کہ وہ ایک ہی جگہ تھا۔ میں ہیلی کا پٹر تک پہنچا اور اسکی پکڑ کر اوپر چڑھا۔ میں نے راج کنور کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اندر پانی بھر گیا تھا اور راج کنور کا ہیولا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کنارے بیٹھ کر اپنے پاؤں اسکیز میں پھنسائے اور سانس روک کر بوئے پشت کے بل پانی میں گیا۔ میرے ہاتھ راج کنور کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ نہ جانے کہاں تھا۔

مجھے جا کر واپس آنے میں پانچ چھ منٹ تو لگے تھے اور اگر راج کنور ہمارے جاتے ہی ڈوب گیا تو اس کی زندگی کی توقع محال تھی۔ راج کنور پتا نہیں کہاں تھا؟ میرا سانس اکھڑنے لگا تھا کہ اچانک ہی اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے اوپر ہوتے ہوئے اسے کھینچا اور سیدھا ہو کر اسے پانی سے باہر نکالا۔ راج کنور بے جان انداز میں جھول رہا تھا۔ یہاں اس کے پیچھے پھردوں میں بھر جانے والا پانی روايتی ابتدائی امداد کے طریقے سے نکالا مشکل تھا اس لیے میں نے آسان طریقہ اختیار کیا اور اسے پیٹ کے بل کنارے پر لٹا دیا۔ اب اس کی ٹانگیں ہیلی کا پٹر کے کیمین کے اندر تھیں اور باقی دھڑ باہر جھول رہا تھا۔ اس کا سر نیچے کی طرف تھا۔ میں نے اس کی پشت ہ کے مارے۔ اس طرح اس کے پیٹ اور پیچھے پھردوں میں بھر جانے والا پانی نکل جاتا۔ چند کموں کا کوئی اثر نہیں ہا لیکن پھر اس نے الٹی کی اور کھانسنے لگا۔ وہ ڈھٹ تھاغ کیا تھا۔ چند لمحے کھانسنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور خود کو اٹنے لگے پاکر گھلا چھاڑ کر چلایا تھا۔

”خاموش رہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم بیچ گئے ہو۔“

”میں مر جاؤں گا۔“ اس نے ٹھکایا کر کہا۔

”اگر یہی حرکتیں رہیں تو مرد گے بھی۔“ میں نے کہا اور پانی میں اتر کر اسے نیچے کھینچا تو وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح ہلچلا۔

”میری ٹانگ.....“

”اے بھول جاؤ اور جان بچ جانے پر بھگوان کا شکر ادا کرو۔“

میں نے اسے بھی سنکاری کی طرح گردن سے پکڑا اور کنارے کی طرف کھینچنے لگا۔ یہ کسی ڈوبتے شخص کو جو تیرنا نہیں جانتا ہو بچانے کا بنیادی اصول ہے، اسے کبھی سامنے سے نہ پکڑو ورنہ وہ آپ کو چھٹ جائے گا اور بعض اوقات اسی طرح ڈوبنے والے بچانے والے کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ سب سے آسان طریقہ ہے کہ پشت سے آکر بازو سے گردن اور سینہ جکڑ لو۔ اس سے ڈوبنے والا آپ کو نہیں پکڑ سکتا ہے۔ ابھی تک کسی طرف سے ہیلی کاپٹر کریش پر کوئی رد عمل نہیں ہوا تھا۔ نہ آسمان سے اور نہ زمین سے۔ چاروں طرف تاریکی تھی اور اگر کوئی متوجہ ہوتا تو روشنی کے ساتھ آتا۔ شاید آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں تھی اور پھر ہیلی کاپٹر بہت بلندی سے نہیں گرا تھا۔ اس لیے یہ دور سے نظر بھی نہیں آیا ہوگا۔ یہ دریا کی نشیبی وادی میں اڑ رہا تھا۔ دھماکہ بھی زیادہ دور تک نہیں سنا گیا ہوگا۔ راج کنور سنکاری کے مقابلے میں زیادہ وزنی تھا اور اپنا ایک پاؤں استعمال کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ پھر اتنی دیر سانس رکھنے سے بھی اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر کھانسیں رہا تھا۔ مشکل سے سہی مگر میں اسے کنارے تک لانے میں کامیاب رہا۔ جیتو بادل نا خواستہ آ گیا اور اسے کھینچ کر کنارے لے گیا۔ اسے ریت پر پھینک کر اس نے مایوسی سے کہا۔ ”بچ گیا حرامی۔“

”انڈین فلموں کی روایت کے مطابق۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”وہ سب سے آخر میں مرتا ہے بعض اوقات ہیرو کے بھی بعد مرتا ہے۔“

سنکاری اب جان کے بجائے اپنے آنے والے مستقبل کے لیے فکر مند تھا اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”تم فلموں کی بات کرتا ہے، ادھر اپنا قلم بننے والا ہے۔ شوٹ آؤٹ ان راوی والا۔“ مجھے ہنسی آ گئی۔ ”فکر مت کرو کسی کو پتا نہیں چلے گا تم بچ گئے ہو، خاموشی سے اپنے گھر چلے جاؤ۔“ ”ابھی یہ ہیلی کاپٹر ملے گا تو جلد اس کے سیریل نمبر سے پتا چل جائے گا کہ یہ میرا ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والا سیدھا میرے گھر آئے گا۔“

کیونکہ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا اس لیے میں نے اس پر سوچا نہیں تھا۔ مگر یہ سنکاری کا مسئلہ تھا اس نے سوچ لیا۔ میں نے کہا۔ ”نی الحال تو یہاں سے نکلنا ہے اس کے بعد سوچتے ہیں کہ کیا کرتا ہے۔“

میں نے جیتو سے لیپ ٹاپ والا بیگ لے کر پشت پر پہن لیا۔ اسلحہ والا بیگ جیتو نے اٹھا لیا تھا۔ میرا ہتھول پانی میں اچھی طرح بھیجا تھا مگر یہ ایک نمبر اسمتھ اینڈ لسن تھا اس لیے امید تھی کہ یہ کام کرے گا۔ البتہ بعد میں اس کی صفائی ضروری تھی۔ دریا کا پانی سرد تھا مگر باہر آئے تو گرمی تھی اور کپڑے مشکل سے دس منٹ میں خاطر خواہ خشک ہو گئے۔ راج کنور کی حالت بہتر تھی مگر اس کی کھانسی جاری تھی اور وہ اس معاملے میں احتیاط سے کام بھی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی با آواز بلند کھانسی یقیناً اس سانے میں خاصی دور تک سنائی دے رہی ہوگی۔ اس

لیے بیٹو نے اسے خبردار کیا۔ ”اپنا کھانسی بند کر دو ورنہ گلا دبا کر بند کر دے گا۔“

”میں..... کھانسی کیسے روکوں.....“ راج کنور نے جواب دیا۔

”یہ حق بجانب ہے۔“ میں نے راج کنور سے کہا۔ ”اس لیے بہتر ہے اس کے کہنے پر عمل کر دو۔“

بیٹو نے کہا۔ ”اس مُردے کو کون لے جائے گا؟“

”اسے سنکاری پائلٹ کرے گا۔“ میں نے کہا۔

سنکاری اب اپنے ہیلی کاپڑ کا ماتم کر رہا تھا، وہ اس کا ذریعہ روزگار تھا اور اب یہ پانی میں پڑا تھا۔ اس نے حسرت سے کہا۔ ”ہم دوسرا نہیں لے سکتا۔“

”یہ دلائے گا۔“ میں نے راج کنور کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ اتنا دولت مند ہے کہ ایسے دس ہیلی کاپڑ دلا سکتا ہے۔“

سنکاری نے سر آہ بھری۔ ”کوئی فائدہ نہیں ہوگا مجھے ابجنی والا لے جائے گا۔“

میں اور بیٹو سارے بیگز لاد چکے تھے۔ بیٹو نے ایک پستول نکال لیا تھا۔ اس کا بیک واٹر پروف تھا اس لیے اسلحہ بھیگنے سے محفوظ رہا تھا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے اپنا پستول واپس رکھ کر سائلنسر والا لے لیا۔ اس کا بس ایک اضافی میگزین باقی رہ گیا تھا۔ اسی لمحے ایک طرف سے بادل بٹے اور چاند نکل آیا۔ اس سے ہمیں سمت کا تعین کرنے میں آسانی ہوئی۔ چاند مشرق کی طرف تھا اور یہ شاید سات یا آٹھ تاریخ کا چاند تھا۔ میں نے راج کنور کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا دوسری طرف، سے سنکاری نے اسے سنبال لیا اور ہم دریا کی ڈھلان پر اوپر چڑھنے لگے۔ کنارہ کم سے کم بھی تیس فٹ اونچا تھا۔ انڈیا نے اپنی طرف کے پتھے بہت اونچے رکھے تھے اور شدید سیلاب کی صورت میں شاید ہی پانی ان تک آتا ہوں گا۔ نیچے دریا کی مخصوص ریت تھی جس پر چلنا آسان کام نہیں تھا خاص طور سے جب آپ کسی کو سہارا دے کر چل رہے ہوں۔ پاؤں رکھنے پر یہ دیتی اور پھسلتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا ہم خشک دلدل پر چل رہے ہوں۔

راج کنور کی حالت اچھی نہیں تھی اور اس نے سارا بوجھ ہم دونوں پر ڈال رکھا تھا۔ کنارے تک آتے آتے سب کی حالت بری ہو گئی تھی سوائے بیٹو کے کیونکہ وہ صرف بیک سنبالے خراماں خراماں ہمارے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اس نے اخلاقاً بھی راج کنور کو سہارا دینے کی کوشش نہیں کی اُس کا بس چلتا تو وہ اسے واپس پانی میں دھکا دے دیتا۔ پتھے پر پہنچ کر میں نے راج کنور کو چھوڑ دیا اور وہ کراہتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ فی الحال تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ ہم سرحد سے زیادہ دور نہیں تھے اور یہاں سیکورٹی فورس کا گشت جاری رہتا ہوگا۔ کسی وقت بھی کوئی آ سکتا تھا اور یہاں بھاگنے کی جگہ نہیں تھی۔ دریا کے دوسری طرف دور تک میدان تھا جس میں جا بے جا جھاڑیاں تھیں۔ ایسی جھاڑیاں مجھے اس وقت بھی ملی تھیں جب میں غلطی سے راستہ بھٹک کر انڈیا پہنچ گیا تھا۔ یہ سخت کانٹے دار جھاڑیاں تھیں مگر یہاں یہ فاصلے سے تھیں اور ان کے درمیان سے گزرنے کی جگہ تھی۔ اگر ضرورت پڑتی تو ہم ان میں پناہ لے سکتے تھے۔

چاند کی روشنی اتنی تھی کہ راستہ نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ آرام کے بعد میں نے راج کنور اور سنکاری سے کہا۔ ”بس اٹھ جاؤ، ہمیں آگے جانا ہے۔“

”میں نہیں اٹھ سکتا۔“ راج کنور نے کہا۔ ”مجھ میں ہمت نہیں ہے۔“
 ”اس صورت میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“ میں نے پستول نکال کر اس کی طرف کیا تو اس نے کوئی حرکت نہیں کی اور مسکرانے لگا۔

”شہباز میں تمہیں جان گیا ہوں، تم انتہائی اشد ضرورت کے وقت ہی کسی کی جان لیتے ہو۔“

”پر ہم تو لے سکتا ہے۔“ بیٹو فرمایا۔ ”چلتا ہے یا تیرا ادھر ہی مرڈر کرے۔“

”ہولی کرائسٹ۔“ سنکاری نے سینے پر کر اس بنایا۔ ”ہم آنکھ بند کر لے۔“

”بہتر ہوگا اسے اٹھاؤ۔“ میں نے راج کنور کی طرف اشارہ کیا تو سنکاری نے بادل نا خواستہ اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ راج کنور چلنے میں جان بوجھ کر سُستی کر رہا تھا مگر جب بیٹو نے اپنے پستول سے اس کا شانہ بجایا تو اس کی ساری سُستی دور ہو گئی اور اس نے بلبللا کر مجھ سے کہا:

”شہباز یہ آدمی بہت ظالم ہے۔“

”اس کے برعکس یہ تمہارے ساتھ بہت رحم دلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔“ میں نے سر دلچے میں کہا۔ ”اس کا سارا خاندان اور قبیلہ تم لوگوں کی ہوس اور سفاکی کی جینٹ چڑھ گیا تھا۔“

راج کنور چونکا۔ ”اس کا تعلق قبائلیوں سے ہے؟“

”ہاں یہ تب سے میرے ساتھ ہے۔“

راج کنور نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھا۔ ”تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟“

”یہ میرا ساتھی ہے۔“

”میرا مطلب ہے.....“

”اپنا مطلب اپنے پاس رکھو اور اب منہ بند کر کے چلو۔“ میں نے اس بار سخت لہجہ اختیار کیا۔ ہم جھاڑیوں تک پہنچ گئے۔ اگر یہاں کوئی ہوتا تو ہماری آوازیں سن سکتا تھا۔ انسان پر آنے والی اکثر آفتیں اس پر زبان کے غیر ضروری استعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔ ”اب بالکل خاموشی سے چلنا ہے کوشش کرنی ہے کہ چلنے میں کوئی آواز نہ ہو میری بات سمجھ رہے ہوتا۔“

راج کنور نے بادل نا خواستہ سر ہلایا۔ اسی دوران میں چاند بادلوں کے پیچھے چھپ گیا اور اب یہاں تاریکی تھی۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس قسم کی جھاڑیوں میں گڑھے بھی ہوتی ہیں، جب آدمی ان میں گرتا ہے تب پتا چلتا ہے۔ اس لیے میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا، باقی سب میرے پیچھے تھے۔ کچھ دیر میں آنکھیں نام کرنے لگیں تو چاند نکل آیا۔ آسمان پر بادلوں کی چاند کے ساتھ آنکھ بچولی جاری تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب چاند ہوگا تب ہم سفر کریں گے اور تاریکی میں رک جائیں گے۔ جیسے ہی رکتے راج کنور اور سنکاری بیٹھ اُتے تھے۔ ایک بار وہ بیٹھے تو میں کہا۔ ”زمین پر ہاتھ مارتے رہو یہاں سانپ ہو سکتے ہیں۔“

”اسنیک۔“ سنکاری نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”کدھر ہے؟“

”ہے نہیں ہو سکتا ہے، وہ بے خبری میں تمہاری طرف آ سکتا ہے۔ اس لیے زمین پر ہاتھ مارتے رہو۔“

”تب تو وہ جان کر آئے گا۔“ سنکاری نے سادگی سے کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

”نہیں سانپ ہمیشہ بے خبری میں انسان کے پاس آتا ہے اور پھر اس کے حرکت کرنے پر بے اختیار ڈس لیتا ہے۔ سانپ زمین پر ہلکی سی بھی دھمک سن لیتا ہے اگر اسے کہیں بے دھمک ملتی ہے تو وہ اس طرف جانے سے گریز کرتا ہے۔“

یہ سن کر سنکاری اور راج کنور جلدی جلدی زمین پر ہاتھ مارنے لگے۔ بیٹو نے سنکاری سے کہا۔ ”اتنا شور کانے کو کرتا ہے سانپ آئے تو بولو بھائی ہے اس کا، وہ ایسے ہی چلا جائے گا۔“

بیٹو کا اشارہ راج کنور کی طرف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری قسمت میرے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہی تھی۔ میں کتنی کوشش کے بعد سرحد پار کر کے گیا تھا اور پھر بس سر زمین چھو کر واپس آ گیا۔ مجھے سویرا کا کچھ خیال آیا جو بے تابی سے میری منتظر تھی۔ اسے پتا چلے گا کہ میں آکر واپس چلا گیا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ جب تک میں اٹریا میں تھا اس کا سارا وقت کسی ٹیشن میں گزرا تھا یہ صرف وہی جانتی تھی،۔۔۔ ابھی صرف اندازہ کر سکتا تھا۔ میرے ساتھ جن کے دن رات میری فکر میں تھے اب دوبارہ اسی فکر میں رہیں گے۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ تقدیر نے پھر مجھے سرحد کے اُس پار دھکیل دیا تھا۔ سادی بھی بیٹو کی طرح اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ وہ چاہتی تو اپنے بھائیوں اور اپنی پرتعیش زندگی کی طرف واپس جاسکتی تھی مگر اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو ترجیح دی۔ وہ پہلے کمار سے وابستہ ہوئی۔ اس کے بعد وسیم نے اس کے زخموں پر مرہم رکھا، اسے اپنا لیا۔ اب سادی ہماری فیملی کا ایسا جزو بن گئی تھی جس کے بغیر یہ خاندان نامکمل تھا۔

چند گھنٹے پہلے میں جتنی شدت اور بے تابی سے پاکستان جانے کے لیے بے چین تھا اب اتنی ہی شدت سے خواہش کر رہا تھا کہ میں اٹریا کی سر زمین پر رہوں۔ میں نے اس علاقے کا نقشہ دیکھا تھا۔ یہاں راوی سرحد کے ساتھ لگ کر اس طرح بہتا ہے کہ کبھی ایک ملک اور کبھی دوسرے ملک میں ہوتا ہے اور کبھی یہ عین سرحد پر بہتا ہے اس لیے یقین سے کہنا بہت مشکل تھا کہ درحقیقت ہم کہاں تھے۔ میزائل سے بچنے کے لیے ہم نے شمال کا رخ کیا تھا اور ہمیں ایک منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد بھی نیلی کا پڑنے شاید دو تین منٹ پرواز کی تھی اور پھر کریش ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے ہم اس جگہ سے شاید تین کلومیٹرز سے زیادہ دور نہیں آئے تھے۔ میں نے ذہن میں نقشہ تازہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آیا کہ شمال کی طرف راوی اٹریا میں بہتا تھا یا پاکستان میں۔

”شوبی چلنے کا نہیں ہے، اٹھاؤں اس حرا خور کو۔“ بیٹو نے مجھے ہلایا اور راج کنور کی طرف اشارہ کیا۔ پاکستان میں رہ کر وہ بہت کم عرصے میں مخصوص الفاظ بولنے لگا تھا۔

”ہاں چلو۔“ میں نے کہا اور بازو تھام کر راج کنور کو کھڑا کیا اس بار میں نے بھی اسے سہارا دیا تھا۔ مجھے راوی کا مقام تو یاد نہیں آیا تھا لیکن نقشے پر اس علاقے میں ایک اٹریا سڑک یاد آئی تھی جو سرحد سے دو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ اگر ہم اٹریا میں تھے تو یہ سڑک ملنی چاہیے تھی اور سڑک کوئی نہ کوئی ٹریفک ہوگا۔ گاڑی مل جاتی تو ہم با آسانی یہاں سے نکل جاتے۔ پندرہ منٹ میں ہم نے شاید ایک کھوٹے کا فاصلہ طے کیا تھا کہ دوبارہ اندھرا ہو گیا۔ ہم آرام کرنے بیٹھے تھے کہ مجھے خیال آیا اور میں نے لیپ ٹاپ والا بیک کر سے اتارا۔ یہ اوپر سے خشک ہو گیا تھا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کے جیڈا شوٹ کے پڑے سے بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اندر پانی جا

سکتا تھا لیکن جب میں نے لیپ ٹاپ نکالا تو وہ مکمل طور پر خشک تھا۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ بیگ کے اندر ذرا بھی نمی نہیں تھی۔ لیپ ٹاپ کے ساتھ کرنسی کی گڈیاں اور انٹرنیٹ ڈیو اےس بھی خشک تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ کھولا تو اس کی اسکرین فوراً روشن ہو گئی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لے کر انٹرنیٹ ڈیو اےس نکال کر لگائی تو چند لمحے بعد اس کی روشنی جلنے لگی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ یہاں انٹرنیٹ کے سکنڈز دستیاب تھے۔ مشکل سے ایک منٹ میں انٹرنیٹ کنکشن آن ہو گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فوراً عبداللہ کا نمبر ملایا۔ وہ شاید منتظر تھا اس نے نیل مکمل ہونے سے پہلے کال ریسیو کر لی۔ ”آپ.....؟“

”ہاں پہنچ گئے ہیں.....“ میں نے مبہم انداز میں کہا۔ ”مسئلہ ہو گیا تھا۔ پرندہ پانی میں اتر گیا۔ ہم سب ہیک ہیں۔“

”جناب ایاز نے دیکھ لیا تھا مجھے سے روشنی کی لکیر لپکی تھی۔“ عبداللہ بھی مبہم انداز میں بولا۔ ”اس کے بعد سے ہم سب بہت پریشان تھے۔“

”تم لوگ فوراً واپس جاؤ اور وسم کو کسی بھی جذباتی قدم سے روکو۔“

”ہم واپس جا رہے ہیں۔ سفیر مسلسل وسم سے رابطے کی کوشش کر رہا ہے۔“

اسی لمحے سفیر کی آواز آئی۔ اس نے دھاڑ کر کہا۔ ”کال کیوں نہیں ریسیو کر رہا تھا..... ہاں سب سوتیلے برٹو ہی ایک سگا ہے..... شہباز آیا تھا پھر واپس چلا گیا ہے..... وہ ہی ایک سگا ہے نا..... ہاں سادی کو بڑے کنور نے اٹھوایا ہے..... شہباز کی اس سے بات ہوئی ہے..... وہ کل تک اس کے پاس پہنچ جائے گی..... شہباز کی کال مٹی ہے..... اچھا اچھا۔“ سفیر نے کہا اور عبداللہ سے موبائل لے کر مجھے وسم کا نمبر بتایا۔ ”لیکن اٹلو کے پٹھے سے ت کر۔“

میں نے نمبر کاٹ کر وسم کا نمبر ملایا۔ میں بلو ٹوٹھ پیٹھ فری کی مدد سے بات کر رہا تھا اس لیے میں لیپ ٹاپ وہیں چھوڑ کر ان لوگوں سے ذرا دور چلا گیا تھا تا کہ وہ میری گفتگو نہ سن سکیں۔ واپس آ کر میں نے دوبارہ کال مائی اور وسم نے کال ریسیو کی۔ ”یہ آپ نے کیا کیا آپ واپس کیوں چلے گئے؟“

”بڑے کنور کی شرط یہی تھی۔ میں نے اسے دھوکا دیا ہے اور دو دن کا وقت مانگا ہے۔ میری کوشش ہے کہ وہ گھنٹے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں اور راستے میں ہی سادی کو واپس حاصل کر لوں۔“

”آپ اور بیٹہ ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”کاش میں بھی آ سکتا۔“

”ہرگز نہیں تم میں سے کوئی میرے حکم کے بغیر اس طرف نہیں آئے گا۔ میں اور بیٹہ کافی ہیں۔“

”شہباز صاحب۔“ وسم کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ جانتے ہیں وہ ماں بننے والی ہے۔“

”میں جانتا ہوں یار اور بڑے کنور کو بھی خبردار کر دیا ہے، وہ بہر حال اس کا بھائی ہے۔ اس نے کہا وہ نے والوں سے کہے گا کہ سادی کا اس حوالے سے بھی خیال رکھیں۔“

”اسے سادی کے بارے میں کیسے پتا چلا؟“

”دعیٰ میں سادی کو کسی انٹرن نے دیکھ لیا تھا۔ شاید اسی سے پتا چلا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اگر واپس نہ آتا تو وہ اب بھی سادی کو نہ چھیڑتا۔ وہ خوش ہے کہ سادی اپنے گھر میں خوش ہے۔“

”خوش ہے۔“ وسیم نے غمی سے کہا۔ ”یہ محبت ہے اس کی اپنی بہن سے؟“
 ”تم اسے ہمارے پیانے سے مت ناپو۔ یہ ایلٹ کلاس ہے۔ ان کی محبت کے پیانے بھی الگ ہوتے ہیں۔“

”ابھی آپ کہاں ہیں؟“

”میرا اندازہ ہے کہ لکیر کے دوسری طرف ہیں مگر کفرم نہیں ہے۔“

”سفیر بتا رہا تھا کہ آپ کو ہٹ کیا گیا تھا؟“

”ہاں بڑی خوفناک صورت حال تھی مگر بس اوپر والے نے رحم کیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں پھر بات کروں گا، ابھی تو یہی بتانے کے لیے کال کی تھی۔ ایک بار پھر وارننگ دے دوں مجھ سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔“

”آپ بے فکر رہیں میں اب ٹھیک ہوں۔ اسلام آباد کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ وہ لوگ بھی پیچھے جکتے جکتے آ رہے ہیں۔“

”تیار ہو جاؤ سفیر سخت غصے میں ہے۔“

میں نے کال کاٹ دی اور ڈیو اُس نکال کر لپ ٹاپ دوبارہ بیگ میں ڈال دیا۔ اس کی بیٹری شاندار قسم کی تھی۔ ابھی بھی تین چوتھائی بیٹری تھی جب کہ میں اسے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ استعمال کر چکا تھا۔ ہمالیہ ہوٹل کے منیجر نے بہترین چیز منگوائی تھی۔ اسی طرح اسکا پکریڈٹ کی وجہ سے میرے لیے کہیں کال کرنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ ہم دوبارہ روانہ ہوئے اور دس منٹ بعد ہی سڑک نظر آگئی۔ بلکہ اس سے گزرنے والی گاڑیاں نظر آئی تھیں۔ ان کی روشنی کی وجہ سے ہمیں پتا چلا کہ ہم سڑک کے پاس پہنچ گئے تھے۔ سڑک سے کچھ دور میں نے راج کنور کو بیٹو کی مگرانی میں چھوڑا اور خود سنکاری کے ہمراہ سڑک تک آیا۔ یہ کوئی ہائی وے نہیں تھی بلکہ ایک طرح کی ذیلی سڑک تھی جو گاؤں دیہاتوں کو درواز علاقوں سے ملاتی ہے۔ مطلب یہ ایک سڑک تھی اور زیادہ بڑی بھی نہیں تھی لیکن اس کا معیار بہت اچھا تھا۔ زمین سے اونچی اور ہموار سڑک تھی۔ رات کے وقت یہاں ٹریفک کم تھا۔ اس وقت دس بجنے والے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک ٹرک نمودار ہوا وہ جنوب سے آ رہا تھا۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”تم یہیں رکو میں ٹرک روکنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن غائب مت ہونا میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔“

”ہم نہیں جائے گا ادھر ہی رہے گا۔“ اس نے یقین دلایا مگر میں اس پر نظر رکھے ہوئے سڑک پر آگیا۔ ٹرک سو گزر دور تھا اور اس کے ڈرائیور نے یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا۔ مگر اس نے رفتار کم کرنے کی زحمت نہیں کی حالانکہ میں مسلسل رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ مجھے اس کا خدشہ تھا اس لیے میں نے ٹرک روکنے کا بند بستی کر لیا تھا جیسے ہی وہ قریب آیا تو میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے ہاتھ میں موجود پتھر اس کی وینڈ اسکرین پر کھینچ مارا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ اسکرین ٹوٹی تو نہیں لیکن اس پر یقیناً بال آگیا تھا۔ ٹرک مجھ سے فٹ بھر کے فاصلے سے گزرا تھا۔ حسب توقع ڈرائیور نے مشتعل ہو کر ٹرک روکا اور نیچے اتر آیا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور میرے ٹوٹے ٹرنے کا اعلان کر رہا تھا لیکن پاس آتے ہی اس کی زبان بند ہو گئی کیونکہ میں نے پستول نکال لیا تھا۔ وہ جوان عمر کا لمبا ترنگا سکھ تھا۔ اسے

دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا کہ میں انڈیا پہنچ گیا تھا۔ سکھ بڑے جارحانہ موڈ میں آیا تھا اور پستول دیکھ کر اس کی تھکی بندھ گئی تھی۔ مگر اس کی زبان نہیں رکی تھی۔ بس ٹون بدل گئی تھی۔

”اؤے..... سرکار..... اے کی اے میں تے بس ابویں غصے وچ آ گیا سی.....“

”تے میں بھی محبت توں نکالا اے جانی۔“ میں نے کہا۔ ”گل اے ہے کہ سانوں لفٹ چائی دی اے۔“

”توانوں۔“ وہ چونکا۔ ”ہور کون اے؟“

”پہلے تم بتاؤ ٹرک میں اور کون ہے؟“

”کوئی نہیں ہے جی میں کلاں واں۔“ اس نے یقین دلایا مگر میں نے ٹرک میں دیکھ کر یقین کیا ٹرک خالی تھا۔ ڈرائیور کا نام اگر سنگھ تھا اور وہ ڈپٹی کر کے مگر جا رہا تھا۔ وہ اسی علاقے میں ٹرک چلاتا تھا اور بار برداری کا کام کرتا تھا۔ اگر اسے اعتراض تھا کہ لفٹ لینے کا یہ کون سا طریقہ ہے، پہلے پتھر مارا اور اب پستول نکال لیا تھا تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے سنکاری کو آواز دی وہ دوڑا ہوا آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”جا کر ان دونوں کو لے آؤ۔“

اگر سنگھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ڈاکو ہوں اس نے شبے کا اظہار کیا۔ ”تسی ڈاکو نہیں مگدے۔“

”ہاں نہیں لگتا۔“ میں نے اقرار کیا۔

”پر تسی ہو۔“

”میں نہیں ہوں۔“

”تے فیر اے پستول.....“

”ہر پستول والا ڈاکو نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے ڈانٹا۔ ”پستول تو پولیس کے پاس ہوتی ہے اور فوج کے

پاس بھی تو کیا وہ ڈاکو ہیں؟“

”نہیں جی پروہ وردی میں ہوتے ہیں۔“

”بعض پولیس والے وردی میں نہیں ہوتے ہیں۔“

اگر سنگھ سکھ تھا مگر عقل سے پیدل نہیں تھا کہ مجھے خفیہ پولیس والا یا کسی خفیہ ایجنسی کا نمائندہ تسلیم کر لیتا۔

اسے بھی معلوم تھا وہ لوگ اس طرح پیدل مارے مارے نہیں پھرتے ہیں، ان کے پاس گاڑیاں اور تمام وسائل ہوتے ہیں۔ بہر حال اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم ڈاکو نہیں ہیں اور اس کا ٹرک نہیں چھینیں گے۔ یہ ٹانگا کا بہت پرانے ماڈل کا ٹرک تھا جو آج بھی بھارت کے گاؤں دیہاتوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ یہ سستا اور آسانی سے مرمت ہونے والا ٹرک ہے اس لیے عام دیہاتی بھی اسے انورڈ کر سکتا ہے اور وہ اپنی پیداوار منڈی تک پہنچانے اور اچھے دام وصول کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں دیہاتی کسان کو کسی قابل ہی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ وہ آج بھی آڑھتیوں کا محتاج ہے۔ بیڑو سنکاری راج کور کو لے آئے اور وہ تینوں ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔ میں اگر سنگھ کے ساتھ ڈرائیونگ کپارٹ میں آ گیا۔ اس نے ٹرک اشارت کرنے سے پہلے پوچھا۔

”تسی کتھے جانا اے؟“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”میں ڈیرہ بابانا تک جا رہا ہوں وہیں کارہنے والا ہوں۔“ اس بار اس نے پنجابی چھوڑ کر صاف لہجے میں کہا۔

”تم پڑھے لکھے ہو؟“

”ہاں جی امرتسر کا لُج سے گریجویٹن کیا ہے۔“ اس نے فخر سے بتایا۔

”اور ٹرک چلا رہے ہو؟“

اس نے اسٹیرنگ بیلنس کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔ ”ہاں تو کیا برا ہے؟“

میں شرمندہ ہو گیا۔ واقعی گریجویٹن کر کے ٹرک چلانے میں کیا برائی ہے۔ یہ ہمارا معاشرتی احساس کتنی کم ہے کہ پڑھا لکھا انسان کوئی محنت کا کام نہ کرے۔ یہ کم پڑھے لکھوں یا آن پڑھوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ کم سے کم ہمارے ہاں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ رات کے ساڑھے دس بجتے والے تھے اور میں نے اب تک سوائے دھکوں کے کچھ نہیں کھایا تھا۔ باقیوں کا نہیں پتا لیکن اس وقت میرا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ لفٹ مل گئی تھی اور ہم خطرے والی جگہ سے دور جا رہے تھے اس لیے اب پیٹ کی فکر لگی اور میں نے اگلا سوال اسی سے متعلق کیا۔ ”ہم سب بھوکے ہیں کھانے کو مل سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں جی۔“ اس نے کہا۔ ”میرے گھر چلو۔“

”میں تمہیں معاوضہ دوں گا۔“ وٹز اسکرین کے پیسے بھی لے لینا۔ ”میں نے سوچ کر کہا۔ ”پھر ہمیں ہوشیار پور جانا ہے۔ اس کے لیے کوئی ٹیکسی یا گاڑی مل سکتی ہے۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”ادھر بابانا تک میں کئی ٹیکسی والے ہیں پر اس وقت شاید ہی کوئی جانے کو تیار ہو۔“

”منہ مانگے معاوضے پر بھی نہیں جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں ڈبل دوں گا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”پھر جائے گا۔ جب تسی چنگے بندے ہوتے فیر پستول کیوں نکالا؟“

”مجبوراً۔“ میں نے کہا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

”مجبور ہو کر کون پستول نکالتا ہے۔“

”بات یہ ہے کہ یہاں سڑک پر ڈاکوؤں نے ہماری گاڑی روکی اور سب لوٹ لیا۔“

”پر آپ کے پاس پستول تھا؟“ اس نے اعتراض کیا۔

اس پر میں نے لطیفہ بیان کیا۔ ”شکر ہے اس پر نظر نہیں پڑی۔ ورنہ یہ بھی جاتا۔ ہم دو گھنٹے سے یہاں

سڑک پر کسی گاڑی کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر کوئی رکنا نہیں، ہم رکے تھے اور لٹ گئے۔“

وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی پروا کیے بغیر اسٹوری آگے بڑھائی۔ ”انہوں نے

ہمیں لے جا کر دریا میں دھکیل دیا اور خود ہماری گاڑی لے کر فرار ہو گئے۔ یہ جو تم ہمارا حال دیکھ رہے ہو اسی وجہ

سے ہے۔“

بادل ناخواستہ اس نے میرا سفید جھوٹ تسلیم کیا۔ وہ دیکھی نظر آ رہا تھا جیسے میں نے سکھوں والا لطیفہ اپنے

نام سے بیان کر کے اس کا احتیاق مجروح کیا ہو۔ اس نے اصل کچھ اعتراض اٹھایا۔ ”وہ کیوں ماریا سی..... شیشے

پر نشان پڑ گیا ہے۔“

”میں نے کہا نا اس کی بھی ادا ہوگی کروں گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

ڈیرہ بابا نانک زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم مشکل سے دس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک درمیانے درجے کا قصبہ تھا لیکن کچے گمروں سے خوشحالی جھلک رہی تھی۔ سرحد سے بہ مشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور خوشحالی کی وجہ ظاہر تھی۔ یہاں کی معیشت اسٹاکنگ پر مبنی تھی۔ مگر سارے ہی اسٹاکر نہیں تھے۔ کچھ یقیناً اگر سنگھ کی طرح محنت کر کے کماتے ہوں گے۔ اس کا گھر قصبے کے شمال میں اور آخر میں تھا۔ اس نے ٹرک ایک احاطے کے ساتھ روکا اور بولا۔ ”یہ میرا گھر ہے۔“

”گھر میں کون کون ہے؟“

”میری ماں، بھائی اور اس کی بیوی؟“

”تنبھلی شادی نہیں ہوئی۔“

”پہلی نوں نے کون سے کچھ دیے ہیں جو ماں دوسری لے کر آئے۔“ اس نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا اور نیچے اتر گیا۔ وہ بھابی سے دل برداشتہ لگ رہا تھا۔ میں بھی نیچے آیا، بیٹو بھی عقبی حصے سے کودا تھا۔ اگر سنگھ دروازے کی طرف بڑھا تو میں اس کے ساتھ تھا اگرچہ ابھی تک اپنے انداز سے وہ خطرناک نہیں لگا تھا مگر اب میں نے انسانوں کے ظاہری روپ پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اوپر سے زنجیر ہٹائی اور اندر داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ عام سادہ بیاتی گھر تھا۔ تقریباً نصف کنال کا پلاٹ تھا اس پر درمیان میں چند کمرے بنے ہوئے تھے اور کمروں کے چاروں طرف سینٹ کی شیٹوں سے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ مکان کچی اینٹوں کا تھا۔ سامنے والے مین میں نیم کے دو بڑے درخت تھے جن کے تلے چار پائیاں تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”بیٹھو جی۔“

وہ اندر جانے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ تمام لیا اور آہستہ سے بولا۔ ”اگر سنگھ تم مجھے مہمان بنا کر لائے ہو اس لیے مجھ پر فرض ہے کہ اس گھر کی سلامتی کا خیال رکھوں..... کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ میں اپنا فرض بھول جاؤں۔“

”نہیں جی تسی اب مہمان ہو۔“ اس نے کہا اور اندر بڑھ گیا۔ میں نے دروازے تک جا کر بیٹو کو آواز دی۔

”ہاں شوبی۔“ اس نے ٹرک کے پاس سے کہا۔

”ان دونوں کو بھی اندر لے آؤ۔“

ایک منٹ سے پہلے وہ تینوں اندر تھے۔ راج کنور کا تھکن اور تکلیف سے برا حال تھا اور سنکاری کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ آتے ہی چار پائیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ بیٹو نے مجھ سے کہا۔ ”شوبی ایک منٹ ادھر آ کر ہمارا بات سنو۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک کونے میں آیا۔ بیٹو نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”شوبی ان لوگوں کو بیکار میں اٹھائے پھر رہا ہے، دفع کرو۔ ہم کنور پبلک کی طرف چلتا ہے۔“

”جلدی مجھے بھی ہے لیکن ان دونوں کو نہیں چھوڑنا ہے۔ راج ایک ایسا سانپ ہے جسے فی الحال

نہیں مارنا، سنکاری کو چھوڑ دیا اور وہ بھارتی پولیس کے مجھے چڑھ گیا تو ہمارے بارے میں سب بک دے گا۔“
 ”اسے کیا معلوم کہ ہم کہاں جا رہا ہے؟“

”وہ بے وقوف نہیں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں کتنی کوشش کر کے سرحد پار گیا تھا اور اب واپس آیا ہوں تو لازماً وہیں واپس جاؤں گا۔ کم سے کم وہ شملہ کی حد تک تو جانتا ہے کہ میں کہاں جا سکتا ہوں۔ پولیس میرے بارے میں جانتی ہے، اس سے پہلے بھی وادی میں ہونے والی لڑائی میں میرا نام آچکا ہے۔ پولیس مجھے وہیں تلاش کرے گی یا کم سے کم وہاں کی پولیس کو خبردار کر دے گی۔“

بیٹو نے مجھے سنکاری کو ختم کرنے کا مشورہ نہیں دیا وہ جانتا تھا کہ میں کسی انسان کو اس طرح موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا تھا۔ خود بیٹو بھی اس حراج کا نہیں تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ہم نے انہیں کون سا اٹھا کر لے جانا ہے، یہ بھی گاڑی میں جائیں گے۔“

”راج کنور کتنے کی طرح براہ راست تھا۔“ بیٹو نے مطلع کیا۔ ”اسے تکلیف ہو رہا ہے۔“

راج کنور کو اس سفر میں جو جھکے برداشت کرنے پڑے تھے یقیناً اس کی جڑ جانے والی بڑی دوبارہ مل گئی ہوگی۔ میں راج کنور کو اپنے ساتھ لے جانے کی نیت سے لے گیا تھا مگر وہ مجھ سے چمٹا ہوا واپس آ گیا۔ اگرچہ اس کے دعویٰ کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ اسے واپسی کا بھی ایک کوڑا بتانا تھا جس کے بعد ہمیں اٹھایا کے ریڈزون سے گزرنے کی اجازت ملتی۔ اس سے پہلے ایک پاکستانی میزائل نے ہیلی کاپٹر کو ہٹ کر دیا تھا۔ پھر اسے ڈوبتے ہیلی کاپٹر سے بھی نکال لایا اور اب اسے ساتھ رکھنا مجبوری تھی۔ فی الحال میں نے سوچا نہیں تھا کہ اس کا کیا کرنا ہے؟ اسے درد ہو رہا تھا۔ اس کا علاج تو کوئی آرٹھروپڈک ہی کر سکتا تھا مگر ہم اس کے لیے چین کلر دوالے سکتے تھے۔ چند منٹ بعد اگر سنگھ اندر سے برآمد ہوا تو میں نے اس سے پہلا سوال چین کلر کا ہی کیا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔
 ”میں لاتا ہوں کھانے کا بول دیا۔“

”کھانے میں کیا ہوگا؟“ میں نے کہا۔ ”میں دہلی میرین ہوں گوشت نہیں کھاتا۔“

”یہاں گوشت ملے گا بھی نہیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے دل ہی دل میں اس سفید جموٹ کی معافی مانگی اللہ سے جس نے اپنے بندے کو ہمیشہ بہترین گوشت کھلایا تھا۔ اگر سنگھ اندر سے لکڑی کی ایک میز اٹھا لایا اور اس نے پانی کا جگ اور گلاس رکھا تو سب ہی ٹوٹ پڑے تھے۔ خود میں دو گلاس پی گیا تھا تب مجھے پتا چلا کہ میں کتنا پیاسا تھا۔ ایک تو موسم گرم تھا دوسرے بھاگ دوڑنے شکر کر دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کریش سے پہلے خون بھی خشک ہوا تھا۔ ہماری پیاس دیکھتے ہوئے اگر سنگھ دوبارہ پانی بھر کر لے آیا۔ اس نے معذرت کی کہ روٹی تیار ہونے میں کچھ دیر ہے۔ بیٹو نے اس سے انگلی اٹھا کر سوال کیا۔ ”لیٹرین کدھر ہے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے بیٹو سے کہا اور اسے مکان کے عقبی صحن کی طرف لے گیا۔ چند منٹ بعد بیٹو خوش باش اور صاف سہرا ہو کر آیا تو میں نے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ پیچھے لائن سے لیٹرین اور غسل خانے بنے ہوئے تھے۔ دونوں کپے اور صاف سہرے تھے۔ اندر پانی سمیت ہر سہولت تھی۔ میں نے لیٹرین اور غسل خانے دونوں سے استفادہ کیا۔ منہ ہاتھ دھو کر اور بال ٹھیک کر کے میں خود کو خاصا بہتر انسان محسوس کرنے لگا تھا۔

کپڑے ریت والے پانی میں بھیج کر خشک ہونے کے بعد عجیب سے ہو گئے تھے۔ بہر حال اب ٹھیک تھے۔ ہمارے پاس مزید کپڑے نہیں تھے۔ بیٹو نے جہز اور اوپر اسکن فٹ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اس لیے اس کا تو پتا نہیں چل رہا تھا۔ سنکاری نے فلائنگ جپ سوٹ پہن رکھا تھا اور سب سے برا حال راج کنور کا تھا جس کا اسپتال کاسکی لباس چرما گیا تھا۔ پلاسٹر کے اندر پانی چلا گیا تھا اور روئی بھیگی ہوئی تھی اسے دوبارہ پلاسٹر کی ضرورت تھی۔ میں نے اگر سنگھ سے کسی اسپتال کا پوچھا تو اس نے کہا:

”ادھر بٹالہ یا گورداسپور جانا پڑے گا۔ بٹالہ پاس ہے گورداسپور ذرا دور ہے لیکن وہاں سہولتیں بٹالہ سے زیادہ ہیں۔“

میں نے ذہن میں نقشہ تازہ کیا تو مجھے یاد آیا کہ شملہ اصل میں ہوشیار پور اور امرتسر سے بھی نیچے ہے یعنی میں گورداسپور کی طرف جاتا تو اوپر کی طرف نکل جاتا ہے اور عین ممکن ہے اس طرف سے شملہ جانے کا کوئی آسان راستہ بھی نہ ملتا تو میری معلومات کے مطابق کشمیر اور ہماچل پردیش کے درمیان راستے نہیں ہیں۔ اس لیے مجھے بٹالہ کی طرف جانا تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ راج کنور کو علاج کی سہولت ملتی یا نہیں۔ بہر حال میں جلد از جلد شملہ اور پھر کنور ہسپتال کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد کھانا آگیا تھا۔ یہ تندور کی لگی کرما گرم موٹی روٹیوں، سرسوں کے ساگ، آلو کی بھانجی اور اچار کے ساتھ لسی پر مشتمل تھا۔ بیٹو کے چہرے پر بارہنج گئے تھے کیونکہ وہ گوشت کے علاوہ کچھ کھانا نہیں تھا۔ مگر اس وقت موقع نہیں تھا اس لیے اس نے یہ کھانا زہر مار کر لیا۔ البتہ میرے ساتھ سنکاری اور راج کنور نے بھی ڈٹ کر کھایا۔

یہاں بجلی تھی اور محن میں بلب جل رہا تھا لیکن اگر سنگھ نے مزید روشنی کے لیے ایک لائٹن کی شکل والی ایرجنسی لائٹ بھی لا کر رکھ دی تھی۔ یہ میڈان چاٹنا تھا اور انڈیا چاٹنا کا دوست نہیں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چین کی مصنوعات دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ چکی ہیں۔ اس سے دوست دشمن سب مستفید ہوتے ہیں۔ سیر ہو کر کھانے کے بعد سب نے لسی کے گلاس چڑھائے اور پھر اوگھنے لگے تھے۔ اگر سنگھ نے بھی ہمارے ساتھ کھایا تھا اور سب کھایا تھا اس لیے مجھے شبہ نہیں ہوا کہ اس نے کوئی مکاری کرتے ہوئے کھانے میں کچھ ملایا ہو۔ کھانے کے بعد سب پر خمار طاری ہونے لگا تھا مگر یہ آرام کا موقع نہیں تھا۔ ہمیں یہاں روانہ ہونا تھا۔ میں نے کھانے کے دوران ہی اگر سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی ٹیکسی والے سے بات کرے ہمیں بٹالہ جانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بٹالہ کاسن کر کوئی نہ کوئی ٹیکسی والا تیار ہو جائے گا کیونکہ یہ صرف بیس میل دور تھا۔ اس سے آگے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی سواری مل جاتی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔ اگر سنگھ نے روانگی سے پہلے پوچھا۔

”ویسے بٹالہ تک کے یہاں سے سو روپے لگتے ہیں۔ پر کتنے پر معاملہ کر لوں۔“

”میں پانچ سو دوں گا۔“ میں نے کہا تو اس کا منہ کھل گیا تھا۔

”پانچ سو دوں گے آپ؟“

”ہاں۔“ میں نے اس کی دلچسپی محسوس کر کے کہا۔ ”اگر تم لے جا سکتے ہو تو چلو اچھی بات ہے کسی اور کو

ہمارے بارے میں علم بھی نہیں ہوگا۔“

”میں چلتا ہوں جی۔“ وہ فوراً راضی ہو گیا تو میں نے اسے ہزار کا نوٹ دیا۔

”یہ تمہارا کرایہ اور کھانے کا بلکہ یہاں لانے کا بھی اور باقی سمجھ لو تمہاری ٹپ ہوگی۔“ میں نے دوسرا نوٹ پیش کیا۔ ”یہ شیشے کے ڈینٹ کے بدلے ہے۔“

وہ خوش ہوا تھا اس نے نوٹ لے لیے۔ ”میں ماں کو بتا کر آتا ہوں۔ وہ مجھے رات کے بعد باہر نہیں جانے دیتی ہے۔“

اس دوران میں نہ تو اگر سنگھ کی ماں اور نہ ہی اس کی بھابی اور بھائی باہر آئے تھے۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا کہ کم سے کم لوگ ہمیں دیکھیں۔ یہاں گاؤں میں آتے ہوئے بھی کسی نے ہمیں اگر سنگھ کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اگر سنگھ آیا تو ہم تیار تھے۔ کھاپی کر جسم کی بیٹری چارج ہو گئی تھی۔ راج کھور کو آرام کا موقع ملا تو اس کی تکلیف میں بھی خاصی کمی آئی تھی پھر اسے ہیرا سینا مول کا انڈین ورژن دیا تھا۔ ہم پہلے کی طرح ٹرک میں سوار ہوئے یعنی بیٹو، سبکداری اور راج کھور کے ساتھ پیچھے تھا۔ باڈی سے شکستہ حال نظر آنے والا ٹرک انجن اور سپسٹن کے لحاظ سے اچھی حالت میں تھا۔ اگر سنگھ اسے گلی سے نکالنے لگا تھا۔ جب ہم سڑک کی طرف روانہ ہوئے اور کراسنگ پر پہنچے تو مجھے جنوب کی طرف سے کئی روشنیاں گاؤں کی طرف مڑتی دکھائی دی تھیں۔ آنے والی گاڑیاں ساتھ تھیں اور ان کے رفتار تیز تھی۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں نے اگر سنگھ سے کہا۔

”رفتار تیز رکھو ہمیں جلدی بنالہ پہنچنا ہے۔“

”فکر نہ کرو آدھے گھنٹے میں پہنچا دوں گا۔“

”کوشش کرو ہم اس سے کم وقت میں پہنچ جائیں ورنہ نصف رات کے بعد ہوٹلوں میں جگہ بھی مشکل ملتی ہے۔ بازار اور دکانیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔“

اس سڑک کی حالت بھی بہت اچھی تھی اور رات کے اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اگر سنگھ نے رفتار بڑھائی اور ایک منٹ میں ٹرک تقریباً سو کلومیٹر زنی گھنٹے کی رفتار سے دوڑنے لگا۔ اس رفتار پر اس کی باڈی کے شکستہ حصے آواز دے رہے تھے مگر ان کے ٹوٹ کر الگ ہو جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر عقب والی چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور بیٹو کو آواز دی۔ وہ پاس ہی تھا۔ ”ہاں شوبی.....؟“

”دیکھو اگر پیچھے کوئی گاڑی یا گاڑیاں آئیں تو فوراً ہٹانا۔“

”ہم دیکھتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہمارے پیچھے کون آئے گا؟“ اگر سنگھ فکر مند ہو گیا۔

”کوئی نہیں..... تم فکر مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو تم پوری رفتار سے ٹرک چلاؤ گے۔“

”خطرے کی بات ہے تو مجھے بتا دو۔“

”تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ اس وقت ہم بنالہ کی طرف جانے والے تیسرے سنگ میل کے پاس سے گزر رہے تھے۔ ابھی سترہ میل سے زیادہ کا سفر باقی تھا۔ کئی گاڑیوں کی روشنیاں دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا کہ وہ انڈین سکیورٹی فورسز کے لوگ ہو سکتے تھے۔ وہ یقیناً پہلی کا پٹرنگ ہلکی

گئے تھے اور اب ہماری تلاش میں تھے اگر وہ امرتسر کی طرف سے آئے تھے تو لازماً اس سے آگے ہی ہمیں تلاش کرتے۔ اس راستے میں کئی چھوٹے گاؤں آئے تھے اور بڑا قصبہ ڈیرہ بابا نانک تھا۔ گویا ہماری تلاش کا دائرہ وسیع کیا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے یہ دائرہ پھیل کر ہم تک آتا نہیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ میں اس وقت کسی ایسے معاملے میں نہیں الجھتا چاہتا تھا کہ جس سے کور بلیس کی طرف میرے سفر میں تاخیر ہو۔ اچانک بیٹو نے عقب سے کہا۔

”شوبی دور دو گاڑیوں کا روشنی پیچھے آیا ہے وہ تیزی سے آ رہا ہے۔“

میں نے اسپید و میٹر دیکھا ٹرک کی رفتار سو سے اوپر تھی لیکن آنے والی گاڑیاں اس سے کہیں تیز رفتار ہو سکتی تھیں۔ بارڈر سکیورٹی والوں کے پاس ہمیشہ بہترین گاڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ ٹرک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمیں آلیے تو مقابلے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ آنے والے تعداد میں زیادہ اور بہتر طور پر مسلح ہوتے۔ اگر ہم کسی طرح ان پر قابو پا بھی لیتے تو یقیناً یہ اطلاع اوپر تک پہنچ جاتی اور اس علاقے کو اسپاٹ کر کے وسیع پیمانے پر تلاش شروع کر دی جاتی۔ اس سلسلے میں فضا سے بھی مدد لی جاسکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا اور میں اس مسئلے کا کوئی پُر اس حل نکالنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے کہا۔ ”اگر سنگھ میں نے فیصلہ بدل دیا اب ہمیں گورداسپور جانا ہے۔“

”کیوں جی؟“

”بس بدل دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم راستے میں کسی ذیلی سڑک سے مڑ جاؤ اور ٹرک کی روشنیاں بند کر

”و۔“

”روشنیاں بند کر دوں تو ٹرک کیسے چلے گا یہ کچے میں اتر جائے گا۔“

”میں جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں ڈبل معاوضہ دوں گا۔“

وہ چپ ہوا پھر اس نے ٹرک کی لائٹس بند کر دیں۔ اس نے ایک سوچ بایا تو بریک لائٹس بھی بند ہو گئیں یہ بات اس نے مجھے بتائی۔ اکثر ڈرائیور اس قسم کا مینول سسٹم بھی رکھتے ہیں تاکہ وائرنگ شارٹ ہو تو میٹری کو بچایا جاسکے۔ ”آگے وڑانچ نامی گاؤں ہے اس سے راستہ نکلتا ہے پر وہ بہت لمبا اور خراب ہے دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں وقت مسئلہ نہیں ہے اب۔“

بیٹو نے بھر پیچھے سے اطلاع دی۔ ”گاڑی تیزی سے آ رہا ہے شاید ایک میل دور ہے اب۔“

بیٹو کی نظر بہت تیز تھی اس نے گاڑیاں خاصی پہلے دیکھ لی تھیں۔ اسی لمحے وڑانچ کی طرف مڑنے والی ذیلی سڑک آگئی اور جیسے ہی ٹرک اس پر آیا جھٹکے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ سڑک واقعی بہت خراب تھی۔ اگر سنگھ نے رفتار سست کرنا چاہی لیکن میں نے منع کر دیا۔ ”اسی رفتار سے چلو۔“

اگر سنگھ نے سوال نہیں کیا تھا لیکن وہ سمجھ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ہمارے پیچھے کچھ لوگ آ رہے ہیں اور ان سے بچنے کے لیے ہم نے راستہ تبدیل کر لیا تھا۔ سو تو نہیں مگر اتنی کلو میٹر کی رفتار بھی اس سڑک پر بہت زیادہ تھی۔ ٹرک اچھل رہا تھا اور ظاہر ہے ہم لوگ بھی اچھل رہے تھے۔ اب ٹرک کی باڈی زیادہ ہیک یا کم آوازیں نکال رہی تھی۔ اگر سنگھ بتدریج رفتار کم کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جب تک گاڑیاں ذیلی سڑک تک آئیں ہم اتنے دور

جا چکے ہوں کہ ٹرک کا ہیولہ بھی نظر نہ آئے۔ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”نظر رکھو کہ روشنیاں ہماری طرف تو نہیں مڑ رہی ہیں؟“

”میں دیکھ رہا ہوں۔“ بیٹو نے شور کی وجہ سے چلا کر کہا۔ ”شوبی..... وہ ادھر مڑے ہیں۔“
میں نے اگر سنگھ سے کہا۔ ”سنو ہمارے پیچھے جان کے دشمن ہیں ہم تک آگئے تو ہمارے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔ یہاں ٹرک سمیت چھپنے کی کوئی جگہ ہے جو سڑک سے نظر نہ آئے۔“
”آگے ایک ڈیرہ ہے اس کے چاروں طرف درخت ہیں اس موسم میں ویران ہوتا ہے۔ گندم کی کٹائی کے دنوں میں استعمال ہوتا ہے۔“

”بس تو وہیں چلو۔“ میں نے کہا اور بیٹو سے پوچھا۔ ”دونوں گاڑیاں ہیں؟“
”نہیں ایک ہے دوسری سیدی گزر گئی تھی۔“

اس کا مطلب تھا کہ انہیں پکا یقین نہیں تھا کہ ہم اس سڑک پر مڑے ہیں اس لیے ایک گاڑی اس طرف آئی ورنہ دونوں آتیں۔ میں نے اگر سنگھ سے پوچھا۔ ”ڈیرہ کتنی دور ہے؟“
”بس کچھ دور ہے۔“ وہ بولا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سیدھا لیکن حوصلہ مند جوان تھا۔ پہلی بار مجھے پستول بدست دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا لیکن اس موقع پر اس نے حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ راستہ اس کے لیے جانے پہچانے تھے اس لیے وہ بند ہیڈ لائٹس کے ساتھ بھی ڈرائیو کر رہا تھا۔ کوئی تاواقف ہوتا تو اب تک ٹرک کو کئی بار کپے میں اتار چکا ہوتا۔ اس نے اچانک ہی ٹرک گھمایا تو وہ رفتار کی وجہ سے ڈرائیو متوازن ہوا تھا مگر اس نے فوراً ہی اسے قابو کر لیا۔ یہ راستہ بالکل کچا تھا اس لیے رفتار کم کرنا پڑی۔ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہم ایک کپے احاطے میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہاں ویرانی تھی ورنہ ٹرک کے انجن کی غراہٹ سن کر کوئی نہ کوئی تو آتا۔ اگر سنگھ نے چابی گھما کر انجن بند کر دیا اور اچانک سناٹا ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ٹرک کا انجن کس قدر شور مچا رہا تھا۔ میں نے اگر سنگھ سے کہا۔

”نیچے اترو میرے ساتھ۔“

وہ نیچے اتر آیا۔ بیٹو بھی نیچے آگیا تھا اور اس نے اسلحے والے بیگ کو حزر جاں بنایا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہم تینوں درختوں کے آخری حصے تک آئے جہاں سے ذیلی سڑک کچھ ہی دور تھی۔ میں نے سائلنسر والا پستول نکال لیا تھا۔ بیٹو کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی۔ اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔
”شوبی اگر وہ لوگ ادھر آگیا تو.....؟“

”ہم نے ان کے ہاتھ نہیں آنا ہے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”ہم سمجھ گیا۔“ بیٹو نے جواب دیا۔ اسی لمحے سڑک پر روشنی ہوئی اور ایک درمیانے سائز کی ملٹری جیپ تیزی سے گزری۔ وہ ٹرک کے تعاقب میں آگے نکل گئی تھی۔ میں نے اور اگر سنگھ نے سکون کا بہت بڑا سانس لیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”ہم واپس چلیں؟“

”نہیں ممکن ہے آگے دشمن موجود ہوں۔ واپس ڈیرہ بابا نانک کی طرف بھی نہیں جاسکتے اس لیے یہیں

رکو۔ جب آنے والے دابہس چلے جائیں گے تو ہم آگے سفر کریں گے۔“
 ”یہ تو بارڈر سکیورٹی فورس کی جیب تھی۔“

”ہاں لیکن ایسی جیبیں اب عام ہیں بارڈر پر رہنے والے بھی استعمال کرتے ہیں بلکہ اسمگلر بھی استعمال کرتے ہیں اس سے وہ شک سے بچ جاتے ہیں۔“
 اگر سنگھ چونکا۔ ”یہ اسمگلر ہیں؟“

”یہ اس سے بڑے مجرم ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر یہ یہاں آجائیں تو تم بھاگ جانا ان کے سامنے آگئے تو یہ بے دریغ تمہیں بھی اڑا دیں گے۔“

میں اگر سنگھ کو پکا کر رہا تھا اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ سچ سچ بارڈر سکیورٹی فورس والے ہیں تو شاید اس کی محب الوطنی جاگ جاتی اور وہ بلاوجہ مصیبت بن جاتا۔ مجھے پورا اطمینان نہیں ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ جیب دابہس آئے گی کیونکہ ہم آگے نہیں ملیں گے تو ان کا شبہ آس پاس چھپنے والے مقامات کی طرف جائے گا اور وہ ایسی جگہیں چیک کریں گے جہاں ایک ٹرک چھپایا جاسکے۔ یہ ڈیرہ اس کام کے لیے موزوں تھا۔ جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا میرا شبہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جیب دابہس آئے گی اور یہ جگہ چیک کی جائے گی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ یہاں آجائے تو ہم نے ان کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ پھران کا کیا کرنا تھا؟ میں اس پر غور کر رہا تھا کہ سڑک کی طرف سے پھر روشنی نمودار ہوئی اور اس بار یہ مخالف سمت سے آئی تھی جس طرف جیب گئی تھی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے جیب وہاں آگئی اور اس راستے پر رکی جہاں سے ٹرک احاطے کی طرف مڑا تھا۔ جیب کے ساتھ ہی ہم سب کے سانس بھی رک گئے تھے۔ پھر وہ آہستہ سے مڑی اور کچے پر اتر آئی۔ میں نے بیٹو سے کہا۔

”دابہس جاؤ اور ٹرک کے پاس گھات لگا لو جب میں کہوں تو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو گرانے کی کوشش کرنا۔ میں سیٹی بجاؤں گا لیکن جب تنک میں نہ کہوں تم نے کچھ نہیں کرنا ہے۔“

”جی شوشی۔“ بیٹو نے کہا اور تاریکی میں رینگ گیا۔

’اگر سنگھ تم اس درخت پر چڑھ جاؤ اور خود کو شاخوں میں چھپا لو جب تنک میں نہ کہوں نیچے مت آنا اگر تم نے ایسا کیا تو اپنی موت کے خود ذمے دار ہو گے۔“

اس نے بغیر کچھ کہے میرے حکم کی تعمیل کی اور اوپر چڑھ گیا۔ وہ دیہات کا رہنے والا تھا درختوں پر چڑھنا اس کے لیے مشکل کام نہیں تھا۔ اس دوران میں جیب ہمارے پاس سے گزری اور اس کی روشنی کے انفکاس سے لپٹے لپٹے میں تنے کے پیچھے ہو گیا۔ جیب کے اندر ہلکی روشنی تھی اور چار افراد صاف دکھائی دیئے تھے ان میں دو آگے بیٹھے تھے اور دو پیچھے۔ سب فوجی وردیوں میں تھے اور میں نے بروقت اگر سنگھ کو اوپر چڑھایا تھا تو نہ وہ لاکھن کی وردیاں دیکھ لیتا۔ اسمگلر سکیورٹی فورس جیسی جیب میں گھوم سکتے ہیں لیکن وہ فوجی وردیاں استعمال نہیں کرتے ہیں۔ اوپر سے اگر سنگھ یہ سب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں جیب کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگا۔ احاطے کے ٹانگ پہنچتے ہی جیب والوں نے ٹرک دیکھ لیا تھا کیونکہ ان میں کھلبلی مچی تھی اور جیب رک گئی تھی۔ فوراً ہی اس لائٹس آف ہو گئیں اور اس سے سائے اتر کر احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیل گئے تھے مگر ان سوراخوں اندر جانے کی ہمت اور کوشش نہیں کی تھی۔

دو میری طرف آئے تھے اور دوسری طرف چلے گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اصولاً تو ٹرک نظر آئے ہی انہیں فوراً ریڈیو پر اپنے لوگوں سے رابطہ کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے وہ اس بڑے احاطے میں کارروائی کی کوشش کر رہے تھے۔ اس طرح پھیلنے کا تو یہی مقصد ہو سکتا تھا۔ ان کے پاس خود کار ہتھیار تھے۔ ان کے مقابلے میں میرے پاس صرف ایک ہسٹول تھا۔ بیوقوفانہ انداز اور وہ اندر سے فوری مدد کو نہیں آ سکتا تھا جب کہ میں نے اسے بغیر اشارے کے حرکت میں آنے سے منع کیا تھا۔ اب مجھے ہی ان سے نمٹنا تھا۔ میری طرف آنے والے دونوں افراد ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں تھے اگر ایک کے ساتھ کچھ ہوتا تو دوسرے کو فوراً ہٹا چلا جاتا اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ میں کوئے والے کے ساتھ حرکت کرتا ہوا دائیں طرف جا رہا تھا اور بہت بھونک کر قدم اٹھا رہا تھا کہ میرے پیروں تلے آ کر کوئی سوکھی لکڑی ٹوٹی یا پتا چر مارتا تو وہ چوکنہ ہو جاتے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ ”بھوپت تُو اس طرف جا دیکھ کوئی فرار نہ ہونے پائے۔“

بھوپت وہی تھا جس کے پیچھے میں تھا۔ وہ مزید آگے جانے لگا اور میں اس کے پیچھے تھا۔ بادل ہلکے ہو گئے تھے اس لیے چاند چھپے ہونے کے باوجود کسی قدر روشنی ہو گئی تھی اور کھلی جگہ پر دکھائی دے رہا تھا البتہ درختوں تلے تاریکی تھی۔ وہ کسی قدر بے احتیاطی سے چل رہا تھا۔ اس کے بھاری فوجی بوٹوں تلے آ کر پتے چر مارتے تھے اور سوکھی شاخیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اس سے مجھے آسانی ہو رہی تھی اور اب میں کسی قدر آسانی سے تعاقب کر رہا تھا۔ میرا اس سے فاصلہ تقریباً بیس فٹ تھا لیکن میں اسے دس فٹ تک لانا چاہتا تھا اسی لیے اس کے قریب بھی جا رہا تھا۔ وہ احاطے کے دوسرے کونے تک پہنچا اور اس طرف سے مڑا تھا کہ میں بھی تیزی سے کونے تک پہنچ گیا۔ میں نے جھانکا تو وہ کوئی دس بارہ فٹ آگے دیوار کے اوپر سے اندر جھانک رہا تھا اور پھر اس نے جس طرح جھلٹ میں رائفل اوپر کی اور کسی کا نشانہ لینے لگا۔

میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا اور میں نے احتیاط بالائے طاق رکھ کر اس کے سر کا نشانہ لے کر دو گولیاں چلائیں۔ جھلٹ کے باوجود گولیاں نشانے پر بیٹھی تھیں اسے جھٹکا لگا اور وہ جھول کر پیچھے آیا اور پھر نیچے گرا۔ رائفل چھوٹ کر نیچے گری اور کسی پتھر سے ٹکرائی کیونکہ اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں تیزی سے آگے آیا اور اسے کھینچ کر درختوں میں لے گیا۔ اس کی رائفل وہیں پڑی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ آواز اس کے دوسرے ساتھی تک پہنچ گئی تھی۔ جب تک میں اسے درختوں تک لے گیا اس کا ساتھی کونے سے نمودار ہو چکا تھا اور وہ بہت خاموشی سے آیا تھا۔ میرے ہاتھ مرنے والے کی وردی ٹٹول رہے تھے۔ اس کے پاس رائفل کے اضافی میگزین اور نیام میں فوجی خنجر بھی تھا۔ میں نے خنجر نکال لیا۔ اتنی دیر میں اس کا ساتھی وہاں پہنچ گیا تھا جہاں بھوپت کی رائفل اور وہ خود گرا تھا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔

”بھوپت.....“

وہ مجھ سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر تھا میں اسے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن اگر نشانہ خطا جاتا تو اس کی جواہر کارروائی سے اس کے ساتھیوں کو ہٹا چل جاتا۔ اس لیے میں نے سر کے بجائے اس کے جسم کا نشانہ لیا اور اس کا بھی دو گولیاں چلائیں۔ اس نے ہلکی سی چیخ ماری اور لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ دوسرے لمحے سے اس نے رائفل کا کار میزری طرف کر کے برسٹ مارا تھا۔ میں بروقت نیچے گرا اور نہ اوپر سے گزرنے والی گولیاں مجھے چاٹ جاتیں۔ فـ

ہی میں کھسک کر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ دو گولیاں اسے لگی تھیں لیکن وہ مر نہیں تھا۔ اب اس نے فائرنگ بند کر دی تھی اور غرارے جیسی آواز نکال رہا تھا بعد میں پتا چلا کہ ایک گولی اس کے گلے سے گزر گئی تھی اور یہی جان لیوا تھی ورنہ دوسری گولی اس کے بائیں بازو میں لگی تھی۔ معاملہ کھلی جنگ تک جا پہنچا تھا۔ اب بیٹو کو اشارے دینا مناسب ہوتا میں نے سیٹی بجائی۔ فوراً ہی دیوار کے دوسری طرف سے ایک لمبے کے لیے بیٹو کا سر برآمد ہوا اور میں نے اس بار ہلکی سی سیٹی بجا کر اسے اپنے جانے وقوع سے آگاہ کیا۔ اس لڑائی کا اگلا مورچہ اسے سر کرنا تھا۔ میں درختوں کے مزید اندر جانے لگا اور میرے کان آہٹوں پر مرکوز تھے۔

باقی دو دوڑتے ہوئے آئے تھے لیکن اب محتاط تھے۔ اس کے باوجود ان کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک جگہ دیکھی یہاں درخت بہت پاس پاس تھے اور تنوں سے اچھی آڑ میسر تھی۔ مجھے وہ جگہ نظر آ رہی تھی جہاں بھوپت مارا گیا تھا اور اس کا ساتھی وہیں پڑا دم توڑ رہا تھا۔ آنے والے اس کے پاس آئے اور اپنے ساتھی کو گرے دیکھ کر انہوں نے یک دم زمین پر بیٹھے ہوئے پوزیشن سنبھال لی۔ ایک کا رخ درختوں کی طرف تھا اور دوسرا دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی کے ان دونوں میں سے ایک جگہ پائے جانے کے امکانات تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں بیٹو بے خبری میں سر نکال کر معائنہ نہ کرنے لگ جائے ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا جو دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ اس کا جسم کم نظر آ رہا تھا اس لیے نشانہ خطا گیا البتہ پستول سے نکلنے والا شعلہ دوسرے نے دیکھ لیا اور اس نے میری طرف برست مارا اور چلایا۔

”اوپر ہے.....“ باقی الفاظ ناقابلِ اشاعت گالیوں پر مشتمل تھے۔ اس سے ظاہر تھا کہ اپنے ساتھی کے مارے جانے پر وہ کتنا مشتعل تھا۔ دوسرے نے بھی گھوم کر اس کا ساتھ دیا اور دور انگلیں مجھ پر گولیاں برسائیں لگیں۔ مگر میں ایک فائر کے بعد ہی خود کو آڑ میں کر چکا تھا اور اب بیٹو کی طرف سے کارروائی کا منتظر تھا۔ ان دونوں کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ سے گولیاں درختوں کے تنوں اور شاخوں کو چھلنی کرتی گزر رہی تھیں۔ میں جس درخت کی آڑ میں تھا اگر اس کا تانہ موٹا نہ ہوتا تو شاید کوئی گولی مجھے بھی چاٹ جاتی۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تیسری راتقل اس آتشیں نفعے میں شامل ہوئی تو دونوں سپاہیوں کی چیخوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ بیٹو نے احتیاطاً پورا اونٹ چلا دیا تھا تاکہ ان کے نیچے اور جوابی کارروائی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جب اس کی راتقل خاموش ہوئی تو میں نے بلند آواز سے کہا۔

”فائر مت کرنا میں باہر آ رہا ہوں۔“

”ایک منٹ ہم میگزین بدل لے۔“ بیٹو بولا اور اپنا کام کر کے اس نے پکارا۔ ”اب آ جاؤ۔“

میں درختوں کے ساتھ آڑے ترچھے پڑے فوجیوں تک آیا۔ بیٹو نے انہیں چھلنی کر دیا تھا۔ ایک کا سر بھی اڑ گیا تھا۔ میں نے خون کی پروا کیے بغیر ان میں سے ایک کی تلاشی لی اور مجھے مارچ مل گئی۔ اسے روشن کر کے میں نے پہلے چاروں کا معائنہ کیا اور اس دوران میں بیٹو دیوار کے مورچے پر پوری طرح مستعد رہا تھا۔ چاروں میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔ مجھے ان کو مار کر ذرا بھی افسوس نہیں تھا کیونکہ وہ بھی ہمیں قتل کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اصولاً انہیں کوشش کرنا چاہیے تھی کہ ہمیں زندہ پکڑیں اور اگر ہم ہتھیار نہ ڈالیں تب ہمیں ماریں مگر وہ تو پہلے ہی مارنے کے ارادے سے آئے تھے۔ اگر میں بروقت بھوپت کو نہ مارتا تو

وہ بیٹو کو مار دیتا میں نے بیٹو کو بتایا اس نے کہا۔

”ہم ادھر ہی چھپا تھا شوبی۔“

”قائریگ کی آواز دور تک گئی ہوگی۔ ہمیں یہاں سے لگتا ہے لیکن اس سے پہلے ان کی وردیاں اتارنی ہوں گی۔“

بیٹو دیوار کو دکر ادھر آگیا۔ ”اور ان کی لاشیں؟“

”وہ یہاں درختوں میں چھوڑ دیں گے۔“

”شوبی ادھر ایک خالی کنواں ہے اس میں نہ ڈال دے۔“ بیٹو نے دیوار کے پار اشارہ کیا۔

”پہلے وردیاں اور سامان۔“ میں نے کہا۔

جیسے پہلے شوٹ کیا تھا اس کی وردی صاف ستھری تھی یعنی اس پر خون نہیں لگا تھا۔ البتہ باقیوں کی وردیاں خون آلود تھیں اور گولیوں کے سوراخ بھی ہو گئے تھے مگر ہمارے کام آ سکتی تھیں۔ وردیاں اتار کر ہم نے لاشیں دیوار کے دوسری طرف پھینکیں اور پھر بیٹو ایک ایک کر کے انہیں اندھے کنویں میں پھینکنے لگا۔ لاشوں سے ہم نے سب اتار لیا تھا اب ان کی شناخت آسانی سے نہیں ہوتی۔ وردی کے ساتھ ان کی تمام چیزیں لے لی تھیں۔ بیٹو صفائی میں لگا رہا۔ احاطے میں ایک کنواں تھا جس پر رھٹ لگا ہوا تھا میں نے رھٹ چلایا اور اس نے تین وردیاں دھوئیں۔ اس دوران میں ہم ٹرک بھی دیکھتے رہے تھے۔ دہشت زدہ راج کنور اور سنکاری اس میں موجود تھے۔ بیٹو نے فوجی اسلحہ اور ایندینیشن بھی بیک میں ڈال لیا تھا اور اب اس کا بیک اتنا ذوقی ہو گیا تھا کہ وہ یہ مشکل اٹھائے ہوئے تھا۔ میں نے اعتراض نہیں کیا آگے نہ جانے ہمیں کون سے معرکے درپیش تھے اور معرکے اسلحے سے لڑے جاتے ہیں۔

مشکل سے آدھے گھنٹے میں یہ سارے کام نمنہ کر ہم روانگی کے لیے تیار تھے۔ اگر سنگھ کا پتا نہیں تھا کہ وہ درخت پر چڑھا ہوا تھا یا اتر کر بھاگ گیا تھا۔ اب مجھے اس سے مطلب نہیں تھا۔ میں نے صاف ستھری وردی پہنی اور اپنے کپڑے ساتھ رکھ لیے پھر جیب اشارت کر کے ٹرک کے پاس لایا۔ ہم نے سارا سامان اس کے عقبی حصے میں واقع خانے میں ڈالا۔ جیب کی چابیاں ایک لاش کے پاس سے ملی تھیں۔ جب سنکاری اور راج کنور کو نیچے اترنے کو کہا تو سنکاری نے کانپتی آواز میں پوچھا۔ ”یہ کیا ہوا تھا؟“

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے الٹا سوال کیا۔

”یہ گن شاٹ کیسا تھا؟“

”کون سا گن شاٹ؟“ میں نے پھر حیرت سے پوچھا۔

”اندھ چلو۔“ بیٹو نے کہا۔ ”ابھی ادھر پولیس آگیا تو اس سے پوچھنا پھر وہ تم کو بتائے گا۔“

راج کنور کی حالت ایک بار پھر بری ہو رہی تھی مگر وہ خاموش تھا البتہ اس نے جیب میں بیٹھنے کے بعد کہا۔

”یہ بی ایس ایف کی جیب ہے۔“

”ہاں ہے تو؟“ میں نے اعتراف کیا۔

”تب وہ کہاں ہیں؟“

”وہ ہمیں جیپ دے کر سونے چلا گیا ہے۔“ بیٹو نے جواب دیا۔ ”اب ہم گشت کرے گا۔ تم کو اعتراض ہے؟“

راج کور میں اعتراض کی جرأت نہیں تھی خاص طور سے بیٹو کے سامنے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نوجوان اس کا دشمن ہے اور اس نے موقع دیا تو وہ اسے خوشی خوشی قتل کر دے گا۔ ویسے اسے اور سنکاری کو یقین تھا کہ ہم نے جیپ والوں کو مار دیا تھا اور اسی وجہ سے خاص طور سے سنکاری کی حالت بری تھی۔ میں نے جیپ باہر نکالی اور سڑک پر آ کر گورڈ اسپور کی سمت روانہ ہو گیا۔ درحقیقت مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ سڑک کہاں نکلے گی میں اندازے سے سڑک کر رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نقشہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کچھ آگے جانے کے بعد لیپ ٹاپ آن کر کے انٹرنیٹ لگایا اور کھل میپ پر علاقے کا نقشہ نکال اور فوراً ہی میں نے وہ روٹ جان لیا جس پر مجھے سڑک رتا تھا۔ انڈیا میں انٹرنیٹ سسٹم بہت اچھا تھا۔ اس دور دراز دیکھی علاقے میں بھی کام کر رہا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ بیٹو کے حوالے کیا اور خود ڈرائیو کرنے لگا۔ نقشے کے مطابق یہ سڑک ایک قصبے کا لاناؤ پر ٹکٹی تھی اور یہاں سے ہائی وے پکچیس جس پر ہم پہلے جیپ سڑک کرتے رہے تھے سیدھی گورڈ اسپور جاتی تھی۔ کالاناؤ کوئی چھ میل کے فاصلے پر تھا اور ہم دس منٹ بعد وہاں پہنچ گئے۔ ہائی وے پر آتے ہی میں نے جیپ کی رفتار تیز کی تھی۔ ابھی موقع نہیں تھا کہیں سکون سے بیٹھ کر میں شملہ تک اور اس سے آگے جانے والا آسان ترین روٹ نکال سکتا تھا۔

اس جیپ میں آسانی تھی کہ کہیں روکا نہیں جاتا لیکن اس پر زیادہ دیر تک سڑک بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گورڈ اسپور بڑا شہر تھا اور یہاں سے ہم کوئی گاڑی لے سکتے تھے جیپ کو کہیں چھوڑا جاسکتا تھا جہاں وہ فوری دستیاب نہ ہوتی۔ مکررات کے اس پہر جب کہ ایک بجتے والا تھا۔ ہمیں مشکل سے ہی کوئی گاڑی ملتی اور اگر خطرہ اضافہ بھی لیتے تو کاغذات اور ہماری شناخت کا مسئلہ ہوتا۔ یہ بات یقینی تھی کہ ہمیں راستے میں کئی چیک پوسٹس سے گزرنا پڑے گا۔ راج کور اور سنکاری کا ساتھ مصیبت بن جاتا اور ہم انہیں چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا اگر ہم اسی جیپ پر ہوشیار پور پہنچ جاتے تو وہاں ایئر کلب سے کوئی ہیلی کاپٹر یا جھونا طیارہ مل سکتا تھا جو ہمیں گھنٹے سے بھی پہلے شملہ پہنچا سکتا تھا۔ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے ہم گورڈ اسپور پہنچ گئے تھے لیکن میں نے شہر میں داخل ہونے سے گریز کیا اور ایک جگہ رک کر میپ کا معائنہ کیا۔ ہائی وے پکچیس کا ایک انٹر لنک شہر سے باہر ہی آگے نکل رہا تھا اور تقریباً دس بارہ میل کے بعد یہ موڑوے اے ون سے مل جاتا تھا اے ون کے ذریعے ہم ہوشیار پور جاسکتے تھے۔ میں نے بھی لنک استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران میں بیٹو نے ایک درودی بہن کی تھی جو اسے کسی قدر ڈھیلی تھی اور باقی دو درودیاں اس نے زبردستی راج کور اور سنکاری کو پہنادی تھیں۔ انہیں میگزین نکال کر راکٹلیں بھی دے دی تھیں اب ہم بی ایس ایف والے نظر آ رہے تھے۔ راج کور نے زخار کیا۔

”ہم بالکل بھی فوجی نہیں لگ رہے ہیں اگر کسی کو شک ہو گیا تو.....“

”تو ہم اسے پکڑ لے گا۔“ بیٹو نے اسے ڈانٹا۔ ”اس لیے اپنا منہ بند رکھو اور جیپ کر کے بچو۔“

آدھے گھنٹے بعد ہم اے ون پر تھے۔ ٹول پوسٹ سے ہم حرے سے گزر گئے۔ فوجی گاڑی دیکھتے ہی ہمیں اجازت مل گئی تھی اور پوسٹ والوں نے ہمارے یا گاڑی کے کاغذات مانگنے کی جرأت نہیں کی۔ میں ذرا تھک گیا تھا اس لیے ڈرائیو تک سیٹ بیٹھ کے سپرد کردی اور خود آرام کرنے لگا۔ میرا فیصلہ فی الحال ہی ثابت

ہو رہا تھا۔ فوجی گاڑی کی وجہ سے ہمیں سہولت مل گئی تھی ورنہ لازمی بار بار ہماری چیکنگ ہوتی اور ہمارے پاس کاغذات نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ موٹر وے پر آنے کے بعد بیٹو نے سنکاری اور راج کنور سے راکٹیں لے لی تھیں کیونکہ ان کے دستوں سے کام لیا جاسکتا تھا۔ ہم دونوں ہی آگے تھے اور وہ پیچھے تھے۔ ہم جہاں سے موٹر وے پر چڑھے تھے وہاں سے کوئی تیس میل کے بعد ایک لنک روڈ نکل کر ہوشیار پور جانے والی موٹر وے کو مل رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم مستقل سفر کرتے تو ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے۔ ایاز نے بیٹو کو ماہر ڈرائیور بنا دیا تھا یہی نہیں اسے ملنیک کا کام بھی سکھایا تھا۔ بیٹو نے فخر سے بتایا۔ ”اگر پارٹ کا مسئلہ نہ ہو تو ہم ہر فالٹ ٹھیک کر سکتا ہے۔“

موٹر وے پر آنے والے پہلے پیٹرول پمپ سے جیب کا ٹینک فل کرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا اسٹور اور ری فریج منٹ کیفے بھی تھا میں نے وہاں سے کاغذی کپوں میں چائے اور کھانے و پینے کا خاصا سامان لے لیا۔ اس کی راستے میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہاں رش نہ ہونے کے برابر تھا اور زیادہ ملازمین بھی نہیں تھے اس لیے ہم ہنا کسی مشکل کے وہاں سے آگے روانہ ہو گئے۔ اسٹور سے پین کھڑل گئی تھیں میں نے وہی انرجی ڈرنک کے ساتھ راج کنور کو دے دیں۔ اس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ ”میرے پاؤں میں اندر زخم ہے اور پانی اسے خراب کر دے گا مجھے باقاعدہ ڈریسنگ اور نئے پلاسٹر کی ضرورت ہے۔“

اس پر بیٹو نے اسے بتایا کہ اسے ڈھائی من لکڑی کی ضرورت ہے جو جلد اسے مل جائے گی۔ ہوشیار پور کی طرف جانے والے لنک پر مڑنے کے بعد میں نے سنکاری سے کہا۔ ”کیا ہمیں ہوشیار پور کے کسی ایریکلےب سے“

ہیلی کاپٹر یا چھوٹا طیارہ مل سکتا ہے۔“

”مشکل ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”رات کے وقت بہت کم طیارے اور ہیلی کاپٹر پرواز کر سکتا ہے، ان میں رات کو پرواز کرنے والے آلات نہیں ہوتے اسی طرح ایریکلےب میں بھی رات کو فیک آف اور لینڈنگ کے آلات نہیں ہوتے۔“

”اوکے ہم صبح ہوتے ہی پرواز کر سکتے ہیں مگر رات کو بات کر سکتے ہیں تمہارا کوئی جاننے والا ہے جو ہمیں شملہ تک لے جاسکے؟“

”شملہ۔“ سنکاری چونکا۔ ”تم شملہ واپس جانا چاہتا ہے۔“

راج کنور بھی حیران ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کیوں واپس جا رہا تھا بس وہ حیران تھا۔ اس نے ایک دوبار پوچھا بھی کہ میں اتنے جتن سے سرحد سے پار کرنے کے بعد واپس کیوں آیا تھا لیکن میں نے اس کے سوال پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ راج کنور نے بھی تعجب سے کہا۔ ”تم واپس جا رہے ہو مگر کیوں؟“

”اس سے تم دونوں کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا اور سنکاری سے بولا۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“

”میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔“ سنکاری نے انکار کیا۔

”اوکے تب تم کسی پائلٹ کی تلاش میں ہماری مدد کرو گے جس کے پاس ذاتی طیارہ یا ہیلی کاپٹر ہو۔ تم خود پائلٹ ہو اور تمہارے پاس لائسنس کے ساتھ کاغذات بھی ہیں۔“

”وہ تو ہیں۔“ اس نے مجبوراً اقرار کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ احاطے میں ہونے والی کارروائی کے بعد اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ وہ عام آدمی تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ میں نے بے دریغ فوجیوں کو مارا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس کے سامنے دو جرائم پیشہ افراد کو جہنم رسید کیا تھا مگر فوجیوں کا معاملہ مختلف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب اس کا کیا کروں اسے چھوڑا تو وہ پولیس کے پاس جا سکتا تھا اسے کم سے کم شملہ تک میری منزل کا پتا تھا پھر وہ راج کنور کے بارے میں بتا سکتا تھا اب تک لازماً ایبویٹس کو پیش آنے والے حادثے کی اطلاع ریاست کی پولیس تک پہنچ گئی ہوگی اور پولیس کو معلوم ہوگا کہ اس میں کنور خاندان کا فرد تھا۔ کڑی سے کڑی ملانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ وہ اسی کے بعد سنکاری کو جانے دوں گا لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ ایک تو وہ میرے خلاف کچھ کر نہیں سکتا تھا دوسرے وہ پائلٹ تھا اور کسی موقع پر ہمارے کام آ سکتا تھا۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس نے التجا کی۔

”میرے کو جانے دو میں پولیس یا کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”وہ کیسے، تم گھر جاؤ گے اور پولیس وہاں موجود ہوگی بلکہ آری اٹلی جنس کے بندے ہوں گے اور وہ تم سے تمہارے بھلی کا پٹر کے بارے میں پوچھیں گے۔“

”میں کہہ دوں گا کچھ لوگوں نے بھلی کا پٹر ہار لیا اور مجھے ایک دیران جگہ چھوڑ کر بھلی کا پٹر لے گئے۔ میں پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا واپس آیا ہوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ کسی کی بات پر یقین کرنے والے لوگ نہیں ہیں وہ اپنے طریقے سے پوچھیں گے اور تم کسی صورت اپنی زبان بند نہیں رکھ سکو گے۔“

”ہم کوشش کر سکتا ہے۔“

”نہیں مجھے سوچنے دو میں کوئی ایسا طریقہ سوچوں گا جس میں میرے اور تمہارے لیے کوئی خطرہ نہ

ہو۔“

میں نے اپنے لیے کافی لی تھی اگرچہ اس کا ذائقہ اتنا اچھا نہیں تھا مگر بھر بھی یہ کافی تھی۔ اس نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا باقی سب نے چائے لی تھی۔ بیٹرا جی ڈرنک سے شغل کر رہا تھا۔ سوا گھنٹے بعد ہم موٹر دے سے اوشیار پور میں داخل ہوئے۔ رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے سڑکیں سنسان اور بندہ نہ بندے کی ذات تھی۔ لبتہ پولیس والے گشت کر رہے تھے مگر کسی نے فوجی جیپ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے انٹرنیٹ پر ہی ایرکلب کی طرف جانے والا راستہ کھوج نکالا۔ چار بجے ہم ایرکلب کے پاس تھے۔ ایک جگہ رگ کر ہم نے دوبارہ کپڑے بدلے اور عام حلیے میں آ گئے۔ اس کے بعد جیپ سے ایسے نشانات مٹائے جن سے یہ دور سے ٹری جیپ نظر آتی تھی۔ اس کے اندر موجود ریڈیو جسے میں نے سوار ہوتے ہی آف کر دیا تھا اسے نکال کر ایک لڑھے میں بھینک دیا۔ نمبر پلٹ پر اس طرح کچھ ملا کہ اس کا رنگ بھی چھپ گیا۔ اب اسے قریب سے دیکھے نیز ملٹری جیپ قرار دینا مشکل تھا۔

ایئرکلب کی پارکنگ میں بہت جگہ تھی اور رات کے گاڑوں نے سنکاری کا پائلٹ لائسنس دیکھ کر ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ ہم سنکاری کے ساتھ تھے۔ یہ وہ ایرکلب تھا

جہاں سے ہم نے جاتے ہوئے ایندھن بھروایا تھا۔ بیڑہ اور راج کنور کو چپ میں چھوڑ کر میں اور سنکاری ایرکلب کی عمارت کی طرف آئے۔ وہ تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور صرف اس کے نیچر کے کمرے میں روشنی تھی مگر وہاں نیچر نہیں تھا بلکہ رات کا گھراں تھا جو ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے لیٹ نائٹ آنے والی فلم لگا رکھی تھی جو غالباً افغان کے لیے تھی۔ لاؤنچ سے ہوتے ہوئے ہم بلا تکلف اندر پہنچ گئے اور جب دروازے سے اندر جھانکا تو وہ چونکا اور جلدی سے ٹی وی آف کر کے باہر آ گیا۔ اس نے خفگی سے کہا۔ ”کون ہو تم لوگ اس طرح بغیر پریشن کے اندر کیوں آئے ہو؟“

”ادھر آنے کا واسطے پریشن کون لیتا ہے۔“ سنکاری نے کہا۔ ”مجھ کو پریشن نہیں چاہیے۔“ سنکاری نے اپنا پائلٹ لائنس دکھایا۔ نو جوان ذرا مرعوب ہوا تھا۔

”اچھا تم پائلٹ ہو لیکن اس وقت یہاں فلائٹ کی پریشن نہیں ہے۔“

”ہم پہلے آ گئے ہیں۔“ میں نے نو جوان سے کہا۔ ”تم یہاں کے نائٹ انچارج ہو؟“

اس نے سر ہلایا اور کسی قدر فخر سے بولا۔ ”ہاں میں یہاں کا نائٹ انچارج ہوں۔“

”ہمیں صبح کے قریب ایک ہیلی کاپٹر یا جھوٹا طیارہ چاہیے۔“

”مل جائے گا لیکن پائلٹ صبح ہی آئیں گے۔“ اس نے کہا۔

”سنو ہمیں ایرجنسی میں جانا ہے۔“ میں نے ایک ہزار کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔ یہ

آزمودہ نسخہ تھا جو اس بار بھی کام آیا۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس نے نیاز مندانہ انداز میں پوچھا:

”میں کیا کر سکتا ہوں سر؟“

”تمہارے پاس یقیناً ایسے پائلٹس کے کولکٹ نمبرز ہوں گے جو انفرادی طور پر کمرشل فلائٹ لے جاتے

ہیں۔ مطلب یہ کہ انہیں کسی کو جواب دہ ہونا نہیں پڑتا ہے۔ ہم براہ راست ان سے بات کر سکتے ہیں۔“

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ایک آدمی ہے۔ لیکن ابھی مشکل سے ملے گا۔ اس کی بیوی بہت خطرناک

ہے۔ فون دی ریسیو کرتی ہے اور ذرا سا شک ہو جائے تو ایسی گالیاں دیتی ہے۔“

”اس حد تک زن مریدہ شخص پائلٹ کیسے بن گیا؟“ سنکاری نے اعتراض کیا۔ ”اس کا تو لائنس کینسل ہو

جانا چاہیے۔“

”بیوی ایسی ہے۔“ نو جوان نے دانت نکالے۔ ”بالکل کترینہ کیف گتی ہے۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ سنکاری نے کہا۔ ”اپنا اعتراض واپس لے لیا۔“

میں نے جان بوجھ کر نو جوان سے نام نہیں پوچھا ورنہ اپنا نام غلط بتانا پڑتا۔ ”اس کے پاس طیارہ کون سا

ہے اور اس میں کتنے لوگ جا سکتے ہیں؟“

”ایک جھوٹا سیڑنا ہے۔“ نو جوان نے بتایا۔ ”اس میں پائلٹ کے علاوہ چار آدمی جا سکتے ہیں۔“

”اتفاق سے ہم چار ہی ہیں۔“ میں بٹے کہا۔

نو جوان چونکا۔ ”چار.....؟ تم لوگ تو دو ہو۔“

”دو باہر گاڑی میں بیٹھے ہیں۔“

”ان کو بھی اندر لے آؤ۔“ اس نے کہا۔ ”باہر تو خاصی گرمی ہے۔“

ایئر کلب کی عمارت تو نہیں لیکن منجر کا کمرہ اسی تھا۔ ہزار کا نوٹ پا کر نوجوان تالعدار خادم بن گیا تھا۔ وہ سنکاری کے ساتھ جا کر راج کنور کو خود اندر لانے پر کمر بستہ ہو گیا تھا اسے بڑی مشکل سے روکا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ فوجی جیب دیکھے۔ میں سنکاری کے ساتھ واپس گیا اور راج کنور کو لے آیا۔ بیٹو اپنا اسلحہ والا بیگ لا رہا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ یہ مٹھوک نظر آتا۔ ہم دونوں کے پاس ہسپتال تھے اور فی الحال یہ بھی کافی تھے۔ ہم اندر آئے تو نوجوان نے ہمیں کولڈ ڈرنک ٹن پیش کیے۔ راج کنور کو ایک کاؤچ مل گئی تھی اس نے کولڈ ڈرنک کے ساتھ مزید پین کلر گولیاں نگلیں اور غڑ حال ہو کر پڑ گیا۔ سنکاری ایک کرسی پر بیٹھ کر ادھکھٹے لگا۔ اس کی بیزاری میں نشے سے دوری بھی شامل تھی اور اپنے مستقبل کی فکر بھی۔ اس کا واحد اثاثہ بلی کا پٹر کریش میں تباہ ہو گیا تھا اور اسے بھارتی ایجنسیوں کی تقشیر کے مرحلے سے بھی گزرنا تھا۔

”آپ لوگوں نے کہاں جانا ہے؟“

”دہلی۔“ میں نے مخالف سمت بتائی۔

اس کو تعجب ہوا۔

”دہلی یہاں سے کتنی دور ہے۔“

”بائی روڈ کم سے کم دس گھنٹے لگیں گے اور بائی پلین ہم ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں پہنچ جائیں گے۔“

میں نے کہا اور راج کنور کی طرف اشارہ کیا۔ ”مسئلہ اس کا ہے۔ اسے جلد از جلد لے جا کر ڈاکٹر کو دکھانا ہے اس کا خاخص آپریشن ہوا ہے اور آپریٹ کرنے والا ڈاکٹر ہی دیکھ سکتا ہے۔ سڑک سے لے جانے میں اسے بہت تکلیف ہوتی۔“

نوجوان مطمئن ہو گیا۔ بیٹو نے ٹی وی کار میوٹ چلا کر آن کیا اور پھر چینل بدلنے لگا۔ اچانک ایک چینل پر وہ رکا۔ یہاں سے ٹی وی رپورٹر رسول ایوی ایشن کے حوالے سے بلی کا پٹر کریش کی رپورٹ دے رہی تھی۔ لڑکی بتا رہی تھی کہ پاکستان انڈیا کی سرحد کے بالکل پاس کریش ہونے والا یہ بلی کا پٹر شملہ کے ایک ایئر کلب میں رجسٹرڈ تھا اور اس کا پائلٹ بی اے سنکاری گزشتہ شام کچھ لوگوں کو لے کر ہمالیہ کی طرف گیا تھا مگر اب اس کا بلی کا پٹر دریائے راوی میں پڑا تھا۔ بلی کا پٹر کا پائلٹ اور دوسرے مسافر غائب تھے۔ پولیس اور بارڈر سکیورٹی فورسز انٹیلی جنس اس معاملے میں تحقیق کر رہی تھی اور امید تھی کہ جلد منسنی خیز انکشافات ہوں گے۔ لڑکی کی رپورٹ نامکمل تھی بی ایس ایف والے جس طرح ہمارے پیچھے آئے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ انہیں بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ یقیناً اس بلی کا پٹر کے بارے میں دفاعی حکام جانتے تھے کہ یہ ان کی طرف سے کلیئرٹس لے کر پاکستانی سرحد کے پار گیا تھا اور اسے واپسی میں نشانہ بنا گیا تھا اس لیے اب وہ اس کے مسافروں کی تلاش میں تھے۔

نوجوان کی توجہ ٹی وی کی طرف نہیں تھی اس لیے وہ بی اے سنکاری کے نام پر چونکا نہیں تھا۔ اس کے بجائے وہ اپنی کرسی سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بیٹو کو گھورا تو اس نے جلدی سے چینل تبدیل کر دیا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر آرام کر لوں۔ میں گزشتہ بیس گھنٹے سے مسلسل جاگ رہا تھا اور حرکت میں تھا۔ جسم اب آرام طلب کر رہا تھا۔ میں نے بیٹو سے کہا کہ میں کچھ دیر آرام کروں گا وہ سمجھ گیا کہ

اب سب دیکھنا اس کی ذمہ داری ہے اس نے مستعدی سے کہا۔ ”آپ سو جاؤ ہم جاگ رہا ہے۔“
میں ایک کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے نوجوان نے ہلایا۔ ”میری پائلٹ سے بات ہو گئی ہے وہ آنے والا ہے۔“

میں نے انگڑائی لی۔ ”یہ تم نے اچھا کیا..... یہ بتاؤ کوئی چائے کافی ملے گی ہم اس کی ادائیگی کریں گے۔“
”میرے پاس سامان ہے میں ابھی بناتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ ساتھ میں واش روم سے فریش ہو جائیں۔“

واش روم اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں تازہ دم ہو گیا۔ بیٹو جاگ رہا تھا میں نے اسے سونے کو کہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ”ہم ٹھیک ہے ذرا باہر سے آتا ہے۔“
اسے اسلحے کی فکر تھی اگرچہ جیب لاک تھی مگر بیٹو اپنی تسلی کرنے گیا تھا اس نے چالاکی سے کام لے کر ایک موقع پر جب نوجوان کمرے میں نہیں تھا وہی کیبل کی تار ایک جگہ سے کاٹ دی تھی تاکہ وہ ٹی وی نہ دیکھ سکے۔ اس کا پورا امکان تھا کہ ہر چینل اب اس پر پورننگ کر رہا ہوگا۔ ممکن ہے انڈیا کے اسٹوری ساز میڈیا نے اس دوران میں کوئی کہانی بھی بنالی ہو جب معاملہ پاکستان کا ہو انڈین میڈیا کے نزدیک سفید جھوٹ بولنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ پائلٹ سات بجے وہاں پہنچا اس وقت تک باہر بہت تیز روشنی ہو چکی تھی۔ موسم پر دواز کے لیے سازگار تھا۔ پائلٹ کا نام آڈیسی منکڈ تھا۔ وہ تقریباً پینتیس برس کا سیاہ رُومرا جھے نقوش والا آدمی تھا۔ اگر اسے کترینا کیف جیسی بیوی مل گئی تھی تو اسے اس سے ڈرنا ہی چاہیے تھا۔ کیونکہ معاملہ برٹس کا تھا اس لیے علیک ملیک کے بعد وہ مجھے لاؤنج میں الگ جگہ لے آیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کہاں جانا ہے اور صرف جانا ہے یا آنا بھی ہے؟“

”ہمیں شملہ جانا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ممکن ہے واپس بھی آنا پڑے۔“
”اس صورت میں چالیس ہزار روپے ہوں گے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”شملہ میں اسٹے بھی تمہارے ذمے ہوگا۔“

”میں پینتالیس ہزار دوں گا اسٹے اور کھانا پینا تمہارا اپنا ہوگا۔“ میں نے کہا تو وہ خوش ہو گیا کہ میں نے کوئی بارکیٹنگ نہیں کی تھی۔ ”لیکن یہاں کسی کو ہماری منزل کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ تم ایئر کلب والوں کو بھی نہیں بتاؤ گے۔“

”اے ٹی ایف کو بتانا پڑے گا۔“
”اسے بے شک بتاؤ..... میں عام لوگوں کے لیے منع کر رہا ہوں۔ ہمارے ساتھ ایک بڑی شخصیت ہے اس کا تعلق ایک سابق راجا خاندان سے ہے سیورٹی کی وجہ سے ہم اس کا سفر پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”مجھے رقم ایڈوانس میں چاہیے۔“
”پچیس سہس اسی ملیں گے اور ہمیں واپسی کے وقت دوں گا۔“ میں نے کہا تو اس نے نفی میں سر

”میں کوئی ٹیکسی والا نہیں ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ رقم ایڈوانس میں چاہیے اور میں بتا دوں کہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ اسے نہیں کروں گا۔“

”ممکن ہے چوبیس گھنٹے سے زیادہ لگ جائیں تو.....“

”معاوضے میں مزید پانچ ہزار کا اضافہ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے..... لیکن تم کسی صورت میرے حکم کے بغیر واپس نہیں آؤ گے اور نہ فلائنگ کرو گے۔“

”ڈن۔“ اس نے ہاتھ آگے کیا اور میں نے ہاتھ ملا کر اسے پینتالیس ہزار بھارتی روپے کے مساوی ڈالر دے دیے۔ ریٹ انٹرنیٹ سے پتا چل گئے تھے۔ بھارتی روپے تیزی سے کم ہو رہے تھے کیونکہ اب تک ان سے ہی خرچ کر رہا تھا۔ یورو کی ایک گڈی شام اور رینا کو دی تھی۔ اس کے باوجود یورو اور ڈالر کی صورت میں خاصی رقم موجود تھی۔ اس لیے اب میں بھارتی کرنسی بچانے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ ہر جگہ ڈالر اور یورو نہیں چلتے ہیں اور ان کا استعمال لوگوں کو چھوڑنا بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر آیا۔ ایک طرف طیاروں کے ساتھ اس کا سینا اسکاٹی ہاک طیارہ کھڑا تھا۔ طیارہ تقریباً نئی حالت میں تھا۔ یہ اس کا نیا ماڈل تھا جس میں تین کے بجائے چار مسافروں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ایک پائلٹ کے ساتھ بیٹھتا ہے اور تین پیچھے آتے ہیں۔ طیارے میں ایندھن بھرا ہوا تھا۔ آؤ لکسی نے بتایا۔

”دودن پہلے ایک پارٹی نے بنگ کرائی تھی اور عین موقع پر پروگرام کینسل ہو گیا تب سے یہ ایسے ہی کھڑا ہے۔“

”تمہارا نقصان ہوا ہوگا؟“

”نہیں۔“ اس نے دانت نکال کر کہا۔ ”میں ہمیشہ ایڈوانس لیتا ہوں اگر کوئی پروگرام کینسل کرتا ہے تو میں روں کے تحت ٹوکنٹی پرسنٹ کاٹ کر واپس کرتا ہوں۔“

وہ ہوشیار آدمی تھا۔ سنکاری نے صرف دس ہزار روپے لیے تھے اور ایندھن بھی اسی رقم سے ڈلوایا تھا۔ اس کے مقابلے میں آؤ لکسی یقیناً ہوشیار آدمی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کتنی دیر میں پرواز کے لیے تیار ہو سکتے ہو ہمیں جلد از جلد روانہ ہونا ہے۔“

”آدھا گھنٹا اور لگے گا مجھے طیارے کو چیک کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم اسے چیک کرو۔“ میں نے واپس عمارت کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”ہم آدھے گھنٹے میں آتے ہیں۔“

میں نے صرف چائے لی تھی اور باقی سب ناشتہ کر رہے تھے ان ہی چیزوں سے جو میں نے پینرول پمپ کے اسٹور سے لی تھیں۔ بیٹو نے مجھے ایک چاکلیٹ بن پکڑا دیا۔ ”کھا کر دیکھو مزے کا ہے۔“

”ہمیں آدھے گھنٹے میں روانہ ہونا ہے۔“ میں نے کہا اور سنکاری کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں ایئر کلب سے جانے کے لیے گاڑی درکار ہوگی وہ کیسے ملے گی۔“

”تم کال کر کے کیب منگوا سکتے ہو۔“ اس نے کہا اور دو کیب کپنیوں کے نمبرز بتائے۔ میں نے اسی وقت ایک کیب کا نمبر ملایا اور ایک کیب شملہ کی ایئر فیلڈ پر بھیجے کو کہا۔ میرے پاس ابھی تک ہمالیہ ہوٹل کے منیجر کا دیا

موبائل تھا اور کام آ رہا تھا۔ سنکاری اور راج کنور بھنے سے قاصر تھے کہ میں کیا کر رہا تھا اور انہیں کیوں لیے لیے پھر رہا تھا۔ گاڑی کا مسئلہ حل ہونے کے بعد میں باہر آیا اسلحہ والا بیگ لا کر اندر بیٹو کے حوالے کیا اور پھر جیب لے کر ایئر فیلڈ سے نکل آیا۔ کچھ دور آ کر جیب ایک جگہ درختوں کے درمیان چھوڑی اور اس پر سے تمام مکینہ جگہوں پر اپنی اگلیوں کے نشانات صاف کر دیے۔ جیب تک میں پیدل واپس آیا آڈیسی طیارے کو پرواز کے لیے تیار کر چکا تھا۔ کیونکہ گیٹ کپڑے جھے جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے واپسی کے وقت بغیر کسی اعتراض کے مجھے اندر آنے دیا۔ آڈیسی اور اس کا طیارہ پرواز کے لیے تیار تھے۔ میں اندر جا کر سب کو لے آیا۔ راج کنور کو پیچھے سیٹ پر بٹھا دیا۔ سنکاری کو اس کے ساتھ والی جگہ ملی تھی۔ آڈیسی نے اسلحہ والا بیگ دیکھا۔

”اس میں کیا ہے؟“

”اس میں کچھ آلات ہیں اور کچھ آٹوموبائل پرزے ہیں۔“ میں نے بیگ کے بھاری پن کے پیش نظر گھر کر جموٹ بولا۔ بیٹو بیگ سیٹ پیچھے گھس گیا آڈیسی نے کہا۔

”بیگ سیٹ کے پیچھے خانے میں رکھ دو۔“

بیٹو نے خانہ کھول کر بیگ اس میں رکھ دیا۔ آڈیسی نے انجن چلانے سے پہلے ایئر ٹریک کنٹرولر سے ریڈیو پر اجازت لی اور اسے فلائٹ پلان بتایا گیا۔ میں نے مداخلت نہیں کی۔ میرا اندازہ تھا کہ اٹلین اٹلین جنس جس طرح سے میرا تقابک کر رہی تھی وہ ہر جگہ مجھ سے گھنٹوں پیچھے تھے۔ اگر سب میری پروگرام کے مطابق ہوتا تو ہم آج کے دن ہی سادی کو حاصل کر کے واپس آ سکتے تھے۔ اس کے بعد واپسی کا لائحہ عمل طے کیا جاتا۔ طیارے نے آٹھ بجے ٹیک آف کیا۔ یہ زیادہ تیز طیارہ نہیں ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار دو سو چلو میٹر فی گھنٹہ ہے۔ ٹیک آف کے وقت کیمین پریشور ہونے کی وجہ سے کالوں کو بے پناہ شور اور بوجھ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آڈیسی نے پرواز سے پہلے بتا دیا کہ اٹلین آٹلین کی صورت میں سیٹ کے ساتھ قبلی موجود تھی اسے استعمال کیا جائے۔ مگر خوش قسمتی سے کسی کو ضرورت نہیں پڑی۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر آ کر طیارہ سیدھا ہو گیا۔ اب شور اور دباؤ کم ہو گیا تھا۔ ہم شملہ کی طرف اڑنے لگے۔ ہم کسی قدر جنوب مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے بتایا کہ شملہ طول البلد میں امرتسر اور لاہور سے بھی نیچے ہے لیکن کیونکہ یہ پہاڑوں میں ہے اس لیے اس کا موسم سرد اور تقریباً مری جیسا ہے۔ آڈیسی نے کہا۔

”ہم آدھے گھنٹے بعد شملہ میں ہوں گے۔“

یعنی ہم ساڑھے آٹھ بجے شملہ میں ہوتے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہاں سے کوئی فورڈ ٹیل ڈرائیوئل مٹی تو ہم چار گھنٹے میں کنور ہٹس کے پاس پہنچ سکتے تھے۔ گاڑی ڈرائیو سمیت تلاش کی جاسکتی تھی۔ میری ساری تک دو کام مرکز وقت بچانا تھا اور اس کے لیے میں خطرہ بھی مول لے رہا تھا۔ اس طرح کچھ بندوں طیارے میں روانگی بالآخر بھارتی اٹلین جنس کے علم میں آ جاتی اور تلاش کا دائرہ شملہ تک پہنچ جاتا۔ میرے پاس بس آج کا دن تھا رات یا کل صبح تک لازمی طیارے تک رسائی حاصل کر لی جاتی اور پھر میں آڈیسی کو استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ میرا منصوبہ تھا کہ آج کے دن سادی کو حاصل کر کے ہم واپس بھارتی پنجاب آ جاتے اور اس کے بعد میں عبد اللہ سے کہتا کہ وہ ہمیں سرحد پار بلوانے کے لیے اپنے چینل استعمال کرے۔ اس کے سرحد پار والوں سے تعلقات تھے۔

شروع میں سنکاری اور راج کنور کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر اب ان کا حل بھی سوچ لیا تھا۔ میں نے جودوائیں امر ترنگہ سے پوچھ کر منگوائیں تھیں۔ ان کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن اب میں انہیں استعمال کر سکتا تھا۔

آٹھ بج کر پچیس منٹ پر آڈیسی نے طیارے کی بلندی کم کرنا شروع کر دی اور پریشر کی وجہ سے پھر ہمیں اسی تکلیف سے گزرنا پڑا تھا۔ بے پناہ شور اور کانوں پر ایسا دباؤ تھا کہ کان کے پردے پھٹتے ہوئے لگ رہے تھے۔ آڈیسی اور سنکاری اس کے عادی تھے۔ مگر مجھے، بیو اور راج کنور کو مشکل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر میں شملہ کا وہی ایئر فیلڈ دکھائی دینے لگا جہاں سنکاری کا ہیلی کاپٹر کھڑا ہوتا تھا۔ سنکاری وہاں جانا پہچانا فرد تھا اس کا طیارے سے باہر آنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کو طیارے میں چھوڑ کر کیب لینے جاؤں گا وہ پارکنگ میں ہوگی۔ طیارے سے براہ راست ان لوگوں کیب میں منتقل کر کے ہم وہاں سے نکل جائیں گے۔ سنکاری کا جمپ سوٹ توجہ کا مرکز بن سکتا تھا اس لیے اس کا نظروں میں نہ آتا ہی بہتر تھا۔ آڈیسی نے ایئر کلب والوں سے اترنے کی اجازت لی اور ایک منٹ بعد طیارہ لینڈ کر رہا تھا۔ میں نے آڈیسی سے کہا۔ ”طیارے کو الگ تھلک جگہ روکنا۔“

اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور طیارے کو ٹیکسی کراٹا ایئر کلب کی عمارت سے کچھ دور ایک جگہ پارک کر دیا۔ میں نیچے اتر آیا اور راج کنور سے کہا۔ ”آپ بیٹھیں میں گاڑی یہیں لاتا ہوں۔“



میں نے باہر نکل کر کیب کے دفتر کال کی تو بتایا گیا کہ مذکورہ کیب پہنچ گئی ہے اور پارکنگ میں ہماری منتظر ہے۔ پارکنگ میں ایک بڑی سفید کار کھڑی تھی۔ یہ نیا ماڈل تھا اور اگر اس پر کیب کا مخصوص نشان نہ ہوتا تو اسے کسی صورت ٹیکسی تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ڈرائیور اندر موجود تھا۔ میں نے شیشہ بجایا تو اس نے شیشہ نیچے کیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا میں نے کہا۔ ”کیب میں نے ہارن کی ہے دروازہ کھولو۔“

اس نے بیک سیٹ کا دروازہ کھولا اور میرے اندر بیٹھتے ہی ادائیگی کا مطالبہ کر دیا میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”میں بھاگا نہیں جا رہا منزل پر پہنچ کر تمہیں ادائیگی کر دی جائے گی۔“

اس نے دوبارہ مطالبہ نہیں کیا اور میری رہنمائی میں کیب کو رن وے پر پارک طیارے تک لے آیا۔ میں نے کیب اس طرح رکوائی کہ وہ طیارے اور عمارت کے درمیان میں آگئی۔ وجہ میں نے بیمار راج کنور کو قرار دیا جسے کم سے کم تکلیف کے ساتھ ٹیکسی میں منتقل کرنا تھا۔ راج سے پہلے بیٹو نے سنکاری کو پھرتی سے کیب میں دھکیلا اور پھر ہم راج کنور کو بھی لے آئے آخر میں بیٹو نے اسلیم والا بیگ کیب کی ڈکی میں منتقل کیا اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ سچی بات ہے کہ روانگی تک میرا دل مسلسل دھڑکتا رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بھارتی حکام اتنی جلدی میرا سراغ نہیں لگا سکیں گے لیکن یہ ایک مفروضہ ہوتا اور اگر کوئی تیز طرار شخص اس کیس پر کام کر رہا ہوتا اور وہ سارے چینلوں استعمال کرتا تو یہ پتا چلانا مشکل نہیں ہوتا کہ ہم ایک طیارہ ہارن کر کے شملہ پہنچے ہیں اور اس کا بھی امکان تھا کہ پولیس یہاں ہماری منتظر ہوتی۔ یہ بات یقینی تھی کہ چار سکیورٹی والوں کا قتل بھارتی حکام کو تیزی سے حرکت میں آنے پر مجبور کرتا۔

جب ہم بحفاظت باہر آ گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ کیب سڑک پر پھسلتی ہوئی تیزی سے شملہ کی طرف رواں دواں تھی۔ جہاں ایئر کلب تھا وہاں بھی موسم سخت گرم تھا اور چشم کی پلشیں اٹھ رہی تھیں۔ کیب اے سی تھی۔ اس لیے اس میں باہر کا موسم پتا نہیں چل رہا تھا مگر یہ یقینی تھا جیسے جیسے ہم اوپر جا رہے تھے موسم خشک ہو رہا ہوگا۔ آڈیسی نے ہمارے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ اس کا مطلب تھا وہ اپنا بندوبست خود کر لیتا ممکن ہے کسی ہوٹل کے بجائے وہ ایئر کلب کی عمارت میں رک جاتا اور ہوٹل کا خرچ بچا لیتا۔ شملہ کے پاس آ کر ڈرائیور نے پوچھا۔ ”سر کہاں جاتا ہے۔“

میں اس دوران میں گوگل میپ پر ایک اسپتال دیکھ چکا تھا میں نے اس کا نام لیا۔ ”پہلے ہم یہاں جائیں

”مے“

اسپتال اتفاق سے شملہ کے نچلے علاقے میں تھا۔ اس لیے دس منٹ بعد ہم وہاں پہنچ گئے تھے لیکن میں نے کیب اسپتال کے اندر لے جانے کے بجائے باہر کوئی اسے یہاں تک آنے کا کرایہ دیا جو نارمل ٹیکسی سے کئی گنا زیادہ تھا۔ ”ہمارا انتظار کرنا ہم آتے ہیں۔“

راج کنور سمجھ رہا تھا کہ میں اسے ڈاکٹر کو دکھانے لایا ہوں اور یہ سچ بھی تھا لیکن اسپتال کے اندر جانے کے بجائے میں اس کو باغ میں لے آیا کیونکہ موسم یہاں بھی گرم تھا اس لیے باغ اس وقت دیران تھا۔ میں نے بیو کو اشارہ کیا اور اس نے پستول نکال لیا۔ راج کنور اور سنکاری پریشان ہو گئے تھے۔ راج کنور نے پوچھا۔ ”شہباز تم کیا چاہتے ہو؟“

”بتاتا ہوں۔“ میں نے لیپ ٹاپ والے بیگ سے انجکشن اور سرنجیں نکالیں۔ سنکاری چونکا۔

”یہ کیا ہے؟“

میں نے سرنج بھری اور راج کنور کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ سختی سے اس کے بازو کی نس ابھرائی اور میں نے اس میں سرنج کی نوک اتار دی۔ راج کنور نے مزاحمت کی کوشش کی تو بیو نے پستول اس کی گدی سے لگا دیا۔ ”فکر مت کرو تم کو زہر لگانے کے لیے اتنی دور نہیں لایا ہے۔“

میں نے پوری دوا اس کی نس میں انجیکٹ کر دی اور پھر اسے پھینک کر دوسری سرنج میں دوسرے انجکشن کی دوا بھری۔ ڈاکٹر امر تر سنگھ کے مطابق یہ سب سے مؤثر دوا تھی اور اس کا اثر چوبیس گھنٹے برقرار رہتا تھا۔ بشرطیکہ اس کا توڑ نہ کر دیا جائے انجکشن دینے کے پانچ سے دس منٹ کے اندر دوا اثر کرتی تھی اور اس کے بعد آدمی ایک خاص کیفیت میں چلا جاتا تھا اس کا ذہن مزاحمت کرنا چھوڑ دیتا تھا اور اسے جو کہا جاتا وہ اس پر عمل کرتا تھا۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”ہاتھ آگے کرو۔“

”یہ کیا ہے؟“

”فکر مت کرو یہ نقصان دہ نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اسے دیکھو کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔“ راج کنور آنکھیں جھپکا رہا تھا اور اس کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس سے لگتا کہ دوا نے اس پر منفی اثر ڈالا ہے۔ جب بیو نے پستول اس کی پشت سے لگایا تو سنکاری نے بادلنا خواستہ ہاتھ آگے کیا اور میں نے سرنج اس کی نس میں خالی کر دی۔ دوا کی شیشی اور استعمال شدہ سرنجیں نزدیک ہی ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔ دس منٹ پورے ہو گئے تھے اور راج کنور بدستور پلکیں جھپکا رہا تھا میں نے آہستہ سے کہا۔ ”راج کنور تم میرے کیا ہو؟“

”میں تمہارا دشمن ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کس حد تک؟“

”اس حد تک کہ جب تک تمہارا وجود منانہ دوں مجھے چین نہیں آئے گا۔“ وہ صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔

”میں نے تم سے بہت کچھ پوچھا تم نے بتایا اس میں کوئی جھوٹ بھی شامل تھا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ واپسی کے ریڈ زون کا پاس ورڈ ہوتا ہے۔“

دوا اثر کر چکی تھی۔ ”کوئی ایسی بات جو تم نے آج تک مجھ سے چھپائی ہو۔“

”میں جانتا ہوں کہ سادھنا تم لوگوں کے پاس ہے۔“

میں دہل گیا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ بات صرف بڑے کنور کے علم میں تھی۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”بڑے کنور کے آدمیوں میں میرے بھائی ہیں وہ مجھے بتاتے تھے۔“

”تب تم نے کیا سوچا؟“

”میں نے سادھنا کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“ اس نے بلا جھجک انکشافات جاری رکھے۔ ”میں

برداشت نہیں کر سکتا کہ میری بہن میرے دشمنوں اور مسلمانوں کے پاس رہے۔“

”تمہیں معلوم ہے اب سادھنا کہاں ہے؟“

”وہ تمہاری حویلی میں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی معلومات آپ ڈیٹ نہیں

تھیں۔

”تمہیں معلوم ہے میں یہاں والہس کیوں آیا ہوں؟“

”نہیں لیکن میں حیران ہوں۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”راج کنور میں تمہاری ٹانگ کے علاج کے لیے تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں

تم یہاں ایڈمٹ رہو گے اور سنکاری تمہارے ساتھ ہو گا سنکاری تم سمجھ گئے ہو۔“

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں۔“

”جب تک میں والہس نہیں آؤں گا تم یہاں اسپتال میں رہو گے۔ راج تم آرام کرو گے اور کسی سے کوئی

بات نہیں کرو گے۔ تم دونوں زیادہ سے زیادہ سونے کی کوشش کرو گے۔“

ان دونوں نے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ میں بیٹو کو باہر چھوڑ کر سنکاری کے ساتھ اندر آیا۔ یہ

چھوٹا اسپتال تھا لیکن یہاں فوری طبی امداد اور آرتھو پیڈک سرجن کی سہولت موجود تھی میں نے انتظامیہ سے کہا کہ

وہ راج کنور کو چوبیس گھنٹے کے لیے داخل کر لیں۔ سنکاری اس کی تیمارداری کے لیے اس کے ساتھ رہے گا۔ کیونکہ

میں تمام اخراجات پیشگی ادا کر رہا تھا اس لیے اسپتال والوں نے بہ خوشی راج کو داخل کر لیا اور سنکاری کے ساتھ

رہنے پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ سنکاری جب سوٹ میں تھا لیکن اس نے اوپری شرٹ اتار دی تھی اور اندر ٹی شرٹ

نما بنیان تھی۔ چٹلون سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ پائلٹ ہے یا نہیں۔ اس کی شرٹ میں نے لے لی تھی۔ آدھے

گھنٹے میں تمام مراحل منٹ گئے اور ڈیوٹی پر موجود آرتھو پیڈک سرجن نے مجھے یقین دلایا کہ مریض کی بہترین دیکھ

بھال کی جائے گی۔ میں نے خود کو ایک انسانی ہمدرد بنا کر کیا تھا اور راج کنور یا سنکاری سے کسی قسم کا تعلق تسلیم نہیں

کیا تھا۔ سنکاری کی موجودگی کی وجہ سے اسپتال والے مطمئن تھے۔ ویسے بھی ان کو پیشگی رقم مل گئی تھی اس لیے

مسئلہ نہیں تھا۔ میں باہر آیا بیٹو باغ میں منتظر تھا ہم کیم کی طرف آئے بیٹو نے توجہ دلائی۔

”شوہی ہم دونوں کا لباس خراب ہو رہا ہے اس کا کچھ کرو۔“

”تم نے اچھا دلا دیا۔“ میں نے کہا اور کیم ڈرائیور سے کسی ایسے شاپنگ اسٹور چلنے کو کہا جو صبح نو بجے

بھی کھلا ہو اور وہاں سے کپڑے مل سکیں۔“

کیب والا ہمیں لوڑ شملہ میں ایک شاپنگ سینٹر لے گیا۔ یہ بہت اچھا تو نہیں تھا مگر یہاں کپڑے دستیاب تھے۔ میں نے اور بیٹو نے ایک ایک ذرا ہلکا جوڑا لیا اس میں سوئی ٹراؤزر اور پوری آستین کی ہلکی شرٹ تھی اور ایک کسی قدر گرم جوڑا لیا، یہ بھی سوئی تھا مگر سردی کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے پیرا شوٹ کے بنے ہوئے اپر لیے یہ بارش سے بچا سکتے تھے۔ میرے پیروں میں جوتے تھے میں نے جو گرز لیے اور وہیں اسٹور کے ٹرائی روم میں چھینچ کر لیے۔ اسٹے کے لیے ایک چرمی بیگ لیا کیونکہ پیرا شوٹ اور کپڑے سے بنے اس بیگ میں بعض اوقات اسلحہ نمایاں ہونے لگتا تھا۔ ٹرائی روم میں ہی اسلحہ چرمی بیگ میں منتقل کیا۔ بھوک لگی تھی لیکن ناشتے کا وقت نہیں تھا۔ بیٹو نے شاپنگ کے دوران ایک بڑی ڈبل روٹی، ابلے ہوئے انڈے، مکھن کا پک، پنیر اور اسی قسم کی کئی اشیاء لے لیں جو راستے میں ہم آرام سے کھا پی سکتے تھے۔ بیٹو نے جانے کیا کیا خرید رہا تھا میں نے اسے رقم دے دی تھی کہ وہ الگ کاڈنٹر پر بل ادا کر دے تاکہ ہمیں تاخیر نہ ہو۔ باہر آ کر میں نے کیب والے کو فارغ کیا۔ یہ بازار تھا اور مجھے امید تھی کہ یہاں کوئی اچھی فورڈ ویل ڈرائیوئل جائے گی۔ ایک جگہ کئی گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے مالک ان کے آس پاس ہی ٹہل رہے تھے بیٹو ان سے مذاکرات کرنے چلا گیا اور میں نے انٹرنیٹ کی مدد سے بڑے کنور کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”تمہارے دیئے ہوئے بارہ گھنٹہ گزر چکے ہیں سادی سے میری بات کراؤ۔“

”ابھی اس کی آمد میں کچھ تاخیر ہے اس کی پرکٹینسی کی وجہ سے میرے آدمی آرام سے سفر پر مجبور ہیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”تب میں کب کال کروں؟“

”تم انڈیا کے وقت کے مطابق شام چھ بجے تک کال کرنا۔“ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں انٹرنیٹ کی مدد سے کال کر رہا تھا کیونکہ اس میں انڈیا کا کوئی نمبر آرہا ہو گا یا پرائیویٹ نمبر لکھا آتا ہے۔ میں نے اسے خبردار کیا۔

”وہ تمہاری بہن ہے لیکن اس کے معاملے میں، میں تم پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں یاد رکھنا

اسے ذرا بھی نقصان ہوا تو اس کا حساب تمہیں دینا ہو گا۔“

”تم فکر مت کرو اسے کچھ نہیں ہو گا۔“ بڑے کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا اور کال کاٹ دی۔ بیٹو ایک چینی

نقوش والے شخص سے مذاکرات کر رہا تھا بعد میں وہ بتتی ثابت ہوا اور وہ چین کا سخت دشمن تھا کیونکہ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ چینی ہے تو اس کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا کہ اللہ نہ کرے میں چینی ہوں۔ اس کی ہندی واجب تھی اور انگریزی بھی بس کام چلاؤ تھی لیکن اس کے پاس ایک بہترین فورڈ ویل ڈرائیوئل کروزر تھی اور وہ ڈرائیور بھی ماہر تھا۔ میں نے اسے انٹرنیٹ پر نقشہ دکھایا اور کنور پیلس کی طرف مڑنے والی ذیلی سڑک کے مقام پر انگلی رکھی۔

”ہمیں اس جگہ پہنچنا ہے۔“

”میں پہنچا دوں گا۔“ اس نے یقین دلایا۔ ”چار ہزار روپے ہوں گے اور چار گھنٹہ لگیں گے۔“

وہ شہر میں تھا اور یہاں آنے والے سیاحوں کی کمی نہیں تھی جو منہ مانگے دام دینے کو تیار تھے اس لیے اس کے ریٹ بھی اسی مناسبت سے تھے ورنہ ہم اس سے چوتھائی رقم میں یہاں آئے تھے۔ بہر حال میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ البتہ واضح کر دیا کہ اسے ہمارے ساتھ رہنا ہو گا۔ اس نے بھی واضح کیا۔ ”اس رقم میں، نہیں

چوبیس گھنٹے تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔“

میں نے بحث نہیں کی۔ کیونکہ واپسی کی بعد میں دیکھی جاتی، چوبیس گھنٹے بہت تھے۔ ہم فوری روانہ ہو گئے۔ ڈرائیور کا نام آئی کن کھو ہونا تھا۔ مجھے اتنا ہی یاد ہے ورنہ نام اس کے بعد بھی جاری تھا۔ گاڑی کے انجن کے ساتھ اس کی زبان بھی چل پڑی تھی کیونکہ اسی وقت میں نے اس سے چینی ہونے کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے اس بہتان کی تردید میں خاصی لمبی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ چینی نہیں بنتی ہے۔ اس کا باپ صرف سولہ سال کی عمر میں تبت سے دلائی لاما کے ساتھ بھاگ آیا تھا۔ واضح رہے کہ دلائی لاما تبت پر چینی قبضے کے بعد سے انڈیا میں پناہ گزین تھا۔ وہ آج بھی مغرب کی مدد سے آزاد تبت کی مہم چلا رہا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مہم میں جان ختم ہو گئی تھی۔ اب یہ ایک گھسا پٹا کیس تھا جو مغرب کی طاقتوں نے اس وقت کے لیے سنبھال رکھا ہے کہ کبھی چین کمزور ہو اور وہ اس سے اپنی بات منوانے کے لیے اسے استعمال کریں مگر فی الحال چین میں کمزوری کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ آئی کن سخت متعصب تبتی تھا جس کا کہنا تھا کہ تبت صرف تبتیوں کا ہے۔ اس کا باپ آزادی کے لیے لڑنے والوں میں شامل تھا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں چین نے تبت پر اپنا قبضہ اس حد تک مستحکم کر لیا ہے کہ اب وہاں جتنے مقامی تبتی ہیں اس سے دس گنا زیادہ تعداد میں چینی باشندے ہیں۔

یہ قابضین کی خاصیت ہوتی ہے۔ وہ کسی زمین یا ملک پر قبضہ کرتے ہیں تو اسے مستحکم رکھنے کے لیے وہاں اپنے لوگ بساتے ہیں۔ یہ پالیسی سوویت یونین نے وسط ایشیا پر قبضے کے دوران اختیار کی تھی اور جب ان ریاستوں نے روسی غلامی کا جو آثار پھینکا تو بعض ملکوں میں چالیس فیصد آبادی روسیوں کی تھی۔ یہی پالیسی زیادہ سفاکی کے ساتھ گوروں نے امریکا اور آسٹریلیا میں اپنائی۔ جب انہوں نے بے بس اور لاچار مقامی آبادی کا بے دریغ قتل عام کیا اور انہیں ختم کر کے ان کی جگہ یورپ سے سفید فاموں کو لا کر ان ملکوں میں آباد کیا۔ اس سے پہلے اسٹینش یہی پالیسی جنوبی امریکا میں آزما چکے تھے۔ مگر چین ذرا مختلف پالیسی پر عمل کر رہا ہے وہ مقامی آبادی کو ختم کیے یا انہیں نقصان پہنچائے بغیر اپنے لوگوں کو آباد کر رہا ہے اس نے اسی حکمت عملی کے تحت منچوریا، ترکستان اور تبت میں مقامی آبادی کو اقلیت میں بدلا ہے لیکن ساتھ ہی وہ مقامی آبادی کو ترقی کے دھارے میں شامل کر رہا ہے اس کا ثبوت یہ ہے اب زیادہ ترقیاتی کام مشرقی چین میں ہو رہے ہیں۔ تاکہ ان علاقوں سے غربت اور پسماندگی کو دور کیا جاسکے۔ چینی یہاں دنیا کے جدید ترین ذرائع مواصلات اور سہولتیں لے آئے ہیں جیسے انہوں نے تبت کے دارالحکومت لہاسا تک ٹرین چلا دی ہے جو دنیا کے بلند ترین ٹرین ٹریک سے گزرتی ہے۔ یہاں دنیا کے بلند ترین علاقوں میں نت نئے شہر آباد ہو رہے ہیں شاہراہیں بن رہی ہیں اور صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ جن سے مقامی لوگوں کو بھی روزگار اور فنی تعلیم کے مواقع مل رہے ہیں۔ جب آئی کن کی تقریر ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”جب تمہارا باپ تبت سے آیا تو وہاں لوگ کن چیزوں پر سرفر کرتے تھے؟“

”جانوروں پر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لوگ گھوڑوں، یاکوں اور خچروں پر سرفر کرتے تھے۔“

”کیسے مکانات میں رہتے تھے کیا کھاتے پیتے تھے؟“

”ہم پتھروں اور مٹی کے بنے مکانوں میں رہتے تھے۔ ہماری خوراک گوشت، دودھ اور بعض سبزیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔“

مزید سوالات کے جواب میں اس نے بتایا کہ تبت میں صرف ایک درجن گاڑیاں تھیں اور وہ سب دلائی لاما کے محل میں تھیں وہ محل سے باہر نہیں چل سکتی تھیں کیونکہ پورے تبت کیا لہاسا کے شہر میں بھی کوئی سڑک ایسی نہیں تھی جس پر گاڑی چل سکتی۔ بجلی کے لیے محل میں ایک جنریٹر تھا باقی پورا تبت بجلی سے نا آشنا تھا۔ عام لوگ جلانے کے لیے جانوروں کا گوشت استعمال کرتے تھے اور اوپری طبقہ (جو سارا مختلف قسم کے لاماؤں اور ان کے ساتھیوں پر مشتمل تھا) باہر سے آنے والی مہنگی لکڑی اور کوئلہ استعمال کرتا تھا۔ پھر اس نے خود بتایا کہ آج تبتی جدید سہولتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں وہ حکومت کی طرف سے بنائے ہوئے گھروں میں رہتے ہیں۔ پورے تبت میں سڑکوں اور اپ ریل کا جال بچھ رہا ہے۔ نت نئے ایئر پورٹ تعمیر ہو رہے ہیں۔ تبتی اب دنیا جہان کی چیزیں کھاتے ہیں اور ہر کپڑے کا لباس پہنتے ہیں۔ بجلی کی سہولت ہر شہری کو میسر ہے اب تبت میں فصلیں کاشت ہونے لگی تھیں کیونکہ چین نے ہالیہ سے نکلنے والے دریاؤں پر ڈیمز بنا کر بجلی پیدا کرنے کے ساتھ اس کے پانی کو کاشت کاری کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ تبت کے غنجر پلینو پر جا بے جا جنگل لگائے جا رہے تھے تاکہ ماحول اچھا رہے۔ سڑکیں اور ریل کی مدد سے دنیا کی ہر چیز اب آسانی سے تبت میں آ رہی تھی۔ میں نے ملامت سے کہا۔

”اس کے باوجود تم لوگ چین کے خلاف مغربی دنیا کی زبان بول رہے ہو۔“

”چین نے ہمارے ملک پر قبضہ کیا ہے۔“

”لیکن چین نے تمہارے ملک کو بنا بھی دیا ہے۔ ساٹھ سال پہلے تم لوگ کیا تھے اور آج تم لوگ کیا ہو؟ کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ اگر چین تبت پر قبضہ نہ کرتا تو برٹش گورنمنٹ کا جاشین انڈیا اس پر قبضے کی تیاری مکمل کر چکا تھا مگر چین نے پہل کر کے اس کے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

”یہ سچ ہے لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں اس کے بارے میں دستاویزات موجود ہیں۔ یہ اصل میں برطانیہ کا منصوبہ تھا، اگر دوسری جنگ عظیم نہ ہوتی تو برطانیہ تبت پر بھی چڑھائی کر چکا ہوتا۔“

”اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا؟“

”فرق یہ پڑتا کہ جو حال آج برصغیر کا ہے وہی تبت کا بھی ہوتا۔ اگر یہ جہاں جاتا تھا سب سے پہلے وہاں

کے گھنٹیا ترین لوگوں کو چین کر اوپر لاتا تھا اور انہیں اچھے لوگوں پر مسلط کر دیتا تھا۔“

آئی کن خاموش ہو گیا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ متفق نہیں ہے۔ انڈیا اور مغربی میڈیا نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے۔ تبت کے لوگ چینی قبضے کے بعد وہاں سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئے اور یہ لوگ اب بھی اپنے رشتے داروں سے رابطے میں تھے۔ ان کے توسط سے چین کے خلاف خیالات تبت تک پہنچ رہے تھے اور وہاں بے چینی کا سبب بن رہے تھے تقریباً یہی صورت حال ترکستان میں رہنے والے ایغور نسل کے مسلمانوں میں تھی۔ وہ بھی چین سے مطمئن نہیں تھے اور وقفے وقفے سے وہاں فسادات ہوتے رہتے تھے جن کے

بارے میں چین کا اہرام تھا کہ ان میں شدت پسند مسلمانوں کے ساتھ مغربی استعمار کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ وہی پالیسی تھی جو سودیت یونین کے خلاف استعمال کی گئی تھی اور اب چین کے خلاف بروئے کار لائی جا رہی تھی لیکن چین نہایت ہوشیاری سے اس پالیسی سے نمٹ رہا تھا۔ وہ سختی کے ساتھ بہتر ذرائع زندگی اور تعلیم کی مدد سے مقامی آبادی کو کنٹرول کر رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم اپر شملہ سے نکل چکے تھے۔ موسم اچھا ہو گیا تھا اور اب کھڑکی سے آنے والے ہوا کے جھونکے خشکی لیے ہوئے تھے۔ میں فرنٹ سیٹ پر تھا اور بیٹو نے پچھلی سیٹ سنبالتے ہی اوگٹنا شروع کر دیا تھا اس نے خود کو سیٹ بیلٹ سے باندھ لیا تھا اور کچھ دیر میں وہ سوچکا تھا۔ میں نے ڈبل روٹی، مکھن اور پیڑ کی مدد سے ناشتہ کیا۔ ابلے ہوئے انڈے بعد کے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ میں نے بیٹو کو سونے دیا کیونکہ میں صبح ایک گھنٹے سو لیا تھا مگر وہ مسلسل جاگ رہا تھا۔ میں موبائل فون دیکھ رہا تھا۔ ایک قصبے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس پر سگنل نمودار ہوئے تو میں نے وہیں رک کر سویم کو کال کی۔ میں گاڑی رکوا کر نیچے اتر آیا تھا اور سڑک کے کنارے چھوٹی سی منڈیر پر ٹپک گیا۔ وسیم نے کال ریسپونڈ کی اور محتاط انداز میں بولا۔ ”ہیلو۔“

”میں بات کر رہا ہوں۔“

”آپ۔“ اس نے سکون کا طویل سانس لیا اور فوراً شکوہ کیا۔ ”کہاں تھے ہم سب کی جان سولی پر لٹکی

ہے۔“

”راستے میں ہیں تمہارے سرال جا رہے ہیں۔ میری بات ہوئی تھی۔ تمہاری بیگم شام میں کسی وقت پہنچ جائیں گی بھیا کے پاس اور ہاں ایک خبر اور ہے۔ چھوٹے بھیا بھی جانتے ہیں کہ بہنا کہاں ہیں۔“

”ان سالوں کی تو.....“ وسیم نے بے ساختہ گالی دی۔ ”کاش آپ نے مجھے نہ روکا ہوتا تو میں اب تک

آچکا ہوتا۔ میرے تعلقات ہیں۔“

”ان تعلقات کو ہماری واپسی کے لیے استعمال کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا تم

جانتے ہو آج کل موبائل محفوظ نہیں ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”سب کو بتا دینا میں بعد میں کال کروں گا۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل آف کر دیا۔ یہ بھی

احتیاطی تدبیر تھی۔ اگر موبائل ٹریس ہو جائے تو آف کرنے کی صورت میں اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا ہے لیکن

آن کرنے پر اس کا سراغ مل جاتا ہے۔ میں واپس گاڑی میں آیا۔ اتنی دیر میں آئی کن نے گاڑی کا پانی چیک کر

لیا تھا۔ اس گاڑی کا انجن اتنی جلدی گرم نہیں ہوتا تھا۔ ہم آگے روانہ ہوئے۔ تین گھنٹے بعد بیٹو خود اٹھ گیا اسے

بھوک لگی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر کھانے پینے کا سامان اس کے حوالے کر کے میں پیچھے آگیا اور سیٹ بیلٹ باندھ کر

آرام کرنے لگا۔ یہ آسان طریقہ تھا کیونکہ پہاڑی راستوں پر گاڑی اتنا گھوم رہی تھی کہ لیٹ کر آدمی بس کبھی

آگے اور کبھی پیچھے ہی پھسلتا رہنا آرام خاک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سیٹ بیلٹ پکڑ لیتی تھی اور آدمی سو جائے تو گرتا

بھی نہیں تھا چاہے جھٹکا کیسا ہی شدید کیوں نہ ہو۔ چند منٹ بعد مجھے نیند آگئی تھی۔ مگر آدھے گھنٹے بعد ہی آنکھ کھل

گئی۔ بیٹو ہلا رہا تھا۔

”شوہی ادھر مسئلہ ہو گیا ہے۔“

مسئلہ آنکھ کھلنے ہی نظر آ گیا تھا۔ سامنے ایک جگہ لینڈسلائیڈنگ ہوئی تھی اور اس کے پیچھے گاڑیوں کی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ آئی کن نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے لینڈسلائیڈنگ دیکھتے ہی لینڈکروزز کو گھما کر اس کا رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔ پھر وہ اتر کر صورت حال معلوم کرنے گیا۔ ”ہم نے مجھے آئی کن کے جانے کے بعد اٹھایا تھا۔ میں فکر مند ہو گیا۔“ یہ تو مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”یہ بھی غائب ہے آئے تو پوچھتا ہے اب کدھر سے جانا ہوگا۔“

اتفاق سے اس جگہ کے پاس ہی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا گاڑیاں رکھتے ہی وہاں سے عورتیں اور بچے ہر وہ چیز لے کر اوپر آ گئے تھے جو فروخت کی جاسکتی تھی۔ اس میں کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ ایک دس گیارہ سال کا لڑکا بڑی سی کیتلی لیے چائے بیچ رہا تھا۔ اس نے ایک اسٹینڈ پر چھ کپ لٹکا رکھے تھے اور اس کی ماں سڑک کے کنارے پانی لیے بیٹھی تھی۔ وہ استعمال شدہ کپ اسے دیتا اور وہ اسے دھلا ہوا دوسرا کپ پکڑا دیتی تھی۔ صبح سے چائے نہیں پتی تھی اور اس وقت نیند کی کمی کی وجہ سے شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ میں نے بچے کو آواز دے کر تین کپ دینے کو کہا۔ معیار کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی مگر حیرت انگیز طور پر چائے بہترین نکلی۔ اس میں دودھ اور چینی مناسب تھی جو زیادہ لیتے تھے بچہ ان کے لیے الگ سے چینی اور دودھ بھی رکھے ہوئے تھا۔ وہ ہوشیار بچہ تھا۔ جانتا تھا کہ شہری لوگ کیسی چائے پسند کرتے ہیں بلکہ اس کی ماں ہوشیار تھی۔ چائے اسی نے بنائی تھی۔ بچہ تو صرف بیچ رہا تھا۔ تیز گرم سنہری مشروب پیتے ہوئے ہونٹ جلتے تھے لیکن اس کا بھی اپنا الگ ہی مزہ تھا۔ آئی کن آیا تو چائے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

”صبح سے نہیں ملی سرگھوم رہا ہے۔“

میں نے بچے سے دوسرے کپ کی فرمائش کر دی، بیٹو نے بھی مانگی۔ میں نے آئی کن سے پوچھا۔ ”اس مصیبت سے کیسے نکلیں؟“

اس نے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”ادھر چار پانچ میل پیچھے ایک راستہ نکلتا ہے جو اوپر جا کر دوبارہ اسی سڑک پر آ جاتا ہے۔ اس میں دو گھنٹے کا وقت اور ملے گا۔“

”سلائیڈ کے بارے میں پتا کیا ہے یہ کب تک صاف ہو سکتی ہے؟“

آئی کن مسکرایا۔ ”صاف تو تب ہوگی جب صفائی کرنے والے آئیں گے۔ ابھی کوئی نہیں آیا ہے لوگ خود سے مٹی صاف کر رہے ہیں مگر یہ بلڈوزر کا کام ہے۔“

”تب واپس چلو اور اسی راستے کی طرف جو اوپر سے گھوم کر واپس سڑک پر آتا ہے۔“ میں نے فوری فیصلہ کیا۔

آئی کن نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”اس کا ہزار روپیہ اوپر ہوگا۔“

”لے لینا مگر ابھی تو چلو ایسا نہ ہو واپسی کا راستہ بھی بند ہو جائے۔“ میں نے گاڑیوں کے بڑھتے دباؤ کو دیکھ کر کہا۔ ہمارے پیچھے بھی کئی درجن گاڑیاں جمع ہو چکی تھیں اور اگر یہ وطن عزیز ہوتا تو اب تک سڑک بھی بند ہو چکی ہوتی لیکن ان لوگوں نے گاڑیاں ایک طرف رکھی تھیں واپسی کا راستہ برقرار تھا۔ ایک ایسے ہی موقع پر میں

نے شمالی علاقے کی ایک معروف سڑک پر میلوں لمبا ٹریفک جام دیکھا تھا جس میں واپسی کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ آئی کن نے چائے ختم کی تو ہم روانہ ہوئے اس دوران میں بیٹو نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ خریداری کر لی تھی اس نے بیٹھ کر بالوں سے ہٹایا کبیل لیا تھا۔ یہ زمین پر بچانے کے لیے بہترین چیز تھی۔ اس کے علاوہ اس نے شہد اور آٹے سے بنی ٹکیاں بھی لی تھیں۔ اس نے مجھے آگاہ کیا۔

”شوہنی بہت مزہ کا ہوتا ہے۔“

میں نے کچھ کر دیکھی واقعی ذائقہ اچھا تھا۔ یہ محفوظ خوراک تھی۔ ہم اسے بعد میں استعمال کر سکتے تھے۔ پندرہ منٹ بعد لینڈ کرورز بائیں طرف اوپر جانے والی ایک سڑک پر گھومی۔ درحقیقت یہ شملہ سے آنے کی صورت میں دائیں طرف پڑتی۔ سڑک پر آتے عام سڑک اور ہائی وے کا فرق سامنے آ گیا۔ یہ عام سے بھی گئی گزری سڑک تھی جو اصل میں پہاڑوں کے اوپر کے کچھ گاؤں دیہات کو ہائی وے سے ملاتی تھی۔ اس میں جا بھ جا کئی اور ناہمواری تھی۔ جب اچھلتی اور ساتھ ہی ہم بھی اچھلتے تھے۔ آغاز میں بیٹو اس درزش سے خوش تھا اسے مزہ آرہا تھا مگر جب یہ خود کار درزش مستقل جاری رہی تو وہ بیزار ہو گیا میں پہلے ہی بیزار بیٹھا تھا۔ بیٹو نے شکوہ کیا۔ ”شوہنی یہ کس مصیبت میں پڑ گیا ہے۔“

میں نے آئی کن کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ ”ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔“

میں نے بیٹو کو تسلی دی۔ ”بس ایک گھنٹہ برداشت کر لو پھر ہم اسی سڑک پر ہوں گے۔“

”ہمارا دل چاہ رہا ہے پیدل چلا جائے۔“

گچی بات ہے خود میرا بھی یہی دل چاہ رہا تھا ایک تو جھکے، اوپر سے رفتار اتنی تھی کہ میں اتار کر اس سے زیادہ تیز چل سکتا تھا۔ آئی کن نے تسلی دی۔ ”بس یہ ٹکڑا خراب ہے آگے اچھی سڑک ملے گی۔“

دس منٹ بعد اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور سڑک اس حد تک بہتر ہو گئی کہ اب ہم اچھل نہیں رہے تھے لیکن واہریت کے انداز میں ہل ضرور رہے تھے۔ اس ایکسر سائز نے بھوک جگا دی تھی مگر یہ کھانے کا وقت نہیں تھا۔ ہمیں پانی کا خیال نہیں رہا تھا مگر آئی کن کے پاس ایک بڑی بوتل تھی جس میں اس نے راستے میں آتے ہوئے ایک پہاڑی چشمے کا پانی بھر لیا تھا۔ ہم یہی نوش کر رہے تھے۔ ایک بجے ہم دوبارہ ہائی وے پر تھے اور یہاں سے کنورجس اب ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہاں پہنچ کر کسی ایسی جگہ مورچہ جمانا ہے جہاں سے بیک وقت آس پاس اور سڑک پر نظر رکھی جاسکے۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میرے پاس ورین بھی ہونی چاہیے تھی جس سے میں دور سے نظر رکھ سکتا تھا لیکن یہ خیال مجھے یہاں آ رہا تھا جہاں دور بین تو کیا کوئی عام چیز بھی ملنا مشکل تھی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں دکانیں اور چیزیں نایاب تھیں۔

پھر حال اب تو بھول کر ہو گئی تھی اور مجھے دور بین کے بغیر گزار کرنا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ آئی کن کو کہاں روکا جائے جب وہ بد وقت ضرورت فوری دستیاب ہو۔ اگر میں اسے ساتھ رکھتا اور مار دھاڑ ہوتی تو وہ بدک جاتا اور اس کے بعد سے کئی گن پوائنٹ پر رکھنا پڑتا تھا اور مجھے ایسی باتوں سے سخت کوفت ہوتی تھی جب مجھے کسی عام فرد کو اپنے ساتھ زبردستی رکھنا پڑتا تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ میری وجہ سے کسی غیر متعلقہ فرد کو تکلیف نہ ہو دوسری صورت میں مجھے خود خاصی کوشش اور خود پر جبر کرنا پڑتا تھا۔ سڑکاری کا معاملہ ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔ میں

چاہتا تھا کہ وہ تفتیش کے رگڑے میں نہ آئے۔ وہ میرے بارے میں تو پھوٹ دیتا ساتھ ہی وہ خود میرا ساتھ دینے پر مارا جاتا۔ بھارتی انجینیئروں سے کسی خیر کی توقع نہیں تھی یہ اپنے لوگوں کے حق میں کتنے سفاک ہوتے ہیں میں دیکھ چکا تھا۔ اس کا پورا امکان تھا کہ سنکاری ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا۔

مسئلے مسائل خاصے زیادہ تھے اور میرا ٹارگٹ سادی کو واپس لے کر جانا تھا۔ بلکہ پرائم ٹارگٹ سادی کو کنورٹیل میں جانے سے روکنا تھا۔ ایک بار وہاں چلی جاتی تو اسے نکالنا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ کنورٹیل میں رہ کر مجھے وہاں کی سکیورٹی کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔ اس جگہ کی سکیورٹی شاید ملک کے صدر یا وزیراعظم کی رہائش گاہ جتنی تھی۔ دیکھا جائے تو صرف دو افراد کے ساتھ یہ کام مشکل سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ مگر مجھے اللہ اور اپنے زور بازو پر بھروسہ تھا۔ آئی کن پورنی توجہ سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ بلاشبہ اچھا ڈرائیور تھا اور اس پہاڑی علاقے سے اچھی طرح واقف بھی تھا۔ کنورٹیل کے آس پاس کوئی ایسی آبادی یا جگہ نہیں تھی جہاں وہ رک سکتا۔ سڑک کے ساتھ رکے رہنا بھی مناسب نہیں تھا اور سڑک سے ہٹ کر گاڑی چھپانے کے لیے اسے قائل کرنا پڑتا اور میرے پاس اس کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اسے بھی وہی انجکشن دینا ہو گا جو راج کنور اور سنکاری کو دیا تھا۔

پون گھنٹے بعد ہم اس جانی پہچانی سڑک پر تھے جو کنورٹیل کی طرف جاتی تھی۔ سڑک ایک پہاڑ کے ساتھ گزرتی تھی جو اصل میں کنورٹیل کے سامنے تھا اور اس تک جانے کے لیے اس سڑک کو ایک پل کی مدد سے اس ڈھلان سے ملایا گیا تھا جس پر کنورٹیل آباد تھا۔ یہ اس ہموار ڈھلان والے پہاڑ کا نچلا حصہ تھا جہاں کنورٹیل تھا اور وہ جگہ خاصی اونچے پر تھی جہاں کنورٹیل سے شروع ہونے والی خفیہ سڑگ جا کر نکلتی تھی۔ میں نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے سڑک پل سے کنورٹیل سے ملتی تھی۔ یہاں بلندی سے میں بیک وقت کنورٹیل اور ہائی وے سے مڑنے والی گاڑیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اسی جگہ مورچہ لگا کر ہم سادی کو لانے والوں کو روک سکتے تھے۔ میں نے آئی کن سے کہا کہ وہ اسی سڑک پر آگے سفر جاری رکھے۔ کنورٹیل کی طرف جانے والے پل کے پاس سے گزرنے کے بعد یہ سڑک اچانک ہی خستہ حال اور عام سی ہو گئی تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی پہلے سڑک کنورٹیل تک جاری تھی اور اس کا معیار ہائی وے جیسا تھا۔ اس سڑک سے کئی کچے راستے دائیں بائیں نکل رہے تھے۔ مگر یہ خاصہ دور تھے۔ ہم واپس آئے اور میں نے ایک کچے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

”تم اس پر گاڑی لے جا سکتے ہو؟“

”کیوں لے جائے؟“ اس نے اعتراض کیا تو میں نے مہر اسانس لیا اور لیپ ٹاپ والا بیگ کھولنے ہوئے اسے گاڑی روکنے کا حکم دیا اس بار اس نے قہقہہ کی۔ میں نے سرخ میں انجکشن بھرنا شروع کیا تو اس نے اگلا سوال کیا۔ ”یہ کس کے لیے ہے تمہیں؟“

”نہیں..... بیمار تم ہو، تمہیں سوالات کرنے کی بیماری ہے..... بیٹو۔“

بیٹو نے اسے عقب سے ہاتھ ڈال کر گردن سے جکڑ لیا اور میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر سیدھا کیا اس کا جسم مزاحمت کے لیے سخت ہوا تو اس خود بخود ابھر کر سامنے آگئی۔ میں نے اس میں سوئی داخل کی اور ساری دوا اس کے جسم میں انجکٹ کر دی۔ چند منٹ بعد اس کا جسم خود بخود ہلکا پڑ گیا۔ بیٹو نے اسے چھوڑ دیا اور وہ آنکھیں جھپکاتے

لگا۔ میں نے دس منٹ پورے ہونے کا انتظار کیا اور پھر اس سے کہا۔ ”تم اب وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔“

”لیس سر۔“ اس نے سر ہلایا۔

”تم ایک تپتی بھگوڑے ہو۔“

”ہاں میں بھگوڑا ہوں۔“

”تم انڈین پٹھو ہو۔“

اس بار بھی اس نے اقرار کیا۔ میں نے کئی ایسی باتیں اس کی زبان سے کہلوائیں جو وہ نارمل حالت میں کسی صورت نہیں کہہ سکتا تھا۔ بیڑ بہت انجوائے کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”شوبی کمال کا دوا ہے ہم کو دینا والہں جا کر ہم بھی انجوائے کرے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”ایک سفیر بھائی کو لگائے گا پھر وہ ہمارا ہر بات مانے گا اور ایک مانی کو لگائے گا وہ ہم میں بے مانی کرتا ہے۔ ہم اسے بے مانی نہیں کرنے دے گا۔“

بیڑ نے اچھا استعمال سوچا تھا مگر یہ واپسی کے بعد کی بات تھی اور ممکن ہے مونا اور باقی خواتین بھی فرمائش کر دیتیں کہ انہیں بھی انجکشن فراہم کیے جائیں تاکہ شوہر کم سے کم چوبیس گھنٹے کے لیے ان کے فرمانبردار بن کر رہیں۔ فی الحال یہاں کے مسائل زیادہ اہم تھے۔ اس بار میں نے آئی کن کو لینڈ کرورز اس کپے راستے پر چڑھانے کا حکم دیا تو اس نے بلا چوں چرا حکم کی تعمیل کی تھی۔ راستہ گاڑیوں کے لیے نہیں تھا مگر اوپر تنگ ہونے سے پہلے ایک جگہ کسی قدر ہموار ہوا تھا اور یہاں گاڑی کو ہینڈ بریک لگا کر اور پھر اس کے پیہوں کے نیچے پتھر رکھ کر روک دیا گیا تھا۔ نیچے سے گزرنے والوں کی نظروں سے بچانے کے لیے جھاڑیاں کاٹ کر اس کے عقبی حصے پر پھیلا دی تھیں۔ ہم ان کاموں سے آدھے گھنٹے میں فارغ ہو گئے۔ میں نے آئی کن سے کہا کہ وہ گاڑی میں رکے اور ہوشیار رہے۔ میں اور بیڑ اسلحہ والا بیگ اٹھا کر روانہ ہو گئے۔ ہم نے سڑک پر آنے کی بجائے اوپر پہاڑ سے گزرنے کو ترجیح دی اور یہ آسان کام نہیں تھا۔

یہاں راستہ نہیں تھا پتھروں، درختوں کی ابھری جڑوں اور سرکتی مٹی پر پاؤں رکھ کر آگے جانا پڑ رہا تھا۔ ایک جگہ گول پتھروں کا ڈھیر تھا اور بیڑ نے اس پر پاؤں رکھا تھا کہ اسکیٹ کرتا ہوا نیچے جانے لگا۔ میں نے بروقت اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ یہ بیڑ کی لاپرواہی تھی ورنہ وہ خود پہاڑوں کا پلا ہوا تھا اسے معلوم تھا کہ یہاں کیسے سفر کیا جاتا ہے میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”دیکھ کر، ابھی ہم کسی چوٹ کے چکر میں نہیں پڑ سکتے۔“

”سوری شوبی اب دیکھ کر چلے گا۔“ اس نے ندامت سے کہا۔ ”جب ہم چھوٹا تھا تو اپنے بھائیوں کے ساتھ ایسا گول پتھر پر چڑھ کر پھسلتا تھا، پھر گرتا اور چوٹ لگتا تو گھر جا کر ماں سے مار کھاتا۔“

”اپنے گھر والے یاد آتے ہیں۔“

”پہلے کم آتا تھا شوبی آپ لوگ کے ساتھ رہ کر ہمارا دکھ کم ہوا تھا پر آج کل بہت یاد آتا ہے۔ سچ ہے ہم یہ جگہ دیکھنے کے واسطے بھی ادھر آیا ہے۔ ہم چھوٹا تھا تب ان پہاڑوں میں پھرتا تھا، ہمارا باپ جانور پالتا تھا وہ ہم کو چار سال کا عمر سے باہر لے جاتا ہم دو تین ہفتے باہر رہتا باپ کے ساتھ۔“

”بس تم دونوں ہوتے تھے؟“

”نہیں گاؤں کا بہت سارا لوگ ہوتا تھا۔ بہت سارا جانور لے کر چراتا تھا۔ سب سردی ختم ہوتی تو ہم یہاں نیچے آتا تھا پر جب کنوروں سے لڑائی ہوا تو ادھر آنا بند کر دیا اس کا آدمی ہمارا لوگ مارا یا جانور کے ساتھ اٹھا کر لے جاتا۔“

کنور پیلس میں تقریباً سارے ملازمین بیٹو کے قبیلے کے لوگ تھے جنہیں زبردستی اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ اکثر کوچپن میں اغوا کیا گیا تھا اور اب وہ کنوروں کے غلام بن گئے تھے۔ لڑکوں کو تربیت دے کر ملازم اور گارڈ بنایا جاتا تھا جب کہ عورتوں کو محل کے کاموں کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان میں جو خوب صورت ہوتیں وہ ان لوگوں کی ہوس کا نشانہ بھی بنتی تھیں۔

”یہ خاصا بڑا علاقہ ہے اور یہاں اچھی چراہ گاہ دکھائی دے رہی ہے۔ اس سے محروم ہونے کے بعد ہم لوگوں نے کیا کیا؟“

”ہم پھر دوسرے علاقوں میں جانے لگا مگر وہ بہت دور تھا اور اتنا اچھا بھی نہیں تھا۔ اس پر کنوروں نے ہماری لڑائی ہوئی۔“

”اصل لڑائی تو بیروں کی کان پر تھی۔“

”ہاں اصل لڑائی اسی پر تھا مگر ہم قبیلے کا عام لوگ سمجھتا تھا کہ کنور ہم کو موسیٰی چرانے نہیں دیتا ہے اس لیے لڑائی ہے۔“

”ہر جگہ حکمرانوں کا ایک ہی انداز ہے وہ پہلے اپنا مفاد دیکھتے ہیں اور پھر ملک و قوم کا۔“ میں تبصرہ کیا۔
 ”ان لوگوں کو کیا ملا؟“ بیٹو نے تجلی سے کہا۔ ”خود بھی مرا اور ہم کو بھی مروا دیا۔ کیا تھا جو کان کنوروں کو دے دیتا..... اب بھی تو ان کا قبضہ میں ہے۔“

”میں نے کہا نا حکمران ہر جگہ اپنے مفاد دیکھتے ہیں ان کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ساتھ اپنی قوم کا بھی بیزا غرق کر رہے ہیں۔“

”شوبی اگر ہم قبیلے کا سردار ہوتا تو ہم کبھی ایسا نہیں کرتا۔“

”تب تم سردار نہیں ہوتے کیونکہ ایک مخصوص طبقہ سردار ہی اسے بناتا ہے جو اس کے اشاروں پر چلے اور اس کے مفاد کے لیے کام کرے۔“

بیٹو نے حسرت سے کہا۔ ”شوبی ہم آپ جیسا شخص حکومت کیوں نہیں کر سکتا ہے۔“

”کیونکہ ہم اس مخصوص طبقے کے لیے کام نہیں کریں گے اور وہ ہمیں آنے نہیں دیں گے اور اگر آجائیں تو ہمارے خلاف سازشیں ہوں گی۔“ میں نے کہا۔ سفر کے دوران میں کنور پیلس پر نظر رکھے ہوئے تھا مجھے اس کے وسیع پورچ والی جگہ پر نظر رکھنی تھی لیکن وہ ذرا مغرب کی طرف تھا اور اسے دیکھنے کے لیے ہمیں ذرا آگے جانا تھا۔ یہ اچھا ہی تھا کیونکہ آگے جا کر ہی ہم بیک وقت سڑک اور پیلس پر نظر رکھ سکتے تھے۔ میں نے اسلحہ والا ایک اٹھا رکھا تھا جب کہ بیٹو کے شانے پر وہ بیک تھا جس میں پہلے اسلحہ تھا اور اب اس میں بیٹو کی شاہک بھری ہوئی تھی میرا خیال تھا اس نے کھانے پینے کا سامان لیا ہوگا۔ بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سڑک تقریباً سو فٹ نیچے تھی

اور یہاں سے نہ صرف پبلز کا بڑا حصہ بلکہ ذیلی سڑک بھی ہائی وے تک دکھائی دے رہی تھی۔

یہاں سڑک ایک کلومیٹر طویل تھی اور اگر کوئی گاڑی اس پر مڑتی تو اسے یہاں تک آنے میں کم سے کم چار پانچ منٹ لگ جاتے کیونکہ یہ سڑک تنگ تھی اور کئی مقامات پر گھوم رہی تھی۔ میں نے ایک جگہ منتخب کی۔ یہ چٹان تھی جو اوپر سے ہموار ہو گئی تھی۔ اس کی جڑ میں سامان رکھا جاسکتا تھا۔ اس کے یہاں سے لڑھکنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جب کہ چٹان سے نیچے کا نظارہ اچھی طرح کیا جاسکتا تھا سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں ڈھلان کم تھی اور اگر ہم نیچے جانا چاہتے تو دو منٹ میں پہنچ سکتے تھے۔ بیو نے اپنا بیگ رکھا تو میں نے پہلی بار اسے دلچسپی سے دیکھا۔ ”کیا بھر کر لائے ہو پر خوردار..... کیا کیا ہے اس میں؟“

”شوہی بہت سارا سامان ہے جو کام آئے گا۔“ اس نے جواب دیا اور چٹان پر چڑھ گیا۔ ”یہاں سے تو سب صاف نظر آرہا ہے۔“

میں بھی اس کے برابر میں آیا۔ ”تجھی اس جگہ کو منتخب کیا ہے۔“

اسی لمحے دو گاڑیاں ہائی سے سڑک پر مڑیں اور میں مضطرب ہو گیا۔ ”کاش کہ دور بین ہوتی تو نگرانی میں آسانی ہو جاتی۔“

”کاش کیوں بولتا ہے، ہے نا۔“ بیو نے ہنس کر کہا اور نیچے جھک کر بیگ اٹھا لیا اس نے اس میں سے دو عدد طاقتور دور بینیں نکالیں۔ ”یہ لوشوہی۔“

”شاباش۔“ میں نے بے اختیار اس کی پیٹھ تھپکی۔ ”تم نے آج واقعی کام دکھا دیا۔“

میں نے کہتے ہوئے دور بین آنکھوں سے لگائی۔ یہ واقعی بہت طاقتور دور بین تھی۔ مضطرب دم سمٹ کر آنکھوں میں آگیا اور تب میں نے دیکھا۔ اگلی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر راسن تھا اس کے ساتھ ڈرائیور کی وردی والا تھا اور گاڑی مرسیڈیز تھی۔ یہ کور پبلز کی گاڑی تھی کیونکہ اس پر پبلز کا مخصوص نشان تھا۔ اس سے پیچھے والی گاڑی پولیس کی تھی۔ راسن کے سر پر پٹی بندھی تھی لیکن وہ جس طرح بیٹھا تھا لگ رہا تھا اسے کوئی ایسی چوٹ نہیں لگی تھی کہ وہ لیٹ جاتا۔ میرا اندازہ درست تھا اس جیسی ڈھیٹ چیز اتنی آسانی سے دنیا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ مرسیڈیز میں صرف وہی اور ڈرائیور تھا جب کہ پیچھے آنے والی پولیس جیپ میں بھی دو افراد تھے ایک وردی کے نشانات سے انسپکٹر لگ رہا تھا دوسرا ڈرائیور تھا اور شاید کانسٹیبل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ راسن بچنے کے بعد کسی اسپتال تک پہنچا تھا اور وہاں سے اس نے کور پبلز رابطہ کیا تھا اسے لینے کے لیے گاڑی بھیجی گئی تھی اور پولیس شاید اسے بحفاظت پبلز تک چھوڑنے آرہی تھی۔ بیو بھی دور بین سے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ ”شوہی یہ ہم کو حیات لگتا ہے۔“

”وہی ہے لیکن اس کا اصل نام راسن ہے اور یہ راکا سابق ایجنٹ ہے۔ کئی بار مجھ سے ٹکراؤ ہوا لیکن ہر بار بچ گیا۔ آخری بار میں نے اسے ایک کھائی میں گرتے دیکھا تھا اور یہ اس سے بھی بچ کر نکل آیا۔“

”یہ آسانی سے مرنے والوں میں سے نہیں ہے۔“ بیو نے دانت نکالے۔ ”شوہی سوچ ہے اسے اڑانہ دے۔“

”نہیں ہم سادی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں کرنا جس سے اس کی واپسی مشکل ہو

ہائے۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ کہے۔“ بیو نے سعادت مندی سے کہا۔ وہ میرے ساتھ خوش تھا اور کسی قدر شوخ دور ہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے کچھ دیر پہلے اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ حالانکہ وہ میری ڈانٹ پٹ کا بھی برا نہیں مناتا تھا بلکہ فوراً سر تسلیم خم کر لیتا تھا۔ پھر وہ کبھی اپنی ذمہ داری سے غافل نہیں ہوتا تھا جیسے بھی اس نے دور بین لی اور مجھے خیال نہیں آیا۔ میں نے پوچھا۔

”تمہیں کیسے خیال آگیا دور بین کا؟“

”ہم ویم بھائی کے ساتھ رہا ہے۔ وہ ہم کو بتاتا رہا ہے کہ کس مشن کے لیے کیا کیا ہونا چاہیے۔ جب ہم نے سوچا تو ہمارے ذہن میں دور بین اور دوسرا چیزوں کا آیا تھا۔“

کیونکہ اس وقت ہم دور بین سے گاڑیوں کا جائزہ لے رہے تھے اس لیے مجھے دوسری چیزوں کا خیال نہیں آیا تھا۔ چند منٹ بعد گاڑیاں چھوٹا ہل کر اس کے کنور ہیلز کے مین گیٹ تک پہنچیں اور انہیں وہاں پوری تلاشی کے بعد اندر جانے دیا گیا تھا۔ گیٹ پر جدید ترین سکیورٹی تھی۔ وہاں یقیناً کیمرے اور ہتھیاروں کی نشان دہی کرنے والے آلات بھی لگے ہوں گے۔ گاڑیاں اندر داخل ہوئیں اور پورچ میں رکیں۔ راسن سرسبز سے اترا اسے نگڑاتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پاؤں شاید سخت بینڈیج سے سیدھا باندھ دیا گیا تھا اور وہ سے اٹھا کر چل رہا تھا۔ راسن اندر چلا گیا اس کے ساتھ انسپکٹر بھی تھا۔ البتہ کانسٹیبل اور سرسبز کا ڈرائیور باہر ہے تھے۔ ان کا اندر کوئی کام نہیں تھا۔ دور بین سے تقریباً چھ سات سو گز دور کا منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ۱۰ دس بارہ فٹ دور ہو۔ میں نے دور بین سے باقی ہیلز کا جائزہ لیا۔ مجھے اندر کے گاڑز پہلے سے زیادہ تعداد میں دکائی دیے تھے۔ اسی طرح وہاں روشنیوں کا اضافہ ہوا تھا۔ محل کے اندر بھی کئی حفاظتی دیواریں بنائی گئی تھیں ی طرح خاردار تاروں کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔ بڑے کنور نے اپنی اور ہیلز کی سکیورٹی میں اضافہ کر دیا تھا۔

بیو نے چٹان پر کھل بچھالیا تھا اور اب اس پر بیٹھنا آسان تھا۔ اس نے بیگ سے منرل واٹر کی ڈبڑھ ہرز والی بوتل نکالی۔ اندر ایسی ایک بوتل اور بھی تھی۔ میٹھی ٹکیوں والا شاہر بھی اسی میں تھا۔ میں نے کچھ نکلیاں کالیں اور کھانے لگا۔ ڈھائی بج رہے تھے اور سورج اب مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا۔ ہم خاصی بلندی پر تھے۔ کنور ہیلز تقریباً چھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ ہم اس سے بھی پانچ چھ سو فٹ اوپر تھے۔ ہوا ہلکی لیکن موسم گرم تھا کیونکہ آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ خاصی تیز تھی۔ آس پاس کی چٹانیں یقیناً گرم ہو رہی تھیں لیکن یہ چٹان سر پر ہم تھے آڑ میں تھی اس لیے یہ ششدری تھی۔ بیو نے کہا۔ ”آپ سو جاؤ ویسے بھی اتنا نہیں سویا ہم سولیا تھا۔“

”ٹھیک ہے لیکن تم ہوشیار رہنا۔“ میں نے لیٹتے ہوئے کہا۔

”آپ فکر نہ کرو۔“ بیو نے اطمینان دلایا۔

”مجھے ساڑھے چار بجے لازمی جگا دینا۔“ میں نے کہا۔

”ہم جگا دے گا۔“

میں لیٹا اور اعصابی کشیدگی کے باوجود چند منٹ میں سو گیا۔ اس کی وجہ حتمی اور بے آرامی تھی۔ گزشتہ صبح سے مسلسل حرکت میں تھا۔ اس دوران میں کئی سوئیل کا فضا کی اور زمینی سفر کیا تھا۔ دو ملکوں کی سرحد دو بار کر اس کی

تھی، ایک ہیلی کاپٹر کریش میں بچا اور ایک خونی معرکہ لڑا تھا اور پھر آرام کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے بہت گہری اور بے خبری کی نیند آئی۔ اس کی ایک وجہ بیٹو کی موجودگی بھی تھی اس کے ہوتے مجھے زیادہ فکر نہیں تھی اور میں گہری نیند سو گیا۔ دو گھنٹے بعد بیٹو نے مجھے بلایا۔ ”شوہی اٹھ جاؤ۔ ساڑھے چار بجتے والا ہے۔“

میں نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ ”کچھ ہوا تو نہیں؟“

”نہیں بس پولیس کا جیپ واپس چلا گیا۔ شوہی یہاں سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزرا ہے۔“

”شاید یہ سڑک کنوروں نے اپنے لیے مخصوص کی ہوئی ہے۔“

”تو شوہی اگر پتیس سے ہمارا گاڑی دیکھا ہو گا تو ان کو شک نہیں ہو گا؟“

بیٹو کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی اتنی دیر میں یہاں سے کوئی گاڑی نہیں گزری سوائے ان تین گاڑیوں کے اور اگر انہوں نے پتیس سے سڑک کی نگرانی کا کوئی بندوبست کر رکھا ہو تو لازمی ہماری لینڈ کرورز ان کی نظروں میں آئی ہوگی یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کسی بھی ٹیلی لینس کیمرے سے با آسانی یہ کام کیا جاسکتا تھا۔ وہ سڑک سے گزرنے والوں کی تصویر بھی بنا سکتا تھا۔ اس طرح کہ گزرنے والوں کو خبر بھی نہ ہو۔ میں نے جلدی سے دور بین نکالی اور اس کی مدد سے پتیس کے ان حصوں کا جائزہ لینے لگا جہاں کیمرہ لگایا جائے تو وہ باہر سڑک تک دکھائے لیکن ایسے تمام حصوں کا جائزہ لینے کے بعد بھی مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جسے کیمرہ قرار دیا جاسکے۔ میں نے دور بین رکھی اور بیٹو سے کہا۔ ”میرا نہیں خیال کہ انہوں نے سڑک سے گزرنے والوں کی نگرانی کا بندوبست بھی کر رکھا ہو گا۔ دوسری صورت میں اب تک پتیس کے گاڑیوں کو حرکت میں آ جانا چاہیے تھا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہا ہے بس ایسے ہی ہمارے ذہن میں خیال آ گیا۔“

”یہ سڑک زیادہ بڑی نہیں ہے اور آگے سے بند ہے اس لیے بھی کوئی گاڑی یہاں نہیں آتی ہے بس وہی آتی ہیں جنہوں نے کنور پتیس جانا ہو۔ کنور پتیس کی سکیورٹی بہت زیادہ ہے اس لیے انہوں نے سڑک کی نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی۔“

”شوہی اب کیا کرتا ہے؟“

”میری بڑے کنور سے بات ہوئی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سادی چھ بجے تک یہاں آئے گی۔“

”اس نے آپ کو بتا دیا؟“ بیٹو حیرت سے بولا۔

”ہاں کیونکہ اس کے خیال میں، ہمیں پاکستان میں ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”پہلی بار میں نے اسے پاکستان سے کال کی تھی اس لیے وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی قید سے آزاد ہو کر پاکستان چلا گیا ہوں۔ اب اتنی جلدی میں واپس بھی آ جاؤں گا یہ اس نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔“

”شوہی دشمن کے بارے میں ایسا مت سوچو وہ بھی سوچ سکتا ہے جو آپ سوچ سکتا ہے۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”منے تم تو بڑے سمجھدار ہو گئے ہو۔“

وہ ہنسا۔ ”آپ بھی ہم کو مٹا کہتا ہے سفیر بھائی کی طرح۔“

”دیکھا جائے تو تم ہم سب کے منے ہی ہو۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

”تب سفیر بھائی ہم سے لڑتا کیوں ہے؟“ بیٹو نے ٹھوہہ کیا۔

”وہ بس دل لگی کرتا ہے۔ تم یہیں رہو میں ذرا آئی کن کو دیکھ آؤں۔ ایسا نہ ہو جب اس کی ضرورت ہو تو وہ غائب ہو۔“

پانچ بجنے والے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ لینڈ کروزر سڑک پر آجائے تاکہ بوقت ضرورت ہم اس سے فوری استفادہ کر سکیں۔ میں اوپر سے ہوتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں جیپ موجود تھی اور آئی کن اس میں محو استراحت تھا میں نے اسے جگایا تو اس نے آنکھیں ملے ہوئے کہا۔ ”آپ..... مجھے نیند آگئی تھی۔“

”اچھی بات ہے اب رات کو ڈرائیونگ کرنا پڑے گی تو تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ تم جیپ نیچے لاؤ۔“ ہم نے پہلے جیپ کے ٹائروں تلے رکھے پتھر ہٹائے۔ پھر آئی کن نے انجن اشارت کیا اور آہستہ آہستہ بریک ریلیز کرتا ہوا لینڈ کروزر کو سڑک پر لے آیا۔ ایک خاص کیفیت میں ہونے کے باوجود اس کی ڈرائیونگ کی صلاحیت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں اس کے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔ ”چلو اور جہاں میں کہوں وہاں رک جانا۔“ اس نے سر ہلایا اور جیپ آگے بڑھادی۔ پونے چھ بجے میں نے جیپ ایک ایسی جگہ رکوائی جہاں سے کنورہیلز نظر آنے کا آغاز ہوتا تھا۔ میں نے آئی کن سے کہا۔ ”تم یہیں رکو گے اور جب پستول کے لگا تار تین فائر سنو کے تو تم آگے آؤ گے۔ کیا کہا ہے میں نے؟“

”میں پستول کے تین لگا تار فائر سنوں کا تو آگے آؤں گا۔“ اس نے بغیر کسی خوف یا جذبے کے اظہار کے کہا جب کہ وہ عام آدمی تھا اسے ڈر جانا چاہیے تھا مگر وہ اس کے زیر اثر وہ سب بھولا ہوا تھا۔

”گڈ بس اس بات کو یاد رکھنا۔“ میں نے کہا اور نیچے اتر آیا لیکن سڑک سے آگے بڑھنے کی بجائے میں ذرا اوپر چڑھا اور آگے بڑھنے لگا۔ اس طرح ہیلز سے کسی کی نظروں میں آنے کا امکان کم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی میں شمال کی طرف والی ڈھلان پر تھا اور سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ اوپر جنگل میں کسی قدر روشنی تھی لیکن جو جگہیں سائے میں تھیں وہاں تاریکی سی آگئی تھی، اس کے مقابلے میں کنورہیلز روشنی میں تھا اور وہاں سے کسی کا دیکھ لینا ممکن نہیں تھا۔ یہاں سے وہ چٹان زیادہ دور نہیں تھی مشکل سے دو سو گز کے فاصلے پر تھی جہاں بیڑا اور میں نے مورچہ لگا یا تھا۔ آئی کن جس جگہ رکھا تھا وہاں سڑک بوٹرن لے رہی تھی اس لیے ہیلز کی طرف سے جیپ کا دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا جب تک کوئی اس موڑ تک نہ آتا۔ ایکشن کا وقت آگیا تھا اس لیے خطرہ تو مول لینا تھا۔ میں اوپر چٹان تک آیا تو چھ بجنے میں دس منٹ تھے۔ میں نے بیڑا سے کہا۔ ”اسلحہ نکالو اور ہر گن لوڈ کرلو۔“

بیڑا اپنے کام میں لگ گیا اور میں نے موبائل نکالا۔ اس پر سگنل تھے۔ کنورہیلز کی وجہ سے اس علاقے میں موبائل میٹ ورک کو رنج تھی۔ میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا۔ کال ملنے ہی میں نے کہا۔ ”میں بات کر رہا ہوں۔ تم اپنے موبائل سے بڑے کو کال کرو اور اس سے سادی کا پوچھو۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ چھ بجے تک یہاں آجائے گی۔ کال ٹھیک چھ بجے کرنا۔“

”آپ کہاں ہیں؟“

”ایک محفوظ جگہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں چھ بج کر پانچ منٹ پر کال کروں گا۔“

کال کاٹ کر میں نے اسلحہ دیکھا۔ ہم نے بی ایس ایف کے لوگوں کا اسلحہ بھی سمیٹ لیا تھا۔ یہ جی ٹو رائفل تھی۔ اس جرمن ساختہ رائفل کے بے شمار ورژن نکلے تھے۔ ہماری فوج اس کا جی تھری ورژن استعمال کرتی

ہے۔ یہ آج بھی دنیا کی چند موثر ترین اسالٹ رائفلوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ہر گن کے ساتھ دو فاضل میگزین تھے۔ ان کے علاوہ دو عدد روسی ساختہ اے کے چوہتر رائفلیں بھی تھیں۔ ایک امریکی ساختہ ری پٹر تھا اور ایک عدد سیون ایم ایم رائفل تھی۔ چار عدد پستول اس کے علاوہ تھے میں نے بیٹو کی طرف دیکھا۔ ”ہم تو پورا اسلحہ خانہ لیے گھوم رہے ہیں۔“

”صرف اسلحہ خانہ نہیں ہے اور بھی ہے۔“ بیٹو نے کہا اور دوسرے بیگ سے ایک واکی ٹاکی سیٹ نکالا۔ اب ایسی چیزیں عام ملنے لگی ہیں اور ان کا شمار بچوں کے کھلونوں میں ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں ان کا رکھنا بھی جرم شمار ہوتا تھا اور ہمارے ملک میں تو ریڈیو بھی بغیر لائسنس کے غیر قانونی ہوتا تھا۔ یہ چائنا کے بچے لیکن اچھی کوالٹی کے واکی ٹاکی سیٹ تھے جن کی ریج تقریباً تین سو میٹر تک تھی اور کھلی فضا میں یہ ریج مزید بڑھ جاتی تھی۔ ان کا سائز ایک عام قسم کے موبائل سیٹ سے بڑا نہیں تھا اور یہ دو عدد پنل سیل سے کام کرتے تھے۔ بیٹو اضافی پنل سیل بھی لے آیا تھا اور یہ بہت اچھی قسم کے تھے۔ اس نے ایک واکی ٹاکی سیٹ مجھے دیا۔

”اب ہم دور درہ کر بھی بات کر سکے گا۔“

”ان کے علاوہ کیا ہے۔“

اس نے بیگ سے جدید ترین ایل ای ڈی ٹارچ لائٹس نکالیں یہ کئی سوڈ پر کام کرتی تھیں۔ یہ سرچ لائٹ بھی بن سکتی تھیں اور عام ٹارچ بھی۔ یہ بھی پنل سیل سے کام کرتی تھی۔ رات میں اشارے دینے والے لائٹس جو صرف مخصوص دائرے میں نظر آتی تھیں۔ رسیاں، چاقو، کلپس اور بکس تھے جو کوہ پیما کی میں بھی کام آتے ہیں۔ ٹارچ بالشت بھر لی تھی اور آرام سے جیب میں آسکتی تھی۔ بیٹو نے ایک اے کے چوہتر شانے پر ناگی اور ری پٹر لیا۔ ایک پستول اس نے کمر کی بیلٹ میں لگا لیا تھا اور دوسرا سامنے لگایا۔ پھر وہ نیچے اتر گیا۔ اس نے کوئی پچاس فٹ دور جا کر واکی ٹاکی پر زور سے کہا۔

”شوہی ہمارا آواز آتا ہے۔“

”بالکل آتا ہے واکی ٹاکی کے بغیر بھی آرہا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بھائی اس میں سرگوشی میں بات کی جاتی ہے۔“

”اچھا اب ہم آہستہ بات کرے گا۔“

بیٹو نے نیچے سڑک پر ایک جگہ مورچہ بجالایا تھا۔ یہ کنور پیلز کی طرف مڑنے والے حصے سے ذرا پہلے تھا۔ میں ہائی وے والے حصے کی طرف دیکھ رہا تھا اور وقفے وقفے سے گھڑی پر بھی نظر ڈال رہا تھا۔ چھ بج گئے تھے اور ابھی تک سڑک کی طرف سے کوئی گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ بڑے کنور نے چھ بجے کا کہا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کے آدمی ٹھیک چھ بجے ہی سادی کو لے کر آتے۔ ان کو تاخیر بھی ہو سکتی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں سادی کو پہلے ہی تو نہیں لے آیا گیا تھا اور بڑا کنور ہم سے جموٹ بول رہا تھا کہ وہ چھ بجے تک آئے گی۔ یہ خیال خاصا پریشان کن تھا کیونکہ اگر ایسا ہی تھا تو میری ساری پلاننگ ناکام ہو گئی تھی اور اب سادی کو کنور پیلز سے نکالنا ناممکن حد تک دشوار کام تھا۔ سوچنے کے دوران میں وقت بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ چھ بج کر پانچ منٹ پر میں نے بیٹو سے کہا۔ ”اب مجھے مخاطب مت کرنا میں عبد اللہ کو کال کرنے جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک شوبی ہم خیال رکھے گا۔“

میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا اور اس نے فوری کال ریسیو کی۔ ”میری اس سے بات ہوئی ہے۔“

”سادی سے.....؟“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”نہیں جناب بڑے کنور سے۔“ عبداللہ نے تردید کی۔ ”اس کا کہنا ہے کہ سادی کو لانے میں تاخیر ہو رہی

ہے مگر وہ آج کے دن ہی کنور پیلس پہنچ جائے گی۔“

”وہ دھوکا دے رہا ہے۔“

”کیا کہہ سکتے ہیں اور وہ کہہ رہا تھا کہ آپ تیار رہیں اسی طرح آپ کو بھی چوبیس گھنٹے میں اس کے پاس

پہنچایا جاسکتا ہے۔“

میں نے سامنے کنور پیلس کی طرف دیکھا۔ ”اسے نہیں معلوم کہ میں پہلے ہی یہاں موجود ہوں۔“

”جناب میرا مشورہ ہے ایک.....“

”کہو.....“

”جناب آپ کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں مت کریں گا۔ بہت سوچ سمجھ کر کنور کے مطالبات ماننے

کا فیصلہ کریں گا۔“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ سادی بڑے کنور کی بہن ہے اور وہ بہر حال اس پر ایک حد سے زیادہ سختی

نہیں کر سکتا۔ خاص طور سے اس حالت میں۔“

”پہلے ہم تصدیق کریں گے کہ سادی اس کے پاس پہنچ گئی ہے اور پھر سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔ فی

الحال ہمارے پاس ایک ہتا ہے کہ آپ وہاں نہیں ہیں اور آپ کو بڑے کنور تک پہنچنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔“

”لیکن سوال یہ ہے کہ وقت لے کر ہم کیا کریں گے؟“

”ہم سب مل کر سوچیں گے جناب۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”وسیم پوچھ رہا ہے کہ راج کنور آپ کے

ہاتھ سے تو نہیں لکھا ہے؟“

”نہیں تقریباً ہاتھ میں ہے۔“

”اس کا کہنا ہے راج کنور بہت اہم ہے وہی ہمیں کامیابی دلانے کا اس کا ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔“

”میں نے اسے ایک جگہ جمع کرادیا ہے۔ امید ہے وہ چوبیس گھنٹے سے پہلے وہاں سے نہیں نکل سکے گا اور

اگر میں کامیاب رہا تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہوگی لیکن خدا نا خواستہ میں ناکام رہا تو پھر میں اسے وہاں سے

حاصل کر لوں گا۔“

”بڑے کنور نے کوئی وقت نہیں دیا ہے اس نے کہا ہے کہ اس نے میرا نمبر نوٹ کر لیا ہے اور وہ سادی کے

آنے پر مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میں نے اس سے وسیم بن کر بات کی تھی۔“

”تم نے ٹھیک کیا..... وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا؟“

”ہاں میں نے کہا کہ اس سفر کے دوران آپ زخمی ہوئے ہیں اور آپ کی صحت ویسے بھی ٹھیک نہیں

ہے۔“ عبداللہ بتاتے ہوئے ہنسا۔ ”اس کا تشویش سے برا حال ہو گیا تھا۔“

”ہاں اس وقت میرے ماں باپ سے زیادہ اسے میری صحت کی فکر ہے۔ میں اس کے لیے قربانی کا بکرا جو ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اُدکے میں پھر کال کروں گا۔“

”اگر کوئی مسئلہ ہو تو میں آپ کو کال کروں؟“

”ہاں لیکن کوشش کرنا صرف انتہائی ایمر جنسی میں کال کرو۔“

میں نے کال کاٹ کر موبائل کو ڈا ہیریت پر کر لیا تاکہ عبد اللہ یا کوئی کال کرے تو کہیں کسی غلط موقع پر یہ بچ کر معاملہ نہ خراب کر دے۔ اس موبائل کی بیٹری بھی لائٹ لائف تھی ایک بار چارج ہونے کے بعد یہ اب تک چل رہی تھی اور اس کے آدھے سیل ابھی باقی تھے۔ کال کے دوران میں سڑک کی طرف بھی دیکھ رہا تھا اور اب تک کوئی گاڑی نہیں آئی تھی۔ بڑے کنور کے مطابق سادی کی آمد میں تاخیر ہو رہی تھی۔ رات ہو جاتی تو ہمارے لیے مشکل ہو سکتی تھی کہ تاریکی میں شکل کیسے نظر آتی اور آنے والی گاڑی میں سادی کے ہونے یا نہ ہونے کا کیسے پتا چلتا۔ ساڑھے چھ بجے کے بعد یہاں تاریکی چھاننا شروع ہو جاتی اور سات بجے تک باقاعدہ طور پر ماحول تاریک ہو جاتا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ واک کی ٹاکی سے بیٹو کی ہلکی سی آواز آئی۔

”شوہلی.....“

میں نے چونک کر بٹن دبایا۔ ”ہاں.....“

”آپ کا بات ہوا؟“

”ہاں ہوئی ہے وہ ابھی تک نہیں آئی ہے۔“ میں نے سادی کا نام لیے بغیر کہے۔ ”اب اس پر نام مت

لینا..... یہ عام فریکوئنسی پر کام کرتا ہے اور جس کے پاس ایف ایم ریڈیو ہو وہ ہماری بات سن سکتا ہے۔“

”اب نام نہیں لے گا۔“

”اس کا استعمال بھی کم سے کم کرو۔“ میں نے دوسرا مشورہ دیا۔ ”اوپر آؤ تم سے بات کرنی ہے۔“

بیٹو چند منٹ بعد میرے سامنے تھا۔ میں نے اسے عبد اللہ سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا اور پھر کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے اگر کسی گاڑی میں سادی کو لایا گیا تو ہم اسے کیسے روکیں کہ اس سے نقصان نہ ہو میرا اشارہ سادی کی طرف ہے؟“

”ہم گاڑی کو ناکارہ کر دے گا اور پھر سادی کے ساتھ آنے والوں کو اڑا دے گا۔“

میرے ذہن میں بھی یہی تھا مگر پلان کی بات اور ہوتی ہے اور جب اس پر عمل کیا جاتا ہے تو بات اور ہو جاتی ہے۔ امکان یہی تھا کہ سادی کو ایک گاڑی میں دو تین افراد کے ساتھ لایا جائے گا کیونکہ بڑے کنور کے خیال

میں، نہیں تو پاکستان جا چکا تھا اور سادی کے لیے زیادہ سکیورٹی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن ہم سادی کو چھڑانے

کی کوشش کریں گے تو یہ دو تین افراد بھی مسلح مزاحمت کریں گے۔ گولیاں چلیں گی اور اس میں نہیں کہا جاسکتا تھا

کہ کسے گولی لگے گی اور کون بچ نکلے گا؟ سادی گاڑی میں ہوگی۔ ہماری کارروائی سے اسے نقصان ہو یہ مجھے گوارہ

نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم فول پروف پلان بنائیں اور گاڑی کو اس طرح روکیں کہ رکنے والوں کو

شک نہ ہو۔ مجھے اچانک خیال آیا۔ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”جا کر آئی کن سے پوچھو کہ اس کے پاس کیلیں ہیں؟“

”اگر اس کے پاس کیل نہ ہو تو؟“ بیٹو نے متبادل حالت کا پوچھا۔

”جب تم اس کے ساتھ جا کر پیچھے والے قصبے سے کیلیں لے کر آؤ جن کے سرے چھپے ہوتے ہیں اور یہ مونے ریڈیل ٹائر بھی پتھر کر سکیں۔ قصبہ یہاں سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر ہے تم دونوں ایک گھنٹے میں آ سکتے ہو۔“

”آئی کن کہاں ہے؟“

میں نے جگہ بتائی جہاں آئی کن تھا بیٹو اپنا بڑا سلحہ چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ دو منٹ بعد مخالف سمت سے جیپ نمودار ہوئی اور تیزی سے ہائی وے کی طرف چلی گئی۔ عبد اللہ سے بات کر کے مجھے امید ہوئی تھی کہ بڑا کنورا اگر دھوکا نہیں دے رہا تھا تو سادی کی جلدی آمد کی امید نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے نگرانی جاری رکھی۔ ہو سکتا تھا کہ میرا اندازہ غلط نکلتا اور سادی جلدی آ جاتی۔ اس صورت میں ہمیں نے سوچ لیا کہ میں اکیلا کارروائی کروں گا اور گاڑی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ میرے پاس سائنلر لگا پستول تھا اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ ساڑھے چھ بجے تک نیچے سڑک سائے میں آگئی تھی اور جنگل والا حصہ تو خاصا تاریک ہو گیا تھا۔ کچھ دیر جاتی تو مکمل تاریکی چھا جاتی۔ میرے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہی مناسب موقع تھا۔ اگر تاریکی چھا جاتی تو گاڑی میں سادی کی موجودگی کا پتا چلانا اسی وقت ممکن تھا جب گاڑی کے اندر روشنی ہو۔ دوسری صورت میں مجھے ہر گاڑی روکنا پڑتی اور میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار غلط گاڑی روکنے پر جنگ چھڑ جاتی جس کے بعد مجھے یہاں سے نکلنا پڑتا۔

اسی ادھیڑ بن میں وقت سرک گیا اور سورج پہاڑوں کے پیچھے چلا گیا، اس کے چند منٹ بعد اتنی تیزی سے تاریکی چھائی کہ جہاں میں تھا وہاں چند گز کے بعد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب اوپر نکلے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے سامان سمینا اور اسے لے کر سنبھلتا ہوا نیچے اس جگہ آیا جہاں بیٹو نے مورچہ بنا رکھا تھا۔ اب ہمیں ایسی جگہ مورچہ بنانا تھا جہاں سے براہ راست ہائی وے سے آنے والی گاڑیوں پر نظر رکھ سکیں اور انہیں خاصا پہلے دیکھ لیں۔ یہ جگہ مجھے مناسب نہیں لگی تھی اس لیے میں ہائی وے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سڑک بھی تاریکی میں آگئی تھی اور دیکھ لیے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سڑک پر ہی سفر کیا اور بالآخر اس کے آخری حصے تک جا پہنچا۔ جہاں ہائی وے کے بعد تقریباً دو سو گز تک سڑک سیدھی تھی اور ہائی وے سے گاڑی مڑتے ہی نظر میں آ جاتی۔ میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ بیٹو پہلے آ جائے۔

میری دعا قبول ہوئی اور آئی کن کی گاڑی ساڑھے سات بجے واپس آئی اور جب وہ پاس پہنچی تو میں سڑک پر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گئے اور بیٹو نیچے اتر آیا۔ ”شوئی آپ یہاں کیوں آیا؟“

”جگہ رات میں بیکار ہے۔ اب ہمیں یہیں مورچہ لگانا ہوگا۔ تم کیلیں لائے؟“

”بالکل ویسا لگ گیا جیسا آپ نے بولا تھا۔“ اس نے ایک ڈبا نکالا اس میں پچیس پیسے کے سکے کے ابرچھپے سرے والی ڈبڑہ لٹائی کیلیں تھیں۔ سوائے غیر معمولی بڑے ٹائروں کے یہ ہر ٹائر کو پتھر کر سکتی تھیں۔ میں نے آئی کن سے کہا۔ ”تم واپس جاؤ اور ہائی وے پر دائیں طرف سڑک تقریباً سو گز کسی جگہ رک جاؤ۔“ میں نے اسے واکی ٹاکی سیٹ دیا۔ ”اسے آن رکھنا اور جب ہم کوئی بات کریں تو یہ بٹن دبا کر تم جواب دے سکتے ہو۔“

”میں سمجھ گیا۔“ اس نے واکی ٹاکی لیا اور جیب موڑ کر چلا گیا۔

”آپ نے ہائی وے پر کیوں بھیجا۔ وہ دور ہے اس کا ضرورت پڑا تو.....؟“

”پیس کے سامنے سے بار بار گزرتا ٹھیک نہیں تھا اور ابھی ہم یہاں کیلیں بچائیں گے ایسا نہ ہو کہ ہماری گاڑی ان کا شکار ہو جائے اس لیے اس کو ہائی وے پر رکھا ہے۔ دور نہیں ہے واک ٹاکی سے ہم اسے فوراً بلا سکتے ہیں۔“

بیٹو مطمئن ہو گیا۔ ”کیل کدھر بچانا ہے؟“

میں نے جگہ سوچ لی تھی یہ ہائی وے سے کوئی سو گز اندر تھی اگر یہاں سے گزرتے ہوئے گاڑی بچکر ہوتی تو وہ رکتے رکتے بھی اس جگہ آجاتی جہاں میں نے مورچہ لگانے کا سوچا تھا اور گاڑی کے رکتے ہی ہم دھاوا بول دیتے۔ میں اور بیٹو سڑک کے اس حصے میں آئے یہاں سڑک تقریباً بائیس یا چوبیس فٹ چوڑی تھی۔ میں اور بیٹو اس طرح کیلیں بچانے لگے کہ گاڑی کا دایاں ٹائر ان سے بچ کر نہ گزر سکے بائیں ٹائر کی طرف اس لیے نہیں بچائی کہ اس کے برست ہونے کی صورت میں گاڑی بائیں طرف کی کھائی میں اتر سکتی تھی اور یہ کھائی خاصی گہری تھی۔ ڈبے میں کوئی دو سو کیلیں تھیں اور یہ بیٹو کو قبضے کے ہارڈ ویئر کی دکان سے با آسانی مل گئی تھی۔ آنے والے میں پون گھنٹا لگا تھا اور بیٹو نے ایک کام بھی کیا تھا کہ اس نے قمراس لے کر وہاں ایک ہوٹل سے چائے بھر والی تھی۔ ساتھ ہی وہ پرائیوٹ اور آلوکی ترکاری بھی لے آیا تھا اس کا پیٹ بھر سکتا تھا۔

”اس وقت ہم یہ نہیں کھا سکتے ابھی چاق و چوبند رہنے کی ضرورت ہے۔“

”شوہی ہم رہ سکتا ہے۔“ اس نے یقین دلایا۔ ”آج ہمارا بھوک کھل گیا ہے۔“

کیلیں بچا کر ہم واپس آئے تو بیٹو کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ روک کر کھایا حالانکہ پرائیوٹ گرم اور ترکاری بہت لذیذ اور ہلکی سی چٹ پٹی تھی۔ دونوں چیزیں سروس کے تیل میں پکی ہوئی تھیں۔ ڈنر کے ہم نے چائے پی۔ بیٹو کاغذی کپ بھی لے آیا تھا۔ آٹھ بج رہے تھے اور تاریکی ہوتی ہی سردی میں اضافہ ہونے لگا تھا مگر یہ اضافہ ایسا نہیں تھا کہ ہم ٹھہرنے لگتے۔ بیٹو نے کہا۔ ”شوہی ہم گھاس جمع کرے یہ سردی سے بچاتا ہے۔“ ان پہاڑوں پر جا بے جا گھاس کے سوکھے پودے کھڑے تھے۔ یہ گھاس بارش میں اُگ آتی تھی اور جب چند دن بارش نہیں ہوتی تو پودے کھڑے کھڑے سوکھ جاتے تھے۔ بیٹو ان کی بات کر رہا تھا کہ انہیں جمع کر لے۔ یہ بہت گرم ہوتے ہیں اور ان کا بستر بنا لیا جائے تو یہ سردی سے محفوظ رکھتا ہے۔ میں نے منع کیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے ہمیں آرام نہیں کرنا ہے ہوشیار رہنا ہے۔ اس کے لیے یہ سردی اچھی ہے۔“

”ہم ہوشیار ہے۔ آپ کے آرام کا کہہ رہا ہے۔“

”نہیں یار واپس جا کر ایک ہی بار آرام کریں گے۔“ میں نے کہا اور اپنی رائفل چیک کرنے لگا۔ اس کا میگزین اور دوسرے پارٹس ٹھیک حالت میں تھے۔ پھر میں نے سالٹسٹر والا پستول کھول کر صاف کیا کیونکہ یہ ہالی میں بھیکا تھا۔ صفائی کے لیے اپنی شرٹ استعمال کی تھی۔ مجھے امید تھی کہ ضرورت کے وقت یہ ٹھیک کام کرے گا۔ بیٹو سڑک پر تھا، اچانک ہائی وے کی طرف سے روشنی لہرائی اور ہم چونکا ہو گئے۔ بیٹو ذرا گے جانے لگا تھا کہ میں اسے روک دیا۔ ”بیٹو واپس آؤ۔“

”شوہی اگر یہ کیل سے بچ گیا تو.....“ اس نے واپس آتے ہوئے کہا۔

ہائی وے سے مڑنے والی گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ چند سیکنڈ میں وہ اس جگہ پہنچی جہاں کیلیں بھی تھیں۔ اچانک ہی ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ گاڑی لہرائی اور پھر پہاڑ کی طرف آئی۔ رفتار کی وجہ سے ڈرائیور بریک نہیں لگا سکا تھا اور گاڑی ڈھلان پر چڑھی اور پھر الٹ گئی۔ اب وہ پہلو کے بل ڈھلان سے رگڑتی آگے آرہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم تک آگئی۔ ہم پیچھے ہوئے درنہ گھسنتی گاڑی کی زد میں آجاتے۔ یہ فورڈ ہیل ڈرائیو تھی۔ اس کا نچلا حصہ ہمارے سامنے تھا اور کیبن والا حصہ پیچھے تھا۔ جیسے ہی گاڑی رکی ہم اس کی طرف دوڑے۔ بیڑہ اور میں نے تاراج روشن کر لی تھیں۔ سامنے آتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص دکھائی دیا اور اس نے روشنی دیکھتے ہی ایک پستول سامنے کیا تھا میں نے بے اختیار اس پر گولی چلا دی۔ گولی ونڈا سکرین سے گزرتی ہوئی اس کے سینے میں اتر گئی اور وہ جھٹکالے کر سیٹ ہیٹ سے بندھے بندھے ہو گیا تھا۔ بیڑہ گھوم کر پیچھے والے حصے میں جمنا کر رہا تھا۔ مجھے سادی کی فکر تھی کہ گاڑی اس طرح اٹلنے سے اسے کوئی تکلیف نہ ہوئی ہو۔

بیڑہ بھی بے تابی سے اسے آواز دے رہا تھا۔ اچانک اندر سے ایک فائر ہوا اور بیڑہ گھوم کر گر گیا میرا دل رک گیا۔ مگر فوراً ہی بیڑہ ریٹنگتا ہوا میری طرف آیا۔ چھت سے آنے والی گولی بیڑہ کو لگی تھی مگر دائیں شانے میں۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”اندر کوئی ہے۔“

گولی چلانے والے نے چھت سے گولی ماری تھی جو سوراخ کرتی بیڑہ کے شانے میں اتر گئی تھی۔ بیڑہ نے زخم کس کرد بار کھا تھا تا کہ خون نہ بچے اور آفرین ہے، اس نے ذرا بھی آواز نہیں نکالی تھی۔ اگر وہ سادی کو آواز دینے کی غلطی نہ کرتا تو اندر موجود فرد کو چٹا نہ چٹا اپنے ساتھی کے مارے جانے کے بعد اس نے بے دھڑک فائر کیا تھا۔ اب ہم اس پر اس طرح اندھا دھند فائر نہیں کر سکتے تھے۔ بیڑہ نے سرگوشی میں کہا۔ ”سادی اندر ہے۔“

میں نے تاراج کی روشنی میں اس کا زخم دیکھا۔ گولی اندر ہی تھی اور خون بہت تیزی سے نہیں بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا رد مال اس کے زخم پر رکھا اور اپنی شرٹ کا دامن پھاڑ کر اس کی پٹی سی بنا کر بیڑہ کے زخم پر باندھ دی۔ بیڑہ کا ہاتھ اور جسم کا دایاں حصہ خون سے بھر گیا تھا۔ یقیناً اسے تکلیف ہو رہی تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ پٹی کے بعد اس نے اٹلے ہاتھ سے رائفل تھام لی۔ وہ رائٹ ہینڈر تھا اور اٹلے ہاتھ سے پستول کا استعمال بیکار تھا۔ ہاں رائفل استعمال کی جاسکتی تھی۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”اب کیا کرتا ہے؟“

میں نے سائیکس لگا پستول استعمال کیا اور اندر موجود فرد نے چھوٹے کیلی برک پستول استعمال کیا تھا اس لیے آواز کم تھی مگر کیا کہا جاسکتا تھا کہ فائر کی یہ آواز کنورجیس تک پہنچی ہو اور وہاں سے گارڈز آنے والے ہوں۔ اس سے پہلے ہمیں اپنا کام کرنا تھا۔ میں نے واکی ٹاک کی پر آئی کن سے رابطہ کیا۔ ”آئی کن میری آواز سن رہے ہو؟“

”ہاں صاحب سن رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم گاڑی ہائی وے سے اندر لے آؤ مگر پچاس گز کے بعد رک جانا اس سے آگے کیلیں بھی ہیں، سمجھ

مئے؟“

”سمجھ گیا صاحب۔“ اس نے کہا تو میں نے واکی ٹاکی جیب میں رکھ لیا۔ میں بہت ہلکی آواز میں بات کر رہا تھا اس لیے امکان تھا کہ آواز گاڑی میں موجود فریک نہیں جارہی ہوگی۔ اس دوران میں ایک ترکیب سمجھ میں آئی تھی۔

”گاڑی الٹی ہوگی۔“ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”تم پیچھے ہٹ جاؤ میں یہ کام کرتا ہوں۔“

”ہم ٹھیک ہے ایک ہاتھ سے کام کر سکتا ہے۔“ بیٹو نے کہا۔

بحث کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے بات مان لی۔ ”ٹھیک ہے تم فرنٹ سیٹ والی طرف آؤ میں پیچھے سے دھکا دیتا ہوں اور دھکا دیتے ہی فوراً ڈھلان پر درخت کی آڑ میں چلے جانا اور وہاں سے ٹارچ کی روشنی گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالنا ٹھیک ہے؟“

بیٹو نے سر ہلایا اور ہم گاڑی کے نچلے حصے کی طرف آئے یہ پہلے ہی کسی قدر تر چھا تھا کیونکہ گاڑی ڈھلان پر بھی چڑھ گئی تھی۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے پوری قوت سے گاڑی کو دھکا دیا۔ بیٹو نے بھی حسبِ توفیق مدد کی اور گاڑی چڑھا کر ایک دم چھت کے بل گر گئی۔ بیٹو والپس بھاگا اور میں کسی قدر عقیست میں ہو گیا۔ اندر موجود فرد نے گولیاں چلائی تھیں مگر ہم اس کے سامنے نہیں تھے۔ پھر بیٹو نے درخت کی آڑ میں ہونے ہوئے ٹارچ کی روشنی گاڑی کی عقبی سیٹ پر ڈالی اور ایک لہو لہان مردانہ چہرہ سامنے آیا۔ وہ باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ میری موجودگی محسوس کر کے اس نے ہتھیار والا ہاتھ آگے کیا تھا کہ میں نے اسے شوٹ کر دیا، گولی اس کے سر پر لگی اور وہ فوراً مر گیا۔ پھر میں تیزی سے دوسری طرف آیا اور ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔ ایک چادر پوش گول مول سا ہو کر پڑا تھا۔ مجھے وہ سادی لگی اور میں نے بے اختیار اس پر سے چادر ہٹائی۔ مجھے جھٹکا لگا تھا میرے سامنے راج کنو تھا وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس گاڑی میں راج کنو تھا تو پھر سادی کہاں تھی؟ اسی لمحے آسمان کی طرف سے ہیلی کاپٹر کا شور سنائی دیا میں نے پلٹ کر دیکھا ایک ہیلی کاپٹر کنور پیلس کے ہیلی پیڈ پر اتر رہا تھا۔



کنور پیلس کا ہیلی پیڈ کا حصہ بقیہ فوراً بنا ہوا تھا لیکن وہ حصہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ گاڑی میں بس یہ دو ہی لوگ تھے۔ تیسرا فرد راج کنور تھا۔ میں نے بیٹو کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ اسے دیکھو۔“

بیٹو نے اسے دیکھ لیا تھا اور میری طرح حیران تھا۔ راج کنور کو ہم اسپتال میں جمع کرا کے آئے تھے اور بیٹو زخمی تو تھا مگر یہاں تھا۔ میں نے بیٹو کو واکی ٹاکی دیا اور کہا۔ ”آئی کن کو بلاؤ اور اسے گاڑی میں منتقل کر کے میرا انتظار کرو۔“

”آپ کدھر جاتا۔“

”سوال مت کرو۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”وقت نہیں ہے جو کہا ہے وہ کرو۔“

میں پیلس کی طرف دوڑا میرے ذہن میں ایک اندیشہ سرسرا رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر ہیلی پیڈ کے اوپر پہنچ گیا تھا۔ میں اس طرف جا رہا تھا جہاں سے میں ہیلی کاپٹر کو پیلس میں اتارتے دیکھ سکوں۔ اس جگہ پہنچ کر میں ڈھلان پر اوپر چڑھنے لگا۔ ابھی تک پیلس کی طرف سے کسی کی آمد کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ میں پہاڑ کی ڈھلان پر

اوپر چڑھ رہا تھا اور مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا جب مجھے ہیلی پڈ نظر آنے لگا تو میں نے رک کر دور بین آنکھوں سے لگائی۔ سارا منظر یک دم سمٹ کر آنکھوں میں آ گیا۔ ایک شخص مخصوص بلا اٹھائے ہیلی کا پٹر کے پائلٹ کی رہنمائی کر رہا تھا اور وہ ہیلی کا پٹر نیچے لا رہا تھا۔ یہ کنورٹیلز کا ہیلی کا پٹر تھا اور مجھے یاد آیا میں نے پہلے اسے ہیلی پڈ پر نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس وقت توجہ نہیں دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کا پٹر نیچے اتر گیا۔ میں نے دور بین ہیلی کا پٹر پر مرکوز کر دی۔ نیچے اترتے ہی اس کا انجن بند ہو گیا تھا کیونکہ شور میں یک لخت کمی آئی تھی۔

مجھے آس پاس حرکت محسوس ہوئی تو میں نے دور بین گھمائی اور مجھے بڑا کنور دکھائی دیا۔ وہ چار محافظوں کے ساتھ تھا جنہوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ ہیلی کا پٹر کا اترنے والا دروازہ دوسری طرف تھا یہ سائیڈ میری نظروں سے اوجھل تھی لیکن ہیلی کا پٹر سے اترنے والا کوئی فرد میری نظروں میں آئے بغیر پیلز میں نہیں جاسکتا تھا۔ بڑے کنور کو خود ہیلی پڈ پر دیکھ کر میری رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی تھی۔ وہ کسی عام فرد کے لیے ہیلی پڈ تک نہیں آ سکتا تھا۔ اب ہیلی کا پٹر کے دوسری طرف حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دور بین مرکوز رکھی اور پھر میں نے ایک عورت کو ایک شخص کے ساتھ آگے بڑھتے دیکھا۔ میری ساری بینائی کھینچ کر آنکھوں میں آ گئی تھی۔ وہ چال ڈھال اور جسامت سے سادی لگ رہی تھی۔ اس نے لان کا سوٹ پہن رکھا تھا اور سردی سے بچاؤ کے لیے اسے ہلکی شال دی گئی تھی۔ وہ آگے آئی اور بڑے کنور کے سامنے رک گئی۔ بڑے کنور نے اسے دیکھ کر بازو پھیلائے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس کے سینے سے لگ جائے گی۔ کچھ بھی سہی وہ اس کا بڑا بھائی تھا مگر وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کی طرف سے کوئی رد عمل نہ پا کر بڑے کنور کے ہاتھ خود نیچے ہو گئے۔ وہ اچانک مڑا اور اندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ جاتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ہدایت دے گیا تھا کیونکہ ان میں سے دو اس کی طرف آئے اور اسے گھیرے میں لے لیا۔ اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا اور پیچھے مڑی تب میں نے سادی کا معصوم اور روتا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت سہی ہوئی اور پریشان لگ رہی تھی۔ بڑے کنور سے جو رویہ تھا، وہ عکاسی کر رہا تھا کہ اپنے بھائیوں کے لیے اس کے دل میں کوئی گنجائش تھی تو اسے یوں اغوا کرنے سے وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا مگر کہا ضرور ہوگا۔ وہ ان دونوں آدمیوں کے ساتھ اندر کی طرف روانہ ہو گئی اور میں بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ میری ساری کوشش اور جدوجہد رائیگاں گئی تھی۔ میرا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ بھارتی حدود میں آنے کے بعد سادی کو کنور پیلز تک لانے کا سب سے آسان اور تیز ترین طریقہ ہیلی کا پٹر ہے۔

سادی کے اندر جانے کے بعد میں نے دور بین سے پیلز کے سامنے والے حصے کا جائزہ لیا وہاں سب معمول کے مطابق تھا اس کا مطلب تھا کہ حادثے اور اس کے بعد ہونے والی فائرنگ کی آواز وہاں پہنچ نہیں پائی تھی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ اول اسی دوران میں ہیلی کا پٹر آ گیا تھا اور اس کے انجن کے شور میں فائرنگ کی آواز دب گئی تھی، دوسرے فائرنگ دو ہتھیاروں سے ہوئی تھی۔ میرے ہسٹول پر بالکل سر تھا اور مارے جانے والے کے پاس کم آواز والا ہتھیار تھا۔ پھر یہ جگہ پیلز سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اب یہاں کتنا بیکار تھا۔ راج کنور ہاتھ لگا تو تھا مگر وہ ہاتھ سے نکل بھی گیا تھا اور بیوقوفی نہ تھی۔ مجھے ان دونوں کو دیکھنا تھا۔ میں ابس گیا۔ حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی میں اب صرف لاشیں تھیں۔ بیٹو راج کنور کو لے کر جا چکا تھا۔ اس

نے مجھے دیکھ لیا اور دور سے لائٹ مار کر سٹغل دیا۔ میں نے مارچ سے جوابی سٹغل دیا اور سڑک پر پچھی کیلوں سے بچتا ہوا گاڑی تک پہنچا۔ بیٹو فرنٹ سیٹ پر تھا اور اس نے شانہ قہام رکھا تھا۔ راج کنور پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پچھلی نشست پر بیٹھتے ہی کہا۔ ”اب نکلو یہاں سے۔“

بیٹو نے پلٹ کر پوچھا۔ ”کیا ہوا شوہی، سادی.....؟“

میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”وہ پیلس پہنچ گئی ہے ہیلی کا پڑا سے ہی لے کر آیا تھا۔“

آئی کن نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ بیٹو نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہم بلا وجہ سڑک کا نگرانی کرتا رہا۔“

”ہاں ساری کوشش بیکار گئی۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”زخم کیسا ہے؟“

”شوہی درد ہو رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے کم تھا اب بڑھ رہا ہے۔“

”کہاں جانا ہے صاحب؟“ آئی کن نے ہائی وے پر گاڑی روک کر پوچھا۔

”بائیں طرف چلو۔“ میں نے کہا۔ ”جس قصبے سے کیلیں لی تھیں ہمیں وہیں جانا ہے۔“

وہاں بیٹو کو طبی امداد مل سکتی تھی۔ پہلے بھی ڈاکٹر شوکیہ گپتا نے رقم کے بدلے ہماری مدد کی تھی اور مجھے امید تھی کہ وہ اس بار بھی انکار نہیں کرے گا۔ آئی کن کو ہدایات دے کر میں راج کنور کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بالکل خاموش اور بے تاثر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس پر انجکشن کا اثر تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”راج کنور تمہیں اسپتال سے کس نے نکالا۔ تم بڑے کنور کے آدمیوں کے ہتھے کیسے چڑھے؟“

”وہاں راوالے آگئے تھے۔ انہوں نے سنکاری اور مجھے گرفتار کر لیا۔“ راج کنور نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے اسی کا خدشہ تھا۔ انٹیلی جنس والے بہت تیزی سے حرکت میں آتے تھے۔ انہوں نے آڈیسی کا طیارہ فریس کیا اور شملہ تک آئے اس کے بعد کیب تک رسائی حاصل کی جس نے ہمیں اسپتال پہنچایا تھا۔ وہاں پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس سے آگے ہم خود گئے تھے۔ اگر انجنی والوں نے اس بازار میں بھی پوچھ گچھ کی ہوگی تو عین ممکن ہے انہیں کوئی فرد مل جائے جس نے ہمیں آئی کن کے ساتھ جاتے دیکھا ہو گا۔ اگر ایسا ہوا تھا تو جلد یہاں بھی ہمیں بھارتیوں سے واسطہ پڑنے والا تھا۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔ ”اگر وہ راوالے تھے تو انہوں نے تمہیں کیسے چھوڑ دیا؟“

”میں نہیں جانتا وہ مجھ سے اور سنکاری سے سوالات کرتے رہے لیکن ہم نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ پھر وہ سنکاری کو لے گئے اور دو گھنٹے بعد یہ لوگ مجھے وہاں سے لے آئے۔“

”کون لوگ؟“

”جنہیں تم نے مار دیا۔“

”تمہیں معلوم تھا کہ وہ بڑے کنور کے آدمی ہیں؟“

”اس وقت نہیں معلوم تھا لیکن جب وہ پیلس کے پاس پہنچے تو مجھے اندازہ ہو گیا۔“

راج کنور کے جسم پر اسپتال کا لباس تھا اور اس کے پاؤں سے پلاسٹر اتار کر ایک جدید قسم کی مینڈج چڑھا دی گئی تھی۔ یہ پاؤں کو پلاسٹر کی طرح پکڑ لیتی تھی مگر اسے اتارنا بھی جاسکتا تھا۔ چند گھنٹے اسپتال میں گزار کر اس کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ رانے اسے اتنی آسانی سے کیسے بڑے کنور کے سپرد کر دیا تھا جب

کہ وہ انہیں ایک اہم ترین کیس میں درکار تھا۔ وہ ملزم نہیں تھا مگر بھارت کے ملزموں کے ساتھ ضرور تھا۔ اس نے سرحد پار کرنے کا کوڈ اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور پاکستان کی طرف سے شوٹ کیے جانے والے ہیلی کاپٹر میں وہ بھی موجود تھا۔ پھر اس نے میری ہدایت کے مطابق سوالوں کے جواب دینے سے بھی انکار کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی رہائی کے پس پشت بڑے کنور کا دباؤ اور ضمانت ہو۔ اس نے ضمانت دی ہوگی کہ جب راکو تفتیش کی ضرورت ہوگی تو راج کنور تک رسائی دی جائے گی۔ اسپتال والے اور را کے افسران بھی اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ راج کنور اور اسکا ریکری دوا کے زیر اثر تھے۔ راج کنور فی الحال آزاد تھا مگر سنکاری ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور جلد یا بدیر وہ سب اگل دیتا اور اس کے بعد وسیع پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جاتی۔ گویا میرے پاس وقت کم تھا۔

”راوا لے کب اسپتال پہنچے تھے؟“

”میرا خیال ہے دو بجے کا وقت تھا۔“ راج کنور نے سوچ کر کہا۔ ”مجھے صحیح سے یاد نہیں ہے، میں سو رہا تھا جب انہوں نے مجھے اٹھایا، اس کے کچھ دیر بعد میں نے گھڑی دیکھی تھی اس میں سوا دو بج رہے تھے۔“

میں نے اسے اور سنکاری کو زیادہ تر سونے کی ہدایت کی تھی۔ وہ اس پر عمل کرتے رہے تھے۔ راج کنور بدستور دوا کے زیر اثر تھا۔ مگر میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا۔ اس سے پہلے بھی میں دھوکا کھا چکا تھا جب میں فاضلی کو دوا کے زیر اثر سمجھ رہا تھا اور دوانے اس پر اثر نہیں کیا تھا۔ عین ممکن تھا راج کنور جو کہانی بنا رہا ہو وہ اس کی اپنی بنائی ہوئی ہو۔ اس کی کہانی میں واحد مشکوک بات را کا اسے اتنی آسانی سے جانے کی اجازت دینا تھا۔ اگرچہ اس کی وجوہات تھیں مگر یہ میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھیں۔ آئی کن میری ہدایات پر ہر ممکن تیزی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔ ”کنور پیلس سے باہر جانے کا کوئی اور خفیہ راستہ ہے، اس کے علاوہ جہاں سے ہم باہر نکلے تھے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہی ایک راستہ ہے اور اب وہ بھی بند ہو گیا ہوگا کیونکہ اب وہ خفیہ نہیں رہا تھا اسے ڈائنات سے اڑا دیا ہوگا اور محل میں داخل ہونے والے راستے کو کنکریٹ ڈال کر بند کر دیا ہوگا۔ یہ طے شدہ فیصلہ تھا کہ سرنگ کا راز فاش ہوتے ہی اسے تباہ کر دینا ہے۔“

یہ بات بھی مجھے ہضم نہیں ہوئی تھی۔ متبادل راستہ تیار کیے بغیر وہ اس سرنگ کو تباہ نہیں کر سکتے تھے ہاں اس کی نگرانی کی جاسکتی تھی۔ مگر راج کنور کہہ رہا تھا کہ سرنگ کو تباہ کیا جا چکا ہوگا۔ شاید اس لیے کہ میں اس سرنگ کے راستے کنور پیلس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ راج کنور بالکل معمول بنا ہوا تھا۔ وہ نہ تو خود سے کوئی حرکت کر رہا تھا اور نہ بات کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سریٹ سے نکالیا اور آنکھیں بند کر لیں جیسے سو رہا ہو۔ اس کی ٹانگ پر جو جدید بینڈج لگائی تھی یہ گھٹنے کے پاس سے مز بھی سکتی تھی اس لیے وہ آرام سے بیٹھا ہوا تھا اور نہ پہلے اس کے لیے سیٹ پر بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے دوسرے زخم تقریباً بھر گئے تھے یا اب تکلیف دہ نہیں رہے تھے۔ خاص طور سے چہرے والے زخموں کے بس نشانات باقی رہ گئے تھے۔ میں نے راج کنور کو ہلایا۔

”انٹواب مت سونا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سیدھا حاکو کر بیٹھ گیا۔ ”اب نہیں سوؤں گا۔“

”راج کنور تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں؟“

”دہلی میں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کیا راج کنور اور راسن جانتے ہیں کہ تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”جانتے ہیں۔“

”جب تمہیں خطرہ نہیں ہے کہ وہ ان کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں۔“

”وہاں میرا سسرال ہے۔ وہ طاقتور لوگ ہیں، میرے بیوی بچوں کی حفاظت کر سکتے ہیں اس لیے میں

ان کی طرف سے بے فکر ہوں۔“

اسی لیے راج کنور اپنے بیوی بچوں کی طرف سے مطمئن تھا۔ ”راج بڑے کنور کی کمزوری کیا ہے؟“

”اس کی صحت۔“ راج کنور نے جواب دیا۔ ”اپنی صحت کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔ وہ

تمہارے خون کا پیا سا ہے لیکن صرف اپنی صحت کی وجہ سے تمہارے آگے جھکتا رہا ہے۔ مگر جیسے ہی اس کا مطلب

نکلے گا وہ تمہیں عبرتاک موت مارے گا۔“

”مجھے بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔“ میں نے آگے دیکھا جہاں قصبے کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ

راستے میں آنے والا پہلا بڑا قصبہ تھا۔ میں نے آئی کن سے تصدیق چاہی۔ ”کیا ہم پہنچ گئے ہیں؟“

”جی صاحب۔“

”شوہن ہم کدھر جاتا ہے۔“ بیو نے اتنی دیر میں پہلی بار زبان کھولی۔ اس کے لہجے سے تکلیف جھلک رہی

تھی۔

”یہاں ایک ڈاکٹر ہے جو پیسے لے کر کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور آئی کن کو سمجھانے لگا کہ

اس نے کس راستے سے گاڑی اوپر کی طرف موڑنی تھی اور یہ چڑھائی صرف فورڈ ہیل چڑھ سکتی تھی۔ اس نے سر ہلایا

کر بتایا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ اسلحہ اور دوسرا سامان گاڑی کے پچھلے حصے میں تھا۔ بیو ڈنچی ہونے کے باوجود سب

سامان بھی ساتھ لے آیا تھا۔ رات ہونے کے ساتھ سردی شدید ہوتی جا رہی تھی اور اب ہمارے ہلکے سوتی

کپڑے اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے اس کا اندازہ مجھے ڈاکٹر گپتا کے کلینک کے سامنے اترنے کے بعد ہوا۔

بند گاڑی میں اتنا ہوتا نہیں چل رہا تھا۔ میں نے بیو سے کہا۔ ”تم یہاں رکو اور ہوشیار رہو۔“

”ہم ہوشیار ہے شوہن۔“

میں نے کلینک کے اوپر زینے کے ساتھ گلی کا لٹیل بجائی تو اوپر سے ڈاکٹر گپتا کی آواز آئی۔ ”کون

ہے؟“

”ایک پرائیوٹ۔“ میں نے کہا۔ ”نیچے آؤ۔“

ڈاکٹر گپتا اپنے آبائی علاقے سے دور اس پہاڑی قصبے میں یقیناً کمانے کے لیے بیٹھا ہوا تھا اس لیے

پوسٹ کا سنتے ہی ایک منٹ میں نیچے آ گیا۔ اس نے کوٹ کے بجائے صدری پہن رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔

”تم وہی ہے.....؟“

”ہاں میں وہی ہوں لیکن اس بار میرے ساتھ کچھ دوسرے لوگ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم کیا پھٹ لاتا ہے۔“ اس نے شک سے کہا۔

میں نے جواب دیا۔ ”اگر تم کو اعتراض ہے تو میں کسی اور ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔“

”اپن کا یہ مطلب نہیں ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا اسے یاد تھا کہ میں نے اس کی منہ مانگی فیس دی

تھی۔ ”پھٹ کدھر ہے؟“

”گاڑی میں..... تم کلینک کھولو۔“ میں نے کہا۔ وہ کلینک پر لگا تالا کھولنے لگا اور میں گاڑی کی طرف آیا۔

پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے راج کنور سے کہا۔ ”نیچے اترو۔“

اس بار بھی اس نے بلاچوں چر امیرے حکم کی تعمیل کی اور باہر نکل کر گاڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ میں

نے بیٹو سے کہا۔ ”آئی کن کے ساتھ اندر آؤ اس سے کہنا گاڑی لاک کر دے۔“

میں سہارا دے کر راج کنور کو اندر لے گیا۔ بیٹو خود اندر آیا تھا۔ ڈاکٹر گیتا راج کنور کو مریض سمجھا اور اسے

اندر والے کمرے میں لے جانے کا اشارہ کیا لیکن اسے میں نے وہیں بیٹھ کر بٹھا دیا۔ ”پھٹ آ رہا ہے اسے گولی

لگی ہے۔“

وہ پھر چونکا۔ ”ایک اور بلٹ پھٹ..... باپا یہ تم ہر روز کہاں سے لاتا ہے۔“

”پھر سوال۔“ میں نے ڈانٹا۔ ”تم پیسے کن بات کے لیتے ہو، علاج کرنے کے یا سوال کرنے کے؟“

وہ گڑبڑا گیا۔ ”ناراج کاٹے کو ہوتا ہے۔“

بیٹو آئی کن کے ساتھ اندر آیا اس کی لبو میں بھیگی شرٹ بتا رہی تھی کہ بلٹ پھٹ دی ہے۔ ڈاکٹر گیتا

اسے اندر لے گیا اور آئی کن راج کنور کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ دونوں ایک سے انداز میں آنکھیں جھپکا رہے تھے۔

میں نے ان سے کہا۔ ”تم دونوں یہیں بیٹھو اور میرے آنے تک اپنی جگہ سے ہلنا مت نہ کسی سے بات کرنا۔“

انہوں نے سر ہلائے تو میں کلینک سے باہر آیا دروازہ بند کر کے میں نے جھری سے اندر جھانکا۔ یہ جھری

میں نے تاڑ لی تھی۔ اس سے اندر کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ دونوں بیچ پر ساکت بیٹھے ہوئے۔ میں کوئی پانچ

منٹ باہر رہا اور وہ بیٹھے رہے۔ سردی نے مزاج پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ جب خاصی دیر راج کنور نے کوئی

مٹھوک حرکت نہیں کی تو میں اندر آیا اور آئی کن سے گاڑی کی چابی لے کر اپنا کپڑے والا بیگ اندر لے آیا۔ ایک

طرف اسکرین رکھی تھی اس کے پیچھے جا کر میں نے گرم لباس اور ہلکی جیکٹ پہنی تو ذرا سکون ملا تھا۔ راج کنور نے

ہاسٹل والا ہلکا سوٹ پہن رکھا تھا اور اسے سردی لگ رہی تھی البتہ آئی کن نے جیکٹ پہن لی تھی۔ میں نے ڈاکٹر

گیتا کے آپریشن روم میں جھانکا تو وہ بیٹو کا زخم صاف کر کے گولی نکالنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بیٹو کی شرٹ اتار دی

تھی اور اب وہ صرف پتلون میں تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”یہ کام کر کے کچھ کھانے پینے کا انتظام بھی کر دینا۔“

”ابھی بولتا ہے۔“ اس نے کہا اور دفتر میں آکر انٹر کام پر مرٹھی زبان میں اوپر کچھ ہدایات دیں اور واپس

آپریشن روم میں چلا گیا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔ اس نے بانو یا شیاام کے بارے میں کچھ نہیں

پوچھا تھا۔ وہ ان کی فیس وصول کر چکا تھا اس لیے ان میں دلچسپی بھی نہیں رہی تھی۔ یہ بات میں نے بھارت میں

شدت سے محسوس کی تھی یہاں رکھی علیک سلیک کا رواج نہیں تھا۔ لوگ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ اگر پیشہ ور

امور میں کسی سے دس بار بھی ملاقات ہو تو اسے پیشے کی حد تک محدود رکھتے تھے، اسے ذاتی سطح پر نہیں لاتے تھے۔

ڈاکٹر گیتا نے دس منٹ میں بیٹے کے زخم سے گولی نکال کر اس کی مرہم پٹی کر دی اور پھر اسے یکے بعد دیگرے کئی انجکشن دیئے۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”فکر کا بات نہیں ہے گولی سامنے تھا زیادہ نقصان نہیں کیا۔ احتیاط کرے گا تو تین دن میں زخم ٹھیک ہو جائے گا اور ایک ویک بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے پہلے کی طرح اسے دو ہزار دیئے جو اس نے خاموشی سے رکھ لیے۔ کچھ دیر میں اوپر سے کھانا آگیا۔ حسب معمول یہ پوریوں، ترکاری اور اچار پر مشتمل تھا۔ لیکن لذیذ اور چٹ پٹا تھا۔ بیٹے نے بھی شوق سے کھایا حالانکہ کچھ گھٹنے پہلے وہ ڈٹ کر پراٹھا اور بھاجی کھا چکا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا اس لیے اب ٹھیک سے کھایا۔ کھانے کے بعد سب کے لیے چائے آئی اور بیٹے کو دودھ میں گائے کا گھی کا ڈال کر دیا گیا جو اس نے بڑی مشکل سے اور منہ ہٹا کر پیا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ اس کی ماں اسے مار مارا اس طرح دودھ میں گھی ڈال کر پلاتی تھی کہ اس سے جسم اور ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں۔ میں نے سر ہلایا۔

”ہڈیاں تو مضبوط ہیں تمہاری اور یہ اسی دودھ گھی کی وجہ سے ہے۔“

کیونکہ ڈاکٹر گیتا نے مزید رقم کا مطالبہ نہیں کیا تھا اس کا مطلب تھا کہ کھانا پینا بھی اسی رقم میں شامل تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب یہاں سے کہاں جائیں۔ اس قصبے میں کئی ہوٹل تھے لیکن ہم کسی ہوٹل میں نہیں رک سکتے تھے سوائے آئی کن کے اور کسی کے پاس کاغذات نہیں تھے۔ ہوٹل والے مٹھوک ہو جاتے تو پولیس کو بتا سکتے تھے اور اگر نہ بھی بتاتے تو ہماری تلاش شروع ہوتے ہی سب سے پہلے ہوٹلوں میں تلاش کی جاتی۔ اس وقت کسی ہوٹل کا رخ کرنے کا مطلب خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا بھی ہو سکتا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے ڈاکٹر گیتا سے پوچھا۔

”ڈاکٹر ہمیں رات کو کہیں رکتا ہے یہاں کوئی گھر ہے جہاں ہمیں ایک آرام دہ کمر مل جائے۔“

”ادھر کئی ہوٹل ہے۔“

”ہم ہوٹل میں ٹھہرنا نہیں چاہ رہے۔“ میں نے انکار کیا۔ ”ہم ادا لنگی کریں گے اگر کھانا پینا دیا تو اس کے پیسے بھی دیں گے۔“

ڈاکٹر گیتا نے سر ہلایا وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”ٹھیک ہے ادھر میرا سٹر ہے، بیوہ ہے،

بچہ ہے اور اسے پیسے کا ضرورت رہتا ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہے۔“

میں خوش ہو گیا۔ ”ہم سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں ہوٹل سے زیادہ ہی کرایہ دوں گا۔“

اس نے فون اٹھایا اور نمبر ملا کر مراٹھی میں جی جی کرنے لگا کہ ہم اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ لڑ رہا ہو یا

شدید قسم کی بحث کر رہا ہو لیکن اس جی جی کا نتیجہ مثبت نکلا تھا۔ فون رکھ کر اس نے کہا۔ ”میرا سٹر مان گیا ہے۔ پر

وہ ایک دن کا ہزار روپیہ مانگ رہا ہے کھانے پینے کا الگ ہوگا۔“

”مجھے منظور ہے لیکن ہم چار ہیں اس لیے کرایا ہو کہ ہم چاروں آرام سے رہ سکیں گھس گھسا کر نہ رہنا

پڑے۔“

”اس کا مانج اچھا ہے، شوہر فاریسٹ کٹر یکٹر تھا۔ پر ایک حادثے میں مر گیا۔“

میں نے رکی افسوس کیا۔ مرہم پٹی اور کھاپی کر بیٹو چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر گپتا نے کپسول اور گولیوں ایک ایک کا پتا دیا۔ کپسول اینٹی بائیوٹک تھے اور گولیاں جین کلر تھیں۔ اس نے کہا۔ ”کپسول ہر چھ گھنٹے بعد ایک گلاس سادہ دودھ کے ساتھ لیتا ہے پر دودھ گرم نہ ہو اور تین کلر اس وقت لیتا جب درد بہت ہو اور سوتا ہے۔“

”اس کی پٹی کیسے تبدیل ہوگی۔“

اس نے پٹی تبدیل کرنے کا سامان دیا اور طریقہ بھی بتایا۔ میں نے احتیاطاً لے لیا لیکن ساتھ ہی اس سے کہا۔ ”جب تک ہم یہاں ہیں تم پٹی تبدیل کرنا میں فیس دوں گا۔“

”میں کر دے گا۔“ اس نے راج کور کی طرف دیکھا۔ ”اس کا کیا مسئلہ ہے۔“

”اسے گھٹنے میں فریکچر تھا اب ٹھیک ہے پر کبھی کبھی پین ہوتی ہے۔“

”پین ہوتی یہی گولی اسے بھی دے دینا پر ایک سے زیادہ مدت دینا بہت ہائی پوٹنسی ہے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ڈاکٹر شوکیہ گپتا غلط کام کر رہا تھا لیکن وہ ہمارے بہت کام آیا تھا۔ اس نے تقریباً سارے مسائل حل کر دیے تھے۔ ہم گاڑی میں آئے۔ ڈاکٹر نے کلینک بند کر دیا اور ہمارے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اس کی بہن کا گھر اس کے کلینک کے متوازی پہاڑی کے دوسرے حصے میں تھا۔ یہ قصبے کا پوش حصہ تھا یہاں زمین چھوڑ کر کالچر اور بنگلے بنے ہوئے تھے۔ یہاں راستے نسبتاً بہتر اور سڑکیں ہموار تھیں۔ ڈاکٹر گپتا نے ایک دو منزلہ کالچ کے سامنے گاڑی روکائی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ کالچ کے سامنے چھوٹا سا باغ تھا جس میں انگوڑی ٹیلیں اور اسٹراہیری کے پودے لگے تھے۔ باغ اور کالچ کی حالت سے لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر گپتا کی بہن کھاتی پتی بیوہ تھی۔ جب کہ اس کا کہنا تھا کہ وہ ضرورت مند ہے۔

سکتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو شہر تو رہا نہیں تھا تو آمدنی کے ذریعہ بھی نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر گپتا کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کی بیوہ بہن بس بچوں کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ کتنے آرام سے چار اجنبی افراد کو اس کے پاس ٹھہرانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ حیرت اس کی بہن پر تھی۔ گپتا خاصی عمر کا سیاہ رنگت اور بد صورت نفوس والا شخص تھا اوپر سے اس کے کروت بھی اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ اس کی بہن اگر اس پر گئی تھی تو اسے لحاظ سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا مگر آبرو کے علاوہ جان اور مال کا خطرہ بھی تو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گپتا کوئی دس منٹ بعد اندر سے برآمد ہوا اور اس نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ ہمیں کالچ کے برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں لایا اس کا دروازہ باہر کھلتا تھا اور ایک دروازہ اندر بھی کھلتا تھا۔ فرش پر دیڑھ قالین تھے اور دیواروں کے ساتھ گاؤں ٹیکے اور سیلے سے تہہ کیے ہوئے چار کبل رکھے تھے۔ کمر کارنر کا تھا اور دو طرف کھڑکیاں تھیں۔ جن پر اچھے دیڑھ پردے تھے۔ کمرابہ ظاہر بہت اچھا تھا۔ لیکن یہاں کوئی تیسرا دروازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر گپتا نے دوسرے دروازے کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ گھر میں کھلتا ہے اور اندر سے بند تھا۔ گویا ہم باقی گھر سے الگ تھے۔ یہ ایک لحاظ سے اچھا تھا کہ کوئی ہمارے کمرے میں بھی اچانک نہیں آ سکتا تھا۔ مگر ایک مسئلہ تھا۔ یہاں کوئی باتھ روم نہیں تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”بعض اوقات فطرت آدمی کو پکارتی ہے۔“

وہ کنفیوژ ہو گیا۔ ”کیا..... کیا بولا..... کون کس کو پکارتا ہے؟“

”میرا مطلب ہے کال آف نمبر۔“ میں نے سلیس انگریزی میں سمجھایا اور مزید سمجھانے کے لیے چھوٹی انگلی بھی کھڑی کر کے دکھائی جو یونیورسل اشارہ ہے۔ اس نے دانت نکالے۔

”اچھا..... اچھا..... اس کا بھی انتظام ہے میرے ساتھ آؤ۔“

وہ مجھے کالج کے عقبی حصے میں لے گیا یہاں الگ سے ایک چھوٹا واش روم تھا جس میں حوائج ضروریہ کے علاوہ غیر ضروریہ سے فارغ ہونے کے بھی انتظامات تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے تسلی کرا کے ایک دن کا کرایہ پیشگی لیا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ صبح کے ناشتے کا بھی ابھی سے کہہ دوں۔ میں نے پانچ سو مزید دیئے اور اسے آرڈر نوٹ کرا دیا۔ ناشتے میں ابلے اور تلے ہوئے انڈے، پراٹھے، ڈبل روٹی، چائے اور کافی درکار تھی۔ ڈاکٹر گپتارم لے کر اندر چلا گیا۔ ابھی تک اس کی بہن سانسے نہیں آتی تھی اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہم ڈاکٹر گپتا کے توسط سے آئے تھے اور وہی سب دیکھ رہا تھا۔ دو منٹ بعد اس نے واپس آ کر مجھ سے کہا۔ ”تم لوگ اس کمرے تک رہے گا اور باہر بھی صرف واش روم کے لیے جائے گا۔ واک بھی نہیں کرے گا۔ نہ اس کے لیے باہر جائے گا۔“

”ہم بلا ضرورت کمرے سے نہیں نکلیں گے، لیکن یہ گاڑی کھڑی کرنی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بلاوجہ یہ لوگوں کی نظر میں آئے اور وہ سوچیں کہ یہاں کچھ لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”تم گاڑی اور ہر مکان کے کونے میں سڑک پر کھڑا کر دو لوگ سمجھے گا کہ کسی اور گاڑی ہے۔ سیتا کی گاڑی اندر کھڑی ہے۔“

”تمہاری سسٹر کا نام سیتا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”سیتا دیوی۔“

ڈاکٹر گپتا رخصت ہو گیا میں نے آئی کن سے گاڑی کالج کے کونے پر اس طرح کھڑی کروائی کہ یہ ظاہر اس کا تعلق کالج سے نہ لگے۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے اور آئی کن اور راج کنورج نوبے تک انجکشن کے زیر اثر رہے لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سے پہلے انہیں دوسرا انجکشن دے دوں گا۔ ابھی تک راج کی تلاش کا دائرہ یہاں تک دراز نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوا تھا تو فی الحال اس قصبے تک نہیں آئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ یہ رات ہم سکون سے گزاریں گے۔ بیٹو کو آرام کی اشد ضرورت تھی۔ ابھی تو اسے پین کلر کا انجکشن دیا ہوا تھا۔ اس کا اثر تھا اس لیے وہ لیٹ کر آرام سے سو گیا۔ اس کے لیے خوراک سے زیادہ آرام ضروری تھا۔ میں نے راج کنور اور آئی کن کو سونے کا حکم دیا تو انہوں نے سعادت مندی سے اس کی تعمیل کی۔

میں نے بیٹو کو کبل اوڑھادیا تھا۔ آپریشن کے بعد اسے گرم شرٹ پہنا دی تھی لیکن جیکٹ نہیں پہنی تھی۔ آئی کن نے جیکٹ پہن رکھی تھی اس لیے اس نے صرف ٹائٹ کبل لیا البتہ راج کنور کبل میں گھس کر اچھی طرح لیٹ گیا تھا۔ اس نے سردی کے لحاظ سے ہلکا لباس پہنا ہوا تھا۔ ان کے لیٹنے کے بعد میں نے اسے والا بیک اپنے اور بیٹو کے درمیان رکھا۔ ان کو کمرے کے کونے میں جگہ دی تھی۔ میں اور بیٹو دروازے کے پاس تھے بلکہ میں نے اپنا ڈیرہ بالکل دروازے کے سامنے جمایا تھا۔ یہ اندر کی طرف کھلنے والا سنگل ڈور تھا اور جب تک میرا تکیہ نہ ہٹایا جاتا دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ مگر میرا سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ نکالا اور سب سے پہلے لیپ ٹاپ اور موبائل چارجر سے لگائے۔ یہاں کمرے میں ایک طرف دیوار پر ملی سا کٹ لگا ہوا تھا

جس میں ہر طرح کا پلگ لگ سکتا تھا۔ اگرچہ دونوں کا آدھا آدھا چارج باقی تھا لیکن میں نے اسے فل کرنے کا فیصلہ کیا۔

چارج پر لگا کر میں نے لیپ ٹاپ سے انٹرنیٹ یو ایس بی ڈیو اےس لگائی اور کنکشن آن ہوتے ہی اسکا پ پڑ گیا۔ میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا مگر وہ بند جا رہا تھا پھر میں وسیم کا نمبر ملانے لگا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے سفیر کا نمبر ملایا۔ اسکا پ سے میں نے ابھی تک سفیر کو کال نہیں کی تھی۔ عبداللہ اور وسیم کے نمبر مکینہ طور پر بڑے کنور اور اس کے توسط سے بھارتی حکام کے علم میں آچکے تھے اس لیے ان پر کال کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے بلو تو تھ پینڈ فری لگا لیا تھا۔ سفیر نے کال ریسیو کی اور آہستہ سے بولا۔ ”یہ تو ہے؟“

”نہیں میرا بھوت ہے۔“

”ہم سب بھی مر چکے ہیں انتظار کر کر کے۔“ اس نے حسب معمول بھنا کر کہا۔ ”کہاں مر گیا تھا تو؟“

”بس یا سمجھ لے کام نہیں ہوا۔“

سفیر ایک لمحے کو چپ ہوا تھا پھر اس نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”بھیا کے پاس پہنچ گئی، ہم زمینی راستے پر انتظار کر رہے تھے اور بھیا نے بائی ائیر بلو الیا۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ سفیر نے تشویش سے کہا۔ ”اس کا ہوتا سوتا تو پاگل ہو رہا ہے۔“

”اسے قابو میں رکھو یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں منے کے شانے میں چوٹ آئی ہے۔ اس کی مرہم پٹی کرا کے ایک جگہ آرام کر رہا ہوں۔“

”کیا ہوا اسے..... وہ ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں ڈاکٹر نے آپریٹ کر کے مرہم پٹی کر دی ہے ابھی سو رہا ہے۔“

”ہوا کیا تھا؟“

”ہم نے ایک گاڑی روکی جو بھیا کے محل کی طرف جا رہی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اس میں بہنا ہوگی، مگر اس میں دوسرا بھیا نکل آیا۔ اسے بڑے بھیا نے وہاں سے منگو الیا تھا جہاں میں نے اسے محفوظ کیا تھا۔ اسے روکا تو ساتھی جھگڑنے لگے۔ ان کو تو سلا دیا مگر منے کے شانے پر بھی چوٹ آئی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے تین لگ سکتے ہیں ٹھیک ہونے میں۔“

”تب تک تو کیا کرے گا؟“

”آرام اور تم لوگ اب بڑے بھیا سے گفت و شنید کرو۔ اگر مجھ سے بات کرنا چاہے تو مجھے بتا دینا میں رابطہ کر لوں گا مگر اسے یہی بتانا کہ میں فی الحال صحت بحال کر رہا ہوں۔“

”ٹو ایک بات بھول رہا ہے پرندہ گرنے میں تیرا نام بھی آیا ہوگا۔“

میں سنکاری کو بھول گیا تھا۔ وہ راولوں کے پاس تھا۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا اور سفیر کو مطلع کیا کہ بڑے بھیا تک میری یہاں موجودگی کی اطلاع پہنچ چکی ہوگی۔ اب وہ اس کی طرف سے رابطے پر میرے بارے میں لا علمی ظاہر کریں۔ بلکہ عبداللہ اور وسیم فی الحال اس کا فون بھی اٹینڈ نہ کریں۔ سفیر نے طعنہ دیا۔ ”تجھے کیا ہو گیا..... سامنے کی بات تھی۔“

”بس یار ذہن پر بوجھ اتا ہے کہ بعض اوقات سامنے کی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اچھا ہوا تھا سے بات ہوگئی اور بات کلیئر ہوگئی۔ اب میں اس پر نئے زاویے سے سوچوں گا۔“ میں نے کہا اور مبہم انداز میں اپنی مہم جوئی اور بھارتوں کی طرف سے تلاش کا بتایا۔ سفیر یہ سن کر فکر مند ہو گیا کہ ہم بدستور کنور پبلس کے پاس ہیں۔

”اب تیرا زیادہ دیر وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

”ہاں، لیکن ٹو جانتا ہے میں اسے لیے بغیر واپس نہیں آ سکتا۔ یار میں نے اسے دیکھا تھا جب وہ بڑے بھائی کے سامنے آئی اور اس نے بازو پھیلائے تو وہ اس کی طرف نہیں بڑھی، بھائی کے سینے سے نہیں لگی۔ وہ ان لوگوں سے تعلق توڑ چکی ہے۔ اب وہ ہماری ہے۔ ہماری ذمے داری ہے۔“

”تو میں کب انکار کر رہا ہوں یار، اسے اپنی بیگم کی طرح سمجھتا ہوں۔“

میں ہنسا۔ ”اس کے شوہر نامدار نے سنا تو تیرا مرڈر کر دے گا۔“

”وہ برابر میں بیٹھا دانت نکال رہا ہے لے، اس سے بات کر۔“

”آپ ٹھیک ہیں؟“ وسیم کی آواز آئی۔

”تقریباً تم نے سب سن لیا ہے، نہیں تو یہ بتا دے گا، نام کسی کا بھی نہیں لینا۔“

”منے کا سنا تھا، وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں تین چار دن میں فٹ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ وسیم کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ ان معاملات کا ماہر تھا اور مجھے اچھا مشورہ دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔

”میں مانی کی مدد سے انٹرنیٹ پر دیکھ کر آپ کو بہتر مشورہ دے سکوں گا۔“

”بالکل یار اس چیز نے بہت آسانی کر دی ہے، اس کی مدد سے میں بالکل اجنبی علاقوں میں آسانی سے گھومتا رہا ہوں۔ اللہ مانی کا بھلا کرے اس نے بہت اہم چیزیں سکھائی ہیں، اس کا کیا حال ہے؟“

”منے کے بغیر اداس ہے اور دوبارہ حویلی جانے پر ضد کر رہا ہے۔“

”کیونکہ وہاں شازیہ ہے۔“ پیچھے سے سفیر نے کہا۔ ”یہ دونوں ایک نمبر کے بد معاش ہیں۔“

”مناسٹریف ہے۔“ میں نے بیٹو کا دفاع کیا۔ ”بد معاش مانی بھی نہیں ہے لیکن وہ بیٹو سے مختلف ذہن کا لڑکا ہے۔“

”آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے، آج ہی عدالت سے آپ کے خلاف تمام کیمرز خارج کر دیئے گئے ہیں۔“ وسیم نے انکشاف کیا۔

”ارے واہ۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”اور تم لوگ اب بتا رہے ہو۔“

”وکیل صاحب نے ایک گھنٹا پہلے مطلع کرنے کی زحمت کی تھی۔“ وسیم ہنسا۔ ”اب ہمیں وعدے کے مطابق بیڑ زادے کو پھیر جی کے حوالے کرنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تو وکیل صاحب سے تصدیق کر کے بیڑ زادے کو حوالے کر دو۔ ویسے اس کی حالت کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہتر ہے، اب گزرنے کا خطرہ نہیں ہے۔“

”یہ کار خیر برادر کلاں کے ہاتھ انجام پائے تو زیادہ اچھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسکا پ پر آسکتے ہو؟“

”ہاں میں آن لائن ہوتا ہوں۔“ سفیر نے کہا۔ میں نے کال کاٹ دی۔ اگرچہ ہمالیہ ہوٹل کے آئی ٹی کے ماہر نے ہزار منٹس کا کریڈٹ ڈلوایا تھا لیکن میں اسے محفوظ رکھنا چاہتا تھا نہ جانے کب کہاں اس کی ضرورت پڑ جائے۔ ایک منٹ بعد سفیر آن لائن ہوا لیکن وڈیو میں مانی نظر آیا۔ اس نے پُر جوش طریقے سے غلبہ سلیک کی لیکن نام نہیں لیا غالباً اسے پہلے ہی بتا دیا۔ کیونکہ مانی ان چیزوں کا ماہر تھا اس لیے میں نے اس سے پوچھا کہ میں اس طرح اسکا پ استعمال کر رہا ہوں اس میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟

”بالکل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”انڈیا والے اس معاملے میں خاصے آگے ہیں اور انہوں نے حکومتی سطح پر اس کا انتظام بھی کیا ہوا ہے۔ وہ کسی بھی انٹرنیٹ سرگرمی کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔“

”وہ کیسے؟“

”کم سے کم بات کریں اور جگہ بدلتے رہیں۔“

کیونکہ جگہ بدلنا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے مانی کے دوسرے مشورے پر عمل کیا اور مختصر بات کر کے اسکا پ بند کر کے لیپ ٹاپ بھی بند کر دیا۔ مانی کا کہنا تھا بوائیس بی ڈیوائس صرف استعمال کے وقت لگایا کروں ورنہ اس سے سنگٹل جاتے رہتے ہیں اور اس کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ یعنی میں نے خاصی دیر بات کی تھی۔ آئی کن باقاعدہ خراٹے لے رہا تھا لیکن راج کنور خاموشی سے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اب تک شک تھا کہ وہ اب دوا کے زیر اثر نہیں رہا تھا۔ اسے اسپتال میں اینٹی ڈوٹ دے دیا گیا تھا۔ اینٹی ڈوٹ کسی بھی دوا کے توڑ کو کہتے ہیں۔ بہر حال اس کا ہٹا چلانا اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک وہ خود کوئی حرکت نہ کرتا۔ راج کنور پر تو شک تھا ہی ساتھ ہی میں کسی ممکنہ ریڈ سے بھی ہوشیار رہنا چاہتا تھا۔

یہ سوچنا کہ بھارتی یہاں نہیں پہنچ سکتے تھے خوش فہمی تھی۔ وہ جتنی تیزی سے پیچھے آئے تھے اور اسپتال تک پہنچ کر سنکڑی کو قبضے میں لیا تھا اس کا امکان تھا کہ میرے بارے میں جانتے ہی وہ زیادہ مستعدی سے حرکت میں آجائیں اور اس سارے علاقے میں بڑے پیمانے پر میری تلاش شروع ہو جائے گی۔ پچھلے ایک عشرے میں ہماری سلامتی کے اداروں کو جتنے انتشار اور مسائل کا سامنا تھا۔ وہ قومی سلامتی کے بجائے دوسرے کاموں میں الجھا دیے گئے اور اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان اداروں کی جو ساکھ تھی اسے شدید نقصان ہوا تھا۔ بعض ایسے دل گداز سانحے پیش آئے جن سے عوام کی نظروں میں ان اداروں کی ساکھ خراب ہوئی تھی۔

روشن خیال آمرانہ دور میں جہاں ایک طرف ملک کی نظریاتی اساس کو نقصان ہوا وہیں ہمارے بیرون ملک آپریشن متاثر ہوئے۔ دہشت گردی کی جنگ میں ایک بار سریندر کر کے بعد ہم گرتے ہی چلے گئے اور حتیٰ کہ بھارت جیسا ازلی دشمن اور ریاستی دہشت گردی کا بانی ملک ہمیں طعنے اور گالیاں دینے لگا جو ہم خاموشی سے سننے لگے۔ بیرون ملک آپریشن بند ہونے سے بھارت کو فوری ہینڈ ملا اور کشمیر میں اسے ریلیف دینے کا صلہ یہ ملا کہ اس نے ہمارے ملک کے مختلف حصوں میں مداخلت شروع کر دی۔ جس عشرے میں ہمارے سلامتی کے ادارے انحطاط پذیر ہوئے اسی دوران میں بھارت نے مغرب کے تعاون سے اپنے سلامتی کے اداروں کو نئے

سرے سے منظم اور مضبوط کیا اور اپنے ملک میں ان کا وسیع جال بچھا دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب بھارت کے پاس ریاستی اداروں کا بہت بہتر نظام موجود ہے جو اس کی سلامتی کو لاحق کسی بھی خطرے سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس لیے مجھے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ بھارتی یہاں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے اور درحقیقت میں مگر مجھ کے جڑے میں موجود ہونے جیسی خطرناک صورت حال سے دوچار تھا۔ جس لمحے یہ جڑے آپس میں ملتے ہیں ان کے ٹخنے میں آجاتا۔ میں صرف اللہ کے بھروسے پر تھا اور یہ ظاہر اس کا امکان کم تھا کہ میں یہاں سے صحیح سلامت نکل سکوں گا یا سادی کو واپس حاصل کرنے کے مشن میں کامیاب ہوں۔ مگر ساتھ ہی مجھے تجربہ تھا کہ صبر اور قتل کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے سے کوئی نہ کوئی راہ نکل آتی ہے۔ میں لیٹا ہوا تھا اور جب نیند کے جمونکے آنے لگتے تو اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ رات میں راج کنور نے اٹھ کر دوش روم جانے کی فرمائش کی اور مجبوراً مجھے یہ ناگوار کام کرنا پڑا تھا اسے سہار دے کر دوش روم تک لے گیا اور پھر وہاں سے واپس لایا۔

باہر سردی اچھی خاصی تھی، اس کے مقابلے میں کانچ میں سردی کم تھی۔ اس کی ٹخلی منزل کا فرش اور دیواریں پتھر سے بنی تھیں جب کہ چھت اور اوپری منزل لکڑی سے بنی تھی یہی وجہ تھی یہاں موسم کی شدت کا اثر کم تھا۔ چھ بجے روشنی ہوئی اور اوپر کھٹ پٹ ہونے لگی تھی۔ شاید سیتا دیوی اور اس کے بچے جاگ گئے تھے۔ میں نے ڈاکٹر گپتا سے کہا تھا کہ ہمیں نوبے ناشتہ درکار ہوگا۔ رات میں نے ایک بار بیٹو کو اٹھا کر اینٹی بائیوٹک دوا دی تھی۔ اس وقت تک پین کرائنگش کا اثر تھا لیکن سات بجے اس کی آنکھ کھلی تو اسے تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”فکرم ت کرونا شتے کے بعد تمہیں پین کلدیتا ہوں۔“

”آپ جاگتا رہا رات بھر؟“

”ہاں مجبوری تھی میں نہیں سو سکتا تھا خیر میں ناشتے کے بعد سو جاؤں گا۔ ابھی ان دونوں کو دوبارہ انجکشن دینا ہے۔“

”پہلے دے دو۔“ بیٹو نے مشورہ دیا۔

اٹھ بجے اثر ختم ہو جاتا۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ میں نے انجکشن نکالے اور پہلے راج کنور کو لگایا۔ اس نے بلا جھجک بازو آگے کر دیا۔ اس کے بعد میں نے آئی کن کو انجکشن دیا۔ اس نے بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ بیٹو جاگ رہا تھا اس لیے میں دوش روم سے ہو کر آیا اس کے بعد بیٹو گیا۔ آخر میں آئی کن میرے ساتھ گیا۔ اس پر پڈ میں ناشتے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ میں آئی کن کے ساتھ گیا تھا اور جب واپس آیا تو برآمدے میں ایک جوان اور دلکش عورت موجود تھی۔ اس نے سردی سے قطع نظر روایتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ مختصر سرخ بلاؤز اور ساڑھی میں اس کا سر اپا نمایاں تھا۔ صاف رنگت جسے گوری تو قرار نہیں دیا جاسکتا تھا مگر وہ سانولی بھی نہیں تھی۔ بندھے ہوئے لائٹ براؤن بال اور اسی رنگ کی آنکھیں تھیں۔ نقوش بھی اچھے تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا تو میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔

”ناشتہ تیار ہے۔“ وہ بولی۔

”لے آؤ۔“ میں نے کہا پھر مجھے خیال آیا۔ ”سیتا دیوی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“

وہ دلا آویز انداز میں مسکرائی۔ ”آپ سیتا دیوی سے ہی مل رہے ہیں۔“

میں دنگ رہ گیا۔ میرے خواب و خیال میں نہیں تھا کہ شوکیہ گپتا اور سہاش گپتا جیسے منحوس صورت بھائیوں کی بہن اتنی خوب صورت ہوگی۔ وہ ان کے مقابلے میں کم عمر بھی تھی۔ اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے معذرت کی۔ ”سوری میں سمجھا تھا کہ آپ ایجنڈ ہوں گی..... اور آپ گڈ لک بھی ہیں۔“

”تھینک یو۔“ وہ مسکرائی اور پلٹ کر چلی گئی۔ اس کی چال بھی دلکش تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ جوان اور خوب صورت عورت تھی اور اس نے اتنی آسانی سے چار اغضبی افراد کو اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا۔ بے شک یہ کمر باتی گھر سے الگ تھا لیکن تھا تو گھر کا ایک حصہ اور اس کا کھانے کے لیے ہمارے پاس آنا جانا رہتا۔ اس کا اعتماد قابلِ داد تھا۔ دس منٹ بعد ایک دس سال کے بچے کے ساتھ ٹرائی میں ناشتہ لے آئی۔ لڑکا صورت سے اس کا بیٹا لگ رہا تھا۔ اس نے سلیقے سے قالین پر دسترخوان بچھایا اور ٹرائی سے ناشتے کا سامان اٹھا کر سجانے لگا۔ پراٹھے کپڑے میں لپٹے اور گرم تھے۔ انڈول کا خاکینہ اور ایلے ہوئے انڈے الگ تھے۔ نمک اور کالی مرچ ساتھ تھی۔ ڈبل روٹی، مکھن اور ایک کنوری میں شہد بھی تھا۔ یہ اچھا اور بھرپور ناشتہ تھا۔ چائے خاص کیتلی میں تھی جس میں یہ دیر تک گرم رہتی۔ سب سے اچھی بات کہ دودھ اور شکر الگ سے تھے۔ برتن بہت اچھے والے تھے۔ پانی کا جگ اور گلاس الگ سے تھے۔ ناشتہ لگانے کے بعد سیتا دیوی نے کہا۔ ”آپ ناشتہ کر لیں میرا بیٹا پراوین برتن لے جائے گا۔“

”ٹھیک ہے آپ آدھے گھنٹے بعد پراوین کو بھیج دے گا۔“ میں نے کہا اور ان کے جاتے ہی سب ناشتے پر نوٹ پڑے تھے۔ رات کا کھانا پیارات میں ہی ہضم ہو گیا تھا۔ اُن فٹ بیٹو اور راج کنور بھی پورا ساتھ دے رہے تھے۔ آدھے گھنٹے میں دسترخوان کی ہر چیز ہمارے پٹوں میں منتقل ہو گئی تھی، اس میں دس پراٹھے بھی شامل تھے۔ اپنی اپنی پسند کی چائے پی کر سب خود کو آسودہ محسوس کرنے لگے تھے۔ میں نے بچ جانے والے دودھ کے ساتھ بیٹو کو دوا کھانے پر مجبور کیا۔ آدھے گھنٹے بعد پراوین آکر برتن لے جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔ ”بیٹا اپنی اتاجی سے کہو میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ برتن سمیٹ کر لے گیا اور میں بھی باہر برآمدے میں نکل آیا۔ سیتا دیوی کچھ دیر بعد اندر سے برآمد ہوئی۔ وہ غالباً کام کرتی ہوئی آئی تھی کیونکہ اس نے ساڑھی کا پلو اڑس رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اتنے اچھے ناشتے کا لکریہ..... اب ہم رات کو کھانا کھائیں گے۔“

”دوپہر میں نہیں کھائیں گے؟“

”نہیں میں آپ کو زیادہ مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔“

”مشکل تو نہیں ہوگی۔“ اس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ شاید اس لیے کہ اب تین وقت کے بجائے دو ت کے کھانے کی رقم ملے گی۔ وہ یقیناً اس سے بھی اچھا خاصا بچا رہی ہوگی۔ ”مجھے بتا دیں کیا کھانا ہے میں بنا لگی۔ گوشت والی ڈش بھی بنا سکتی ہو۔“

”ٹھیک ہے مٹن کڑا ہی بنا لیجئے گا اس کے علاوہ جو ہودہ دیچی ٹیرین ہو۔“ میں نے اسے پانچ سو کا ایک لے اور دیا جو اس نے اپنے بلاؤڈز میں غائب کر دیا۔ ”دوسرے ہم اب کمرے میں رہیں گے بلا ضرورت کوئی

باہر نہیں آئے آپ بھی اگر کسی سے ہمارا تذکرہ نہ کریں تو اچھا ہوگا۔ ہمیں لوگوں کی توجہ نہیں چاہیے۔“

اس نے بغیر کسی تاثر کے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، ویسے آپ نے اور کتنے دن رکنا ہے؟“

”کم سے کم آج رات اور..... میرے ساتھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہماری گاڑی مکان کے ساتھ

کھڑی ہے اگر کوئی پوچھے تو آپ لاعلمی ظاہر کرے گا۔“

”ٹھیک ہے دن میں چائے، کافی، پانی یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو دروازے کو بجا کر بول دے گا۔“

اپنے بھائیوں کی نسبت اس کی زبان صاف ستھری اور کسی حد تک دہلی والوں کی سی تھی۔ شاید وہ اچھے کالج سے

پڑھی ہوئی تھی۔ اب مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی بہن تھی بھی یا گیتا نے اسے منہ بولی بہن بنایا ہوا ہے۔ میں

نے ہچکچاتے ہوئے یہ سوال پوچھ لیا تو وہ ہنسی۔

”سب یہی سمجھتے ہیں، لیکن میں شوکیہ اور سہاش کی اکلوتی بہن ہوں۔ ان سے پورے پندرہ اور تیرہ سال

چھوٹی ہوں۔ وہ پتا جی پر گئے ہیں میں ماما جی پر گئی ہوں۔ ابھی کچھ چاہیے؟“

اس نے خود پیش کش کی تھی اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”ہاں اگر کافی مل جائے..... کھانے

کے علاوہ بھی جو آپ دیں گی اس کی بھی ادائیگی ہوگی۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”میں بھیجتی ہوں۔“

میں کمرے میں آیا تو راج کنور اور آئی کن اونگھ رہے تھے حالانکہ وہ ساری رات سوئے تھے۔ شاید بھاری

ناشتہ کر کے انہیں اونگھ آگئی تھی۔ ابھی تک آئی کن نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ اسے جانا ہے اور اس کے گھر والے

پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اچانک اس کی جبکٹ سے موبائل کی تیل بجی اور اس نے موبائل نکالا۔ ”ایک منٹ

کال ریسیو مت کرنا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کس کی کال ہے؟“

آئی کن نے موبائل دیکھا۔ ”میری بیوی کی۔“

”اوکے اسے بتاؤ کہ تم سیاحوں کے ساتھ ہو اور کچھ دن میں واپس آؤ گے وقت کا بتانا نہیں سکتے۔“

اس نے سر ہلا کر کال ریسیو کی اور نارمل انداز میں جو میں نے کہا تھا وہ اپنی بیوی سے کہہ دیا لیکن اس کا

انداز مناسب تھا اس لیے اس کی بیوی کو شک نہیں ہوا کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔ مجھے خیال نہیں آیا کہ اس کے

پاس موبائل ہو سکتا ہے۔ جب اس نے بیوی سے بات کر لی تو میں نے اس سے موبائل لے کر آف کر کے اپنے

پاس رکھ لیا۔ گاڑی کی چابیاں پہلے ہی میرے قبضے میں تھیں۔ راج کنور کے پاس کچھ نہیں تھا پھر بھی میں نے

احتیاط اس کی تلاشی لی۔ بیٹو غور سے دیکھ رہا تھا اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”شوہن انجکشن نے بچا لیا ورنہ ان

دونوں کے ساتھ تو مارا جاتا۔“

”یہ دو اڑے کام کی چیز ہے شیر کو بکری بنا دینے والی۔“

”یہ شیر نہیں کتا ہے۔“ بیٹو نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ ”پر ابھی دُم دبائے بیٹھا ہے۔“

اس بے عزتی پر بھی راج کنور نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اس وقت وہ یقینی طور پر انجکشن کے زیر اثر تھا۔

اگر دو میں گزربو ہوتی تو آئی کن پر بھی اثر نہ ہوتا۔ ”تکلیف میں کمی ہوئی ہے؟“

بیٹو نے سر ہلایا۔ ”ابھی بہتر ہے۔ آپ سو جاؤ۔“

”کافی منگوائی ہے وہ بی کر سوس گا۔“

پراوین کافی کا گنگ لایا تھا۔ یہ سلیتے سے چھوٹی ٹرے میں اور ڈھکا ہوا کپ تھا۔ ہم خوش قسمت تھے کہ ایک کمر میں اچھے ہوٹل والی سوئٹس حاصل کر رہے تھے اور یہاں ہم سے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ میتا دیوی سادہ مزاج عورت تھی۔ اس نے صورت دیکھ کر مجھ پر اعتبار کر لیا تھا اور صرف کنڈی کے سہارے خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہماری جگہ جگے مجرم اور جرائم پیشہ ہوتے تو اس کی جان، مال اور آب و سب خطرے میں ہوتی۔ کافی بی کر میں لیٹ گیا اور سونے سے پہلے بیٹو سے کہا۔ ”تم ٹھیک چار بجے مجھے جگا دینا، درمیان میں تمہیں دوا بھی لینی ہے۔“

”شو بی اب کھانا کب ملے گا؟“

”شام میں.....“ میں نے کہا۔ ”اس دوران میں کمرے سے باہر مت جانا اور کوئی ایمر جنسی ہو تو مجھے فوراً

اٹھا دینا۔“

”آپ فکر مت کرو۔“

میں مسلسل جاگ رہا تھا۔ گزشتہ چھتیس گھنٹے سے زیادہ وقت میں مجھے مشکل سے دوڑھائی گھنٹے سونے کا موقع ملا تھا مگر پریشانی کی وجہ سے نیند حاوی نہیں ہو پاری تھی، اس وقت بھی سونے میں کچھ وقت لگا۔ مگر یہ مدہوش اور بے خواب نیند تھی۔ ساڑھے چار بجے بیٹو نے مجھے اٹھا دیا۔ میں نے انگڑائی لی۔ چھ گھنٹے کی نیند نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس دوران میں کچھ ہوا تو نہیں؟“

”نہیں۔“ بیٹو بولا۔ ”ہم نے دوا لے لیا ہے درد بڑھ گیا تھا اب ٹھیک ہے۔“

میں اٹھ کر باہر آیا اور دروازہ بجایا۔ ایک چھوٹی بچی نے دروازہ کھولا اور مصومیت سے بولی۔ ”جی انگل۔“

”بیٹا اپنی مانتی سے کہو ہمیں چائے چاہیے۔“

بچی سات آٹھ سال کی تھی اس لیے مجھے امید تھی وہ ماں تک بات پہنچا دے گی۔ میں واش روم میں آیا۔ ابھی دن تھا اور موسم اتنا سرد نہیں تھا لیکن پانی خاصا سرد تھا۔ اس کے باوجود میں نے دل کڑا کر کے غسل کر لیا۔ دریا کی ریت اب تک جسم سے چپکی محسوس ہو رہی تھی، غسل کر کے میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ کپڑے صاف سترے تھے۔ اس علاقے میں پسینا آتا ہے اور نہ دھول مٹی ہوتی ہے۔ میں خوش خوش واپس آیا تو بیٹو نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ ”آپ مڑے سے نہ لیا ہم ابھی نہیں نہا سکتا۔“

”ہاں جب تک زخم ٹھیک نہیں ہو جاتا تم نہیں نہا سکتے۔“ میں نے تائید کی۔ ”واش روم جانا ہے کسی نے؟“

آئی کن اور راج کنور دونوں نے جانا تھا۔ میں باری باری انہیں لے گیا۔ اس دوران میں چائے آگئی تھی یہ صبح کی طرح گرم رکھے والی کیتلی میں اور دودھ و شکر الگ سے تھی۔ چائے کی پتی بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ بیٹو نے غسل تو نہیں کیا تھا لیکن تقریباً نہا لیا تھا۔ نچلے حصے پر پانی بہایا تھا اور اوپر کیلے کپڑے پھیر لیے تھے۔ وہ بھی آیا تو تکلیف کے باوجود خوش تھا۔ ”شو بی مزہ آگیا۔“ اس نے سرور لہجے میں کہا۔ ”پانی ٹھنڈا پر مڑے کا ہے ہم کو یاد آگیا، بچپن میں ماں ہم کو پکڑ کر نہلاتا تھا، ہم بھاگتا تھا، نہیں نہاتا تھا۔“

”بچپن میں سب ایسا کرتے ہیں۔“

”شوبی آپ خوش قسمت ہے۔“ اچانک وہ اداس ہو گیا۔ ”آپ کا ماں باپ..... بہن بھائی سب آپ کے پاس ہے..... آپ سے محبت کرتا ہے..... ہمارا ماں باپ بہن بھائی سب بھگوان کے پاس چلا گیا۔“

میں اس کے پاس آ بیٹھا۔ ”ہاں یہ اوپر والے کی مرضی ہے۔ پر وہ تم سے محبت کرتے ہوں گے اور اب تم ہمارے ساتھ ہو کیا تمہیں ہم میں سے کسی کی محبت پر شک ہے۔ سفیر تم سے کتنا لڑتا ہے تمہیں شک کرتا ہے لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ تم زخمی ہو تو وہ بے قرار ہو گیا تھا۔ تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن تم سو رہے تھے۔“

بیٹو کا چہرہ چمکنے لگا۔ ”ہم جانتا ہے آپ سب ہم سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہم کو پتا ہے آپ کا حویلی کے زنانے میں کوئی باہر کا مرد نہیں جاسکتا پر ہم بابا سے چھپ کر وہاں گھس رہا تھا۔ بابا بھی منع نہیں کرتا، پر ہم کو اچھا نہیں لگتا تھا اور کوئی منع نہیں کرتا تھا۔ ماں جی ہم کو بہت پیار کیا۔ ہم کو بیٹا بنالیا۔ سو پر اور شرمیدی نے ہم سے کہا کہ شوبی جب حویلی واپس آئے گا ہم آپ کے ساتھ ہوگا۔“

”ہاں تم میرے ساتھ ہو گے۔“ میں نے کہا۔ ”باقی سب میرے ساتھی ہیں لیکن تم میرے وجود کا ایک حصہ ہو۔“

”سفیر بھائی بولتا ہم آپ کا دست نارا ست ہے۔“ بیٹو نے شکوہ کیا۔

میں ہنسا۔ ”حالانکہ وہ تالائق خود ایسا ہے۔ تم میرے کارآمد بازو ہو۔“

بیٹو بہت سادہ انسان تھا وہ اس خیال سے خوش ہو گیا کہ اب ہماری عمر میرے ساتھ رہے گا۔ وہ سارا دن جاگتا رہا تھا اور تھکن بھی ہو رہی تھی پھر اسے آنے والی رات میں بھی جاگتا تھا اس لیے وہ سو گیا۔ پراوین چائے کے برتن لینے آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”بیٹے اپنی ماما جی سے کہو ڈاکٹر گپتا کو بلا لیں، میرے ساتھی کی پٹی تبدیل کرنی ہے۔“

مجھے شبہ ہوا تھا کہ بیٹو نے بے احتیاطی سے کام لیا تھا اور پانی کا اثر زخم تک نہ گیا ہو اس لیے میں چوبیس گھنٹے سے پہلے پٹی تبدیل کرانا چاہتا تھا۔ پراوین نے کچھ دیر بعد بتایا۔ ”انکل..... شوکیہ ماموں سات بجے آئیں گے۔“

یہ بھی اچھا تھا بیٹو اتنی دیر سو لیتا اور پھر اس کے بعد کھانا کھا کر دوبارہ سو جاتا میں، اسے دو تین بجے اٹھا کر خود سو سکتا تھا۔ ابھی تک میں نے سوچا نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ بیٹو اس قابل ہو جائے کہ بھاگ دوڑ کر سکے۔ اس میں اسے کم سے کم تین دن لگتے۔ یہاں زیادہ دیر رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن یہاں سے نکل کر کہاں جاتے۔ اگر شملہ کی طرف جاتے تو امکان تھا بھارتی ایجنسیاں سب سے زیادہ وہیں سرگرم ہوں گی۔ یہ تو بھٹیروں کے بھٹ کے جانے کے مترادف ہوتا۔ اس لیے بہتر یہی تھا جب تک ہمیں یہاں کوئی مسئلہ نہ ہو ہم یہیں رکیں۔ ڈاکٹر گپتا اور اس کی بہن اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔ سات بجے ڈاکٹر آ گیا اس نے بیٹو کو چمکا کر اس کے زخم کی دوسری ڈریسنگ شروع کی۔ توقع کے برخلاف اس کا زخم بہت بہتر حالت میں تھا۔ وہ خشک ہو رہا تھا اور اس کا منہ بھی چھوٹا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر گپتا نے صفائی کی ضرورت محسوس نہیں کی اس نے پاؤڈر چھڑک کر اوپر سے روئی رکھ کر دوسری پٹی رکھ کر اسے ٹیپ سے چپکا دیا۔ احتیاطاً اس نے بیٹو کو ایک اور انٹینی باؤنک انجکشن دے دیا۔

”اس سے زخم جلدی بھرے گا۔“ اس نے اپنا نیک بند کرتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگوں کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

”نہیں بلکہ بہت آرام ہے، مجھے شرمندگی ہوتی ہے سیتا دیوی ہمارا زیادہ ہی خیال رکھ رہی ہیں۔“
 ”وہ اچھی عورت ہے پر قسمت خراب ہے۔“ ڈاکٹر گپتا نے کہا۔ ”ابھی جوان ہے خوب صورت ہے دوسرا پتی مل جائے گا پر مانتی نہیں ہے۔“
 ”اسے اپنے سونگہا پتی سے بہت محبت ہوگی۔“

اس بات پر ڈاکٹر گپتا کا چہرہ عجیب سا ہوا تھا مگر صرف ایک دولہے کے لیے پھر وہ نارمل ہو گیا اور سر ہلاتا ہوا اکھڑا ہو گیا۔ ”کوئی بات کہنی ہے۔“
 ”نہیں رات کے کھانے کا میں نے صبح ہی کہہ دیا تھا۔“

اس شام بادل آگئے تھے اور کچھ سرد ہوا بھی چل رہی تھی کبھی کبھی پھواری پڑتی تھی اس سے موسم اور سرد ہو رہا تھا۔ آٹھ بجے کھانا آ گیا اور کھانا کے بعد چائے پی کر سب کیمبلوں میں کھس گئے۔ آج موسم کل سے زیادہ سرد تھا۔ نو بجے بارش شروع ہو گئی تھی۔ بارش تیز نہیں تھی لیکن ایک مستقل رفتار سے ہو رہی تھی۔ بوندیں گرنے کی آوازیں خاموشی میں نمایاں تھیں۔ بیٹو دوالے کر پھر سو گیا تھا۔ راج کنور اور آئی کن بھی سو رہے تھے یا کیمبلوں میں دبکے لیٹے تھے۔ انجکشن نے انہیں بندہ بے دام بنادیا تھا ان کی طرف سے کسی حرکت یا سوالات کا اندیشہ بھی نہیں رہا تھا۔ گرم کبل میں لیٹے رہنے سے مجھے بھی اونگھ آنے لگی تھی۔ کبھی کبھی نیند کا جھونکا آتا لیکن پھر میں چونک جاتا۔ ایسے ہی ایک بار چونکا تو میں سمجھا شاید ایسے ہی چونکا ہوں مگر فوراً ہی کسی گاڑی کا انجن زور سے غرایا جیسے بند کرنے سے پہلے انجن کو ریس دی جاتی ہے اور پھر انجن بند ہو گیا۔

میں چونکا ہوا کراٹھا اور سامنے والی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کالنج کے ڈرائیوے کے سامنے ایک بڑی جیپ رکی تھی اور پھر اس سے ایک شخص اتر کر اندر آیا۔ اس نے ہاتھ اندر ڈال کر گیٹ کی کنڈی کھولی اور بے تکلف اندر آ گیا۔ جاگنے کے بعد میں نے خطرہ محسوس کیا تھا اور مجھے خیال آیا کہ میری بوسو گھسنے والے کتے پالا آخر یہاں تک آگئے تھے مگر حواس بحال ہونے اور ایک شخص کے یوں بے تکلفانہ اندر آنے سے مجھے اپنا خیال غلط لگا تھا۔ اول تو اتنے زور و شور سے گاڑی نہیں روکی جاتی دوسرے آنے والا ایک نہیں ہوتا اور نہ وہ یوں منہ اٹھائے آتا۔ اس کے باوجود میں نے پستول نکال لیا اور بیٹو کو ہلایا وہ جاگ گیا۔ ”کیا کیا ہوا شو بی؟“

”باہر کوئی ہے۔“ میں نے کہا اور کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ کمرے میں تین چھوٹے انرجی سیور چلتے تھے، رات کو ان میں سے دو آف کر دیئے جاتے تو تیسرا ناٹ بلب بن جاتا۔ میں نے اسے بھی آف کر دیا اور اب کمرے میں اندھیرا تھا صرف برآمدے میں چلتے والی لائٹ کی ہلکی سی روشنی پردے سے چھلک کر اندر آ رہی تھی۔ آنے والا بکٹری کی سیڑھیاں چڑھتا اور عملاً انہیں بجاتا ہوا برآمدے میں آیا اور اس نے سیتا دیوی کے دروازے کی کال بیل بجائی۔ اندر کہیں ہلکی سی مترنم گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ میں نے اٹھ کر اپنا تکیہ اور کبل دروازے کے سامنے سے ہٹایا اور آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ مگر کے اندر جانے والا دروازہ مشکل سے پانچ

نٹ کے فاصلے پر تھا۔ مجھے تجسس تھا کہ آنے والا کون تھا اور اتنی رات گئے یہاں کیوں آیا تھا۔ سیتا نے دروازہ نہیں کھولا تھا اس نے ایسے ہی پوچھا۔

”کون ہے؟“

”تیرا بھتی.....“ آنے والے نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ وہ نشے میں لگ رہا تھا۔ ”دروازہ کھول.....“

”ارون۔“ سیتا کی برہم آواز آئی۔ ”تو یہاں کیوں آیا اب تیرا میرا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔“

”سمبندھ تو ہے، یہ دو بچے تو اپنے میکے سے لائی تھی۔ دروازہ کھول۔“

”تو مجھے طلاق دے چکا ہے۔“ سیتا کی آواز تیز ہو گئی۔ ”اب یہاں سے چلا جا اس سے پہلے میں پولیس کو کال کروں۔“

ارون ہنسا۔ ”کردے تو جانتی ہے یہاں کی پولیس میرا نام سنتے ہی فون کرے گی۔ وہ میرے کتے ہیں میرا کھاتے ہیں مجھ پر کیسے بھونک سکتے ہیں۔“

سیتا کو چپ لگی تھی۔ یہ انکشاف تھا وہ بیوہ نہیں مطلقہ تھی اور اس کا سابق شوہر ارون بد معاش قسم کی چیز تھا۔

اس وقت بھی وہ بد معاشی کے ارادے سے آیا ہوا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ سیتا کے شوہر کے ذکر پر ڈاکٹر گپتا کا

چہرہ متغیر کیوں ہو گیا تھا۔ سیتا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تو کیا چاہتا ہے؟“

”بچوں کو دیکھوں گا تجھ سے کچھ پیار بھری باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا۔“ ارون کے لہجے سے خباثت

جھلک رہی تھی۔

”تیرا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے، پیار کی باتیں ان کتیاؤں سے کر جن کے پاس تو اُس وقت گھسا رہتا تھا

جب میں تیری بیوی تھی۔ بچوں سے ملنا ہوتا تو صبح آنا دن کی روشنی میں، تو اچھی طرح جانتا ہے میں شریف عورت

ہوں۔“

ارون نے دروازے پر لات ماری۔ ”کھول دروازہ..... ورنہ.....“ اس کی آگے کی بات ناقابلِ بیان

تھی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ مگر میں نے کوئی حرکت نہیں کی۔

”ارون چلا جا..... یہاں سے چلا جا.....“ سیتا رونے لگی۔ ”میرا تجھ سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق ہو جائے گا تو دروازہ کھول.....“ ارون نے مزید بکواس کی۔ ”آخر تو نے گھر میں ہوٹل بھی تو

کھول رکھا ہے غیر مردوں کی سیوا کرتی ہے آج میری کر لے اور تیرے لیے کون سی نئی بات ہوگی۔“

”ارون چلا جا..... یہ دروازہ تجھ پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔“

جواب میں ارون نے دروازے پر مزید چند ٹھوکریں ماریں اور بکواس کی۔ مجھے لگا کہ اب میری برداشت

کی حد جواب دے جائے گی اور میں باہر نکل کر اس گھٹیا شخص کو ماروں گا۔ مگر ایسی نوبت آنے سے پہلے وہ بکنا

جھلکا وہاں سے دفع ہو گیا اور جانے سے پہلے اس نے جان بوجھ کر جب کا ہارن زور زور سے بجایا۔ سیتا شاید

دروازے سے لگی کھڑکی تھی کیونکہ اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بہت آہستگی سے دروازہ

بند کر دیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا چہرہ جو دروازے کے کٹے حصے سے نکلا ہوا تھا برف ہو رہا تھا۔ بکیہ اور کبل

ٹھیک کر کے میں نے بیٹو سے سونے کو کہا تو وہ بولا۔ ”اس کا آدمی کتنا خراب ہے ہمارا دل چاہ رہا تھا باہر نکل کر اس

کا زبان کھینچ لے۔“

”اگر وہ ایک دو منٹ اور نہ جاتا تو اس کے ساتھ یہی ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”اتنی اچھی عورت اور قسمت دیکھو..... ایسا لگتا ہے اس دنیا میں اب خوشیاں کم ہو گئی ہیں اور ہر گھر میں دکھ زیادہ ہو گئے ہیں۔“

”اس سے شادی کر کے غلطی کیا۔ پراچھا کیا جو طلاق لے لیا۔“

مجھے پیاس لگ رہی تھی میں نے پانی پیا۔ بیتا نے دو لیٹر کی بوتل اور گلاس بھیج دیا تھا تاکہ ہمیں پانی کا مسئلہ نہ ہو۔ تین بجے بیٹو کو جگا کر اسے دوا دی اور میں سو گیا۔ رات کے کھانے کے برتنوں کے ساتھ ہی اگلے چوبیس گھنٹے کا کرایہ اور صبح ناشتے کی رقم دے دی تھی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے بیٹو نے اٹھایا۔ ”شوبی بیتا دیوی آپ کو بلاتا۔“

پراوین آیا تھا۔ میں جوتے پہن کر اس کے ساتھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ بیتا دیوی باہر ہوگی مگر وہ دروازے کے اندر تھی۔ اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ اس نے شال لپیٹ رکھی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے لگا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس نے ہمدردی بھی کر دی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں آپ لوگوں کے لیے ناشتہ نہیں بنا سکوں گی۔“ اس نے معذرت بھرے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں ہم باہر سے ناشتہ منگوا لیتے ہیں کیا آپ کا بیٹا لادے گا؟“

”ہاں..... آں۔“ اس نے مشکل سے کہا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اچانک وہ لہرائی اور اس سے پہلے وہ گرتی میں نے اسے تھام لیا۔

”بیتا دیوی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ مگر وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کا بدن جل رہا تھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا اور پراوین سے پوچھا۔ ”بیٹا آپ کی ماما کی طبیعت خراب ہے۔ ان کا کرا کہاں ہے؟“

وہ ماں کی حالت دیکھ کر پریشان تھا۔ ”اوپر ہے۔“

”مجھے دکھاؤ۔“ میں نے کہا اور اس کی رہنمائی میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ بیتا دیکھنے میں مناسب جسامت کی لگتی تھی لیکن اس کا وزن اتنا زیادہ نہیں تھا۔ اس کا بیڈ روم خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ بیڈ بل تھا، فرش پر قالین بچھا تھا۔ ایک طرف شیشم کی ڈیرینگ اور الماری تھی۔ میں نے اسے بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے بغل چپک کی۔ بغل سسٹ مگر خطرے کی بات نہیں تھی۔ اس نے یقیناً رات والے واقعے کی نینش لی تھی اور اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ جب تک میں نے اس کا معائنہ کیا پراوین نے اپنے ماموں کو کال کر دی۔ کیونکہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ واپس چلا جاؤں۔ پراوین کو اپنی ماں کا خیال رکھنے کا کہہ کر میں نیچے آیا اور دروازے سے باہر نکلا تھا کہ ٹھنک گیا۔ سامنے اردن موجود تھا۔ وہ گورے چتر رنگ کا مگر مردہ صورت شخص تھا۔ ممکن ہے اس کے کروت اتنے سیاہ نہ ہوتے تو وہ خوب صورت لگتا۔ اس نے چھتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم کون ہو اور اندر کیا کر رہے تھے؟“

”میں یہاں بے انگ گیسٹ ہوں، ناشتے کا کہنے گیا تھا مگر بچے نے بتایا کہ بیتا دیوی کی طبیعت خراب

ہے۔“

”اچھا طبیعت خراب ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”رات ایسا کیا کیا؟“
 ”تم کون ہو؟“ میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے فضول کی باتیں کیوں کر رہے ہو جب کہ
 میں تمہیں جانتا بھی نہیں ہوں۔“

”بہتر ہے مجھے جان لو، میں اردن کمار ہوں۔“
 ”ایک اور کمار۔“ میں نے زربلب کہا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ”سچ سچ کے کمار ہو یا بنے ہوئے
 ہو؟“

وہ میز میاں چڑھ کر اوپر آیا اور میرے قریب آ کر اچکنے کی کوشش کی۔ اس کا قبہ مجھ سے چار انچ کم تھا اس
 لیے کوشش کے باوجود وہ میرے چہرے کے سامنے نہ آ سکا۔ اس نے سر دلچے میں کہا۔ ”میرا نام پیدائش سے
 اردن کمار ہے۔“
 ”اوکے مسٹر اردن، اگر تم یہاں رہائش کے ارادے سے آئے ہو تو یہاں کا واحد کمرہ میں لے چکا
 ہوں۔“

”کمرہ۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”یہ پورا گھر میرا ہے۔ میں سیتا کا بچہ ہوں۔“
 ”رنیلی میں نے سنا ہے تم مرچکے ہو، آئی مین سیتا دیوی بیوہ ہے تو اس کا شوہر مر چکا ہے۔“
 ”اس نے بکواس کی ہے، ہر ایک سے جھوٹ بولتی ہے۔ کسی سے کہتی ہے بیوہ ہے اور کسی کو ڈائیورس کا
 بتاتی ہے۔“

”چہارہ اور اس کا ذاتی معاملہ ہے۔“ میں نے ڈاکٹر گپتا کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ درحقیقت میں اسی لیے
 اس گھٹیا آدمی سے باتوں میں الجھایا ہوا تھا کہ ڈاکٹر آجائے ورنہ یہ اندر گھس جاتا اور نہ جانے وہ کس ارادے سے
 آیا تھا۔ ڈاکٹر گپتا اسے دیکھ کر تیزی سے آگے آیا اور اس نے نفرت سے کہا۔
 ”تم..... اب یہاں کیوں آیا ہے؟“

”یہ میرا گھر ہے۔“ اردن نے ڈھٹائی سے کہا۔
 ”مجھ سے بھی اس نے یہی کہا ہے۔“ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”سیتا دیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ
 شاید بے ہوش ہو گئی۔“

”تم سے بعد میں بات کرتا ہے۔“ ڈاکٹر گپتا نے کہا اور تیزی سے اندر چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ دروازہ
 اندر سے بند کر گیا تھا۔ کیونکہ اردن نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو نا کام رہا۔ میں مسکراتے ہوئے اپنے کمرے
 میں آ گیا پیچھے سے میں نے اردن کو دبی زبان میں گالیاں دیتے سنا، نہ جانے اس کا ہدف کون تھا۔ سب سراپا
 انتقام تھے۔ میرے نہیں ناشتے کے کیونکہ رات کا کھانا ہضم ہو چکا تھا۔ میں نے اطلاع دی۔

”نی الحال ممبر کیونکہ سیتا دیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر گپتا اسے دیکھنے آیا ہے۔ وہ ٹھیک ہوگی تو
 براوین ہمیں باہر سے ناشتہ لادے گا۔“

بیڑ کا منہ لٹک گیا۔ ”باہر کا ناشتہ..... ڈبل روٹی اور مکھن۔“

”خلوہ پوری بھی مل سکتی ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”بہت دن ہو گئے کھائے ہوئے۔“

”ہم کو بھی حلوہ پوری کھائے بہت دن ہو گئے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے تم لوگ دن رات باہر سے کھاتے تھے تو حلوہ پوری کیسے نہیں کھائی ہوگی؟“

بیٹو جھینپ گیا۔ ”آنے سے بس ایک دن پہلے کھایا تھا۔ سفیر بھائی لایا تھا کہیں سے، بہت مزے کا تھا۔“

”یعنی صرف تین دن پہلے اور ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے ایک سال سے حلوہ پوری نہیں کھائی۔“

”آپ نے آخری بار کب کھایا تھا؟“

”جب یہاں سے نکلے تھے۔ شملہ کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔“

بیٹو ہنسا۔ ”یعنی تین دن ہوا ہے۔“

اس بار میں جھینپ گیا۔ ”مئے تم کچ مج تیز ہو گئے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں سرحد پار چین بھیج دیا جائے۔“

”ہم چین نہیں جائے گا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”آپ نے وعدہ کیا ہے ہم آپ کے پاس رہے گا۔“

کچھ دیر وقت گزاری کر کے میں باہر آیا۔ اردن کمار جا چکا تھا۔ گھر والا دروازہ کھلا اور پراوین باہر آیا۔

”اب آپ کی ماما کی طبیعت کیسی ہے؟“

”وہ ٹھیک ہیں، ماموں نے انکشن لگایا تھا۔ ماما ہوش میں آگئیں انہوں نے کہا ہے آپ کے لیے ناشتہ

لے کر آؤں۔ مجھے پیسے بھی دیئے ہیں۔“ اس نے پانچ سو کا نوٹ دکھایا۔ ”آپ بتائیں کیا کیا لاؤں؟“

”یہاں شہد والا ایک اور حلوہ پوری بھاتی ملتی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بہت اچھی ملتی ہے۔“

”بس تو چالیس پوریاں لے لینا۔ اگر حلوہ الگ سے ملتا ہو تو لینا اور شہد والے ایک لے آنا۔ تعداد تم خود

دیکھ لینا اور چائے کافی کا کیا ہوگا۔“

”چائے میں بناؤں گا۔ ماما نے مجھے بنانا سکھائی ہے کافی نہیں آتی۔“

”ٹھیک ہے چائے چلے گی اب فنانٹ لے آؤ۔“

وہ چلا گیا تو میں برآمدے میں کچھی کین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں چار کرسیوں اور میز کا سیٹ تھا۔ اندر

سے بھی مکان بہت اچھا اور اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ مجھے لگا کہ اردن کمار مکان کی ملکیت کے

بارے میں ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر مکان سیتا دیوی کے نام پر تھا تب بھی یہ اسی نے بنایا ہوگا۔ ڈاکٹر گپتا اور اس کے

بھائی کی اتنی اوقات نہیں لگ رہی تھی کہ وہ بہن کو جھینپ میں اتنا شاندار مکان دے سکتے۔ علیحدگی کی وجہ تو رات کو ہی

سامنے آگئی تھی۔ اردن کمار ایک اوباش اور بد فطرت شخص تھا۔ کوئی بھی عورت شوہر کی یہ حرکتیں برداشت نہیں کرتی

ہے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر گپتا اندر سے برآمد ہوا اور میرے پاس آگیا۔ ”تھینک یو، تم نے سیتا کا مدد کیا۔ ابھی مجھے

بتایا اس نے اور پراوین نے۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ شخص رات کو بھی یہاں آیا تھا اور نشے میں دھت تھا۔“

”اردن۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”اس نے سیتا کا زندگی تباہ کر دیا۔ اپن اور سبھاش بہت سمجھا یا پر

سیتا نہیں مانتا۔ اس پر اردن کا بھوت سوار تھا۔“

”تو میرج۔“

”ہاں وہ دلی میں پڑھتی تھی، ادھر رہی ساری عمر..... اپنی موسیٰ کے پاس پھر موسیٰ کا انتقال ہوا تو ادھر آگیا۔ ادھر آکر اس کا ملاقات ارون سے ہوا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ سیتا بالکل سیدھا..... ایک دم بدصو..... شہر میں رہا پڑا بھی چالاک نہیں تھا۔ اس نے ارون سے شادی بنایا اور پھر بچھڑایا۔“

”ڈائریس کب ہوئی؟“

”ابھی سال پہلے..... عدالت سے لیا..... یہ مکان اور خرچ بھی ملا۔ پر ارون نے خرچ بند کر دیا اور اب تنگ کرتا ہے۔“

”کیوں تنگ کرتا ہے؟“

”بس بلا وجہ یہاں آتا ہے سیتا اور بچوں سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ کورٹ اسے دور رہنے کا کہا ہے پر یہ آ جاتا ہے۔“

”یہ مکان اسی نے سیتا دیوی کو دیا تھا؟“

”ڈاکٹر گپتا نے سر ہلایا۔“ عدالت کے آرڈر سے سیتا اور بچوں کو ملار نہ اس حرامی نے کچھ نہیں دیا۔“

”ڈاکٹر گپتا کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ لوگ ارون کمار سے ڈرتے تھے۔ وہ اسے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے کہا۔“ تم لوگ کورٹ کیوں نہیں جاتے۔“

”سیتا تیار نہیں ہے۔ ارون نے اسے دھمکی دی ہے اگر وہ کورٹ گئی تو وہ بچے کڈ نیپ کر کے لے جائے گا۔ وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔“

مجھے سیتا اور اس کے بچوں سے ہمدردی تھی لیکن میں ان کے لیے عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس معاملے میں اتنی دلچسپی لینے کا مقصد یہ جانتا تھا کہ ارون کمار ہمارے لیے کس حد تک خطرہ بن سکتا تھا۔ یہ جگہ فی الحال پُرسکون پناہ گاہ ثابت ہو رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ بیٹو کا زخم مناسب حد تک بھرنے تک میں ہم نہیں رہیں۔ اب اس پُرسکون جگہ پر ارون کمار نامی شیطان آگیا تھا۔ میں ڈاکٹر گپتا سے بات کر رہا تھا کہ پراوین ناشتے کا سامان اٹھا کر لے آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”انکل میں ابھی سب ٹرائی میں رکھ کر لاتا ہوں۔“

”بیٹے آپ اکیلے سب کر لو گے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ دس سال کا بچہ تھا۔

”جی انکل کر لوں گا۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ کام کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور ڈاکٹر گپتا کی طرف دیکھا۔ ”اگر تمہیں یا سیتا دیوی کو اعتراض نہ ہو۔“

”نہیں..... نہیں تم اچھا آدمی ہے، تم اندر بھی جاسکتا ہے۔“ اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اب جاتا ہے کلینک کا ٹائم ہو گیا ہے۔“

میں پراوین کے ساتھ کچن میں آیا۔ یہ جدید امریکن طرز کا کچن تھا۔ میں نے چائے کا پانی چڑھایا اور پراوین حلوہ پوری ہاٹ پاٹ میں رکھے لگا۔ بھائی اور چنے کا سالن اس نے ڈوگوں میں نکالا۔ جی ایک ٹرے میں رکھے اور پھر سارا سامان ٹرائی میں رکھا۔ بیٹو اور باقی دونوں بھی بھوک سے بے تاب تھے۔ میں نے پراوین سے کہا۔ ”یہ آپ لے جاؤ جب تک چائے تیار ہوتی ہے۔ مجھے کیتلی دے دو۔“

اس نے کیتلی دی اور ٹرائی لے کر چلا گیا۔ چائے تیار ہوئی تو میں نے اسے کیتلی میں ڈالا۔ ملک اور شوگر پاٹ موجود تھے۔ سارا سامان ٹرے میں رکھ کر میں جانے کو تیار ہوا تھا کہ اوپر سے بیٹا نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر چوکی۔ ”ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”سوری آپ کی اجازت کے بغیر آپ کا کچن استعمال کیا۔“ میں نے معذرت کی۔

”میں اس کی بات نہیں کر رہی آپ چائے خود کیوں بنا رہے ہیں؟“

”پراوین بچہ ہے، مجھے اچھا نہیں لگا سارا بوجھ اس پر ڈال دوں۔ خاص طور سے گرم چائے ہینڈل کرنا اس کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا اس لیے چائے میں نے خود بنائی۔“

بیٹا کی حالت بہتر تھی۔ اس کے چہرے کی سرخی بحال ہو گئی تھی اور وہ چاق و چوبند نظر آرہی تھی۔ ”میں آپ کی شکر گزار ہوں اگر آپ نہ ہوتے تو بچے بہت پریشان ہو جاتے۔“

”یہ میرا فرض تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے آپ کو ابھی آرام کرنا چاہیے۔“

”نہیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں، بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔ بھیا نے انجکشن دیا تو اب ٹھیک ہے۔ لایے چائے میں لے چلوں۔“

”میں لے جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اجازت دیجئے ناشتہ کرنا ہے۔“

”جی ہاں۔“ اس نے کہا۔ میں چائے لے کر آیا تو وہ تینوں ادھاناشتہ صاف کر چکے تھے۔ مجھے بچے کچھ پر گزرا کر تا پڑا، پیٹ بھر انہیں تھا بس گزرا ہو گیا تھا۔ اس دوران میں آئی کن اور راج کنورا انجکشن کے اثر سے نکل آئے تھے اور بیٹو نے اب انہیں پستول کی مدد سے قابو کیا ہوا تھا۔ راج کنور پُر سکون تھا لیکن آئی کن کا تشویش سے برا حال تھا۔ وہ بار بار خوفزدہ نظروں سے بیٹو کے برابر میں رکھے پستول کو یوں دیکھتا تھا جیسے وہ کوئی جاندار ہو اور موقع پاتے ہی اس پر حملہ کر دے گی۔ البتہ ناشتے میں اس نے اپنی تشویش کو ذرا بھی آڑے آنے نہیں دیا تھا۔ ناشتے کے بعد چائے نوشی کے دوران اس نے التجائی۔

”صاحب ہم کو جانے دو..... میرا بیوی بچہ پریشان ہو گا۔“

”فکرت کرو تم کو جانے دیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ابھی ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں

تمہاری خدمت کا پورا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔“

اس نے دہشت زدہ نظروں سے پستول کی طرف دیکھا۔ ”صاحب تم ہم کو گولی تو نہیں مارو گے۔“

میں نے نظروں میں بیٹو کو اشارہ کیا اور اس نے پستول اپنے لباس میں چھپا لیا۔ ”ہم بلاوجہ کسی کو نقصان پہنچانے والے لوگ نہیں ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا اور راج کنور کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرا بدترین دشمن ہے لیکن یہ ہمارے ساتھ زندہ ہے اور اس سے پوچھو میں نے کتنی بار اس کی جان بچائی ہے اور کتنی بار میں اسے مار سکتا تھا لیکن نہیں مارا۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ راج کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم فکرت کرو تم کو کچھ نہیں ہو گا۔“

آئی کن کی مزید تسلی کے لیے میں نے اسے اس کا مزید تین دن کا معاوضہ بھی دیا تھا۔ نوٹ پا کر وہ خوش ہو گیا تھا۔ ناشتے کے بعد پراوین برتن لینے آیا اس نے کہا۔ ”ماما آپ کو کافی پر بلارہی ہیں۔“

شاید وہ اس طرح شکر یہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔“

پراوین کے جانے کے بعد بیوہ معنی خیز میں مسکرایا۔ ”بیٹا دیوی آپ پر مہربان لگتا ہے۔“

میں نے بیوہ کو بتایا کہ اس کی طبیعت خراب تھی اس حالت میں بھی میں نے اس کی مدد کی وہ اسی کا شکر یہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔ اس وضاحت پر بیوہ کے چہرے پر مزید شرارت بھرے تاثرات نمودار ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا میں نے کہا۔ ”لگتا ہے مئے سفیر کی صحبت نے تم پر اثر ڈالا ہے۔“

سفیر کے نام پر اس نے برا سامنہ بنایا۔ ”ہم سفیر بھائی جیسا نہیں ہے۔“

”تب باتیں اس جیسی کیوں کر رہے ہو؟“

بیوہ کے ذم کو تقریباً اڑتیس گھنٹے گزر گئے تھے اور اب تکلیف ایسی نہیں تھی کہ اسے پین کھل لینا پڑتی۔ معمولی تکلیف تھی جسے وہ برداشت کر رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی اس طرح وہ جلدی عادی ہو جاتا کیونکہ ذم مکمل طور پر بھرنے میں ایک ہفتہ دس دن لگ سکتا تھا۔ راج کنور ہوش میں آگیا تھا میں نے پوچھا۔ ”تمہیں یاد ہے گزشتہ دو دن میں کیا کیا ہوا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”سب یاد ہے، بس اس وقت میرا ذہن قابو میں نہیں تھا۔ یہ اس دوا کا اثر ہے نا جو تم

انکشن سے دیتے ہو؟“

”ہاں یہ قوت ارادی کو ختم کر دیتی ہے۔“

”میں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری بات پر عمل کرتا رہا۔“

”راج تم جانتے تھے کی سادی ہمارے پاس ہے؟“

”میں بتا تو چکا ہوں۔“

”تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تم اسے مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے؟“

”ہاں لیکن دوسرے معاملات میں الجھ کر مجھے موقع نہیں ملا۔“

”وہ تمہاری سگی بہن ہے۔“

”وہ میری بہن تھی، اب وہ میرے دشمنوں کے ساتھ ہے۔“

”یعنی تمہیں اب بھی موقع ملے گا تو تم اسے قتل کر دو گے؟“

اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، کم سے کم اس وقت میرا یہی خیال ہے۔

آگے کا مجھے نہیں معلوم۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تم نے اچھا کیا جو کھل کر بات کر لی اب میں ذرا کھل کر بات کر دوں گا۔ بڑے

کنور نے سادی کو پاکستان سے اغوا کر لیا ہے۔“

راج کنور چونکا۔ ”لیکن کیوں.....؟ اس کا ارادہ سادھنا کو چھیڑنے کا نہیں تھا۔“

”یہ درست ہے، اس نے مجھے مجبور کرنے کے لیے یہ کام کیا ہے اور دو دن پہلے شام کے وقت سادی

یہاں پہنچ گئی ہے۔ میں نے خود اسے کنور ہٹس کے ہیلی پڈ پر اترتے دیکھا ہے۔“

راج کنور ڈرا بے چین ہو گیا۔ ”تمہیں یقین ہے تو ٹھیک ہو گا لیکن تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں سادی کو واپس لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہارے اور سنکاری کے توسط سے بڑے کنور کو علم ہو گیا ہے کہ میں واپس آ گیا ہوں۔“

”میں نے کچھ نہیں بتایا، میں دوا کے زیر اثر تھا پھر بڑے کنور نے ڈوریاں ہلائیں اور ابجھی والے مجھے اس کے آدمیوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ البتہ سنکاری سے انہوں نے تمہارے بارے میں معلوم کر لیا ہو گا۔“

”راج کنور تم جانتے ہو میں دشمن کو بھی بے وجہ صرف اپنے کسی جذبے کی تسکین کے لیے مارنے کا قائل نہیں ہوں لیکن میں منافقانہ اہنسا کا پجاری بھی نہیں ہوں۔ مجھے محسوس ہو گا کہ اگر تم آئندہ میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے خطرہ بنو گے تو میں مار دوں گا۔ اب تک میں تمہیں اپنے ساتھ سی لیے رکھے ہوئے ہوں، کئی بار تمہاری جان میری وجہ سے بچی ہے۔ یہ سب اس لیے کہ شاید کبھی تم میرے کام آ جاؤ۔ اب تمہارے پاس چار گھنٹے کا وقت ہے تم سوچ لو کہ تم کس طرح میری مدد کر سکتے ہو اور مجھے قائل کر لو دوسری صورت میں.....“

”تم مجھے مار دو گے؟“ راج کنور نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

میرے بجائے بیٹو نے جواب دیا۔ اس نے پستول نکال کر اسے راج کنور کی طرف کیا اور یوں پستول سے نشانہ لینے لگا جیسے فرضی مشق کر رہا ہو مگر اس کی حرکت راج کنور کو سمجھانے کے لیے ضرورت سے زیادہ کافی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہارے پاس چار گھنٹے ہیں۔“

ان دونوں کو انجکشن نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے پاس ایک ہی سیٹ رہ گیا تھا۔ دوسرے انجکشن بھی تھے لیکن ڈاکٹر امرتسر کے مطابق وہ زیادہ مؤثر نہیں تھے اس لیے اب میں کچھ وقت گزار کر ضرورت کے وقت انہیں انجکشن دیتا تب تک یہ گن پوائنٹ پر بھی رکھے جاسکتے تھے۔ میں جانے لگا تو آئی کن نے کہا۔ ”صاحب آپ اجازت اور موبائل دو تو میں اپنی بیوی کو بتا دوں۔“

”تم بتا چکے ہو وہ اتنی جلدی پریشان نہیں ہوگی۔“

اس نے لجا جت سے کہا۔ ”صاحب وہ پریکٹسٹ ہے، صاحب تھوڑی بات کروں گا۔“

اس بار میں نے اسے موبائل دے دیا اور خبردار کیا۔ ”کوئی الٹی سیدھی بات مت کرنا ورنہ تمہارا بچہ یتیم پیدا ہوگا۔“

”ہم نہیں کرے گا۔“ اس نے کہا اور اپنی بیوی کو کال کرنے لگا۔ اس نے دو منٹ بات کی اور اس دوران میں کوئی مٹھکوں بات نہیں کی۔ بات کر کے اس نے موبائل مجھے واپس کر دیا۔ ”آپ کا بہت شکریہ صاحب۔“

میں بیٹو کو ہوشیار رہنے کا کہہ کر باہر آیا اور کال ٹیل بجائی۔ ایک منٹ بعد سیتا کی بیٹی نے دروازہ کھولا۔ وہ بڑی پیاری بچی تھی۔ نقوش میں ماں پر گئی تھی اور رنگ باپ کی طرح بہت گورا تھا۔ میں اندر آیا تو سیتا اوپر سے نیچے آرہی تھی۔ وہ مجھے کچن میں لے آئی۔ ”تھینک یو کہ آپ نے میری دعوت قبول کی؟“

”شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ کافی مجھے بہت پسند ہے۔“

”میں جان گئی ہوں۔“ اس نے کہا اور کافی تیار کرنے لگی۔ یہ نہیں کیف گولڈ تھی۔ اس کی مہک اور ذائقہ دونوں لا جواب ہیں۔ سیتا نے ساڑھی بدل لی تھی صبح وہ سادہ ساڑھی میں تھی لیکن اس وقت اس نے دھنک رنگ

رہی ساڑھی پہن لی تھی۔ سیاہ رنگ کے بلاؤز میں اس کا سنہری رنگ دمک رہا تھا۔ وہ اپنے لیے بھی کافی تیار کر کے لائی تھی۔ اس نے مگ میرے سامنے رکھا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ ”آپ ارون کمار سے مل چکے ہیں اور آپ نے دیکھ لیا کہ وہ کیسے مجھے تنگ کر رہا ہے۔“

اس کی بات پر میں محتاط ہو گیا۔ ”جی اور مجھے افسوس ہے کہ آپ مشکل میں ہیں۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عذاب سے کیسے بچوں؟..... ارون یہاں کا طاقتور اور دولت مند شخص ہے۔ اس کے پاس بد معاشوں کا ایک ٹولہ ہے۔ قصبے کے عام لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور پولیس اس کی دولت کی وجہ سے اس کے پیچھے دم ہلاتی ہے۔ میں کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتی۔ میرے بھائی شریف لوگ ہیں۔ ان میں بد معاشوں سے لڑنے کی سکت نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے وہ اس مکان کے چکر میں ہے کسی طرح اسے آپ سے واپس حاصل کر لے۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”بالکل یہی بات ہے، آپ نے کیسے جانا؟“

”جب آپ بے ہوش ہوئی تھیں اور میں آپ کو بیڈروم تک پہنچا کر واپس جا رہا تھا تب میرا اس سے سامنا ہوا تھا اور اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا۔“

”بالکل یہی بات ہے، اس کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے اس کے باوجود اس سے برداشت نہیں ہو رہا کہ یہ مکان میرے اور بچوں کے پاس رہے۔ وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے کہ میں مکان اس کے حوالے کر دوں تو وہ میرا پیچھا چھوڑ دے گا لیکن یہ مکان میرے بچوں کا مستقبل ہے۔“

”آپ کے بچوں کا مستقبل آپ ہیں اور یہ جگہ زیادہ بڑی نہیں ہے آپ چاہتی ہیں کہ ان کا مستقبل بنے تو انہیں یہاں سے لے جائیں اور یہ مکان سیل کر دیں۔“

”میں دہلی میں رہی ہوں، وہاں میری موسیٰ تھیں۔ ماما جی کے مرنے کے بعد انہوں نے میری پرورش کی پھر ان کا بھی دیہانت ہو گیا تو میں یہاں آنے پر مجبور ہوئی اور ارون کے چکر میں پھنس گئی۔“

”غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ آپ اس غلطی کو اس طرح ٹھیک کر سکتی ہیں کہ واپس دہلی چلی جائیں اور وہاں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں، آپ پڑھی لکھی ہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”دہلی یونیورسٹی میں ماسٹر کر رہی تھی جب موسیٰ کا دیہانت ہوا۔ ماسٹر ادھورا چھوڑ کر یہاں آنا پڑا تھا۔“

”آپ واپس جا کر ماسٹر مکمل کر سکتی ہیں۔ دہلی بڑا شہر ہے وہاں مواقع زیادہ ہیں۔ یہاں تو آپ کو جاب بھی نہیں ملے گی۔ پے انگ گیٹ سے تو کام نہیں چلتا ہوگا۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”یہی بات ہے، میرے پاس واحد چیز یہ مکان ہے۔ میں اسے سیل کرنا چاہتی ہوں لیکن ارون کے ڈر سے کوئی لینے کو تیار نہیں ہے۔“

”آپ کسی اسٹیٹ والے کی مدد حاصل کریں وہ بکوا سکتے ہیں ان کو زیادہ کمیشن کا لالچ دیں۔“

”یہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کئی گاہک آئے اور لینے کو بھی تیار ہو گئے مگر ارون نے انہیں بھگا دیا۔ اب تو وہ ایک اور چکر میں ہے۔“ کہتے ہوئے سیتا کا رنگ سرخ ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے

اسے دیکھا تو اس نے مشکل سے کہا۔ ”وہ میرے چکر میں ہے۔“

میں نے انجان بن کر کہا۔ ”لیکن آپ کو ڈائیورس دے چکا ہے۔“

”وہ قہر ڈکلاس شخص ہے اس کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ سینا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”وہ

عزت بے عزتی کا مطلب ہی نہیں سمجھتا ہے۔ سب کو اپنی طرح سمجھتا ہے۔“

میں ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سینا مجھے یہ سب کیوں بتا رہی تھی۔ کیا وہ صرف دل کی بات کر رہی تھی یا پھر مجھ سے کسی قسم کی مدد طلب کر رہی تھی۔ میں قبل از وقت کوئی تاثر دے کر غلط فہمی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے مناسب رد عمل دیتے ہوئے کافی کی چشکیاں لیتا رہا۔ سینا کے بچے پراوین اور سوہیتا اسکول میں پڑھ رہے تھے، اس کی گزر اوقات بے انگ گیسٹ اور بھائیوں کی مدد سے ہوتی تھی۔ وہ خود ملازمت کرنا چاہتی تھی لیکن یہاں کوئی ملازمت تھی ہی نہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ بچے کے پورے حصے کو ہوٹل میں بدل دے لیکن اس کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ اصل مسئلہ ارون کا تھا وہ چاہتی تھی کہ کسی صورت اس سے نجات مل جائے۔

اس نے کھل کر نہیں کہا لیکن اس کی باتوں سے ایسا تاثر آیا جیسے وہ ارون سے جانے چھڑانے میں کسی کی مدد چاہتی ہو کیونکہ پولیس ارون کی مٹھی میں تھی اور دوبارہ عدالت تک جانے کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ ارون کا دباؤ بھی تھا۔ مگر وہ مکان بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے مسئلے یہی تھے اور اسی لیے میں نے اسے یہ مشورہ دیا تھا۔ جس طرح اس نے اپنی بات کی تھی اسی طرح میں نے بھی کھل کر کہے بغیر اپنی بات کہہ دی کہ میں خود بہت مشکل میں تھا اور اسی وجہ سے عارضی طور پر یہاں رکھا ہوا تھا۔ میں کسی چکر میں پڑنے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ سینا کا چہرہ سمجھ سا گیا تھا۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ نہ جانے کیا بات تھی جو اس نے مجھ سے مدد کی توقع کی تھی۔ وہ اچھے مزاج کی عورت تھی۔ اگر اس کے کردار میں خرابی ہوتی تو وہ ارون کی بات نہ مان لیتی۔ اس لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کسی اور نکتہ نظر سے مجھ سے بات کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”میں اور میرے ساتھی شاید ایک یا دو دن اور یہاں رکھیں گے پھر ہمیں جانا ہوگا۔ جب تک ہم یہاں ہیں کوئی آپ کو یا آپ کے بچوں کو تنگ نہیں کر سکے گا۔ اس سے آگے کا میں کہہ نہیں سکتا۔“

میری اس بات سے اس کے چہرے پر کسی قدر اطمینان آیا تھا۔ میں کافی کا شکر یہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ سینا نے گھر کو بہت صاف ستھرا اور فرینے سے رکھا تھا۔ باغ بھی ہرا بھرا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی اچھی خاصی مالیت تھی۔ یہ تقریباً نصف کنال رقبہ پر تھا۔ پہاڑی قصبہ ہونے کے باوجود یہاں ہر سہولت تھی۔ اس علاقے میں ہر گھر خوب صورت اور بڑا تھا۔ یہ امرا کی آبادی تھی۔ ممکن ہے یہاں بہت سارے گھر میدانی علاقوں میں رہنے والے امرا کے ہو سکتے تھے جو گرمیاں گزارنے یہاں آتے ہوں گے۔ شاید اسی وجہ سے اس جگہ زیادہ چہل پھل نہیں تھی۔ سامنے سڑک سے بہت کم لوگ یا گاڑیاں گزرتی دکھائی دیتی تھی۔ میں واپس آیا تو بیٹہ اونگھ رہا تھا۔ وہ رات سے جاگ رہا تھا مگر اونگھتے ہوئے بھی وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ”تم سو جاؤ۔“ بیٹہ نے مشورے پر عمل کیا اور لیٹ کر کچھ ہی دیر میں خراٹے لینے لگا۔ دوپہر میں وہ کچھ دیر کے لیے اٹھا جب سینا نے سوئٹ ڈش بھیجی تھی جو خوبانی، سیب اور شہتوت ملا کر بنائی گئی تھی اور بہت مزے کی تھی۔ پراوین نے

بتایا کہ یہ اس کی ماما کی طرف سے تھی یعنی اس کا کوئی چارج نہیں لیا جائے گا۔ رات کے کھانے کا میں نے ملاقات میں بتا دیا تھا اور رقم بھی دے دی تھی۔ دوپہر کا کھانا گول کرنے کا مقصد ہماری یہاں موجودگی کو کم سے کم ظاہر کرنا تھا۔ مگر اس کے باوجود آمد و رفت کم نہیں ہوئی تھی۔ کمراباہر کی طرف تھا اور سڑک پر آتے جاتے لوگ با آسانی برآمدے تک دیکھ سکتے تھے۔ مجھے خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اب سیتا سے ملاقات ہوئی تو میں اس سے درخواست کروں کہ ایسے تمام کاموں کے لیے گھر کے اندر کھلنے والا دروازہ استعمال کرے۔ بے شک صرف مخصوص وقت کے لیے کھولے اور پھر بند کر لے۔

میرا مقصد تھا کہ سامنے کی طرف سے آنا جانا کم سے کم ہو۔ ہم خود دن میں صرف دو بار ہاتھ روم جاتے تھے۔ ایک صبح سویرے اور دوسرے سورج غروب ہونے کے بعد، یہ دونوں وقت ایسے تھے جب سڑک پر اور آس پاس لوگ کم نظر آتے تھے۔ پراوین شام کی چائے لایا تو میں نے اس کے توسط سے سیتا کو پیغام بھجوادیا۔ راج کنور سارا دن خاموش پڑا رہا تھا۔ چائے نوشی کے دوران اس نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”شہناز تم کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے تمہارے گرد و خطرات گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔“

”مجھے اندازہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر میں فی الحال یہاں رکنے پر مجبور ہوں۔“

”اس کی وجہ ہے؟“ راج کنور نے بیتو کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی وجہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے دوپہر میں تمہیں وقت دیا تھا اور اس سے زیادہ ہی وقت گزر گیا ہے۔“

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تمہاری مدد کیسے کروں کیونکہ میں بیلنس کی حد تک تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہوں۔ وہاں اب میرا کوئی وفادار نہیں رہا ہے۔“

”تب تم میرے لیے بیکار ہو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔“ میں نے سر دلچے میں کہا۔ ”تم مدد نہیں کر سکتے تو بیکار کے بوجھ ہو، تم سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہی مناسب ہوگا۔“

”ہم بھی یہی کہہ رہا ہے ادھر سے نکلتے ہی اسے کسی کھائی میں ڈالو۔“ بیتو نے مشورہ دیا۔

”میرا خیال ہے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“

راج کنور دہشت زدہ ہو گیا۔ اس سے زیادہ آئی کن خوفزدہ نظر آنے لگا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ”صاحب میرا قصور نہیں ہے۔“

”تم نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن اگر تم نے ہمارے بارے میں زبان کھولی تو پھر ہم تمہارے گھر بھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ مشکل نہیں ہے تمہارے ڈرائیونگ لائسنس پر پتا دیکھ لیا ہے اگر تم کہیں اور رہتے ہو تب بھی تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہمیں خود نہیں آنا پڑے گا صرف چند ہزار خرچ ہوں گے اور کرائے کے قاتل آکر تم سمیت تمہارے پورے گھر کا خاتمہ کر دیں گے۔“

آئی کن کا چہرہ سفید پڑ گیا اور آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ”بدحا کا سونند میں کسی سے کچھ نہیں کہے گا صاحب۔“

”اسی میں تمہاری عافیت ہے۔“

شام سات بجے ڈاکٹر گپتا خود آ گیا تھا۔ اس نے بیٹو کی پٹی ہٹائی تو زخم کی حالت دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”مزید ٹریٹمنٹ کا ضرورت نہیں ہے بس اوپر سے پٹی رکھ کر ٹیپ کرنا ہو گا زخم کو رگڑ نہ لگے۔“

”دوا کب تک کھانی ہے؟“

”ابھی پورا ہفتہ کھانی ہے۔ میں نے تین دن کی دی تھی۔“

”باقی چار دن کی اور دے دو۔“ بیٹو نے کہا۔ ”اب پین کھڑ نہیں کھانا۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، جوان آدمی ہے تو فوراً درد برداشت کر لے گا۔“ ڈاکٹر گپتا نے اپنے بیگ سے اینٹی بائیوٹک کپسول کا ایک پتا اور نکال کر دیا۔ وہ ضروری دوائیں ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے کچھ خشک پٹیاں اور میڈیکو ٹیپ کا ایک رول بھی دیا۔ میں نے رکھ لیا کہ بعد میں کبھی کام آئے گا۔ میں نے ڈاکٹر سے زخم صاف کرنے والا محلول اور خشک کرنے والا پاؤڈر بھی لیا۔ وہ حیران تھا کہ میں بلاوجہ یہ سب کیوں لے رہا ہوں مگر اس نے انکار نہیں کیا میں اسے قیمت دے رہا تھا۔ یہ اچھی خبر تھی کہ بیٹو کا زخم تیزی سے بھر رہا تھا۔ اب کوئی ایمر جنسی ہوتی تو ہم کل بھی یہاں سے جا سکتے تھے ورنہ میرا ارادہ پرسوں تک نکلنے کا تھا۔ اس شام بھی موسم ایراؤڈ تھا اور نوبت جتنی بارش شروع ہو گئی تھی۔ آج گزشتہ روز کی نسبت تیز بارش تھی اور بادل بھی گرج رہے تھے۔ تیز ہواؤں کا شور الگ ماحول پر حاوی ہو گیا تھا۔ آٹھ بجے کھانے اور چائے کے بعد سب اوگھر رہے تھے۔

سیتانے ہمیں رات کا کھانا اندر والے دروازے سے فراہم کیا تھا۔ وہیں سے ٹرائی لائی اور برتن واپس لے گئی۔ سامنے سے آنا جانا نہیں ہوا تھا۔ سیتانے کہا کہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہو اسی دروازے پر ناک کر کے مانگ لیا کریں۔ وہ معاوضہ لے رہی تھی مگر اسے پوری طرح حلال بھی کر رہی تھی۔ کھانا بہت اچھا ہوتا تھا۔ چائے کافی دونوں لاجواب بناتی تھی۔ دوپہر میں میٹھا بھی بہترین تھا۔ وہ یقیناً بہت محنت سے کھانا بناتی تھی۔ برتن اعلیٰ درجے کے اور صاف سترے ہوتے تھے۔ ہمیں تو ہونٹوں سے زیادہ یہاں آرام تھا۔ بے شک ایک کمرے میں چار افراد تھے لیکن اس میں بھی کوئی مشکل نہیں تھی۔ فرش پر دبیز اور آرام دہ قالین تھا۔ صاف سترے گاؤٹیکے اور کبل تھے۔ مسلسل آرام، بہترین علاج اور خوراک سے بیٹو کی توانائی بھی بحال ہو گئی تھی۔ اس نے شام سے دایاں ہاتھ ہلانے اور اس سے کام لینے کی مشق شروع کر دی تھی۔ میں نے اسے بھاری چیزیں اٹھانے سے منع کیا تھا ورنہ وہ شاید یہ کام بھی شروع کر دیتا۔ میگزین نکال کر وہ خالی پستول سے مشق کر رہا تھا اور جان بوجھ کر راج کنور کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف پستول کر کے ٹریگر دباتا اور اس کی جان پر بن آتی تھی۔

دس بجے میں باہر آیا اور آئی کن کی جیب میں قصبے کا ایک راؤنڈ لگا کر آیا۔ مقصد ذرا جسم کھولنا اور جیب کی بیٹری کو رینک کنڈیشن میں رکھنا تھا۔ اس دوران میں بارش جاری تھی مگر لینڈ کرورز کے بہترین ٹائر سڑک پر گرپ کر رہے تھے اور مجھے ہلکی رفتار سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ جیب کا ٹینک دو تہائی بھرا ہوا تھا اور پیچھے بھی ایک دس لیٹر کا کین رکھا تھا۔ میں واپس آیا تو کسی قدر بیگ گیا تھا۔ جیکٹ بھرا شوٹ کی تھی اس لیے پانی اندر نہیں گیا بس بال اور چہرہ بھیگا تھا۔ بیٹو فکر مند تھا اس نے آتے ہی پوچھا۔ ”آپ کہاں گیا تھا؟“

”جیب لے کر نکلا تھا۔ کیوں کیا ہوا؟“

”شوبی ابھی اندر سے تھوڑا آواز آیا جیسے کچھ گرا ہو۔ پھر بچہ بھی چلایا تھا۔“

”ہو سکتا ہے بچے کو چوٹ لگی ہو؟“

”نہیں شوبی اس کے بعد بالکل خاموشی ہے بچہ روتا تو یا سیتا دیوی کچھ کہتا پر ایسا لگ رہا ہے سب سو گیا ہے۔“

میرا سیتا کے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اگر اس کے گھر میں کچھ ہوا تھا اور بات پولیس تک جاتی تو ہم بھی اس کی لپیٹ میں آ سکتے تھے پولیس کے ہاتھ نہ بھی آتے تو تب بھی ہمیں بھاگنا پڑتا اور اس کے بعد سکون ختم ہو جاتا۔ بیٹو کا شک نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا اگر سیتا کے گھر میں کچھ غلط ہوا تو جلد یا بدیر ہم بھی اس میں ملوث ہو جاتے۔ میں نے درمیانی دروازہ چیک کیا وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا۔ ”دروازہ اندر سے بند ہے۔“

وہ چونک گیا۔ ”شوبی سیتا دیوی نے دروازہ کھلا چھوڑا تھا۔ یہ کس نے بند کیا؟“

اس کا ممکنہ جواب یہ تھا کہ اندر آنے والے یا والوں نے یہ دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ ہماری طرف سے مداخلت کا خدشہ نہ رہے۔ ”تم یہیں رکو اور ہوشیار رہو۔“ میں نے بیٹو سے کہا اور باہر نکل آیا۔

میں نے پہلے داخلی دروازے سے سن گن لی مگر اس طرف سنا تھا۔ تالے کے سوراخ سے اندر لاؤنج میں تاریکی نظر آرہی تھی۔ جب کہ عام طور سے یہاں روشنی ہوتی تھی۔ میں گھوم کر اور برآمدے سے اتر کر مکان کے بائیں طرف آیا۔ یہاں لاؤنج اور کچن کی کھڑکیاں تھیں ان سے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ باہر شور تھا اس لیے اگر اندر کچھ آوازیں ہو رہی تھیں تو وہ اس شور میں باہر سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں پیچھے کی طرف آیا یہاں کچن کا دروازہ تھا اور اس کے ساتھ نشست گاہ کی کھڑکی تھی۔ نشست گاہ کے ساتھ ہی میز بھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ عقبی دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ میں کھڑکیاں بھی چیک کر رہا تھا۔ ان پر گرل نہیں تھی اس لیے اگر کوئی کھڑکی کھلی ہوتی تو میں اندر جا سکتا تھا۔ لاؤنج اور کچن والی کھڑکیاں بند تھیں مگر جب نشست گاہ والی کھڑکی چیک کی تو اس کا ایک پٹ کھلا پایا۔ اسے اندر سے کھٹکا نہیں لگایا تھا۔ شاید کسی بچے نے کھول دیا تھا اور پردے کی وجہ سے پتا نہیں چلا کہ کھٹکا کھلا ہے۔ میں نے آہستہ سے پٹ اندر دھکیلا اور ساتھ ہی پردہ پیچھے کیا۔ کوشش کر کے اتنی جگہ بنا لی کہ اندر جا سکوں۔

میرے جوتے مٹی اور کچڑ زدہ ہو رہے تھے اور میرے لباس سے پانی ٹپک رہا تھا۔ سیتا کے قالین کا حشر ہو رہا تھا۔ میں نے اندر آ کر کھڑکی بند کی اور دبے قدموں لاؤنج کی طرف آیا۔ نشست گاہ کا دروازہ اوپن تھا اور پردے کے طور پر موتیوں کی جھال لگی ہوئی تھی۔ میں نے احتیاط سے کونے سے جھال ہٹا کر لاؤنج میں قدم رکھا۔ اندر آنے کے بعد باہر کا شور بہت کم سنائی دے رہا تھا اور میرے کان مکان میں ہونے والی کسی آہٹ پر مرکوز تھے لیکن اب تک سنا ہی تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں بیٹو نے غلط تو نہیں سن لیا تھا اور میں بلاوجہ یہاں گھس آیا تھا۔ اگر سیتا یا اس کا کوئی بچہ مجھے یہاں دیکھ لیتا تو میں مشکل میں پڑتا یا نہ پڑتا لیکن میری ساکھ ضرور خراب ہو جاتی میں مشکوک بن جاتا۔

میں سوچتا رہا پھر میں نے جوتے اتارے اور دبے قدموں اوپر کی طرف بڑھا۔ نیچے میں دیکھ چکا تھا کہ

کوئی نہیں ہے یہاں چھپنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ میں نے پستول نکال لیا تھا اور بہت آہستگی سے بیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ یہ لکڑی کی تھیں اور زیادہ زور سے وزن ڈالنے پر چڑھاتیں۔ میں ابھی نصف بیڑھیوں پر تھا کہ مجھے اوپر سے گھٹی ہوئی نسوانی آواز آئی جیسے کسی کا منہ بند ہو اور وہ ناک سے آواز نکالے۔ اوپر دو بیڑھیں تھیں ایک بیڑھا کا تھا اور دوسرا یقیناً بچوں کا تھا۔ ہاتھ روم کا من تھا یہ اس ہاتھ روم کے اوپر تھا جسے نیچے ہم استعمال کرتے تھے۔ دونوں بیڑھیں ہاتھ روم کے ساتھ ساتھ تھیں۔ بیڑھیاں گھوم کر چارہ تھیں اور یہ لاؤنج میں داخل ہونے کے عین اوپر نکلتیں۔ جہاں سے بیڑھیاں گھوم رہی تھیں وہاں سے بیڑھیں کے دروازے نظر آ رہے تھے اور اگر وہاں کوئی ہوتا تو مجھے دیکھ لیتا اس لیے میں جھک کر نظروں سے بچتا ہوا اوپر آیا اور پھر کونے سے اوپر جھانکا مگر دونوں کمروں کے دروازے بند تھے اور وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں اوپر آیا اور بیڑھا کے کمرے کے دروازے سے کان لگائے۔ چند لمحوں کے بعد سناں ہا پھر دبی ہوئی مردانہ آواز آئی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں لیکن لہجہ نشیلا تھا۔ میں نے بہت آہستہ سے ہینڈل گھمایا دروازہ کھلا تھا کیونکہ آزاد ہوتے ہی وہ اندر کی طرف کھلا تھا۔ میں نے پستول آگے کیا اور ایک دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ارون بیڑھے کے پاس کھڑا تھا اور نہایت شرمناک حالت میں تھا۔ بیڑھا بستر سے بندھی تھی اور حالت اس کی بھی اچھی نہیں تھی۔ ارون نے مجھے دیکھتے ہی منہ کھولنا چاہا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر پستول کی نال اس کے کھلمنہ میں رکھ دی۔ غالباً میرے تاثرات بھی خونخوار نہ تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور پھر اچانک وہ لہرا کر نیچے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اگر وہ دھوکا دے رہا تھا تو میں دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے نہایت بے دردی سے اس کے سر پر وار کیا اور وہ اب سو فیصد بے ہوش تھا۔ اس سے مطمئن ہو کر میں بیڑھا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی ساڑھی اور بلاؤز غائب تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک مختصر سا پٹنی کوٹ اور انڈر گارمنٹ تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اس کا منہ کھولا اور پھر اس کے ہاتھ آزاد کیے۔

”میں اسے باہر لے جا رہا ہوں تم اپنا حلیہ درست کر کے آؤ، ویسے تم ٹھیک ہونا؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے بچے.....“

”میں دیکھتا ہوں ویسے ان کو پتا نہ چلے تو اچھا ہے۔“

ارون کے کپڑے وہیں بکھرے ہوئے تھے میں نے اس کے کپڑے اس پر ڈالے اور اسے ٹانگ سے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں نے بہ مشکل اسے پتلون پہنائی۔ یہ بھی صرف ستر پوشی کے لیے۔ اتنی دیر میں بیڑھا کپڑے پہن کر آگئی تھی۔ اس نے نفرت سے ارون کو دیکھا اور پھر اس پر تھوک دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ اکیلا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم، میں سو رہی تھی۔ مجھے کسی بچے کے چلانے کی آواز آئی۔ میں باہر نکلی اور بیڑھیوں سے نیچے آئی تھی کہ اس نے ڈرائنگ روم سے نکل کر میرے منہ پر کچھ رکھا اور مجھے ہوش نہیں رہا۔ ہوش آیا تو میں بستر پر بندھی تھی.....“ کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ کس حالت میں تھی۔

”تم بچوں کو دیکھو کہیں وہ بھی بے ہوش نہ ہوں۔“

وہ جلدی سے بچوں کے کمرے کی طرف لپکی۔ فوراً ہی اس کی آواز آئی وہ بیٹے اور بیٹی کو پکار رہی تھی پھر

”پلیز انہیں دیکھو یہ جاگ نہیں رہے۔“

میں بچوں کے کمرے میں آیا۔ دونوں بچے گہری بے ہوشی میں تھے ان کے سانس اور دل کی دھڑکن ذرا سست تھی مگر خطرے کی علامت نہیں تھی۔ ان کے منہ سے کلوروفارم کی بو آرہی تھی۔ ارون نے کلوروفارم استعمال کیا تھا۔ مجھے خیال آیا میں نے سیتا سے پوچھا۔ ”یہ بے ہوش ہیں پھر تم اتنی جلدی کیسے ہوش میں آگئیں۔ میرا خیال ہے یہ سب آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہوا ہے؟“

سیتا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ”مجھے ہوش میں آتے ہوئے کھٹی سی بو کا احساس ہوا تھا۔“
میں اس کے کمرے میں آیا سیتا میرے پیچھے تھی۔ میری تجسس نگاہیں دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”کیا تلاش کر رہے ہیں؟“

”یہ۔“ میں نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی چھوٹی سی بوتل اٹھائی یہ مشکل سے تین انچ لمبی اور انچ بھر قطر کی تھی میں نے ڈھکن ہٹا کر سونگھا اور امونیا کی تیز بھٹی بو نے تصدیق کر دی۔ ”یہ امونیا ہے وہ تمہیں اس کی مدد سے ہوش میں لایا تھا۔ اب میں اسے لے جا رہا ہوں اور تم بچوں کو ہوش میں لاؤ اور اگر انہیں تھکی کی شکایت ہو تو کرنے دینا۔ پانی پلاتا۔ پھر یہ بوتل مجھے نیچے لا دینا۔“

”آپ اسے کہاں لے جا رہے ہیں پولیس کو دینے؟“
میں رک گیا۔ ”سیتا میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔ اگر تم اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتی ہو تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ بے ہوش ہے اور میں اسی وقت اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے چلا جاؤں گا۔“
”نہیں..... نہیں۔“ اس نے بے تابی سے کہا۔ ”پلیز آپ نہ جائیں..... مجھے معلوم ہے پولیس اسے چھوڑ دے گی اور یہ دوبارہ آجائے گا۔“

”یہ اندر کیسے آیا؟ کیا تم نے گھر کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند نہیں کی تھیں؟ میں خود نشست گاہ کی کھلی رہ جانے والی کھڑکی سے آیا ہوں لیکن یہ وہاں سے نہیں آیا ہے۔“
”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”میں باہر گیا تھا۔ میرے ساتھی نے تمہارے بچے کی چیخ سنی تھی۔“
”میں آپ کی احسان مند ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر آپ نہ بچاتے تو آج میں خود کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی۔“

”بچانے والا اوپر بیٹھا ہے۔“ میں نے مبہم انداز میں کہا۔ ”تم بچوں کو دیکھو میں اسے لے جا رہا ہوں بچوں کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ وہ بچے ہیں بعد میں کسی اور کے سامنے بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”میں خیال رکھوں گی۔“ اس نے کہا میں نے ارون کو بغلوں سے پکڑ کر اٹھایا حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ اسے اوپر سے دھکا دے دوں یا ناگوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جاؤں۔ مجھے کسی کو قتل کرنے والے سے اتنی نفرت محسوس ہوتی ہے جتنی کسی عورت سے زیادتی کرنے والے سے ہوتی ہے۔ ارون کو مُردہ کتے کی طرح کھینچتا ہوا میں نے اسے لاؤنچ میں کھٹنے والے دروازے سے اندر لایا۔ بیٹو بے تابی سے میرا منظر تھا۔ اس نے بے ہوش ارون کو دیکھ کر پوچھا۔

”یہ کیوں ہے؟“

”سیتا دیوی کا سابق شوہر نامدار..... اسی کے چکر میں آیا تھا، کلوروفارم سونگھا کر سب کو بے ہوش کر دیا تھا مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“ میں نے ارون کو رسی سے باندھتے ہوئے کہا۔ رسی بیڑو سامان کے ساتھ لایا تھا۔ راج کنور نے مسکرا کر کہا۔

”ایک بوجھ اور اٹھالائے اب اسے بھی لیے لیے پھر دے۔“
 ”نہیں جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو تمہارے ساتھ اس کا بھی فیصلہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ارون کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے اور پھر اس کے منہ پر مضبوط میڈیکوٹیپ لگا دیا۔ بیڑو نے پوچھا۔
 ”سیتا دیوی، اس کا بچہ ٹھیک ہے؟“

”سیتا ٹھیک ہے اور وہ بچوں کو دیکھ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک منٹ میں اپنے جوتے لے آؤں۔“
 میں لاؤنج میں آیا اور نشست گاہ کے پاس رکھے جوتے اٹھائے تھے کہ اوپر سے سیتا نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے آئی۔ ”دونوں ہوش میں آگئے ہیں، میں نے پانی پلایا تو ان کی حالت ٹھیک ہو گئی۔ میں یہ دینے آئی تھی۔“ اس نے امونیا کی بوتل مجھے تھما دی۔ ”ان کو کچھ دے سکتی ہوں؟“
 ”ہاں سیاہ چائے یا کافی دو اس سے ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”میں بتاتی ہوں آپ کے لیے بھی بناؤں؟“
 ”زحمت ہوگی ہم چار افراد ہیں۔“
 ”میرا خیال ہے باقی سو رہے ہوں گے آپ یہیں آکر پی لیں۔“
 ”نہیں وہ جاگ رہے ہیں۔“

”تب میں سب کے لیے بناتی ہوں لیکن آپ یہیں آئیے گا۔“
 مجھے عجیب لگ رہا تھا، اگرچہ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ مجھے کوئی خاتون لکرائی اور میں نے کسی معاملے میں اس کی مدد کی ہو مگر پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بیڑو میرے ساتھ تھا۔ وہ مجھ سے محبت اور مجھ پر اعتماد کرتا تھا مگر کسی کے ذہن میں سوچ آنے سے خود انسان بھی نہیں روک سکتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ ”نہیں مجھے ارون سے منٹنا ہے تم وہیں لا دینا۔“

اس کا چہرہ ذرا بجھا تھا مگر میں توجہ دینے بغیر واپس آ گیا۔ ارون کی ناک سے امونیا کی بوتل لگائی تو وہ فوراً کلبلانے لگا اور چند سانس لینے کے بعد ہوش میں آ گیا۔ میں نے بوتل ہٹائی اور سر دلچھ میں کہا۔ ”تم میری آواز سن رہے ہو؟“

اس نے سر ہلایا اور خود کو ہلانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ”تم بندھے ہوئے ہو۔“ میں نے مطلع کیا۔ ”یہ بتاؤ تم ہوش میں ہو؟“

اس بار اس نے ذرا دیر سے سر ہلایا۔ میں نے خبردار کیا۔ ”میں تمہارے منہ سے ٹیپ ہٹا رہا ہوں لیکن اگر کوئی غلط آواز نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہوگی۔“

اس نے سر ہلایا تو میں نے ٹیپ ہٹا دیا اور ساتھ ہی مخمر نکال لیا، یہ بھی بیڑو نے لیا تھا۔ وہ دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ ایک کمزور عورت پر ظلم کی تیاری کرنے والا سوراہا پستول اپنے حلق میں موجود پا کر بے ہوش ہو گیا تھا، اس

لیے مجھے امید نہیں تھی کہ وہ شور شرابا کرے گا۔ اس کی ٹھگی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن سے لگائی تو اس نے لرزنا شروع کر دیا اور ہٹکا کر بولا۔ ”مم..... مجھے..... مم..... معاف..... کر..... کر دو۔“

”تم مکان میں کیسے گھسے؟“ میں نے اس کی التجا نظر انداز کر کے خنجر کی نوک گردن میں مھسائی تو اس نے بلبلاتا کو کہا۔

”سو..... سو میتا سے کھلوا یا..... در..... دروازہ.....“

”اور پھر اسے بے ہوش کر دیا۔“ میں نے اس کی بات مکمل کی۔ ”تم سیتا سے اور کیا چاہتے ہو؟“

”میں..... اپنا مکان واپس لینا چاہتا ہوں۔“

”اس کے لیے اس کی عزت سے کھینا ضروری نہیں تھا۔“ میں نے خنجر کی نوک سے شغل جاری رکھا۔ اس کی گردن سے خون بہنے لگا تھا۔

”مجھے معاف کر دو، میں پاگل ہو گیا تھا۔“

میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا اور وہ خنجر کی نوک کے سامنے فر فر جواب دیتا رہا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کے پاس اس علاقے میں خاصی جائیداد تھی۔ بینک بیلنس تھا اور اس نے جنگل کی کسائی کے دو بڑے ٹھیکے لے رکھے تھے۔ یہاں وہ اکیلا آیا تھا اور اسی وجہ سے مارا گیا۔ اگر اس کے ساتھی ہوتے تو وہ اتنی آسانی سے میرے قابو میں نہ آتا لیکن اس کا خیال تھا کہ سیتا اس کے لیے تر نوالہ ہوگی۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ یہاں ہے۔ اس کی گاڑی بھی مکان سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ یہ جاننے کے بعد میں نے اس کے منہ پر دو ہارہ ٹیپ لگایا۔ اس کے جیب سے پرس اور دوسری چیزیں میں پہلے ہی نکال چکا تھا، اس میں گاڑی کی چابیاں اور ایک جدید ترین آئی فون تھا۔ یہ میرے کام آسکتا تھا۔ سیتا سب کے لیے چائے اور میرے لیے کافی بنالائی تھی۔ کافی پی کر میں باہر نکلا اور دو گلی نیچے کھڑی اردن کی گاڑی لے کر روانہ ہو گیا۔ قصبے سے باہر نکل کر گاڑی ایک کھائی میں گرادی اور پیدل واپس روانہ ہوا۔ گاڑی میں ایک چھتری اور برساتی موجود تھی، میں نے وہی استعمال کی اور بھیکے بغیر واپس پہنچ گیا۔ اس کام میں ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا تھا مگر اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اردن یہاں موجود ہے۔

میں مکان میں داخل ہوا تو کسی کو براہِ آمدے میں دیکھ کر رک گیا۔ لائٹ آف تھی لیکن ہیولہ نظر آ رہا تھا۔ پہلے میں چونکا ہوا مگر اندر داخل ہوتے ہی میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ سیتا تھی۔ وہ اس سردی میں باہر موجود تھی۔ میں اوپر آیا تو اس نے بے قراری سے پوچھا۔ ”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”اردن کی گاڑی ٹھکانے لگانے گیا تھا۔ وہ یہاں ملتی تو اس کی گمشدگی کا شک تم پر جاتا۔“

”گمشدگی۔“ اس نے فکر مندی سے کہا پھر بولی۔ ”اندر چلیں یہاں بہت سردی ہے۔“

اس سے پہلے میں کچھ کہتا وہ بے تکلفی سے ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی۔ میں نے ہاتھ چھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

”بچے ٹھیک ہیں اب؟“

”ہاں..... شکر ہے انہیں کچھ نہیں ہوا، اب سو رہے ہیں۔ میں نیچے آئی تو آپ کے ساتھی نے بتایا آپ باہر گئے ہیں۔“

وہ کچن میں لے آئی۔ میں نے برساتی اتار دی تھی اور ہاتھ مل رہا تھا۔ اس نے کافی کا پانی رکھ دیا۔ اندر اتنی سردی نہیں تھی۔ میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس نے کافی تیار کر کے گگ ساٹنے رکھا۔ ”مجھے آپ کا نام نہیں معلوم۔“

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کل تک میں اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”کیوں یہاں کوئی پریشانی ہے کیا؟“

”تم میرے بارے میں نہیں جانتیں، میں دشمنوں سے بچتا پھر رہا ہوں۔ اگر وہ یہاں آگئے تو مجھ سمیت سب کو قتل کر سکتے ہیں۔ اردن ان کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے وہ تمہارے ساتھ تمہارے بچوں کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ اس گھر کو آگ لگا سکتے ہیں۔ وہ ایسے ہی سفاک لوگ ہیں۔“

سیتا کا رنگ اڑ گیا۔ ”ہائے بھگوان..... تو اتنے خطرناک لوگوں سے دشمنی کیوں کی؟“

”کون خوشی سے دشمنی کرتا ہے۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”سیتا مجھے تم سے ہمدردی ہے تمہارے لیے میں جو زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ اردن سے ہمیشہ کے لیے تمہاری جان چھڑا دوں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ میرے ساتھ جائے گا اور دوبارہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”امید ہے اس بات سے تم نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں اور میرے کتنے نزدیک آنا مناسب ہے۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر میرا بازو دھاتتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ ”آپ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

”میں تمہیں حقیقت سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سیتا تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے بہتر ہے کہ تم بھول جاؤ کہ یہاں کچھ لوگ آئے تھے تو وہ کون تھے اور انہوں نے کیا کیا؟ تم نے ہمیں کرائے پر کرا اور تین وقت کا کھانا دیا اور اس کا معاوضہ لیا۔ اس سے زیادہ تم ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں۔“

”پولیس اور ممکن ہے کچھ دوسرے لوگ بھی آئیں۔ اگر تم نے اس سے ہٹ کر کچھ اور کہا تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گی اور میں یا کوئی اور تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔“

اس نے ہاتھ اپنے سینے پر رکھا۔ ”اب تم مجھے ڈرارہے ہو ایسی کیا بات ہے آخر؟“

”یہ سب مت پوچھو۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

وہ میرے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔ ”اچھا ایک بات بتاؤ یہ جو تمہارے ساتھ دو آدمی ہیں۔“

”ان میں سے جو گورا ہے مقامی نقوش والا ہے۔ اسے تم اردن ثانی سمجھو دوسرا صرف ڈرائیور ہے۔ اسے میں چھوڑ دوں گا وہ دوبارہ نہیں آئے گا لیکن اردن اور یہ شخص دوبارہ آسکتے ہیں اس لیے علاج ضروری ہے۔“ میں جانے کے لیے پلٹا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ ”سنو تم اردن سے الگ ہو گئی ہو لیکن اس کی اولاد ہی اس کی وارث ہو گی

کیا اس کا کوئی اور وارث بھی ہے؟“

”نہیں..... اس دنیا میں اس کی ایک ماں اور ایک بھائی تھا دونوں مر چکے ہیں۔ بھائی کو اس نے خود مارا تھا۔ یہ پولیس کا شبہ ہے وہ گرفتار بھی ہوا تھا مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے رہا ہو گیا۔ ماں اس صدمے سے مر گئی۔“

”گو یا یہ قاتل بھی ہے؟“

”ایک شخص کا نہیں۔“ سیتانے انکشاف کیا۔ ”ارون پر کئی افراد کے قتل کا شبہ ہے، ان میں جنگل سے لکڑی کاٹنے والے مزدوروں کا لیڈر مدن موہن بھی شامل ہے۔ کسی نے اس کے گھر میں گھس کر اسے اور اس کی بیوی دونوں کو کھڑائی سے قتل کر دیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ مدن کی ارون سے دشمنی تھی کیونکہ وہ مزدوروں کی مزدوری کم دیتا ہے اور لکڑی چوری کرتا ہے۔“

”گو یا اس شخص کا وجود اس دھرتی پر بوجھ ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اگر یہ نہ رہے تو اس کی ساری دولت و جاہ ادا اس کے بچوں کو ملے گی؟“

”ہاں اس کا کوئی اور وارث نہیں ہے۔“ سیتا بولی۔

”کافی کا شکریہ۔“ میں نے کہا اور اندر والے دروازے کے بجائے باہر کے دروازے سے واپس کمرے میں آیا۔ بیٹو ہوشیار تھا۔ وہ سارا دن سولیا تھا اس لیے اسے نیند کی اتنی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے بیٹو کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا اور سونے کے لیے اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ گرم کبل میں نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے بیٹو سے کہا تھا کہ مجھے صبح چار بجے اٹھا دے لیکن اس نے پانچ بجے اٹھایا اور جمای لیتے ہوئے بولا۔

”شوبی اب نیند برداشت نہیں ہوتا ہم سو جاتا۔“

”تم نے چار بجے اٹھانا تھا۔“ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”بس دو منٹ اور جاگ لو میں واش روم سے آتا ہوں۔“

واش روم سے آکر میں نے بیٹو کو سونے کی اجازت دے دی۔ راج کنور اور آئی کن سورہے تھے حتیٰ کہ ارون بھی کروٹ کے بل پڑا سو رہا تھا حالانکہ وہ خاصے مشکل پوز میں بندھا ہوا تھا۔ اس کے سر کی ضرب والی جگہ کا ورم خاصا کم ہو گیا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ نکالا اور سکا پ سے سفیر کو کال کی۔ وہ سو رہا تھا اور کسی قدر دیر سے کال ریسپونڈ کی۔ وہ جمای لے کر بولا۔ ”یہ ٹو ہے میری نیند کے دشمن نمبر دو۔“

”اول نمبر موتا کا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کہاں غائب تھا بڑی مشکل سے خود کو کال کرنے سے روکا ہوا تھا۔“

”اچھا کیا..... یہاں معاملات جوں کے توں ہیں، یہ بتا بڑے بھیا نے رابطہ کی کوشش تو نہیں کی؟“

”بہت..... اس کے ذرائع وسیع ہیں۔ اس نے راجا عمر دراز سے رابطہ کر لیا تھا مگر اس نے بھی ہمارے بارے میں لا علمی ظاہر کی ہے۔“

”اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنا بے تاب ہے۔“

”اسے معلوم ہو گیا ہے کہ ٹو وہیں ہے اس نے کہا کہ ٹو اس سے جلد رابطہ کر لے کیونکہ تیری تلاش جاری ہے اور اگر ٹو کسی مشکل میں پڑ گیا تو وہ بھی تیری مدد نہیں کر سکے گا۔“

میں سمجھ رہا تھا، مشکل میں پڑنے سے بڑے کنور کی کیا مراد تھی، یقیناً بھارتی ایجنسیاں اور خاص طور سے راءیری تلاش میں تھی۔ اگر میں ان کے ہاتھ آجاتا تو بڑا کنور بھی مجھے نہیں چھڑا سکتا تھا۔ وہ ایک طرح سے مجھے دھمکا رہا تھا میں نے پوچھا۔ ”اس نے سادی کے حوالے سے کوئی بات کی۔“

”نہیں لیکن راجا عمر دراز سے کہا تھا کہ وہ خیریت سے ہے اور اگر اس کا شوہر اس سے بات کرنا چاہے تو پبلس کے نمبرز پر کال کر کے کر سکتا ہے۔“

”وسیم کا کیا رد عمل ہے؟“

”اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ آپ کی ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔“

”یہ اس نے اچھا کیا۔“ میں نے کہا اور مختصر آسے یہاں کے احوال سے آگاہ کیا۔ ”سننے کی حالت بہتر ہے زخم تقریباً بھر گیا ہے بس کوئی بھاری کام نہیں کر سکتا ہے۔“

”ٹو نے اچھا کیا جو ٹھکانہ تلاش کر لیا۔ راجا نے ایک مشورہ دیا ہے؟“

”راجا سے مدد حاصل کرنے کا؟“

”ٹو سمجھ گیا..... ہاں اس نے یہی مشورہ دیا ہے۔“

”نی الحال میں نے اس کا نہیں سوچا ہے لیکن اگر مجبوری ہوئی اور کوئی راستہ نہ نکلا تو رانا سے بھی مدد مانگ سکتے ہیں۔ وہ منع نہیں کرتا ہے لیکن اس کا انداز خاصا لیا دیا سا ہوتا ہے جیسے وہ میرے معاملے میں ذاتی طور پر شامل نہیں ہونا چاہتا ہے۔“

”وہ راجا عمر دراز کا دوست ہے۔“

”یار اول تو یہ دوستی ہماری دوستی جیسی نہیں ہے اور اس بات کو نصف صدی سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔ ظاہر ہے اب ان کے تعلق میں وہ گہرائی نہیں ہوگی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں لیکن رانا دیاس اس کے لیے اپنی پوزیشن خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ اس نے اپنی عمر گزار لی ہے اب اس کی اولادیں ہیں۔ اس کے بھائی کی اولادیں ہیں۔ ان کا وقت ہے اور رانا دیاس کی کسی حرکت کی سزا انہیں ملے گی۔ وہ ایسا ہر گز نہیں چاہے گا۔“

سفر کی حد تک قائل ہوا۔ ”کہہ تو تو ٹھیک رہا ہے۔“

”اسی لیے میں اس سے رابطہ کرنے سے ہچکچاتا رہا تھا۔ اب بھی جب تک مجبور نہ ہوں میرا اس سے رابطہ کا ارادہ نہیں ہے۔“

”اب تیرا کیا ارادہ ہے؟“

”میں یہاں سے نکل کر سوچوں گا۔ میں ایک آبادی میں ہوں اور راج میرے پاس ہے۔ میں اس کے لاف کھل کر کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ اسے کسی دیرانے میں لے جاؤں گا۔“

”ٹو بلاوجہ اسے اٹھائے محوم رہا ہے، کہیں ٹھکانے لگا دے۔“

”یہ کام تو کسی وقت بھی کیا جاسکتا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ اس سے مجھے کچھ معلوم ہوگا۔ وہ کنور پبلس کے نگوں میں سے ہے اور وہاں کے رازوں کے بارے میں جانتا ہوگا۔ کامیابی کے لیے اس کی زبان کھلوانا لازمی

”ہے۔“

”ٹھیک ہے یار اور رابطہ کرتا رہا کر..... ہم لوگ ٹینشن میں پڑ جاتے ہیں۔“

”میں رابطہ رکھوں گا۔“ میں نے کہا اور اسکاپ سے لاگ آف ہو گیا۔ اس کے بعد میں اس علاقے کے بارے میں کچھ سرچنگ کرتا رہا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انٹرنیٹ اس قدر کارآمد چیز ثابت ہوگا۔ دودن کے آرام سے نہ صرف ذہنی اور جسمانی تھکن اتر گئی تھی بلکہ میرے ذہن میں ایک خاکہ بھی واضح ہونے لگا تھا۔ بیٹو کی وجہ سے میں نے سیتا سے ناشتہ نو بجے لانے کو کہا تا کہ وہ کچھ دیر اور سولے۔ اردن اور باقی سب صبح جاگ گئے تھے۔ جب ناشتے کا وقت آیا تو میں نے بیٹو کو جگا دیا۔ وہ چار گھنٹے سو کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ واش روم سے فارغ ہو کر سب نے ناشتہ کیا سوائے اردن کے۔ وہ بے بسی سے بندھا ہوا ہمیں کھاتے پیتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ فی الحال اسے بھوکا پیاسا رکھنا تھا۔ راج کنور نے اس کے بارے میں سوال کیا تھا لیکن میری جھڑکی کھا کر چپ ہو کر بیٹھ گیا۔ ناشتے کے بعد میں نے بیٹو سے کہا۔ ”میرے ساتھ باہر چلو تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”یہ لوگ.....“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

میں نے اسلحے اور سامان کا بیگ اٹھالیا۔ ”یہ یہیں رہیں گے تم یہ لیپ ٹاپ والا بیگ اٹھا لو۔“ میں نے بیٹو سے کہا اور پھر راج کنور کو خبردار کیا۔ ”ہم سامنے موجود ہیں کوئی اتھقانہ حرکت مت کرنا۔“

”میں کچھ نہیں کروں گا۔“

میں بیٹو کو باغ میں لایا اور بولا۔ ”بیٹو کنور پبلیس کے عقب میں موجود علاقہ تمہارا دیکھا بھالا ہے۔“

”ہاتھ کا کیکری طرح۔“ اس نے یقین سے کہا۔ ”ہمارا سارا بچپن ادھر ہی گزرا ہے۔“

”اگر ہم وہاں چھپنا چاہیں تو کوئی مناسب جگہ ملے گی جو کنور پبلیس سے زیادہ دور بھی نہ ہو؟“

”بہت جگہ ہے، ادھر ہمارا گھر بھی ہوتا تھا اور غار بھی ہوتا جہاں ہم ٹھہرتا تھا۔“

”گھر تو ختم کر دیئے گئے ہوں گے، غار مناسب رہیں گے۔“

”ادھر ایک غار ہے جدھر ہم بھائیوں کے ساتھ جاتا تھا۔ وہ ہمارا غار تھا اور اوپر ہے، اس لیے کوئی اور نہیں جاتا تھا۔ وہ ہم کو یاد ہے۔“

”مشکل تو نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”آنے جانے اور فرار ہونے کے لحاظ سے۔“

”اس لحاظ سے تو اچھا ہے شوبی..... اس کا ایک راستہ پیچھے بھی نکلتا ہے۔ مگر وہ چھوٹا ہے، جب ہم بچہ تھا تو آسانی سے نکل جاتا تھا ایک بار بابو جی نے پکڑ لیا اور بہت مارا کیونکہ ادھر پہاڑی بہت خطرناک تھا پھر اس نے راستہ بند کر دیا پر وہ کھولا جاسکتا ہے۔ شوبی کیا ارادہ ہے؟“

”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ میں راج کنور سے سکون سے پوچھ کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ان دو کا کیا کرنا ہے؟“

”سیتا کے شوہر کو کسی کھائی میں پھینکنا ہے اور آئی کن کو انکشن لگا کر چھوڑ دیں گے۔“

”شوبی اس کا گاڑی بہت اچھا ہے ایسا کرو آپ اسے خرید لو۔“

بیو کی بات سے مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے ارون کا پرس نکال کر دیکھا اس میں ایک ڈبیٹ کارڈ اور ایک کریڈٹ کارڈ بھی تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے ادا نیگی ارون سے کرائی جائے۔“ بیو خوش ہو گیا۔ ”یہ ٹھیک رہے گا۔“

ہم اندر آئے، میں نے ارون کو انجکشن دیا اس نے مزاحمت کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں، میں اسے خطرناک انجکشن دے رہا تھا۔ دس منٹ بعد وہ سُکون ہو گیا اور مخصوص انداز میں پلکیں جھپکانے لگانے لگا۔ اسے کھولنے سے پہلے میں نے آزمائش کے لیے کچھ سوالات کیے اور اس نے فر فر جواب دیئے خاص طور سے مزدور لیڈر اور اس کی بیوی کے قتل کے اعتراف سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پوری طرح دوا کے زیر اثر آ گیا تھا۔ میں نے اسے کھولا اور اسے پانی پینے کو دیا۔ پانی پی کر اس نے بھوک کی شکایت کی۔ میں نے تسلی دی۔ ”ہم باہر جا رہے ہیں تم کو کھانے کو ملے گا۔“

میں نے سامان والا بیگ خالی کر کے ساتھ لے لیا تھا۔ ہم باہر آئے۔ میں نے اسے آئی کن کی گاڑی کی پچھلی نشست پر لیٹنے اور سر نیچے رکھنے کو کہا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے جیب اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اور اس سے پوچھا۔ ”تمہارا اکاؤنٹ کس بینک میں ہے؟“

اس نے بینک کا نام بتایا۔ اکاؤنٹ کرنٹ تھا اور وہ اے ٹی ایم سے لامحدود مقدار میں رقم نکلوا سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے اصل میں دوا کاؤنٹس تھے، ایک میں گیارہ لاکھ پچھتر ہزار کی رقم تھی اور دوسرے میں سترہ لاکھ پچاس ہزار سے اوپر رقم تھی۔ مجھے حیرت ہوئی وہ جس حیثیت کا آدمی کا تھا یہ رقم خاصی کم تھی۔ میں نے مزید سوالات کیے تو اس نے انکشاف کیا کہ اصل رقم تو اس کے گھر کی تجوری میں تھی۔ اس کی مالیت ایک کروڑ روپے سے اوپر تھی اور یہ ساری رقم ڈالرز اور یورو میں تھی۔ اس سے زیادہ مالیت کا سونا اور جواہرات تھے۔ اس کا گھر اسی میں سڑک کے دوسری طرف تھا اور میرا اس طرف جانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے نیچے پہنچنے سے پہلے بیگ تمہا کر جیب سے اتار دیا۔ ”اب تم پیدل بینک تک جاؤ گے اور اے ٹی ایم سے جتنی رقم نکلوا سکتے ہو وہ نکلوا کر اس بیگ میں ڈال لو گے۔ دونوں اکاؤنٹس سے نکلوانا۔ اگر ایک بینک کے اے ٹی ایم سے رقم نہ نکلے تو دوسرے اور پھر اس سے آگے والے سے ٹرائی کرنا اس کے بعد رقم لے کر واپس یہیں آنا بینک میں کسی صورت نہیں جاؤ گے، سمجھ گئے؟“

اس نے سر ہلایا اور جیب سے اتر کر پیدل روانہ ہو گیا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے خاص طور سے اس کا حلیہ ٹھیک کر لیا تھا تاکہ بینک جانا پڑے تو وہ مشکوک نظر نہ آئے۔ بینک والے عام طور سے اے ٹی ایم میں بیس پچیس لاکھ سے زیادہ رقم نہیں رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹا دیہاتی علاقہ تھا مگر اس قصبے میں مرکزی سڑک پر مجھے کئی بینک نظر آئے تھے۔ یہ قصبہ یقیناً آس پاس کی کاروباری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ میں نے جیب ایک جگہ روک دی جہاں سے ارون پر نظر رکھ سکتا تھا۔ وہ پہلے اس بینک کے اے ٹی ایم میں داخل ہوا جہاں اس کا اکاؤنٹ تھا۔ اٹھیا میں ہزار سے زیادہ کا نوٹ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے ارون کو خاصی رقم کرنسی ملتی اور اسے ایسے ہی بیگ میں بھرنا پڑتی کیونکہ نوٹ گڈی کی صورت میں بھی نہیں ہوتے۔ ساری رقم کھلی ملتی۔ وہ تقریباً دس منٹ بعد اس اے ٹی ایم سے نکلا اور واپس چھپے ایک بینک کے اے ٹی ایم تک آیا یہاں اسے زیادہ وقت لگا تھا شاید دوسرا بینک ہونے کی وجہ

سے اے ٹی ایم پروسس میں زیادہ وقت لے رہا تھا بہر حال وہ پندرہ منٹ بعد وہاں سے بھی نکل آیا۔ پہلے اے ٹی ایم سے نکلنے وقت بیگ ہلکا تھا مگر اب وہ واضح بھاری ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے ساری رقم نکلوائی تھی مگر وہ تیسرے ہینک کے اے ٹی ایم کی طرف بڑھا۔ یہاں اسے دس منٹ لگے اور جب وہ باہر آیا تو بیگ مشکل سے اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے واپسی اس جگہ کا رخ کیا جہاں میں نے اسے اتارا تھا۔ وہ اپنی دھن میں میرے پاس سے گزر گیا۔ میں جیب تک آیا اور اشارت کر کے اسے ارون کے پیچھے لایا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ انجکشن اتنے کمال کے نکلیں گے۔ گلی میں داخل ہونے کے بعد میں نے آس پاس دیکھا اور جیب لے جا کر ارون کے پاس روکی۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہری آپ اندر آ جاؤ۔ پہلے کی طرح لیٹ جاؤ اور بیگ نیچے رکھ لو۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے جیب آگے بڑھا دی۔ جیب بیتا کے گھر کے سامنے روک کر میں نے پھر آس پاس دیکھا اور کسی کو نہ پا کر ارون کو بیگ سمیت اندر جانے کا حکم دیا۔ میں جیب لگا کر اندر آیا تو ارون کمرے میں بیگ سمیت موجود تھا۔ بیتا اسے اکیلے آتے دیکھ کر کسی قدر پریشان ہوا تھا مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”ہم تو ڈر گیا تھا۔“

”فکرمات کر دیہ پوری طرح قابو میں ہے۔“ میں نے بیگ لے کر اسے قالین پر الٹ دیا اور اندر بھرے کرنسی نوٹ بکھر گئے تھے۔ یہ ہزار اور پانچ سو کے کرنسی نوٹ تھے جب کہ سو والے نوٹ بھی نظر آرہے تھے۔ میں نے ارون، آئی کن اور راج کنور کو لگا دیا کہ وہ نوٹ الگ کر کے سب کی سوسو والی گڈیاں بنائیں۔ پھر میں نے درمیانی دروازے سے لاؤنچ میں جھانکا جیتا مکن میں تھی۔ میں لاؤنچ میں آ گیا۔ ”مجھے چھوٹے ربر بینڈز کی ضرورت ہے تمہارے پاس ہیں؟“

”دیکھتی ہوں ورنہ پراوین سے منگوا دیتی ہوں۔“

”پلیز ضرورت ہے۔“

”چائے کافی.....؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے لیے کافی باقی کے لیے چائے۔“

وہ میرے پاس آئی اور آہستہ سے بولی۔ ”ارون کہاں ہے؟“

”یہیں ہے۔“ میں نے جوابی سرگوشی کی۔ ”لیکن تم فکرمات کر دوہ پوری طرح میرے قابو میں ہے۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے، تم نے اسے آزاد کر دیا تو وہ پھر میرے لیے مصیبت بن جائے گا۔“

”تم اس کی طرف سے بے فکر ہو۔“ میں نے کہا۔ بیتا نے پراوین کو بلا کر اس سے ربر بینڈز کا پوچھا تو

اس نے پوری حیلی لادی۔ اس میں کئی سوا چھی کوٹائی کے چھوٹے ربر بینڈز تھے جیسے مجھے درکار تھے۔ پراوین کے

جانے کے بعد میں نے بیتا سے کہا۔ ”چائے کافی خود لے کر آ پراوین کو مت بھیجنا۔“

”میں سمجھتی ہوں وہاں ارون ہے۔“

”ہاں لیکن ایک وجہ اور بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جب تم آؤ گی تو دیکھ لو گی۔“

میں واپس آیا اور ربر بینڈز ان کے حوالے کیے۔ وہ نوٹوں کی گڈیاں بنا کر ان پر ربر بینڈز چڑھانے لگے۔

اسی طریقے سے نوٹ سمٹ کر رہ سکتے تھے۔ ارون پوری رقم نکالو لایا تھا اور یہ اتنیس لاکھ سے اوپر کی رقم تھی۔ زیادہ نوٹ ہزار اور پانچ سو کے تھے اس لیے کام جلد نمٹنے لگا۔ جب تک بیٹا چائے اور کافی لے کر آئی نصف نوٹ گڈیوں کی صورت میں آچکے تھے۔ بیٹا کی آنکھیں پھیل گئی تھیں لیکن میں نے اشارے سے اسے کچھ کہنے سے منع کیا اور وہ خاموشی سے واپس چلی گئی۔ ٹی بیک کے بعد ان تینوں نے باقی کام نمٹایا۔ اب ہزار کے نوٹوں کی سولہ گڈیاں تھیں اور کچھ نوٹ الگ سے تھے۔ پانچ سو والی چوبیس گڈیاں تھیں اور کچھ نوٹ الگ سے بچ رہے تھے جب کہ سو والی دس گڈیاں تھیں۔ گڈیوں کی صورت میں کل اتنیس لاکھ روپے کی رقم آئی تھی۔ میں نے آئی کن سے کہا۔ ”میں تمہاری گاڑی خریدنا چاہ رہا ہوں۔ کتنے میں سودا کرو گے؟“

وہ حیران ہوا تھا۔ ”تم جیپ کیوں خرید رہا ہے؟“

”مجھے ضرورت ہے تم اس سے اچھی لے لینا۔“

وہ ہچکچایا۔ ”یہ دو ہزار پانچ کا ماڈل ہے میں نے ایک سال پہلے بیس لاکھ میں لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے اس میں سے بیس لاکھ لے لو۔“ میں نے نوٹوں کی گڈیوں کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”تم بیس لاکھ دے رہو؟“

”ہاں تو اور کیا کہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن خیال رہے، اگر تم یہاں سے جانے کے بعد پولیس کے پاس دوڑے گئے تو تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“

”اگر گاڑی پولیس کے ہاتھ لگی تو.....“

”اس صورت میں تم آزاد ہو گے اپنی جان بچانے کے لیے جو چاہے بیان دو مگر اس سے پہلے تم نے زبان کھولی تو وہی ہوگا جو میں نے کہا تھا۔ کوئی کرائے کا قاتل آکر تمہیں تمہارے بیوی بچے سمیت مٹا دے گا۔ اگر منظور ہے تو رقم لے لو۔“

آئی کن نے سوچا اور پھر ڈھیر سے بیس لاکھ کی گڈیاں الگ کرنے لگا۔ البتہ میرے کہنے پر اس نے سواور پانچ سو والی گڈیاں لے لی تھیں۔ اب صرف نو گڈیاں بچی تھیں۔ آئی کن نے اپنی رقم بیک میں ڈال لی۔ میں باقی رقم لے کر بیٹا کے پاس آیا۔ اس وقت وہ بچوں کو کھانا دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے تم سے بات کرنی ہے اکیلے میں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ نشست گاہ میں لے آئی۔ میں نے اسے نو لاکھ کی رقم دی تو وہ حیران رہ گئی۔ ”یہ کہاں سے آئی..... مجھے کیوں دے رہے ہیں؟“

”یہ ارون کی رقم ہے..... کیسے حاصل کی اس پکڑ میں مت پڑو لیکن میرا خیال ہے اس پر تمہارا اور تمہارے بچوں کا حق ہے۔ پھر تمہیں اپنے بچوں کے وراثتی حق کے لیے بھی رقم کی ضرورت ہوگی۔“

”لیکن یہ بہت بڑی رقم ہے۔“

”نو لاکھ روپے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ارون کی دولت میں یہ کچھ بھی نہیں ہے، وہ کروڑ پتی ہے۔ زمین جایداد کے علاوہ کروڑوں تو صرف نقدی اور سونا و دیگر قیمتی اشیاء کی صورت میں ہیں اس کے پاس۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک اجنبی میرے لیے اتنا کچھ کرے گا۔“ وہ کہتے ہوئے جذباتی ہو گئی۔

”تم نے ان چند دنوں میں میرا اور میرے ساتھیوں کا خیال رکھا اور ہم پر اعتماد کیا، یوں سمجھ لو کہ یہ اس کا شکریہ ادا کیا ہے میں نے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا ایک مشورہ ہے اگر تم مانو، اردن سے چھٹکارے کے بعد یہاں سے چلی جانا۔ اردن کے اور ساتھی اور رشتے دار ہوں گے وہ تمہارے لیے مشکل پیدا کر سکتے ہیں۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“

”یہاں اردن کا جو بنگلا ہے اس کی تجوری میں اس نے اپنا سارا اثاثہ رکھا ہوا ہے، یقیناً زمین و جاہیاد کے کاغذات اور دوسرے بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات بھی اسی میں ہوں گی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں وہ بہت بڑی اور مضبوط تجوری ہے۔ بیک وقت نمبروں اور چابیوں سے کھلتی ہے۔“

”ایک منٹ رکو میں اردن سے پوچھ کر آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور واپس آ کر اردن سے تجوری اور اسے کھولنے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے آرام سے بتا دیا کہ اس کی چابیاں اس کے بیڈروم میں ایک خفیہ جگہ رکھی تھیں۔ اس نے خفیہ جگہ بتائی اور پھر تجوری کھولنے کا پورا طریقہ کار بتایا۔ اس میں نمبرز بھی شامل تھے۔ میں نے اسے ذہن نشین کر لیا اور واپس بیٹا کے پاس آ کر اسے لکھوا دیا۔ اس طرح امکان نہیں تھا کہ وہ کوئی غلطی کر جائے۔ تجوری میں کوئی ٹریپ نہیں تھا لیکن اگر اسے غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی جائے تو اس میں کرنٹ آ جاتا تھا۔ بیٹا خوش تھی۔

”اس مکان میں صرف ایک ملازم ہوتا ہے۔ اردن اگر دنیا میں کسی پر اعتماد کرتا ہے تو وہ یہی آدمی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم اس وقت تک تجوری تک رسائی حاصل نہیں کر سکتیں جب تک کورٹ سے آرڈر نہ لے لو۔“

”ایسا ہی لگ رہا ہے۔“

”اس صورت میں نو لاکھ روپے کم ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ مکان بھی سیل کر دینا اب تمہیں روکنے والا کوئی نہیں ہوگا اور مقامی وکیلوں کے بجائے شملہ جا کر وکیل کر لینا۔ شملہ بڑا شہر ہے اور وہاں ہر طرح کی سہولت ہے۔“

”اگر تمہارا مشورہ ہے تو میں شملہ منتقل ہو جاتی ہوں۔“

”یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا، میرا مشورہ یہاں سے جانے کا ہے۔“

”تم یہاں سے جا رہے ہو؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں کل ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ سب بھول جا۔ مگر یہاں کوئی پوچھ گچھ کرنے آئے تو انجان بن جانا۔“

”کون آ سکتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ممکن ہے سرکاری لوگ آئیں۔ لیکن تم بڑھی لکھی اور سمجھدار عورت ہو، ان کو اس طرح سے ہینڈل کرنا

کہ وہ مطمئن ہو جائیں کیونکہ اگر ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ میرا اور تمہارا خلاف معمول کوئی تعلق ہے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گی۔“

وہ پریشان ہو گئی۔ ”اس صورت میں، نہیں انکار نہ کروں کہ یہاں کوئی ٹھہرا ہی نہیں۔“
 ”یہ ناگہبی ہو گی، کیونکہ سرکار کے لیے جھوٹ پکڑنا مشکل نہیں ہو گا۔ تم جانتی ہو کہ پولیس اور دوسری ایجنسیاں کیسے تفتیش کرتی ہیں، اس لیے وہ جھوٹ بولو جو قابل قبول ہو خود کو مشکوک مت بنانا اور یہ اچھا ہوا کہ بچوں کے سامنے کچھ نہیں آتا تم بھی چمپا کر کھانا ان سے بھی پوچھ گچھ ہو سکتی ہے۔“
 ”اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ڈر مت حوصلہ رکھو..... تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے اس لیے تمہارے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔ جب تک تم خود نہ اقرار کر لو اور ہاں یہ رقم اور کوئی ایسی چیز جس سے ہماری نشان دہی ہو اس مکان سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دو یہاں کی مکمل تلاشی لی جا سکتی ہے ایک سوئی بھی چھپی نہیں رہے گی۔“
 ”میں ایسا ہی کروں گی۔“

مجھے کچھ کام اور تھے اس لیے میں واپس اس کمرے میں آیا۔ میں نے ارون سے پوچھا۔ ”یہاں کوئی ایسا پراسٹور ہے جہاں سے کپڑے اور ڈبا بند خوراک مل سکے؟“
 اس نے سر ہلایا۔ ”سب مل جائے گا لیکن ایک جگہ نہیں۔“

”میرے ساتھ چلو۔“ میں نے اس سے کہا اور بیٹو سے ہوشیار رہنے کا کہہ کر ارون کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ اسی طرح گاڑی میں چھپا رہا۔ ناریٹ کے پاس اسے اتار کر رقم دی اور بتایا کہ کیا کیا لینا ہے۔ میں نے اسے اپنے اور بیٹو کے کپڑوں کا سائز بھی دے دیا تھا۔ ہمارے پاس سردی کا مقابلہ کرنے کے لحاظ سے بس ایک ہی سوٹ تھا اور ہمیں ایسے ایک سوٹ کی مزید ضرورت تھی۔ بیٹو کے پاس جیکٹ تھی میرے پاس نہیں تھی۔ ارون تقریباً ایک گھنٹے بعد آیا اس نے نئی شاپرز اٹھا رکھے تھے۔ میں نے جب ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ ارون نے شاپرز اندر رکھے اور خود بھی اندر آ گیا۔ میں نے وہیں چپک کرنے کے بجائے واپس گھر پہنچ کر دیکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ میں ارون کے ساتھ جتنی دیر باہر رہنا زیادہ لوگوں کی نظر میں آتا۔

واپس آ کر میں نے دیکھا۔ ایک اچھی اور گرم جیکٹ تھی۔ پیروں میں گھٹنوں سے اوپر تک آنے والے گرم موزے تھے۔ میرے اور بیٹو کے ٹاپ کی اوئی پینٹ اور جرسی کی ہائی نیک شرٹس تھیں۔ اوئی ٹوپے اور دستانے پہلے سے ہمارے پاس تھے۔ شام کے چار بجے اچانک ہی بادل گھر آئے اور بہت تیز بارش شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔ پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر بارش ہو جائے تو موسم بہت سرد ہو جاتا ہے اور ٹارمل میں بھی رات کو سردی ہوتی ہے۔ سب کبلوں میں دبک گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جب سے میں بیٹا کو پولیس یا ایجنسی کا حوالہ دیا تھا وہ اور اس کے بچے یہاں نہیں آئے تھے ورنہ وہ ہر تھوڑی دیر بعد پوچھتی تھی۔ کبھی خود پوچھتی اور کبھی بچوں سے کہلاتی تھی۔ کچھ دیر بعد پراوین نے درمیانی دروازے سے جھانکا اور چائے لانے کا بتایا۔ چائے کے ساتھ گھر میں بنے ہوئے سمو سے، پکوڑے اور پکوری تھی۔ ساتھ ہی اس نے بیٹا کا پیغام دیا وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔

بیٹو خوش ہو گیا تھا کیونکہ اسے تین دقت کھانے کی عادت تھی اور یہاں دو پہر کا کھانا گول ہوتا تھا۔ اگرچہ ناشتہ اور رات کا کھانا ساری کسر پوری کر دیتا تھا مگر درمیان میں کچھ دقت کے لیے پیٹ بالکل خالی ہو جاتا تھا۔ میں تمام چیزوں سے انصاف کر کے اور چائے کا گم لے کر لاؤنج میں آیا جہاں سیتا رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے معذرت کی۔ ”سوری میں نے اتنی دیر سے پوچھا نہیں۔ اصل میں یہ سب تیار کرنے میں مصروف تھی۔“

مجھے اپنی سوچ پر اندر ہی اندر شرمندگی ہوئی تھی۔ ”کوئی بات نہیں میں بھی آرام کر رہا تھا۔“

”کل کس وقت جاؤ گے؟“

”صبح سویرے۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا ہے قصبے میں چہل پہل ہونے سے پہلے یہاں سے چلا جاؤں۔“

”ناشتہ کب کرو گے؟“

”چھ بجے۔“

وہ افسردہ ہو گئی۔ ”پھر کبھی نہیں آؤ گے؟“

”امکان تو یہی ہے۔“

”میں تمہیں یاد کروں گی۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”میرے لیے یہی بہت ہے کہ کوئی مجھے اچھے الفاظ میں یاد کرے گا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”پوچھو..... اگر جواب دے سکا تو ضرور دوں گا۔“

”تم مسلمان ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے کسی قدر تعجب کے ساتھ کہا کیونکہ میں نے گفتگو میں بہت خیال رکھا تھا کہ ایسی کوئی

بات نہ کہوں مگر شاید کہیں بے احتیاطی ہو گئی تھی۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں جس کالج میں پڑھتی تھی وہاں اکثر لڑکیاں مسلمان تھیں۔ میری ساری سہیلیاں مسلمان تھیں مجھے

معلوم ہے مسلمان کس طرح بات کرتے ہیں۔“

”لیکن میں نے اپنی گفتگو میں ایسا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جو خاص مسلمان بولتے ہیں۔“

”ہاں لیکن تم نے ہندی کے وہ لفظ بھی نہیں بولے جو ہر ہندو بولتا ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”اس۔۔۔“

مجھے اندازہ ہوا کہ تم مسلمان ہو۔“

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ ”امید ہے اس سے تمہارے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچی ہوگی؟“

”نہیں ہم چھوت چھات کے قائل نہیں ہیں۔“ وہ بولی۔ ”میں نے کہا تا میری ساری سہیلیاں مسلمان

تھیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ صرف اللہ کی مدد تھی کہ مجھے اب تک ہمدرد اور مددگار لوگ ملے تھے۔

شک انہوں نے پیسے کے لیے مدد کی تھی لیکن یہ بھی بڑی بات تھی۔ اس متعصب ملک میں جہاں بعض اوقات

صرف مسلمان ہونا جرم بن جاتا تھا اور اس پر اعلیٰ عدالتیں تک سزائے موت جیسی انتہائی سزا دے دیتی ہیں۔

مسلمان سب سے بڑی اقلیت ہوتے ہوئے بھی سکھوں اور عیسائیوں حتیٰ کہ بدھوں سے بھی گزرے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سرکاری ملازمتوں میں ان تینوں قوموں کا حصہ مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ عام لوگوں میں اب تک کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جو صرف مسلمان یا پاکستانی ہونے کے جرم میں میرا دشمن ہو جاتا۔ میں نے سیتا کو مزید رقم دینا چاہی تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

”تم نے اتنا کیا ہے کہ میں کسی صورت اس کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔ اس لیے پلیز اب میں جو کر رہی ہوں اسے میرا خلوص سمجھو۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ جذباتی ہو رہی تھی اور جب میرے پاس آنے والی کوئی عورت جذباتی ہوتی ہے تو میں الجھن میں پڑ جاتا ہوں کہ نہ جانے اس کی جذباتیت کیا رخ اختیار کرے۔ یہ چیز بعض اوقات مشکل کا باعث بن جاتی تھی۔ اس لیے میں نے موضوع بدل دیا۔ اس کے بچوں کے بارے میں بات کرنے لگا۔ پرا دین چھٹی کلاس میں تھا اور سمیٹا چوتھی میں تھی۔ دونوں سرکاری اسکول میں پڑھ رہے تھے کیونکہ سیتا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچوں کی نجی اسکول میں پڑھا سکتی۔ وہ خوش تھی کہ اب وہ اپنے بچوں کو بہترین اسکول میں پڑھا سکے گی۔ اس نے سرور لہجے میں بتایا کہ شملہ میں انڈیا کے بہترین اسکول تھے۔ وہ ان میں سے کسی میں پرا دین اور سمیٹا کو داخل کرائے گی۔ اب اس کے وسائل بھی تھے۔ اس کا موڈ بدل گیا تھا۔ میں واپس آیا تو بیٹو اوگھر رہا تھا، وہ آج صبح سے جاگ رہا تھا، رات میں بھی صرف چار گھنٹے سویا تھا۔ میں نے پٹی ہٹا کر اس کا زخم دیکھا جو مکمل طور پر خشک ہو گیا تھا اور جہاں سے کھال غائب ہوئی تھی وہاں اب سرخ رنگ کی جھلی آگئی تھی۔ زخم بہت بہتر حالت میں تھا۔“

”شوبی ہم نے اس ہاتھ سے بیگ اٹھا کر دیکھا ذرا سادہ ہوا پر کوئی مشکل نہیں ہوا۔“ بیٹو نے انکشاف کیا۔

”ایسا کرو ابھی سو جاؤ تمہیں رات کو جاگنا ہوگا۔ کھانا آنے میں تین گھنٹے ہیں۔“

”نیند نہیں آرہی ہے شوبی کیا ادھر والوں سے بات ہو سکتی ہے۔“ بیٹو نے دبی زبان میں کہا۔ ”وہ سب یاد آرہا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن لمبی بات نہیں کرنا۔“ میں نے کہا اور اسکاپ سے سفیر کو کال کر کے اسکاپ پر آنے کا کہا۔ چند منٹ بعد وہ اسکاپ پر تھا۔ بیٹو نے ہینڈ فری لگا لیا تھا اور لیپ ٹاپ سامنے رکھ لیا۔ کچھ دیر میں مانی اور دوسرے بھی آگئے تھے۔ سب بیٹو کو دیکھ کر خوش تھے البتہ سفیر چھیڑ خانی کر رہا تھا مگر بیٹو نے برا نہیں مانا وہ ہنستا رہا۔ اس نے سفیر سے کہا۔ ”ہم جانتا ہے آپ ہم سے بس اوپر اوپر سے ایسا کرتا ہے۔ ہم مر گیا تو سب سے زیادہ آپ یاد کرے گا۔“

جواب میں سفیر نے کچھ کہا تو وہ پھر ہنسا۔ ”ہاں منہ ہی ایسا ہے۔ پر آپ سے اچھا ہے۔“

پندرہ منٹ بعد میں نے بیٹو سے ہینڈ فری لیا اور باہر برآمدے میں آ گیا۔ یہ یہاں سے بھی کام کر رہا تھا۔ بس نے دسیم اور سفیر کو مختصر اپنے پلان سے آگاہ کیا۔ ”میں کل یہاں سے نکلوں گا اور کنور پبلز کے پاس کوئی جگہ فلاش کروں گا۔“

”وہاں آپ سے رابطہ مشکل ہوگا۔“ وسیم نے کہا۔

”ہاں وہاں موبائل سگنل مشکل سے ہوں گے، انٹرنیٹ کا نہیں پتا لیکن مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے ایک لینڈ کرور لے لی ہے اس کی مدد سے کسی ایسی جگہ تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے جہاں سگنلز ہوں۔ میں اگر روز نہیں تو دو دن بعد لازمی رابطہ کروں گا۔ وہاں کی کیا صورت حال ہے؟“

”نادر کو مرشد کے حوالے کر دیا ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”ٹھیک ہے اب تم لوگ زیادہ محتاط رہو۔“

”آج کل محتاط رہنے کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔

”بڑے کنور کا راجا عمر دراز سے رابطہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہمارے بارے میں کچھ زیادہ ہی جانتا ہے۔ لازمی مرشد سے بھی واقف ہوگا۔ اگر اس نے مرشد سے رابطہ کر لیا تو ہمارے لیے پھر سے مشکلات کا آغاز ہو جائے گا۔ فتح خان کی انڈیا میں موجودگی کا مطلب ہے کہ ڈیوڈ شاہی یہیں ہے ورنہ فتح خان کی دلچسپی کی کوئی چیز یہاں نہیں ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے ہمارے دشمن آپس میں مل رہے ہیں؟“ وسیم نے صورت حال کا خلاصہ کیا۔

”بالکل یہی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جیسے ہی راج کنور کی مدد سے مجھے کنور پبلس میں محسنے کا موقع ملا

میں سادی کو وہاں سے نکال لوں گا۔“

”اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو.....“ وسیم نے کسی قدر جذباتی لہجے میں کہا۔

”یاد رہے مفروضات پر بات نہیں کر سکتے بہر حال ایک بات طے ہے کہ سادی کو بڑے کنور کی قید میں نہیں

چھوڑا جاسکتا ہے، اسے آزاد کرانے کے لیے اگر مجھے خود کو بڑے کنور کے حوالے کرنا پڑا تو میں.....“

”آپ اپنے طور پر ایسا کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔“ وسیم نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”سوری میں جذباتی

ہو گیا تھا۔“

”یا ر ایک دوسرے کے لیے یہ جذبات ہی تو ہمارا سرمایہ ہیں ورنہ کسی کو دوسرے سے کیا غرض ہو سکتی

ہے۔“

”ٹھیک کہاؤ نے۔“ سفیر نے تائید کی۔

میں نے کچھ دیر بعد کر کے کال کاٹ دی اور لیپ ٹاپ بند کر کے اسے اور موبائل دونوں کو چارج پر لگا دیا۔

اردن کے پاس سے جو آئی فون نکلا تھا وہ اس کا چارج نہیں تھا لیکن بیٹری فل تھی۔ اسے آف رکھا ہوا تھا۔ ابھی تو اس

کا کام نہیں تھا لیکن ممکن تھا کہ آگے چل کر اس کی ضرورت پڑ جاتی۔ اسے بھی سامان میں شامل کر لیا تھا۔ اس بار

میں نے تفصیل سے دیکھا کہ بیٹو نے کیا کیا لیا تھا۔ اس میں بہت ساری کام کی چیزیں تھیں۔ حتیٰ کہ اس نے ہانچ

اور لائٹرز بھی لیے تھے۔ اسلحہ سمیت سارا سامان دو بیگز میں آگیا تھا۔ سب سے بات کر کے بیٹو خوش تھا، وہ لیٹ

گیا۔ وہ مسلسل اینٹی بائیوٹکس کھا رہا تھا اور یہ دوائیں انسان کو کمزور بھی کرتی ہیں۔ مگر ان کے بغیر گزارنا نہیں تھا۔ آج

رات بیٹو کے زخم کو چار دن ہو جاتے۔ ڈاکٹر گپتا نے تین دن کا کہا تھا اس لحاظ سے اب وہ حرکت کر سکتا تھا۔

بیٹو نے جس جگہ کا بتایا تھا وہاں تک جیب کی رسائی مشکل لگ رہی تھی اور یقیناً کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا

پڑتا۔ یہاں سے اس کا امتحان شروع ہوتا۔ سفر کی مشکل پھر سامان اٹھانا اور غار کی بے آرامی بیٹو کے لیے مشکل پیدا کر سکتی تھی۔ بہر حال اس کا ذہم بکڑنے کا اندیشہ بہت کم تھا اور پھر ہمارے پاس دو انیس بھی تھیں۔ میں نے جو سامان منگوایا تھا اس میں ٹیڑا پیک دودھ بھی شامل تھا، بہ وقت ضرورت یہ کھانے اور پینے دونوں کے کام آسکتا تھا۔ چائے کی پتی اور کافی بھی شامل تھی۔ خاصی چیزیں تھیں جو اس بے سروسامانی میں ہمارے کام آتیں۔ یہ سب ایک الگ شاپر میں پیک تھیں۔ رات کا کھانا آیا تو میں نے بیٹو کو جگا دیا۔ کھانے کے بعد وہ دوبارہ سو گیا تھا۔ نو بجے باہر شدید سردی اور شدید سناٹا تھا۔ بارش رک گئی تھی لیکن درختوں سے ٹپکتے قطروں کی آواز اندر تک آرہی تھی۔ چائے اور کافی نے وقتی طور پر نیند کو بھگا دیا تھا لیکن جب کبل میں لپٹ کر بیٹھتا تو غنودگی حملہ کرتی تھی۔ یہاں ٹیلنے کی محاش کم تھی اس لیے میں کبل اتار دیتا تا کہ سردی سے جسم چاق و چوبند ہو جائے۔ ایک بار میں کبل میں تھا کہ درمیانی دروازہ کھلا اور میں آنکھ بند کر کے سوتا بن گیا۔ میں دیکھ نہیں سکا تھا لیکن چوڑیوں کی کھٹک نے بتایا کہ آنے والی سیتا تھی شاید وہ مجھے بلانے آئی تھی مگر میں بیٹو کو سوتا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے بیٹو کو تین بجے اٹھایا۔ وہ چھ گھنٹے سولیا تھا اور اب چاق و چوبند تھا۔ وہ واش روم سے ہو کر کانپتا ہوا آیا تو میں سونے کے لیے لیٹا۔ بیٹو نے کہا۔ ”شوبی باہر بہت سردی ہے۔“

”کل سے ہمیں اسی سردی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”اُدھر زیادہ سردی ہوگا۔“ بیٹو نے خبردار کیا۔ ”ادھر برف والا پہاڑ پاس ہے نا وہاں سے ٹھنڈا آتا ہے۔“

”دیکھ لیں گے یا یاد نہیں ہے ہم نے کئی دن کیسے برفانی علاقے میں گزارے تھے جہاں سوائے برف کے اور کچھ نہیں تھا۔“

”ادھر تو بہت سردی تھا۔“

کچھ دیر بعد میں سو گیا تھا۔ چھ بجے بیٹو نے مجھے اٹھا دیا۔ ”شوبی سیتا دیوی ناشتے کا بول کر گیا ہے۔“

”ہاں بس، ہمیں روانہ ہونا ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ واش روم سے ہو کر آیا اور درمیانی دروازے سے اندر جھانکا جہاں سیتا اکیلی ناشتہ بنا رہی تھی۔ اتنی صبح بچے یقیناً سو رہے تھے۔ میں لاؤنج میں آیا اور کھکا را۔ اس نے چونک کر دیکھا اور مسکرائی۔

”اٹھ گئے۔“

”ہاں فریش ہوں۔“ میں میز کے کنارے ٹک گیا۔

”کافی پیو گے ناشتے میں ذرا دیر ہے، سوری میری آنکھ وقت پر نہیں کھلی۔“

”کیوں نہیں اور کوئی بات نہیں ہم ذرا تاخیر سے نکل جائیں گے۔“

اس نے کافی کا پانی رکھ دیا۔ ”تم شملہ جاؤ گے؟“

”ہاں لیکن ہماری منزل اس سے دور ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ پراٹھے بنا رہی تھی۔ ”میں نے راستے کے لیے بھی کچھ چیزیں بنادی ہیں، ایک دو وقت کھا سکتے ہو۔“

”اس کی ضرورت نہیں تھی تم نے زحمت کی۔“

”میں نے سوچا کہ راستے میں بھی باہر کا کھاؤ گے تو میں کیوں نہ بنا دوں ٹھنڈا ہوگا پر گھر کا ہوگا۔“

اس نے کافی بنا کر میرے سامنے رکھی اور آہستہ سے بولی۔ ”مجھے ارون کا سوچ کر ڈر لگ رہا ہے۔“
 ”میں نے کہا تا اس کی طرف سے بے فکر رہو وہ واپس نہیں آئے گا لیکن اس کی گمشدگی کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ مت کہنا۔ میرا خیال ہے جلد اس کی گمشدگی کی خبر پھیلے گی اور پولیس تمہارے پاس آئے گی تب تم وراثت کے لیے کارروائی کرنا اور وہ بھی اس وقت جب پولیس اس کا کیس بند کر دے۔ تم پولیس سے رابطے میں رہو گی تو خود پتا چلتا رہے گا۔ پرا دین اور سمجنا اس کے وارث کی حیثیت سے عدالت میں درخواست دے سکتے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو میں کسی اچھے وکیل سے مشورہ کر کے یہ کام کروں گی۔“
 جب تک میں نے کافی پی اس نے ناشتہ تیار کر دیا اور خود ہی دینے آئی۔ ارون اسے دیکھ کر چونکا مگر وہ اسے دیکھ کر زیادہ چونکی تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ”تم نے اسے ایسے ہی چھوڑ رکھا ہے؟“
 ”میں نے اسے ایسی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے جو نظر نہیں آتی لیکن فولاد سے زیادہ مضبوط ہے یہ صرف بے بس ہی نہیں پوری طرح میرے قابو میں ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”اے ارون ادھر آؤ۔“ میں نے اسے حکم دیا۔ ”کتے کی طرح چاروں ہاتھ بیروں پر چل کر آؤ۔“
 اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے سیٹا کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کے قدموں میں سر رکھو۔“
 اس بار بھی اس نے حکم کی تعمیل کی تو سیٹا اچھل پڑی تھی۔ ”یہ کیسے کیا؟“
 ”مجھے جادو آتا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور ارون کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ سیٹا ناشتہ لگا کر واپس چلی گئی تھی۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ اس دوران میں باہر دھوپ پھیل رہی تھی جب کہ مجھے توقع تھی کہ موسم ابر آلود ہوگا مگر خلاف توقع دھوپ نکل آئی تھی۔ ناشتے کے فوراً بعد میں نے سارا سامان ارون اور آئی کن پر لے دیا۔ چار دن کے آرام سے راج کنور کے پاؤں کی حالت خاصی بہتر ہوئی تھی لیکن وہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ کوئی بوجھ اٹھا سکے۔ بیٹو کو ان کے ساتھ روانہ کر کے میں اندر آیا۔ جہاں سیٹا دیوی کچن کی میز پر منتظر چہرے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔
 ”ہم جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک بار پھر تمہارا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”شکر یہ تو مجھے کہنا چاہیے۔“ اس نے رندھے لہجے میں کہا پھر یک دم اٹھ کر میرے سینے سے لگ گئی۔
 ”شوبی میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔“

میں نے نرمی سے اسے خود سے جدا کیا۔ ”میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا اور تمہارے لیے دعا گو رہوں گا۔“
 اس نے آٹھل سے آنسو صاف کیے۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی تم کال کروا کر ملنے نہ آ سکو تو؟“
 ”کوشش کروں گا۔“ میں نے سر ہلایا حالانکہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
 اس نے ایک بڑا سا ٹفن مجھے پکڑایا۔ ”اس میں کھانا ہے، یہ بارہ گھنٹے گرم رہے گا۔“ پھر اس نے دو تھرماس پکڑائے۔ ”اس میں چائے ہے اور اس میں کافی ہے۔“

”میں ایک بار پھر تمہارا شکر گزار ہوں۔“ میں نے کہا اور باہر جانے لگا تو اس نے ساتھ چلنا چاہا لیکن میں نے روک دیا۔ ”نہیں تمہارا میرے ساتھ نظر آنا مناسب نہیں ہے اگر بعد میں کوئی پوچھے تو تم کہہ سکتی ہو کہ کمرے

میں رکنے والے صبح سویرے تمہارے علم میں آئے بغیر یہاں سے چلے گئے۔“

اس نے سر ہلایا اور میں کمرے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ جب میں گیٹ سے نکل رہا تھا تو بیٹا لاؤنچ کی کھڑکی لٹے دیکھ رہی تھی۔ مجھے متوجہ پا کر اس نے ہاتھ ہلایا میں نے جواب دیا اور جیب کی طرف آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر آئی کن تھا۔ بیٹا اس کے ساتھ تھا۔ جب کہ ارون اور راج کنور پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے ساتھ آگیا۔ آئی کن نے جیب آگے بڑھائی اور ہم اترائی میں جانے لگے تھے۔ میں نے آئی کن سے کہا کہ وہ مرکزی سڑک پر کسی ایسی جگہ نکلے جہاں زیادہ رش نہ ہو۔ اس نے مختلف سڑکوں پر گھماتے ہوئے جیب کو جنوب میں بالکل قصبے کے آخری حصے میں نکالا تھا۔ یہاں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ سڑک پر آ کر اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”اب کدھر جانا ہے؟“

”ہماتا ہوں۔“ میں نے کہا اور عقب سے اس کا بازو پکڑ کر پیچھے کیا۔ اس نے تڑپ کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن بیٹو نے بھی اسے جکڑ لیا اور میں نے آخری انجکشن آرام سے اس کے ہاتھ میں اتار دیا۔ انجکشن دے کر اسے چھوڑ دیا۔ اس نے شکوہ کنٹاں لہجے میں کہا۔ ”تم کوڑھٹ نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”تم بیس لاکھ روپے لے کر دھوکا دے سکتے ہو اور پولیس کے پاس جا سکتے ہو۔“

دس منٹ بعد انجکشن نے اس پر غلبہ پالیا تھا۔ میں نے اسے حکم دیا۔ ”اب تم شملہ کی راہ پکڑو گے پھر سیدھا دہلی جاؤ گے وہاں سے بمبئی جانے والی فلائٹ میں بیٹھ جاؤ گے اور پھر وہاں سے مدراس کی فلائٹ پکڑو گے۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

”گڈ اب روانہ ہو جاؤ اور جلد از جلد شملہ پہنچنے کی کوشش کرو اس کے لیے کوئی پرائیویٹ گاڑی ہائر کر لو۔“

آئی کن سعادت مندی سے قصبے کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ گاڑی اسے وہیں سے مل سکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیب کا رخ شمال کی طرف کر دیا۔ بیٹو نے اسلٹ والا بیگ اور دوسرا بیگ پیچھے رکھ دیا تھا۔ اگرچہ یہ حصہ بھی جیب کے اندر ہی تھا لیکن اس تک رسائی صرف عقبی دروازے سے ممکن تھی اس لیے راج کنور کی طرف سے خدشہ بھی نہیں تھا۔ رواجی سے پہلے میں نے ایک بار پھر اس کی تلاشی لی تھی کہ اس نے موقع پا کر کوئی جھج یا کاٹنا نہ چھپا لیا ہو۔ وہ اب خود چل رہا تھا۔ اگرچہ ہلکا سا ٹکڑا رہا تھا مگر اب اسے سہارا نہیں دینا پڑتا تھا۔ آگے کا کہہ نہیں سکتے تھے کہ جب ہمیں پیدل سفر کرنا پڑتا تو اس کی کیا حالت ہوتی؟ ذرا دیر بعد ہم قصبے سے باہر نکل آئے تھے۔ یہاں سے کنور پبلس ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ بیٹو نے ارون کمار کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا کیا کرتا ہے؟“

”راستے میں کہیں اتار دیں گے۔“ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ بیٹو سمجھ گیا اس نے دانت نکالے

تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”زخم میں تکلیف کیسی ہے؟“

”بہت کم شوبی بس کبھی اچانک زور سے ہاتھ ہلائے تو نہیں اٹھتا ہے۔ لگتا ہے ہم ایک دو دن میں ٹھیک

ہو جائے گا۔“

”ان شاء اللہ۔“ میں نے جیب کی رفتار بڑھائی تھی کیونکہ یہاں سڑک تقریباً سیدھی اور ہموار تھی۔ ڈرائیونگ کے دوران میری نظر ڈھلان پر بھی لگی ہوئی تھی بعض جگہ جیب روک کر میں نے گہرائی کا جائزہ بھی لیا تھا۔ مگر جگہ موزوں نہیں لگی۔ بالآخر ایک جگہ مجھے ٹھیک لگی۔ سڑک کے ساتھ یہ تقریباً نوے درجے زاویے کی گہرائی تھی اور اس کی تہ کم سے کم بھی دو سو فٹ نیچے تھی میں نے جہانک کر دیکھا جھاڑیوں کے درمیان بڑے بڑے پتھر الجھے ہوئے تھے اور اگر کوئی اوپر سے ان پتھروں پر گرتا تو اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیوہ اور راج کنور سمجھ رہے تھے کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں اور ارون کمار انجکشن کے زیر اثر بے حس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے جیب سے اترنے کو کہا وہ سعادت مندی سے نیچے اتر آیا۔ بیوہ اندر رہا تھا۔ میں نے ارون سے کہا۔

”ارون تمہیں ایک بہادری کا کام کرنا ہے۔“

”کیسا کام؟“ اس نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔

”تم یہاں سے دوڑتے ہوئے جاؤ گے اور اس خلا میں چھلانگ لگا دو گے۔“ میں نے کھائی کی طرف اشارہ کیا تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔

”تب تو میں نیچے گر کر مر جاؤں گا۔“

”نہیں مردے نیچے ایک جال ہے جیسا کہ سرکس میں ہوتا ہے تم اس پر گرو گے اور بچ جاؤ گے۔“

چھکچھاہٹ کے ساتھ اس نے سر ہلایا۔ ”میں بچ جاؤں گا نا؟“

”ہاں لیکن زور سے خلا میں چھلانگ لگانا تاکہ سیدھا جال پر جاؤ ورنہ ڈھلان پر گر کر وہ تو لڑھکتے ہوئے نیچے پہنچو گے۔“

میں ایک بار پھر تجربہ کر رہا تھا کہ یہ دوا کس حد تک آدمی کی قوتِ ارادی ختم کرتی ہے اور وہ کس حد تک آپ کے حکم پر عمل کرتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اردن کمار اس مریضاً خودکشی سے انکار کر دے گا۔ قوتِ ارادی ختم ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ آدمی کہنے پر خودکشی کر لے۔ مگر حیرت انگیز طور پر وہ تیار ہو گیا۔ وہ ذرا پیچے گیا اور میری طرف دیکھا۔ ”کیا چھلانگ لگا دوں؟“

میں ہاں کہنے والا تھا کہ شمال کی طرف سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور میں نے اسے روک دیا۔ ”خمس رک جاؤ..... یہ گاڑی گزر جائے اس کے بعد چھلانگ لگانا۔“

یہ بڑے سازش کی نیلے رنگ کی فاکس ویگن تھی۔ اب یہ ماڈل آنا بند ہو گیا مگر برصغیر پاک و ہند میں نظر آتا ہے۔ وہ پاس سے گزری اور جب آگے جا کر ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے ارون کمار سے کہا۔
 ”اب چلائے لگا دو۔“

وہ ہچکچایا۔ ”میں بیچ جاؤں گا؟“

”بالکل تم فکر مت کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی اور دل ہی دل میں اللہ سے اپنے اس جھوٹ کی معافی مانگی جو میں ایک عورت اور اس کے بچوں کو اس موذی شخص سے نجات دلانے کے لیے بول رہا تھا۔ ارون پیچھے ہٹا اور پھر تیزی سے کنارے کی طرف بڑھا۔ میرا دل ایک لمحے کو رک گیا تھا۔ آج سے پہلے میں نے بے شمار لوگوں کو مرتے دیکھا تھا کتنے ہی میرے ہاتھ سے مارے گئے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا جب میں کسی شخص کو ایسے مرتے

دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے کہنے پر از خود موت کے منہ میں چھلاٹک لگا رہا تھا۔ اردن نے کنارے پہنچ کر ایک لمبی چھلاٹک لگائی اور غلامیں غائب ہو گیا اگلے ہی لمحے اس کے منہ سے ایک تیز جھجھکی نکل اڑی اور اس وقت تک نکلتی رہی جب تک وہ پیچھے نہیں جا کر۔ دھپ کی ایک روٹنے کھڑے کرنے والی آواز آئی تھی۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھی۔ میں نے جھپکتے ہوئے کنارے سے پیچھے جھٹکا تو اردن کا ٹوٹ پھوٹ جانے والا جسم ایک چٹان پر پڑا تھا اور اس کے آس پاس کا پتھر خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھ سے اس سے زیادہ نہیں دیکھا گیا اور میں نے بے اختیار پلٹتے ہوئے قے کر دی۔ صبح کا کھانا پینا ناشتہ نکل گیا تھا۔ بیٹو اتر کر میرے پاس آیا اور میری پشت سہلانے لگا۔

”شوبی ٹھیک ہے سب ٹھیک ہے وہ اسی انجام کا مستحق تھا۔“

میں نے پانی کی بوتل لے کر کھلی کی اور پھر چند گھونٹ پانی کے پیا۔ ”ہاں یار پر میں نے کسی کو اس طرح راضی خوشی مرتے نہیں دیکھا ہے، اس نے میرے حکم پر چھلاٹک لگائی ہے۔“

”آجاؤ ادھر سے چلو کوئی آگیا تو بلا وجہ شک ہوئے گا۔“ بیٹو مجھے جیب تک لایا اس نے ڈرائیو تک خود سنبھال لی۔ میں نے قمراس سے کافی نکال کر لی اس سے میری حالت تیزی سے سنبھل گئی۔ راج کنور ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد بھرائی آواز میں کہا۔ ”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ دو اتنی بھیاٹک ہوگی۔“

”پتا نہیں کیا بلا ہے اور ڈرا سوچو میڈیکل اسٹور پر عام مل رہی ہے بغیر ڈاکٹر کی ہدایت تو ایسی دوائیں کتنی خطرناک ہوں گی جو اسی مقصد کے تحت بنائی گئی ہوں گی اور وہ مارکیٹ میں دستیاب بھی نہیں ہوں گی۔“

بیٹو نے کہا۔ ”شوبی اس پر بھی آزمائو ہم چاہتا ہے یہ کتنے کی طرح بھونکے، ہمارے پاؤں چائے اور پھر ہم اسے کتنے مارز ہر دے کر کھانے کو بولے تو یہ کھالے۔“

راج کنور بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ”تم..... تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”ہم اس سے بھی زیادہ کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بیٹو کا آئیڈیا اچھا ہے۔ اگر تم نے ہماری مدد نہیں کی تو ہم ایسا ہی کریں گے۔ بیٹو راتے میں آنے والے اگلے قصبے سے کتنے مارز ہر لے لیتا۔“

”میں بتا چکا ہوں میں تمہاری کنور پیلس کی حد تک کوئی مدد نہیں کر سکتا ہوں۔“ اس نے لیو پر زبان پھیری۔ ”بڑا کنور جانتا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ لگ چکا ہوں اس لیے اس نے وہ سارے راتے بند کر دیئے ہوں گے جہاں سے تم میری مدد سے اندر داخل ہو سکتے ہو۔“

”تمہارا اشارہ خفیہ راستے کی طرف ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”وہ لازمی بند ہو چکا ہوگا۔ اس کے علاوہ کنور پیلس کی سکیورٹی میں کچھ لوہس تھے وہ بھی بڑے کنور نے بند کر دیئے ہوں گے۔“

”کیسے لوہس؟“

”مین گیٹ اور اگلی سکیورٹی لائن کے درمیان فاصلہ تھا اگر کوئی گیٹ کے گارڈز پر قابو پالیتا تو وہ اندر داخل ہو جاتا۔ اگرچہ پیلس کی اصل عمارت تک پہنچنا پھر بھی ناممکن حد تک مشکل ہوتا لیکن آدمی اندر جا سکتا ہے۔ اس علاوہ پیلس کے دائیں طرف ایک کھائی ہے یہ وہی کھائی جس سے پیلس میں جانے والا پل گزرتا ہے یہ سامنے

سے ہوتی ہوئی دائیں طرف جاتی ہے۔ اس کی ڈھلان کے ساتھ گلی دیوار صرف بارہ فٹ اونچی تھی اور اس پر بازو بھی نہیں تھی لیکن اب یہ راستہ بھی بند ہو گیا ہوگا کیونکہ میں نے خود اسے اونچا کر کے اس پر کیرے لگانے کا حکم دیا تھا، بس اور کام شروع ہونے والا تھا۔“

”اندر سیوری گاؤز کی تعداد کیا ہے؟“

”ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔ باہر کے گاؤز سو سے زائد ہیں لیکن پبلز کی اصل سیوری ان پچاس گورکھوں کے پاس ہے جو ہائیلی ٹریڈ اور مرنے مارنے کو کھیل سمجھتے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے پبلز کے اندر داخل ہونا ناممکن ہے۔ وہ بلٹ پروف جیکٹوں اور گیس ماسک سے مسلح ہوتے ہیں۔ ان کے پاس خود کار رائفلیں، خطرناک چھوٹے دستی بم، چاقو اور تاریکی میں دیکھنے والی عینکیں بھی ہوتی ہیں۔ وہ سب جدید ترین وائیٹ کیز کی مدد سے آپس میں رابطے میں ہوتے ہیں۔“

”ان کی تعداد کتنی ہے؟“

”ان کی تعداد پچاس ہے لیکن سب ہر وقت ڈیوٹی پر نہیں ہوتے ہوں گے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”عام حالت میں ایک وقت میں بیس ڈیوٹی پر ہوتے اور آٹھ گھنٹے بعد ڈیوٹی بدلتی ہے۔ اسی طرح باہر ایک وقت میں پچاس گاؤز ہوتے ہیں لیکن تمام گاؤز ہمہ وقت چوکے ہوتے ہیں اور پانچ منٹ کے نوٹس پر وہ پورے پبلز میں کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں اس کی باقاعدہ ریہرسل ہوتی ہے۔“

راج کنور پبلز کی سیوری کے بارے میں بتا رہا تھا اور میں ان معلومات کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتا جا رہا تھا۔ بیو توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اچانک اس نے کہا۔ ”شوہی ایک نیلا دیگن آ رہا ہے۔ یہ پہلے ہمارے پاس سے گزرا تھا دوسری طرف گیا تھا اب پیچھے آ رہا ہے۔“

میں نے عقبی آئینے میں دیکھا تقریباً سو گز پیچھے نیلی فاکس دیگن آرہی تھی لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ وہی فاکس دیگن تھی یا کوئی دوسری گاڑی تھی۔ میں نے بیو سے کہا۔ ”رفار تیز کرو۔“

بیو نے ایکسی لیٹر دیا اور چند لمحوں میں لینڈ کروزر بیس میل سے چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار پر آگئی۔ فوراً ہی میں نے فاکس دیگن کی رفتار میں اضافہ ہوتے دیکھا۔ رفتار کے معاملے میں وہ کسی طرح لینڈ کروزر سے کم نہیں تھی مگر اس کے ٹائر سڑک کو اتنا اچھا گرپ نہیں کر سکتے جتنا لینڈ کروزر کے ٹائر کرتے ہیں۔ یہاں سڑک سیدھی تھی اس لیے فاکس دیگن کو دوبارہ سو گز تک پیچھے آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بیو نے مہارت سے ایک موڑ کاٹا اور فوراً ہی پوری بریک لگائی تھی کیونکہ سامنے ہی دو عدد جنپین کھڑی تھی اور ان کے ساتھ کم سے کم نصف درجن افراد خوف کا رتھیا روں سے لیس پوزیشن سنبھال کر کھڑے تھے۔ میں نے بیو سے کہا۔ ”ریورس کرو۔“

لیکن اس سے پہلے بیو جیب ریورس کرتا عقب سے فاکس دیگن نمودار ہوئی اور اس نے ترچھا ہو کر راستہ بند کر دیا تھا۔ ہم بھنس گئے تھے۔ پھر فاکس دیگن کا سلائیڈنگ ڈور کھلا اور اس سے ایک شخص نیچے اترا۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔



جب سے میں نے سنا تھا کہ فتح خان انڈیا میں موجود ہے تب سے میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا کہ کسی وقت بھی اس سے سامنا ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی فتح خان متعدد بار ڈرامائی انداز میں میرے سامنے آچکا تھا۔ مگر گزشتہ کچھ عرصے سے اس کا منہوس سایا مجھے اپنے آس پاس نظر نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کہ اب فتح خان سے میری جان چھوٹ گئی ہے کیونکہ کم شدہ ہیروں کی تلاش میں، میں اس کی مدد نہیں کر سکا تھا اور شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں مدد کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر اس وقت فتح خان کی صورت دیکھ کر میری ساری خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ فاکس ویگن سے اترنے والا فتح خان ہی تھا۔ اس نے صدری نما لباس پہن رکھا تھا اور بہ ظاہر خالی ہاتھ تھا لیکن مجھے یقین تھا اس کے اس ڈھیلے لباس میں کئی طرح کا اسلحہ روپوش ہوگا اور وہ یکنڈ کے نوٹس پر اسے نکالنے اور استعمال کرنے پر قادر ہوگا۔ اسے دیکھتے ہی بیٹو نے ہسٹول نکالنا چاہا لیکن میں نے روک دیا۔

”نہیں..... ہم گھرے ہوئے ہیں کوئی غیر ضروری حرکت مت کرنا۔“

”شوہی، ہم ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔“ بیٹو غصے سے بولا۔ ”یہ کتے کا بچہ ہمارا چچا کیوں نہیں چھوڑتا۔“

”کیونکہ یہ کتے کا بچہ ہے۔“ میں نے تائید کی۔

فتح خان نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ خاموش تھا یعنی اس نے کوئی کبواں نہیں کی تھی۔ میں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ البتہ میرا ہسٹول میرے ہاتھ کی پہنچ میں تھا۔ راج کنور ذرا حیران تھا۔ اس نے تجسس سے پوچھا۔ ”شہباز یہ کون ہیں؟“

”میرے دشمن۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا اگر کوئی غلط حرکت کی تو میں تمہیں ضرور شوٹ کر دوں گا۔“

اس نے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کے ساتھ میں کوئی غلط حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟“

فتح خان خاموشی سے غالباً میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر میں نے کچھ کرنا ہوتا تو اب کر چکا ہوتا۔ جب کا انجن اسٹارٹ تھا۔ بیٹو نے آہستہ سے کہا۔ ”شوہی، ہم رپورس کر کے ویگن کو کھر مارتا ہے اسے راستے سے ہٹا کر ہم یہاں سے نکل سکتا ہے۔“

میں نے بیٹو کی تجویز پر غور کیا اور فوراً مجھے محسوس ہوا کہ یہ بہت رکی تجویز ہے۔ اول تو ہمارے سامنے چھ سے سات مسلح افراد تھے۔ جیپ کے حرکت میں آتے ہی ان کی خود کار گنوں کے دہانے بھی کھل جاتے۔ اتنے

جتھیاروں کے خلاف سامنے سے ہمیں کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ دوسرے اگر جیب دیکن سے ٹکراتی تب بھی لازمی نہیں تھا کہ وہ راستے سے ہٹ جاتی۔ پھر پیچھے فتح خان اور اس کے چند ساتھی اور بھی تھے وہ بھی مزاحمت کرتے۔ اس کے بعد بھی ہم ریورس میں پیچھے جاتے تو بہت دور تک جیب موڑنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اتنی دیر میں سامنے موجود دونوں جیبیں ہمیں آلتیں۔ اس لیے میں نے بیٹو کی تجویز مسترد کر دی۔ ”یہ بہت خطرناک ہے۔ اگر ہم فتح بھی گئے تب بھی فرار مشکل ہے یہ آسانی سے ہماری گاڑی کا کارہ بنا سکتے ہیں۔“

بیٹو نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”شوٹی تو کیا خود کو ایسے حوالے کر دے؟“

”حالات کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”نی الحال صبر بہتر رہے گا۔“ میں نے کہتے ہوئے

بایاں ہاتھ باہر نکال کر بلند کیا اور بولا۔ ”فتح خان میں نیچے آ رہا ہوں اپنے کتوں کو پناؤ ڈال کر رکھو۔“

”فکرمٹ کرو شہباز خان! پناؤ ڈالا ہوا ہے ہمارا کتا میری مرضی کے بغیر بھونکنے لگا ہے۔“

سامنے موجود افراد کے چہرے ساکت رہے یعنی انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں اور فتح خان انہیں کتا قرار دے رہے تھے۔ یقیناً انہیں چوں نہ کرنے اور دُم ہلاتے رہنے کا بہت بھاری معاوضہ دیا گیا ہوگا۔ میں نیچے اتر آیا اور نے تلے قدموں سے فتح خان کی طرف بڑھا۔ وہ چوکنٹا ہو گیا تھا۔ جب میں دس قدم دور تھا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”بس شہباز خان وہیں رکت جاؤ۔“

”اتنی گنتوں کے ہوتے ہوئے بھی تم خوفزدہ ہو۔“ میرا لہجہ ہلکا سا استہزائیہ ہو گیا۔

”ہاں..... فتح خان نے اپنی حفاظت کے لیے کبھی دوسرے کا گمن پر اعتبار نہیں کیا۔“ اس نے صاف کوئی

سے کہا۔ ”یہ تمہارے واسطے ہے ہمارے واسطے نہیں۔“

میں ٹھہر گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہی بولا۔ ”فتح خان تم کیا چاہتے ہو؟ کیوں بار بار میرے راستے

میں آتے ہو۔ میں نے تم سے کیا کہا تھا کہ اب تم میرے سامنے آئے تو مروت اور لحاظ کا ہر رشتہ ختم ہو جائے گا۔“

”ہم کو یاد ہے۔“ اس نے اپنی سفید ہو جانے والی بخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”یقین کرو شہباز خان ہم بھی

ہر بار یہی سوچتا ہے کہ اب تمہارا سامنا نہیں کرے گا۔ ہم خطرناک دشمن پالنے کا قائل نہیں ہے یا تو اسے مار دیتا

ہے اور مار نہ سکے تو اس سے دور رہتا ہے۔ پر تم سے ہمارا ستارہ ملتا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا سبب ہو جاتا ہے کہ تم سے

ملنا پڑتا ہے۔“

”اب ایسا کیا سبب ہو گیا؟“

فتح خان نے پھر اپنی بخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”پرانا سبب ہے، تم جانتا ہے ڈیوڈ شاتم سے کیا چاہتا

ہے۔“

یہ پہلا موقع تھا کہ فتح خان کھل کر بات کر رہا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”جانتا ہوں لیکن وہ حماقت کر رہا

ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا انگریز جو جدید دنیا کا پروردہ ہے ایسی احمقانہ بات کا اتنی سنجیدگی سے قائل ہو

جائے گا۔“

”معاذ اُدھر کا نہیں اُدھر کا ہے۔“ فتح خان نے دماغ کے ساتھ دل کی طرف اشارہ کیا۔ ”اُدھر کوئی بات

منطق سے نہیں آتا ہے اس لیے منطق سے کیسے نکالا جاسکتا ہے۔“ اُن پڑھ اور بہ ظاہر جاہل نظر آنے والے فتح

خان نے دانشوروں کی سی بات کی تھی اور وہ یقیناً ہمارے ان بہت سے نام نہاد دانشوروں سے بہتر ہے جن کی ساری دانشوری ان کے نظریات کے تابع ہوتی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔

”میں سمجھتا ہوں لیکن ڈیوڈ شا سے اس سلسلے میں میری جتنی بار بات ہوئی اور جو طے ہوا وہ ویسا نہیں کر سکا۔ تب وہ مجھے کس طرح مجبور کر سکتا ہے کہ میں اس کے ساتھ کسی احمقانہ ایڈوچر میں شامل ہو جاؤں۔“

”وہ تم سے ایک اور آخری بار بات کرنا چاہتا ہے۔“ فتح خان نے داڑھی پر ہاتھ پھیرنا چھوڑ کر ناخن سے دانتوں میں خلال شروع کر دیا۔ ”جہاں تک مجبوری کا بات ہے تو اتنا آدمی کس واسطے لایا ہے تم ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کیا تم مجبور نہیں ہے؟“

میں نے دل میں تسلیم کیا میں مجبور تھا۔ اتنے مسلح لوگوں سے صرف پیر میں لڑ سکتا تھا کیونکہ اس پر گولیاں اثر نہیں کرتی تھیں لیکن میں گوشت پوست سے بنا انسان ہوں جسے ایک گولی سفر آخر اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے اس لیے میں زندہ رہنے کے لیے مجبور تھا۔ البتہ ضروری نہیں تھا کہ میں فتح خان کے سامنے اس کا اقرار بھی کرتا۔ ”تم جانتے ہو میں نے کبھی خود کو بے بس نہیں سمجھا۔“

اس نے دانت نکالے۔ ”ہم جانتا ہے، اس لیے پورا بندوبست کر کے آیا ہے۔ ہم یہ بھی کر سکتا تھا کہ دو بندے لاتا اور وہ تم کو اور تمہارے ساتھی کو بے ہوشی والا بلٹ مارنا اور ہم تم کو آرام سے ڈھوکر لے جاتا۔ ہم پہلے بھی کئی بار یہ کام کیا پر اب ہم کو اچھا نہیں لگتا ہے تم اچھا اور معزز آدمی ہے اس لیے ہم تم کو معزز آدمی کی طرح لے جانا چاہتا ہے۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا اس بار اس کے لہجے میں شرارت نہیں تھی۔ وہ بالکل سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ ”معزز آدمی کی طرح جانے کی کیا صورت ہے؟“

”تم اپنا اور اپنے ساتھی کا سارا ہتھیار ہمارے حوالے کرے گا۔ کوئی موبائل یا رابطے کا چیز تمہارے پاس نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں لے گا۔“

”تو باقی کیا بچا..... بس کچھ رقم اور یہ گھڑی۔“ میں نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔ ”فتح خان ہتھیار تم کو دے کر کیا میں خالی ہاتھ رہ جاؤں۔ اس کے بعد تم میرے ساتھ جو چاہے کرو۔“

”نہیں ہم وعدہ کرتا ہے۔ اپنی مری ماں کی قسم کھاتا ہے تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں کرے گا۔“ فتح خان نے بات کرتے ہوئے اپنی گھڑی دیکھی۔ ”شہباز خان فیصلہ ذرا جلدی کرو ابھی تم کو لے کر جانا بھی ہے۔“

”ڈیوڈ شا کہاں ہے؟“

”شملہ میں ہے۔“ اس بار بھی اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”فرض کرو یہ غلط سلوک ڈیوڈ شا نے کرنے کا فیصلہ کر لیا تو تمہاری مری ماں کی قسم ٹوٹ نہیں جائے گی؟“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”تم جانتا ہے ڈیوڈ شا غنڈے دماغ کا آدمی ہے۔“

”ہاں وہ کھانا کھاتے ہوئے کسی کو غنڈے دماغ سے قتل کر کے اپنا کھانا مکمل کر سکتا ہے۔“

”شہباز خان تم جانتا ہے وہ تم سے کام لینا چاہتا ہے تمہارا جان لینا ہوتا تو اس کے لیے بہت مواقع آیا تھا

پر اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہے؟“

میں نے دل میں تسلیم کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ”میں اس وقت ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں اور وہ میرے لیے ہر کام سے بڑھ کر ہے اس صورت میں، میں ڈیوڈ شا کے کام آنے سے انکار کروں گا تو اس کا رد عمل کیا ہوگا؟“

”میں جانتا ہے تم کس کام سے جا رہا ہے۔“ فتح خان نے کہا اور ذرا آگے آ کر آہستہ سے بولا۔ ”تم چاہے تو ڈیوڈ شا تمہارے کام آ سکتا ہے۔ کنور پبلش سے کسی کو نکالنا بہت مشکل کام ہے کم سے کم تم دو افراد کے بس کا نہیں ہے۔ اس کے لیے درجنوں مسلح اور تربیت یافتہ افراد اور بہت سارا جدید اسلحہ چاہیے۔“

”جو صرف تم اور ڈیوڈ شا مہیا کر سکتے ہو۔“

”وہی کر سکتا ہے ہمارا اتنا اوقات نہیں ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ میں گفتگو کو بلاوجہ طول نہیں دے رہا تھا میں فتح خان اور اس کے پاس کے عزائم جاننے اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ فتح خان مجھے ترغیب دے رہا ہے کہ میں شرافت سے اس کے ساتھ چلا چلوں اور اسے ہنگامہ آرائی نہ کرنی پڑے۔ اس کے پاس مجھے مجبور کرنے کے لیے تمام تر قوت تھی لیکن وہ اس کا استعمال نہیں چاہتا تھا ایک بار گولیاں چلنا شروع ہو جائیں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کون بچے گا اور کون مارا جائے گا۔ اس وقت زیادہ امکان تو میرا اور بیٹو کا تھا۔ ہم دو تھے اور ہمارے مقابلے پر کم سے کم دس افراد تھے۔ فتح خان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا میں نے کہا۔

”تم نے کیسے پتا چلایا کہ میں یہاں ہوں۔“

”جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ سعدیہ یہاں آگیا ہے میں نے ادھر جال بچھا دیا۔ مجھے معلوم تھا تم ادھر آئے اور تم آیا۔“

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ بات بھارتی ایجنسیوں کی عقل میں نہیں آئی یا ممکن ہے انہیں سعدیہ کی واپسی کا علم ہی نہ ہو۔ میں نے فتح خان سے مطالبہ کیا۔

”میں ایک بار ڈیوڈ شا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم کو اس سے بات کرانے کے واسطے تو لے جا رہا ہے۔“ فتح خان نے عیاری سے کہا اور گھڑی دیکھ کر بولا۔ ”شہباز خاناں وقت ختم ہو گیا۔ اب فیصلہ کر لے ہوش میں جانا ہے یا ہم تم کو پوری کی طرح اٹھا کر لے جائے۔“

فاسک ویگن کے کھلے دروازے سے ایک نال عمودار ہوئی جس کا کیلی برکسی عام نال سے بڑا تھا یہ تقریباً پون اٹھ قطر کی تھی۔ یقیناً اس سے بے ہوش کرنے والے ڈارٹ فائر کیے جاتے ہوں گے۔ میں نے ہاتھ اوپر کیا۔ ”اوکے..... اوکے.....“

”لڑکے کو نیچے بلا لو۔“

میں نے بیٹو کو آواز دی۔ ”نیچے آ جاؤ۔“

وہ نیچے اتر آیا اور فتح خان کے سامنے جا کر بولا۔ ”ہمارا نام لڑکا نہیں بیٹو ہے۔“

فتح خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”بڑا کرنت ہے تیرے میں کبھی آزما کر دیکھے گا۔“

”فتح خان کام کی بات کرو۔“

”اب تم اپنا سارا ہتھیار نیچے ڈال دو۔“

میرے اور بیٹو کے پاس پستول تھے وہ ہم نے نیچے ڈال دیئے۔ فتح خان نے ہمیں پیچھے ہٹنے اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے اعتراض کیا۔ ”یہ کس خوشی میں جب ہم اپنے ہتھیار پھینک چکے ہیں؟“

”تمہارا تلاشی ہوگا۔“ فتح خان نے کہا۔

”ضرور۔“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس موبائل ہے میں وہ نکال رہا ہوں۔“

اس سے پہلے فتح خان مجھے روکتا۔ میں نے موبائل نکال اور اچانک ہی ہاتھ گھما کر اسے نیچے کھائی میں پھینک دیا۔ کھائی اچھی خاصی گہری تھی اور اب فتح خان اپنے آدمیوں کو بھیج بھی دیتا تو یہ بھوسے میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف ہوتا۔ موبائل میں سفیر، عبداللہ اور وسیم کے نمبرز اور خاصی معلومات تھیں جو کسی صورت فتح خان کے ہاتھ نہیں لگتی چاہیں تھیں اس نے کہا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”یہ تم نے اچھا نہیں۔“

”میں اکثر اچھا نہیں کرتا ہوں۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے۔ بیٹو تیار نہیں تھا لیکن میرے اشارے پر مجبوراً وہ گردن پر ہاتھ رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ فتح خان کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا تھا اور متعدد گنتوں کے دہانے ہماری طرف تھے۔ تلاشی لے کر انہوں نے میرے پاس سے چاقو اور رقم نکال لی تھی۔ اصل رقم لیپ ٹاپ والے بیک میں تھی لیکن اس وقت رقم کے بجائے مجھے اپنی اور بیٹو کی فگرتھی۔ فتح خان نے چاقو اور رقم رکھ لی۔ میں نے اردن کا آئی فون اس کھائی میں پھینک دیا تھا جس میں اس نے چھلانگ لگائی تھی اسے اپنے پاس رکھنا قتل کا ثبوت لیے پھر نے کے مترادف تھا۔ فتح خان کی بات سے میں نے اطمینان محسوس کیا کہ وہ بیٹا کے بارے میں بے خبر تھا۔ اس آئی فون کی مدد سے وہ بہت کچھ جان سکتا تھا۔ جب اردن کی لاش ملتی تو اس سے میرا تعلق ثابت ہو جاتا۔ ہماری مکمل تلاشی لے کر ہمارے ہاتھوں میں ناکون کی جھنڈیاں لگا دی گئی تھیں۔

میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ”میں اس وقت خود کو خاصا معزز محسوس کر رہا ہوں۔“

”ایسا ہوتا ہے یہ جتنا بڑا لیڈر لوگ ہے پہلے اسی طرح جیل جاتا ہے پھر معزز بنتا ہے۔“

”تم مجھے معزز بنارہے ہو یا گالیوں دے رہے ہو۔ اللہ نہ کرے جو میں اس قسم کا لیڈر بنوں جیسے آج کل

ہمارے لیڈر ہیں۔“

”قائد اعظم کا دور ان کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔“ فتح خان نے لا پرواہی سے کہا اور ہمیں وین میں ڈالنے کا اشارہ کیا۔ ہمیں دھکیل کر وین میں بٹھا دیا گیا۔ اس میں آنے سے سانسے چوڑی نشستیں تھیں۔ فتح خان اپنے ایک آدمی کے ساتھ اندر آیا۔ میں نے کہا۔

”یہ گاڑی، اس کا سامان اور اس میں بیٹھا ہوا آدمی تمہارے پاس میری امانت ہے اس میں سے ایک چیز

بھی کم ہوئی تو تمہیں حساب دینا ہوگا۔“

”شہباز خان فگرتہ نہ کرو سب پورا ملے گا۔“ اس نے کہا اور سلائیڈنگ ڈور بند کر دیا۔ یہ حصہ بالکل پیک تھا

کھڑکیوں اور عقبی شیشے گہرے سرمئی رنگ کے تھے اور باہر کا منظر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی دین حرکت میں آئی اس نے موڑ کاٹا اور واپس روانہ ہو گئی۔ دوسری گاڑیوں اور ہماری جیب کا ہٹا نہیں تھا لیکن امکان تھا کہ وہ پیچھے آرہے ہوں گے۔ فتح خان کے بیٹھا ہوا دوسرا شخص خاموش اور بہ ظاہر خالی ہاتھ تھا۔ مگر یہاں اس کی موجودگی کا مقصد یقیناً ہمیں قابو میں رکھنا تھا۔ شملہ تک خاصا طویل سفر تھا میں نے فتح خان سے کہا۔

”کیا ہمیں پورا راستہ اسی طرح بندھے ہاتھوں سے بیٹھنا پڑے گا؟“

اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”نہیں بس کچھ دیر صبر کرو پھر تم شا کے سامنے ہوگا۔“

”یہ کچھ دیر کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”مجھے معلوم ہے شملہ یہاں سے کتنا

دور ہے۔“

”میرے کو بھی معلوم ہے۔“ وہ بولا۔ اسی لمحے دین کی رفتار کم ہوئی اور وہ کسی کچے راستے پر آئی تھی۔ وہ ہائی وے سے ہٹ گئی تھی اور کسی قدر بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز خاناں تم نے ادھر بہت کارنامہ انجام دیا ہے۔ پورا انڈین گورنمنٹ پریشان ہے۔“

”وہ میری تلاش میں ہیں اور اگر راستے میں انہوں نے روک لیا تو میرے ساتھ تم بھی پلیٹ میں آ جاؤ گے۔“

”کسی کا باپ بھی ہم کو نہیں روک سکتا۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ اسی لمحے دین رک گئی۔ فتح خان نے اس کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ پھر اس نے مجھے اور بیٹو کو نیچے آنے کو کہا۔ ہم بھی دین سے اتر آئے۔ یہ جگہ سڑک سے ہٹ کر ایک کسی قدر گول ہموار سطح والی پہاڑی پر تھی اور خاص بات یہاں موجود ایک چھوٹا ہیلی کاپٹر تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ فتح خان کچھ دیر میں ہمیں ڈیوڈ شا کے سامنے پیش کرنے کی بات کیوں کہہ رہا تھا؟ ہمیں باقی سفر یقیناً اسی ہیلی کاپٹر سے کرنا تھا۔ فتح خان نے پستول نکال لیا تھا اور بہت چوکنا ہو رہا تھا۔ یہاں تک صرف دین آئی تھی اور باقی گاڑیاں یقیناً ہائی وے پر محسوس تھیں ویسے بھی ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے علاوہ چار افراد کی گنجائش تھی۔ مجھے اور بیٹو کو درمیان میں اس طرح جگہ ملی کہ فتح خان کا ساتھی درمیان میں آیا تھا۔ خود فتح خان پائلٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کیونکہ ہمارے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے فتح خان کے ساتھی نے میری اور بیٹو کی سیٹ بیلٹس باندھی تھیں۔

ہمارے بیٹھے ہی پائلٹ نے انجن چلا دیا تھا اور ایک منٹ سے بھی پہلے ہیلی کاپٹر کے پچھلے پوری رفتار سے گردش کرنے لگے تھے۔ میں نے دیکھا دین واپس جا رہی تھی اور اسی لمحے ہیلی کاپٹر ایک دھچکے سے اوپر اٹھ گیا۔ چند منٹ میں ہیلی کاپٹر خاصا بلند ہو کر جنوب کا رخ کر رہا تھا۔ دس بج رہے تھے اور سورج خاصا بلند ہو رہا تھا۔ بیٹو خاصا مایوس تھا اس نے چلا کر میرے کان میں کہلا۔ ”شوبی یہ کیا ہے ہم پھر پکڑا گیا۔“

”یہ ہمارا نصیب ہے۔“ میں نے سرد آدھ مہری۔ ”ہر کچھ عرصے بعد یہ مشق دہرائی جاتی ہے۔“

”پر شوبی ہر بار تم بچ جاتا ہے۔“

”کیونکہ ہم زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے کہا ہیلی کاپٹر نے رفتار پکڑ لی تھی۔ اس چھوٹے لیکن جدید ہیلی کاپٹر کا انجن طاقتور تھا اور یہ سنکاری کے ہیلی کاپٹر سے کہیں تیز تھا۔ مشکل سے بیس منٹ گزرے

ہوں گے کہ شملہ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اگرچہ ہم نے ہیڈ فون نہیں لگا رکھے تھے اس کے باوجود اندر شور کم تھا۔ درندہ اب تک جن ہیلی کاپٹرز میں سفر کیا تھا ان کا شور دماغ خراب کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ مزید چند منٹ بعد ہم ایک پہاڑی کے اوپری حصے میں بنے خوب صورت مینشن کے ہیلی پیڈ پر اتر رہے تھے۔ تمام پہاڑی مقامات کی طرح شملہ میں بھی آبادیاں مختلف پہاڑی ڈھلوانوں پر ہیں۔ کہیں عام افراد کی آبادیاں تھیں۔ یہاں قریب قریب کھلونوں کی طرح مکانات تھے۔ طرز تعمیر بس گزارے لائق تھا۔ کہیں درمیانے درجے کی آبادیاں تھیں جن میں صاف ستھری اور خوب صورت کئی کئی منزلہ عمارات، بازار اور چھوٹے بنگلے بنے ہوئے تھے۔

چند ایک آبادیاں امرا کی تھیں جن میں جگہ چھوڑ اعلیٰ تعمیراتی ذوق کی حامل عمارات تھیں۔ ان کی شان و شوکت ان کی وسعت سے ظاہر تھی۔ یہ پہاڑی بھی امرا کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں صاف ستھری کشادہ سڑکیں جن کے ساتھ گرین بیلٹ بھی تھی۔ ڈھلان پر جا بہ جا اونچے اور خوب صورت پہاڑی درختوں کے چھوٹے چھوٹے جنگل، سڑکوں کے علاوہ پیدل آمد و رفت کے لیے جگہ جگہ پتھر اور لکڑی سے بنی سیڑھیاں تھیں جن کے دائیں بائیں ریلنگ بھی لگائی گئی تھی۔ ہیلی کاپٹر سے یہ سب صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم جس مینشن کے ہیلی پیڈ پر اتر رہے تھے اس میں کئی عمارتیں تھیں۔ کئی سطحوں پر بنے باغات تھے۔ ایک بڑا کارپورچ تھا جس میں نصف درجن قیمتی گاڑیاں پارک تھیں اور اس سے کہیں زیادہ گاڑیاں پارک ہو سکتی تھیں۔ تمام عمارتوں کے اوپر گلابی کچھریل کی چھت تھی اور عمارتوں پر دودھیا گلابی رنگ تھا۔ ہیلی کاپٹر ہلکے سے دھچکے کے ساتھ ہیلی پیڈ پر اتر گیا۔ پائلٹ نے انجن بند کیا اور سیٹ بیلٹ کھول کر ہوائی نیچے اتر گیا۔

فتح خان کے ساتھی نے ہماری سیٹ بیلٹس کھولیں اس دوران میں فتح خان بھی نیچے اتر گیا تھا اس نے میری طرف کا دروازہ کھولا اور میں نیچے اتر آیا فتح خان مسکرایا۔ ”دیکھا تم کو گھسنے سے بھی پہلے ادھر لے آیا ہے۔“

”تمہاری مہربانی۔“ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے۔“

”اسے پنک مینشن کہتے ہیں۔“ فتح خان نے بتایا۔ ”راہستان کے ایک ٹھاکر کی ملکیت ہے۔“

”اوہ اسی مناسبت سے پنک ہے۔“ میں نے کہا۔ بیٹو اور فتح خان کا ساتھی بھی اتر آئے تھے۔ فتح خان نے کہا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ ایک چھوٹی عمارت کی طرف بڑھا۔ دروازے پر ایک راجپوتی گارڈ موجود تھا اس نے سوالیہ نظروں سے فتح خان کی طرف دیکھا تو اس نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ ”بھورستے سے خانہ خراب۔“

گارڈ جس نے راجپوتی گجڑی باندھ رکھی تھی خوشخوار نظروں سے فتح خان کو دیکھا جو اس کی طرف دیکھے بغیر اندر جا چکا تھا۔ مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اور بیٹو فتح خان کے پیچھے تھے اور فتح خان کا آدی ہمارے پیچھے تھا۔ فتح خان ہمیں ایک نشست گاہ میں لایا۔ یہاں فرش پر قالین اور چند گد یوں والے صوفے تھے دیواریں سادہ اور ایک طرف آتش دان تھا۔ فتح خان نے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے اپنے آدی کو حکم دیا۔

”ان کے ہاتھ کھول دو۔“

اس نے چاقو نکالا اور ناکوں کی جھکڑی کاٹ دی۔ میرا ہاتھ آزاد ہوتا ہی فتح خان نے پستول نکال کر

اس کا رخ بیٹو کی طرف کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کس لیے فتح خان؟“

”حفظ بالانقدم۔“ وہ مکاری سے بولا۔

”تمہاری اردو خاصی بہتر ہو گئی ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میری کلائیوں پر نشان پڑ گئے تھے لیکن میں نے فتح خان کے سامنے انہیں سہلانے سے گریز کیا۔ بیٹو آزاد ہو کر میرے ساتھ بیٹھا تھا کہ فتح خان نے حکم دیا۔

”اسے لے جاؤ یہاں سے۔“

”یہ یہیں رہے گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے جو بات کرنی ہے اس کے سامنے کرو ورنہ چپ رہو۔“ میرے دو ٹوک لہجے پر فتح خان کا رنگ بدلا تھا مگر وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے بات بدل دی۔ ”ٹھیک ہے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اصل میں ڈیوڈ شاہ سے صرف تمہاری ملاقات ہوگی۔“

”تب کی تب دیکھی جائے گی، ویسے ڈیوڈ شاہ کہاں ہے؟“

فتح خان نے شانے اچکائے۔ ”وہ باس ہے میں کیا کہہ سکتا ہے لیکن اس کو پتا چل گیا ہو گا تم ادھر آ گیا ہے وہ تم سے ملے گا۔ تم کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟“

”ہاں کوئی گرم چیز مل جائے تو اچھا ہے۔ گرم چیز سے مراد چائے کافی ہے۔“

فتح خان نے میز پر رکھی ٹھنڈی کابین دیا اور مترنم آواز کو فنی فوراً ہی دروازے کھلا اور ایک نو عمر خادمہ اندر آئی۔ اس کی عمر شاید سولہ برس تھی لیکن وہ لڑکی نہیں رہی تھی۔ ایک خاص قسم کی تجربے کاری اس کے چہرے اور تاثرات سے جھلک رہی تھی۔ اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ وہ اندر آ کر دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی ہو گئی۔ فتح خان نے اسے حکم دیا۔ ”چائے اور کافی کے ساتھ کچھ کھانے کو لاؤ..... پر خیال رکھنا ادھر سب مسلمان ہے کوئی حرام یا جھکے والا چیز مت لانا۔“

خادمہ کے جانے کے بعد میں نے فتح خان سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں ایسی چیزوں سے فرق پڑتا ہے؟“

”کلمہ شریف تو میں بھی پڑھا ہے۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔ اس نے اب پستول گود میں رکھ لیا تھا مگر اس کے دستے پر اس کی گرفت موجود تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ میری طرف سے کچھ زیادہ ہی چوکنا تھا۔ شاید ڈیوڈ شانے اسے وارننگ دی تھی کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں ذمے دار اسے قرار دیا جائے گا۔ حالانکہ ہم یہاں آگئے تھے تو اب یہاں سے فرار تقریباً ناممکن حد تک مشکل تھا۔ جس جگہ ڈیوڈ شاہ تھا وہاں کی حفاظت میں کوئی سقم مشکل سے پایا جا سکتا تھا۔ میں نے راج کنور کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”راستے میں ہے۔“

”وہ یہاں آئے گا؟“

”نہیں وہ کہیں اور جائے گا۔“

”میری گاڑی اور سامان؟“

”گاڑی نہیں آئے گی سامان آجائے گا۔“ فتح خان نے صاف گوئی سے کہا۔

”تب ہو سکے تو ایک کام کرو گاڑی کو شملہ میں کہیں لاوارث چھوڑ دو۔ پولیس اسے خود اس کے مالک تک

پہنچا دے گی۔“

فتح خان نے سر ہلایا۔ ”میرے آدمی ایسا ہی کریں گے۔“

میں صوفے پر ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ ”تمہارے دماغ سے ہیروں کا خناس نکل گیا ہے یا ابھی باقی ہے؟“

”ابھی، ہم اس پر نہیں سوچ رہا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے خناس باقی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان تم نے جتنا وقت، رقم اور قوت ان ہیروں

کے چکر میں ضائع کی ہے کسی اور کام میں لگاتے تو ان ہیروں کی مالیت سے زیادہ ہی حاصل کر سکتے تھے۔“

”کبھی کبھی، ہم بھی سوچتا ہے۔“ اس نے اپنی شیو کھجائی۔ ”پر کوئی اور ایسا کام ملا ہی نہیں۔“

”حالانکہ جو کام تم ڈیوڈ شا کے لیے کر رہے ہو یہی کر لیتے۔ اس خطے میں اسلے اور منشیات کی اسمگلنگ

سے زیادہ نفع بخش کاروبار اور کوئی نہیں۔ انسانوں کی اسمگلنگ بھی اب اربوں کا بزنس بن چکا ہے۔ اگر اس سے

نیچے کا کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو وطن عزیز میں زمینوں پر قبضہ بھی ایک اچھا بزنس ہے۔ اسی طرح ایک لائن لگی ہے

تمہارے مطلب کے کاموں کی۔“

”بات وہی ہے میں نے توجہ نہیں دیا۔“ اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔

”اب اپنے باس سے بات کر لو وہ تمہیں یورپ لے جائے وہاں اس کام میں بہت پیسہ ہے یعنی کرائے

کے فوجی وہاں بہت کماتے ہیں۔“

”میں سوچے گا۔“ فتح خان نے بیزاری سے کہا۔ ”پہلے ایک کام تو کر دے۔“

”اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو تم یہ کام کر چکے ہو۔“

”ہاں مگر اصل کام باقی ہے تم کو ڈیوڈ شا کا کام کرنے پر رضی کرنا۔“

”یہ تمہارا نہیں اس کا کام ہے۔“

فتح خان نے جواب نہیں دیا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان بھی تھا حالانکہ

اس نے اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد خادمہ ایک ٹرائی پر چائے اور کافی کے لوازمات کے ساتھ

کھانے پینے کو بھی اچھا خاصا لے آیا۔ اس میں سمو، سینڈ وچز، ترکاری اور روٹی سے بنے پورے تھے۔ اس

کے ساتھ مختلف طرح کی چٹنیاں تھیں۔ ان کے متوازی کوکیز، بسکٹس اور کیک جس کی انگلش ریفرمٹ بھی تھی۔

وہ سب سے پوچھ پوچھ کر چیزیں نکال کر سرو کرنے لگی۔ بیٹو نے بلا تکلف سب نکلوا لیا۔ میں نے سمو سے اور

پورے لیے ایک کنوری میں املی کی چٹنی بھی تھی۔ فتح خان نے بھی سمو سے لیے تھے۔ ابھی اس نے کھانا شروع کیا

تھا کہ موبائل نے بیل دی۔ اس نے پلیٹ رکھ کر موبائل نکالا اور اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اس نے نظروں میں اپنے

آدمی کو کوئی اشارہ کیا اور کال ریسیو کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے صرف اتنا سنا۔

”لیس سر.....“

فتح خان کے جاتے ہی میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے برابر میں بیٹھے بیٹو کو کہنی ماری تو

س نے کن آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے سر ہلایا تو وہ سمجھ گیا۔ فتح خان کا آدمی ہمارے دائیں طرف

موجود تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے سرخ مرچوں کی چٹنی کی پلیٹ اٹھائی اور اسے اپنی طرف کھینچا

اور فوراً ہی اس پر کھینچ مارا۔ ابھی پلٹ راستے میں تھی کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا میرا خیال تھا کہ چٹنی کی پلٹ اس کے منہ نہیں تو جسم پر ضرور لگی ہوگی مگر حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ وہ ایک طرف کھسک کر پلٹ اور چٹنی سے بچ گیا۔ پلٹ دروازے سے نکل کر ککڑوں میں بٹ گئی اور چٹنی نے دروازے اور دیوار پر سننے ڈیزائن بنائے تھے۔ فتح خان کا آدمی بچ گیا بس چٹنی کے چند چھینے اس پر آئے تھے۔

میں کافی کی تام چٹنی کی کیتلی اٹھاتے ہوئے اس کی طرف جھپٹا اور گھما کر اسے کیتلی ماری۔ اس بار بھی وہ حیرت انگیز پھرتی سے بچ نکلا تھا اس نے غوطہ مارا اور ایک طرف جا کر اگلا وار بیٹو نے کیا اس نے چائے کی کیتلی اٹھا کر ماری۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب نہیں بچ سکے گا مگر وہ تو شاید بجلی کا بنا ہوا تھا اٹھتے اٹھتے وہ واپس گرا اور چائے دانی اس کے اوپر سے گزر دیوار سے ٹکرائی اور بکھر گئی لیکن اس سے پہلے کہ کھولتی چائے اس پر گرتی اس نے سانپ کی طرف کروٹ لی اور دیوار سے دور ہو گیا۔ چٹنی کی پلٹ کی پرواز کے ساتھ ہی خادمہ چیخ مار کر مخالف کونے میں چلی گئی تھی۔ مسلسل تین وار سے بچ کر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ فتح خان ایسے ہی اسے ہم پر مسلط کر کے نہیں گیا تھا۔ میں یک دم محتاط ہو گیا۔ میں نے اس پر نظر جماتے ہوئے بیٹو سے کہا۔ ”خادمہ کے پاس چلے جاؤ اسے قابو رکھو۔ درمیان میں مداخلت مت کرنا یہ میرا حکم ہے۔“

بیٹو زخمی تھا اور اس کا زخم ابھی پورا طرح نہیں بھرا تھا اس لیے میں اسے اس شخص سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ بیٹو ویسے بھی جسمانی لڑائی کا ماہر نہیں تھا عام آدمی کو آسانی سے قابو کر سکتا تھا لیکن یہ یقیناً عام شخص نہیں تھا۔ وہ قالین سے اٹھا اور مسکرایا تو اس کے چوڑے اور سفید دانت نمایاں ہوئے تھے۔ نقوش سے وہ مقامی لگ رہا تھا شاید اس کی رگوں میں ملی جلی نسلوں کا خون تھا اس میں تبتیوں کی جھلک بھی تھی۔ سر گھٹا ہوا تھا اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ کسی قدر لوز پتلون اور ڈریس شرٹ میں اتنا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس نے نرم لہجے اور انگریزی میں کہا۔ ”مسٹر شہباز..... پلیز کام ڈاؤن.....“

جواب میں، میں نے اس کے مشورے کے برعکس کیا اور اس بار دوسری چٹنی کی پلٹ اس پر ماری اور ساتھ ہی خود بھی جھپٹا میرا نشانہ اس کا جڑا تھا لیکن میرا مکا جب اس مقام پر پہنچا جہاں اس کا جڑا ہوتا چاہیے تھا تو وہاں مجھے خلا ملا۔ دار میں بہت قوت تھی اور اس قوت نے مجھے گھمایا۔ اس نے نیچے بیٹھے ہوئے کلک گھمائی اور میں جو پہلے ہی غیر متوازن تھا دھڑام سے نیچے گرا۔ دبیز قالین نے کسی چوٹ سے محروم رکھا۔ مگر ناکامی کا صدمہ بھی کم نہیں تھا۔ میں نے دونوں ٹانگیں گھمائیں اور وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے کہا۔

”مسٹر شہباز مجھے تسلیم ہے تم ایک اچھے فائٹر ہو لیکن اس وقت تم بیکار کی مشق کر رہے ہو ممکن ہے تم مجھ پر قابو پا لو لیکن تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“

”یہ میں تم پر قابو پانے کے بعد سوچوں گا۔“ میں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو ذرا اپنے ساتھی کی طرف دیکھو۔“

میں نے اس پر سے نظر نہیں ہٹائی اور بیٹو سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”نہیں شوبی۔“ وہ مر جھائے لہجے میں بولا۔ ”ہم زریپ ہو گیا ہے۔“

میں نے اس بار اس کی طرف دیکھا۔ بجائے اس کے وہ خادمہ کو قابو کرتا الٹا خادمہ نے اسے قابو کر رکھا تھا اس نے نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر بیٹو کی گردن سے اس کی ٹوک لگا رکھی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔ ”اوکے بیچ ڈرا.....“

اسی لمحے فتح خان اندر آیا اور اس نے سرسری سے انداز سے کمرے کا جائزہ لیا اور سوالیہ نظروں سے اپنے آدمی کی طرف دیکھا اس نے کہا۔ ”مسٹر شہباز ایک بیچ چاہ رہے تھے۔“

اس نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔ ”تم باز نہیں آؤ گے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں باز آ گیا..... تمہاری چند پلیٹوں اور کیتلیوں کا نقصان ہوا ہے وہ اس رقم سے کاٹ لیتا جو تم نے مجھ سے قبضے میں لی تھی۔“

فتح خان نے پستول نکال لیا اور اپنے آدمی سے کہا۔ ”اسے لے جاؤ۔“ اس کا اشارہ بیٹو کی طرف تھا۔

”یہ نہیں جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ فتح خان لا پرواہی سے بولا اور اس نے خادمہ کی طرف دیکھا۔ ”اس کا ایک کان کاٹ دو۔“

خادمہ نے بیٹو کا کان پکڑا تھا کہ میں نے ہتھیرا ڈال دیئے۔ ”اوکے اسے لے جاؤ لیکن اسے کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔“

فتح خان کے اشارے پر اس کے آدمی نے بیٹو کا بازو پکڑا اور اسے وہاں سے لے گیا۔ فتح خان نے ملازمہ کو صفائی اور دوسری چیزیں لانے کا حکم دیا۔ میرا اندازہ اس کے بارے میں غلط نکلا تھا وہ صرف ایک معاملے میں ہی نہیں بلکہ دوسرے کئی معاملات میں خاصی تجربے کا رتھی اس نے بیٹو کو مہارت سے قابو کر رکھا تھا۔ اس نے پلیٹوں اور کیتلیوں کے ٹکڑے ٹرائی میں جمع کیے اور وہاں سے چلی گئی۔ میں اور فتح خان ایک بار پھر آئے سانسے بیٹھ گئے۔ خادمہ صفائی کا سامان لائی اور اس نے تیزی سے دیواروں اور قالین سے صفائی کی اور چلی گئی۔ فتح خان نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم بلاوجہ یہ سب کر رہے ہو تم کسی صورت یہاں سے باہر نہیں نکل سکتے ہو، تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہاں کیسی سیوری ہے۔“

”اور تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ انسان کے اندر آزادی کی کیسی تڑپ ہوتی ہے۔“

”یہاں سے صرف تمہاری روح آزاد ہو کر جاسکتی ہے۔“

”ممکن ہے۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”لیکن یہ دھمکی مجھے کوشش کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی ہے فتح خان یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

”میں دھمکی نہیں دے رہا ہوں یہاں خود کار سائبرگن لگا ہوا ہے اس کا کمپیوٹر کسی بھی غیر متعلقہ آدمی کو دیکھتے ہی شوٹ کر دیتا ہے۔ تم یہاں سے باہر جانے کا اور مارا جائے گا۔“

”کمپیوٹر یہ فیصلہ کیسے کرتا ہے کہ کون متعلقہ ہے اور کون نہیں ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا لیکن میں دیکھ چکا ہے یہاں کچھ جگہیں ہیں جہاں کوئی نہیں جاتا ہے اور اگر کوئی چلا جائے تو مارا جاتا ہے۔ یہاں زمین اور دیوار میں پسندے ہیں جو آدمی کو پکڑ لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک آدمی نشتے

میں اس حصے میں چلا گیا اور گن نے اسے شوٹ کر دیا۔ وہ خود گارڈ تھا۔“

میں حیران ہوا۔ ”یہ سکیورٹی اس مینشن کی ہے یا خاص طور سے ڈیوڈ شا کے لیے کی گئی ہے؟“

”میرا خیال ہے اسٹا پیر گن ڈیوڈ شا کی ہے۔“ فتح خان نے کہا۔ ”باقی سکیورٹی پہلے سے ہے۔ ٹریپ بنانا چند دن کا کام نہیں ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ڈیوڈ شا جدید الیکٹرانک سکیورٹی پر بہت انحصار کرتا تھا کیونکہ اس میں آدمی کم ہوتے ہیں اور انیکورسی زیادہ ہوتی ہے اسے دھوکا دینا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ آدمی بک جاتے ہیں یا اپنی کمزوری کی وجہ سے ناکام ہو جاتے ہیں جب کہ آلات نہ تو بکتے ہیں اور نہ ہی ان میں کمزوری ہوتی ہے۔ فتح خان نے مجھے سب آرام سے بتا دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ خود بھی ڈیوڈ شا کے لیے دل سے کام نہیں کر رہا تھا اس کا رویہ کسی قدر باغیانہ لگ رہا تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے تم ڈیوڈ شا سے فرٹ لگ رہے ہو؟“

اس نے گہری سانس لی اور پھر اچانک ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ وہ منہ سے بولا تو اس کا لہجہ نارمل تھا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوا ہے۔ میں شا کے لیے ہی کام کر رہا ہے۔“

”پھر تم مجھے سب اتنی آسانی سے کیوں بتا رہے ہو؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”اس بار شانے مجھ کو منح نہیں کیا۔ اس لیے بتا رہا ہے۔“

”کیا ڈیوڈ شا میرا اعتماد حاصل کرنا چاہتا ہے؟“

”یہ تو وہی جانتا ہے۔“ فتح خان نے مطمئن انداز میں سر ہلایا جیسے میں بالکل درست بات کر رہا ہوں۔

”پر وہ مجھ کو ہر بار مکمل ہدایت دیتا ہے اگر ابار ایسا نہیں دیا۔ وہ جانتا ہے میں دماغ کا آدمی نہیں ہے۔ میں تو عمل کرنا جانتا ہے۔“

”بیٹو کہاں ہے؟“

”فکرمات کر وہ ادھر ہی ہے۔“

”اگر تم یا ڈیوڈ شا سمجھ رہے ہو کہ مجھے یا میرے کسی ساتھی کو یہ خیال بنا کر کام پر آمادہ کر لو گے تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“

”مجھ کو کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔“ فتح خان نے کہا۔ ”یہ فیصلہ شانے کرنا ہے۔“

شاید بیٹو کو مجھ سے الگ کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا گیا تھا تاکہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے رہیں اور میری حرکت کو جواز بنا کر اس پر عمل کیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ فتح خان اور ڈیوڈ شا مجھے کم سے کم تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ مجھ پر کوئی جبر کر رہے ہیں۔ خادمہ نئے سرے سے ٹرائی سجا کر لے آئی تھی لیکن اب میرا مود نہیں تھا میں نے صرف کافی طلب کی جو اس نے نزاکت اور سلیقے سے بنا کر پیش کی۔ اس وقت یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اسی لڑکی نے کچھ دیر پہلے بیٹو کو قابو کر لیا تھا۔ میں نے کافی کاسپ لیا اور فتح خان کی طرف دیکھا۔ ”بے شک تم لوگوں نے مجھے قابو کر لیا ہے لیکن تم جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں ڈیوڈ شا کا ایک مقصد ہے۔ وہ مجھ سے تعاون چاہتا ہے دوسری طرف میرے ساتھی مشکل میں ہیں۔ سعد یہ اپنے ہی بھائی کی قید میں ہے۔ مجھے بہر صورت اسے وہاں سے نکالنا ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہے۔“

”تم نہیں سمجھ رہے ڈیوڈ شا سے کہو کہ اگر وہ مجھ سے تعاون چاہتا ہے تو میرا وقت ضائع نہ کرے۔ جتنا وقت گزرتا جائے گا میرے ساتھیوں کا اضطراب بڑھے گا اور جب میں ان سے رابطہ نہیں کروں گا تو وہ یہاں آنے کی سوچیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آئیں۔ اس لیے ڈیوڈ شا جلد مجھ سے بات کرے اور مجھے میرے ساتھیوں سے رابطہ کا سہولت دی جائے۔“

فتح خان سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ”شا کو بتاتا ہے۔ وہی فیصلہ کرے گا۔“

”اسے بتا دینا تاخیر سے صرف مجھے ہی نہیں اسے بھی نقصان ہوگا۔ اس لیے جو کرنا ہے جلد کرے۔“ میں نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔ فتح خان کرے سے نکل گیا۔ خادمہ وہیں تھی اور وہ فتح خان کے جانے کے بعد چوکنہ ہو گئی میں نے مسکرا کر کہا۔

”فکرمت کرد، میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔“

”اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ میری حیثیت ایک خادمہ سے زیادہ نہیں ہے۔“

”ہر انسان کی ایک حیثیت ہوتی ہے بہر حال تم جن لوگوں کے لیے کام کرتی ہو وہ اپنے سوا کسی کو انسان سمجھتے ہی کہاں ہیں؟..... اپنی دے تمہارا کوئی نام ہوگا؟“

اس نے سر ہلایا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”مجھے پوچا کہتے ہیں سر۔“

پوچا کسی قدر بھرے جسم کی اور چھوٹے قد کی لڑکی تھی۔ خادمہ ہوتے ہوئے بھی وہ تک سک سے تیار تھی اور اس نے مکمل میک اپ کر رکھا تھا حد یہ کہ آنکھوں کا میک اپ بھی تھا۔ میں نے کافی گامگ میز پر رکھا۔ ”خوب صورت نام ہے۔“

”سر میں خود بھی خوب صورت ہوں اگر آپ کو میری کسی اور خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“

اس کا اشارہ واضح تھا میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارے آقا جنہوں نے مجھے یہاں قید کیا ہے اور تمہاری صورت میں ایک حسین نگران مقرر کیا ہے وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں میں پھول کو کھلا دیکھ کر خوش ہونے والوں میں سے ہوں اسے شاخ سے توڑنے اور ملنے کا مجھے قطعی شوق نہیں ہے۔“

”سر اور کافی پیش کروں؟“

”ضرور یہاں سردی کچھ زیادہ نہیں ہے اور وہ بھی اس موسم میں؟“

”یہ جگہ سات ہزار چار سو فٹ بلند ہے سر اور کل رات بارش بھی ہوئی ہے اس لیے سردی بڑھ گئی ہے۔“

سردی کی صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی بلکہ شملہ کا یہ حصہ برف پوش پہاڑوں کی قربت میں تھا اس وجہ سے بھی یہاں سردی زیادہ تھی۔ ورنہ طول البلد میں شملہ لاہور سے بھی نیچے ہے۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”ٹھا کر یہیں ہوتا ہے؟“

”نہیں ٹھا کر جی بہت کم یہاں آتے ہیں۔“ اس نے مختصر اور غیر واضح جواب دیا۔

”کوئی نام ہوگا ٹھا کر جی کا؟“

”جی ٹھا کر گھمبیر سنگھ..... راجھستان آسبلی کے ممبر بھی ہیں۔“

”گویا خیر سے نیتا جی بھی ہیں۔“ میں نے کہا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ میری گزشتہ روز ہی پاکستان بات ہوئی تھی کم سے کم آج کا دن انہیں ٹینشن نہیں ہوتی لیکن جب میں مزید ایک دن اور رابطہ نہ کرتا تو میرے ساتھی پریشان ہو جاتے اور مزید ایک دو دن بعد وہ یہاں آنے کی تیاری شروع کر دیتے کم سے کم وسم کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ رہ نہیں سکے گا میرے ساتھ اسے سعدیہ کی فکر بھی ہوگی۔ درحقیقت میں اپنے ساتھیوں کے بغیر خود کو ادا حورا اور کنزدر محسوس کر رہا تھا اور ایسا بہت کم ہوا تھا ورنہ میں دشمن اور حوادث کے سامنے اکیلا ہو کر خود کو زیادہ مضبوط محسوس کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ساتھی کسی مشکل میں پڑیں یا ان کی وجہ سے میں کہیں مجبور ہو جاؤں لیکن بعض مقامات ایسے آتے ہیں جب انسان کو دوسروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہی تھا میں اور بیٹو اس سے نمٹنے کے لیے ناکافی تھے مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا مزید کوئی ساتھی اس جہنم میں آکر پھنسے جہاں پاکستانی ہونا سب سے بڑا جرم تھا۔ بلکہ اب تو میں اور بیٹو بھی پھنس گئے تھے۔ پوے ایک بجے دروازہ کھلا اور فتح خان اندر آیا۔

”شاکھانے کا ٹیبل پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ ”لیکن پہلے میں واش روم جاؤں گا۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ فتح خان نے کہا اور مجھے ایک آراستہ پیراستہ واش روم تک لے آیا۔ ”جلدی کرنا بچ

ایک بجے شروع ہو جاتا ہے۔“

”پتا ہے مجھے انگریزوں کا ان کا بس چلے تو مرنے کا وقت بھی خود طے کریں اور پھر اسی وقت پر مریں۔“ میں کہتے ہوئے واش روم میں آ گیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے منہ ہاتھ دھوئے اور خود کو تازہ دم کیا۔ بال درست کیے میری شیو بڑھی ہوئی تھی لیکن اس نے باقاعدہ داڑھی کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ سر کے بال بھی مناسب تھے میں برائیں لگ رہا تھا۔ واش روم سے نکل کر فتح خان کے ساتھ روانہ ہوا۔ ہم باہر آئے مینشن کی مرکزی عمارت کی طرف بڑھے۔ یہاں بڑے ڈائننگ ہال میں کم سے کم پچاس افراد کے لیے مخصوص میز پر ڈیوڈ شا اکیلا موجود تھا۔ فتح خان مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ڈیوڈ شا سربراہ والی کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بغیر کسی تاثر کے بولا۔

”شہباز ملک..... تمہیں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔“

میرا دل چاہا کہ کہوں اسے دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی ہے لیکن اس کے بجائے میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے شروع کیا جائے مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

ڈیوڈ شانے سر ہلایا۔ وہاں موجود دو خادماؤں نے سرونگ شروع کر دی۔ یہ مغربی انداز کا کھانا تھا جس میں ایک ایک چیز سامنے لائی جاتی تھی اور جب وہ کھالی جاتی تو دوسری چیز پیش کی جاتی تھی۔ تمام ڈشز اعلیٰ معیار کی تھیں۔ کھانا مکمل خاموشی سے کھایا گیا اور اس کے بعد سیاہ چائے پیش کی گئی۔ چائے کے بعد ڈیوڈ شا نیکیں سے منہ صاف کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”شہباز میرے ساتھ آؤ۔“

ہم اسی عمارت کی ایک شاندار نشست گاہ میں آئے۔ اس کا رخ شمال کی طرف تھا اور اس طرف پوری

دیوار ایک ہی شے سے بنی تھی۔ شیشہ یقیناً کئی سو کلو گرام وزنی ہو گا اور اسے دیوار میں فکس کرنا ہی مہارت کا کام تھا۔ شے کے پار شملہ کا قدرتی حسن، اس کے پہاڑ اور دور برف پوش چوڑیاں کسی سینری کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جدید ترین لیڈر صوفے نیم دائرے میں اس طرح رکھے تھے کہ ان پر بیٹھنے والا ہر فرد یکساں طور پر اس منظر سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ صوفوں کے درمیان نیم دائرے شکل کی ماربل ٹاپ میز تھی۔ ڈیوڈ شانے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود شے والی دیوار کے ساتھ بیٹھنے لگا۔ وہ ہمیشہ کی طرح صحت مند اور تروتازہ لگ رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک مہذب انکس جنٹل مین لگتا تھا لیکن اس کا دکھاوا کسی خوب صورت سانپ جیسا تھا جس کے اندر مہلک زہر چھپا ہوتا ہے۔ میں آرام سے ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مجھے یقین تھا جو میں نے فتح خان سے کہا تھا وہ اس تک پہنچ گیا تھا۔ بیٹھتے ہوئے اس نے اچانک رک کر کہا۔

”شہباز تم کیا چاہتے ہو؟“

”یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے مجھے تم نے زبردستی بلوایا ہے۔“

”تمہیں پتا ہے میں کیا چاہتا ہوں اور اس کی ہر قیمت ادا کر سکتا ہوں۔“

”ڈیوڈ شام احقاند دعوے مت کرو۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”تم نے پہلے بھی مجھ سے ایک معاہدہ کیا

تھا لیکن کیا تمہارا مرید یعنی مرشد اور ایک معمولی ملازم تمہاری ضمانت کو جوئے کی ٹوک پر رکھ گئے۔“

”مارشل کی لاش بغیر کھال کے ایک نامعلوم قبر میں پڑی ہے اس کی کھال میں بھس بھردا کر میں نے اسے

اپنے گھر میں سجایا ہے اور جہاں تک مرشد کی بات ہے جلد اسے بھی اپنے کیے کا حساب دینا.....“

”مجھے مرشد سے بیٹھنے کے لیے تمہاری یا کسی کی مدد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ

کر کہا۔ ”تم اس وقت اپنی بات کرو۔“

”میں بتا چکا ہوں کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں اور اسی لیے تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم جو کہو گے میں مانوں

گا۔“

”کیا تم سعدیہ کو بڑے کنور کے چنگل سے نکلوا سکتے ہو؟“ میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں نکلوا سکتا ہوں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم جانتے ہو وہ کیا ہے اور اس کے پیلس کی حفاظت کس طرح کی جاتی

ہے؟“

”ہاں میں جانتا ہوں لیکن کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا ہے اگر پلاننگ اچھی ہو تو یہ کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے

سر ہلایا۔ ”تم سودا کر رہے ہو کہ میں سعدیہ کو بڑے کنور کے چنگل سے نکلوا کر دوبارہ پاکستان بھیج دوں تو تم میرے

لیے کام کرو گے۔“

میں نے یہ بات طنزاً کہی تھی اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ڈیوڈ شام اتنی تیزی سے مان جائے گا۔ اگرچہ فتح

خان پہلے بھی تیری اس موضوع پر بات ہوئی تھی اس کے باوجود مجھے خیال نہیں تھا۔ کنور پیلس پر حملہ معمولی بات

نہیں تھی۔ بڑے کنور کا بھارتی حکومت پر اثر و سوجھ بوجھ مسلم تھا اور اس کی ایک فریاد پر بھارتی حکومت کی ساری

مشینری حرکت میں آ جاتی۔ ڈیوڈ شامین الاقوامی طور پر کتنا ہی طاقتور بھی لیکن وہ غیر ملک میں تھا اور یقیناً اس کے

جوتے چائے والوں کے لیے بھی یہ کام آسان نہیں ہوتا وہ مکمل کر اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ دوسری طرف ڈیوڈ شا کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ اس کے لیے بہت مشکل یا ناممکن کام نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس میں خطرہ دوسرے لوگوں کے لیے تھا۔ جو ڈیوڈ شا کے آدمی ہوتے ان کے مرنے سے بھی اسے فرق نہیں پڑتا اور کنور ہیلز کے گارڈز اور لوگ تو تھے ہی دشمن۔ ڈیوڈ شا کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ میں خاموش تھا اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

”اگر تم چاہو تو تم سوچ بھی سکتے لیکن تم ہی نے کہا تھا کہ تمہیں اس معاملے میں جلدی ہے۔“

”ہاں مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”شہباز میری ایک آفر ہے میں تمہیں فری ہینڈ دیتا ہوں۔ تمہیں آدمی، اسلحہ اور جو آلات درکار ہوں میں مہیا کروں گا۔ تم پلاننگ کرو اور سحد یہ کو وہاں سے نکال لو۔ اگر تمہیں یہ قبول نہیں ہے تو سب مجھ پر چھوڑ دو اور میں سحد یہ کو وہاں سے نکال لاؤں گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟“

اس بار میں سچ سچ سوچ میں پڑ گیا میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”میں غور کرنا چاہوں گا۔“

”ضرر کرو۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن شہباز جیسے تمہارے پاس وقت کم ہے اسی طرح میرے پاس بھی وقت کم ہے۔ آج انیس جون ہے اور اگست کے آخر تک وادی والے خطے میں موسم خراب ہونے لگتا ہے وہاں جانے والی کسی بھی مہم کو مئی اگست سے پہلے واپس آنا ہوتا ہے ورنہ برف باری کے ساتھ طوفان آنے لگتے ہیں اور راستے بند ہو جاتے ہیں۔“

”میں بہت وقت نہیں لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے آج شام تک سوچنے کی مہلت دو اور ہاں میں اپنے ساتھیوں سے رابطہ چاہتا ہوں میری گاڑی میں میرا لیپ ٹاپ والا بیگ تھا مجھے وہ چاہیے۔“

ڈیوڈ شانے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا واک ٹاک نکالا اور کسی کو وہ بیگ لانے کا حکم دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی کا سامان یہاں آچکا تھا۔ میں نے راج کنور کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”وہ بیکار تھا۔“ ڈیوڈ شانے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے حیرت سے کہا۔ ”تم نے اسے مار دیا۔“

”نہیں میں نے اسے چھوڑ دیا۔“

میں اچھل پڑا تھا۔ ”میں نے فتح خان سے کہا تھا وہ میرا قیدی ہے پھر اسے کیوں چھوڑا۔“

”اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے تم بلاوجہ اسے لیے لیے پھر رہے تھے۔ وہ صرف بوجھ تھا جسے زمین میں اتارنا ہی مناسب ہے لیکن تم اس کے خون سے کیوں ہاتھ رکتے یہ کام اس کے بھائی کو کرنے دو جیسے مرشد نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا ہے؟“

”مرشد نے نادر کو مار دیا ہے؟“ میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ ڈیوڈ شانے سر ہلایا۔

”چند گھنٹے پہلے مرشد ہاؤس سے اعلامیہ جاری ہوا کہ نادر علی طویل علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا

ہے۔“

”ہو گیا ہے یا کر دیا گیا ہے؟“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”وہ بوجھ ہو گیا تھا مرشد نے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا اب اس کے اور تمہارے درمیان دشمنی کا اصل سبب ختم ہو گیا ہے۔“

”نادر کا کہنا تھا کہ مرشد نے اسے چڑھایا تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو اصل سبب تو خود مرشد ہوا۔“

”ہو سکتا ہے۔“ ڈیوڈ شانے کہا۔ ”اسی طرح راج کنور اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا جائے تو تمہارا ایک اور درد سر کم ہو جائے گا۔“

”میں نے کبھی اس طرح سے سوچا نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے ہمیشہ اپنے زور بازو پر بھروسہ کیا ہے۔“

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مدد کی پیشکش ٹھکرا دو۔“

”تم مدد نہیں سوا کر رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”راج کنور میرا قیدی تھا اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق بھی مجھے ہے۔ ڈیوڈ شانے نے بات کا آغاز غلط انداز میں کیا ہے۔“

”اگر تم چاہتے ہو کہ وہ واپس آجائے تو یہ بھی ممکن ہے۔“

”اب وہ تمہارے ہاتھ کہاں آئے گا؟“

”وہ میری پہنچ سے دور نہیں ہے۔“ ڈیوڈ شانے کہا۔ ”میں تمہیں دکھاتا ہوں۔“ اس نے ایک کوٹنے رکھا لیپ ٹاپ کھول کر ان کو دکھایا اور چند منٹن دہائے۔ اسکرین پر ایک نقشہ ابھر آیا۔ میں نے غور کیا تو یہ ہمارا چل پردیش کا نقشہ تھا میں مستقل اسے دیکھتا آیا تھا اس لیے آسانی سے پہچان لیا۔ ڈیوڈ شانے ایک مٹن دہایا تو اسکرین پر ایک کتہہ ہلک کرنے لگا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ”یہ راج کنور ہے۔“

”اوہ تم نے اسے ٹریپ لگایا ہے۔“

”میں نے اسے چپ لگادی ہے؟“

”ہاں اور وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس کے کان مین پلانٹ کی گئی ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوا اور نہ ہی اب اسے پتا ہوگا۔ وہ جہاں جائے گا مجھے پتا چلتا رہے گا۔ چپ کا سگنل سیٹلائیٹ ریسیور کر رہا ہے۔ یہ کہیں بھی چلا جائے میری نظر سے نہیں بچ سکے گا۔“

یہ حیرت انگیز چیز تھی۔ مغرب جدید ٹیکنالوجی میں بہت آگے جا چکا تھا۔ مستقبل کی ٹیکنالوجی وہ صرف اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے اور باقی دنیا کو موبائل اور اسی طرح کے کھلونے دے کر مصروف رکھے ہوئے ہے۔ بلکہ اسے بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے اب انکشاف ہو رہا ہے کہ موبائل اور انٹرنیٹ کا سسٹم پوری طرح ان کے نظروں میں ہے۔ وہ ہر کال سن سکتے اور انٹرنیٹ کی ہر سرگرمی کی نگرانی کر سکتا ہے۔ مقصد دنیا پر مکمل غلبہ کا جنون ہے جو کبھی نواذ پادیا کی نظام کی صورت میں سامنے آتا ہے اور کبھی نیو ورلڈ آرڈر کی صورت میں۔ مغربی دنیا ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ معاشی نظام اور تجارت کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کر رہی ہے اور میڈیا اس کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔ اس کی مدد سے مغرب اپنی ہر پالیسی اور ہر قدم کو درست قرار دلاتا ہے۔ مخالفوں کو غلط ثابت کرتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ وہی ٹیکنالوجی ہے جو ڈرون طیاروں سے فائر کیے جا رہی ہے۔“

والے میزائلوں کی رہنمائی میں استعمال ہوتی ہے۔“

ڈیوڈ شانے سر ہلایا۔ ”تم اس بات کو سمجھتے ہو۔ یہ بالکل وہی ٹیکنالوجی ہے۔ چپ کو آدمی یا کسی جگہ پلانٹ کیا جاتا ہے۔“

ڈیوڈ شانے جنگ کی اخلاقیات پر بحث بیکار تھی کیونکہ مغرب نے پہلے ہی اس سلسلے میں ایک جملہ تیار کر لیا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ کیونکہ محبت کے معاملے میں وہ جائز ناجائز کی حد صدیوں پہلے ختم کر چکے تھے اس لیے اب اس کا اطلاق صرف جنگ پر رہ جاتا ہے۔ ”ٹھیک ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ راج کنور کہاں ہے لیکن اگر وہ بڑے کنور کے ہتھے چڑھ گیا تو اسے کنور پبلس سے کون نکالے گا۔“

ڈیوڈ شانے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز اگر تم چاہو رہے ہو کہ میں اسے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے سوری کر لوں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ بہر حال میں نے اسے کسی وجہ سے رہا نہیں کیا۔ چپ بھی میں نے احتیاطاً پلانٹ کی ہے۔ اب یہ احتیاط کام آ رہی ہے۔“

ڈیوڈ شانے کے الفاظ پر اعتبار مشکل تھا کہ اس نے ہنسا کی وجہ کے راج کنور جیسے اہم آدمی کو چھوڑ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس بات پر زور دینا مناسب نہیں تھا۔ اس بحث میں پڑنے کے بجائے مجھے یہ فکر کرنی چاہیے تھی کہ ڈیوڈ شانے کا مقصد کیا تھا؟ وہ اس لحاظ سے درست کہہ رہا تھا کہ راج کنور بیکار ثابت ہوا تھا اور میں اسے محض بوجھ کی طرح اٹھائے اٹھائے گھوم رہا تھا یہ ایسا ہی تھا کہ میں نے ایک زہریلے سانپ کو گردن سے پکڑ رکھا تھا اور اسے چھوڑتے ہوئے ڈور رہا تھا کہ وہ پلٹ کر وارنہ کر دے۔ ڈیوڈ شانے اسے چھوڑ کر ایک طرح سے میرا بوجھ ہلکا کیا تھا اور وہ بڑے کنور کے ہاتھ آجاتا تو وہ اسے جہنم رسید کر کے اس بوجھ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔ نادر علی کی موت کا سن کر مجھے ایسا لگا تھا کہ ایک بوجھ کم ہوا تھا۔ میں نے اسکرین پر جلتے بجتے نقطے پر غور کیا۔ وہ اس وقت شملہ کے پاس کہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کچھ اندازہ ہے یہ کتنی دیر سے یہاں ہے؟“

”اسے بارہ بجے چھوڑ دیا گیا تھا۔“ ڈیوڈ شانے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ یہ لپنکس آپریشننگ سسٹم تھا جس میں زیادہ تر کی بورڈ کمائنڈر ذی جاتی ہیں۔ ”یہ گزشتہ آدھے گھنٹے سے یہاں ہے۔“

”کیا اس کی پین پوائنٹ نشان دہی کی جاسکتی ہے کہ یہ کہاں ہے؟“

”بالکل۔“ ڈیوڈ شانے پھر کچھ بٹن دبائے اور اسکرین زوم ہونے لگی ذرا دیر بعد اس علاقے کا نقشہ مکانوں اور گلیوں کی حد تک واضح ہو گیا۔ نقشے پر ہر جگہ کا نام درج تھا۔ یہ دھرم شالہ روڈ تھی اس کی چوتھی گلی کے ایک مکان میں راج کنور موجود تھا۔ میں حیران ہوا تھا۔

”یہ تو گوگل ارضہ کی طرح واضح ہے۔“

”یہ چپ اور اس کی ڈیوائس گوگل ارضہ سے ہی منسلک ہے۔“

”کیا تمہارے آدمی عملی طور پر اس کے پیچھے ہیں؟“

ڈیوڈ شانے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”ہاں میرے آدمی اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔“

”ڈیوڈ شانے مجھے تمہارا اور فتح خان دونوں کا رویہ عجیب لگ رہا ہے۔ تم دونوں مجھے سب کچھ کھل کر بتا رہے

ہو جب کہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تم نہیں بھی بتاؤ گے تو مجھے پتا نہیں چلے گا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرا مقصد تمہارا اعتماد حاصل کرنا ہے تمہیں اس طرح بلانا میری مجبوری تھی کیونکہ تم کسی صورت مجھ پر اعتماد نہ کرتے۔“

”اب بھی نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔

”میں جانتا ہوں اور میں تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اسی لیے تمہیں سب بتا رہا ہوں۔ اپنے تعاون کی ہیکش کر چکا ہوں۔“

”فرض کرو میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں؟“

اس نے سر دھڑکنے سے مجھے دیکھا۔ ”امید ہے تم ایسی بے وقوفی نہیں کرو گے۔ تم اپنی پوزیشن پر غور کرو۔ تم چاروں طرف سے اپنے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہو تمہارے ساتھ صرف ایک مخلص ساتھی ہے۔ تمہیں سعدیہ کو واپس حاصل کرنا ہے اور تم خود کہہ چکے ہو کنور پٹیل میں گھسنا آسان کام نہیں ہے۔ فرض کرو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تم سے کوئی تعرض بھی نہیں کرتا تب بھی تمہارے خیال میں کیا تم دو افراد کچھ کر سکو گے۔“

”تم نے فرض کی بات کی ہے یعنی تمہارا چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے غور کیا۔ ”ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تم مکمل کر بات کر رہے ہو لیکن اس وقت تم نے ذمہ داری کی ہے۔“

”اوکے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں صاف بات کروں گا میں تمہیں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم مجھے کس صف میں شامل کرتے ہو دشمنوں کی یا دوستوں کی۔“

میں ہنسا۔ ”یہ تو تم نے مدد بخش والی بات کی ہے کہ جو ہمارا دوست نہیں ہے وہ دشمن ہے۔“

”یوں ہی سمجھ لو۔“ اس نے کہا۔ ایک شخص جس نے خالص راتھستانی لباس پہن رکھا تھا اندر آیا اور اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر میرا لپ ٹاپ والا بیگ میز پر رکھ دیا اور سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ ”تم چیک کر لو تمہاری کوئی چیز کم تو نہیں ہے۔“

میں نے بیگ کھول کر دیکھا اس میں نہ صرف لپ ٹاپ، یو ایس بی انٹرنیٹ ڈیوائس اور وہ رقم تھی جو میں نے اس میں رکھی تھی بلکہ وہ رقم بھی تھی جو فتح خان نے میرے پاس سے برآمد کی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”سب کچھ ہے۔ ایک بات اور کہ بیٹو کہاں ہے وہ مجھ سے الگ کیا گیا ہے۔“

”تمہیں اسی کے پاس بھیج رہا ہوں۔“ ڈیوڈ شانے کہا۔ ”تم رات تک سوچ لو اب تم سے ڈنر پر ملاقات ہوگی۔“

ڈیوڈ شا کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہاں فتح خان آگیا اور میں اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ ہم واپس اسی چھوٹی عمارت میں آئے۔ بیٹو اس کے ایک آراستہ حیراستہ کمرے میں ٹھاٹ سے جہازی سائز بستر پر دراز سامنے بڑے سائز کے ایل سی ڈی ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش گیا۔ ”شو بی یہاں تو بہت آرام ہے۔“

”پھر کیا خیال ہے؟“ میں اس کے برابر میں بستر پر گر گیا۔ ”یہیں نہ رہا جائے۔“

بیٹو کھٹک کر میرے پاس آیا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شو بی یہاں ہمارے ساتھ بہت اچھا کیا جا رہا ہے۔ ابھی ہم کو یہاں آنے کے بعد کاسب سے اچھا کھانا ملا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں نے بھی ابھی شاندار لंच کیا ہے۔“ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”آگے کہو۔“

”شوبی دشمن بلاوجہ ایسا سلوک نہیں کرتا ہے اس سے پتا چلتا ہے اس کو آپ سے کوئی بڑا غرض ہے تو شوبی اس کا فائدہ اٹھاؤ نا۔“

”وہ کیسے؟“ میں سمجھ رہا تھا لیکن ذرا انجان بن کر پوچھا۔

”شوبی جب ہم آپ کے ساتھ کنور پبلز جا رہا تھا تب بھی ہم کو یقین نہیں تھا کہ ہم دو آدمی کچھ کر سکے گا پر آپ کا فیصلہ تھا اس لیے ہم خاموش رہا شوبی ہم نے دیکھا ہے کنور پبلز بہت محفوظ جگہ ہے وہاں سے کسی کو نکالنا تو ایک طرف رہا اندر گھسنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ شوبی ڈیوڈ شا طاقتور آدمی ہے اسے آپ سے کام ہے۔ تو آپ اس سے کام کیوں نہیں لیتا؟“

”تم نے ٹھیک سوچا ہے۔“ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”لیکن میں اکیلے اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھے دوسروں سے بھی بات کرنا ہوگی۔“

بیٹو نے پہلی بار لیپ ٹاپ والا بیگ دیکھا اور بولا۔ ”یہ آپ کو واپس مل گیا۔“

”ہاں سوائے اسلحہ، گاڑی اور راج کنور کے سب واپس مل گیا ہے۔“

وہ چونکا۔ ”راج کہاں ہے؟“

”ڈیوڈ شانے اسے سگل دینے والی چپ لگا کر چھوڑ دیا لیکن اپنا مقصد نہیں بتایا۔“

”شوبی ڈیوڈ شا بہت مکار آدمی ہے وہ بھی سیدھی بات نہیں کرے گا اگر وہ سیدھی بات کرے گا تو اس میں بھی کوئی پکڑ ہوگا۔“

میں ہنسا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ڈیوڈ شاتم نے سن لیا ہوگا کہ میرا ساقی تمہارے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟“

”وہ سن رہا ہے؟“ بیٹو نے شک سے پوچھا۔

”ظاہر ہے ہم اس کی قید میں ہیں اس نے نگرانی کا پورا بندوبست کیا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے سنتا ہے تو سن لے۔“

”اس نے تمہاری تجویز بھی سن لی ہوگی۔“

”ابھی وہ آپ کا اور باقی سب کابات بھی تو سنے گا۔“ بیٹو نے ڈھٹائی سے کہا۔

”یہ تو ہے۔“ میں نے بیگ سے لیپ ٹاپ نکال کر آن کیا اور ایس بی ڈیوڈ اس سے لگائی۔ انٹرنیٹ

کنکشن آن ہوتے ہی میں نے اسکا پ آپ آن کر کے پہلے عبداللہ کو کال کی۔ رابطہ ہوتے ہی میں کہا۔

”میں ہوں اسکا پ پر آؤ۔“

میں نے کال کاٹ دی اور عبداللہ یا سفیر کے لاگ آن ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ بعد سفیر لاگ

آن ہوا۔ اس نے ویڈیو آن کی ہوئی تھی۔ میری ویڈیو بھی آن تھی اس لیے سفیر نے دیکھ لیا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں

اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔ ”جینے کیا واپس کنور پبلز پہنچ گئے ہو؟“

”نہیں دوست لیکن اس سے ملنا جتنا سمجھو۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”میں اس وقت ڈیوڈ شا کا مہمان

”یہ شا صاحب کہاں سے ٹپک پڑے اور تو ان کا مہمان کیوں ہے اور سب سے بڑی بات تجھے اتنی چھوٹ کیوں ملی کہ ہم سے اسکا ٹپ پر رابطہ کر سکے۔“

”یاریبی سب بتانے کے لیے کال کی ہے سب کو بلا لے۔ اگر دور ہیں تو ان کو کال کر کے بلا۔ میری مراد عبد اللہ اور وسیم سے ہے۔“

”دو لوں آرہے ہیں۔“ سفیر نے مطلع کیا۔ ”ایک خبر ہے۔“

”نادر کے انتقال بے طال کی؟..... وہ پہلے ہی مجھ تک پہنچ گئی ہے۔“

”ہاں جناب حضرت اعلیٰ کے مہمان جو ہیں۔“ سفیر نے سرد آہ بھری۔ ”ایک ہم ہیں میرے پھرتے ہیں خوار کوئی پوچھتا نہیں۔“

”موتا بھی نہیں؟“

”ہائے ہائے کیا یاد دلایا۔“ سفیر نے بلبل کر کہا۔

”اتنا ہائے ہائے کرنے کی کیا ضرورت ہے جا کر مل آ۔“

”نہیں یار..... سعدیہ والے واقعے کے بعد ہم سب بہت محتاط ہیں کوئی بلا ضرورت باہر نہیں نکلتا ہے اور حویلی کی سیوریٹی میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔“

”حویلی کے ذکر پر مجھے بھی کچھ یاد آ رہا ہے۔“ میں نے بھی سرد آہ بھری۔ ”لیکن مجبوری ہے میں یہاں سے رابطہ نہیں کرنا چاہتا۔“

”بہتر ہے تو محتاط ہی رہ۔“ سفیر نے کہا۔ ”مرشد کا کچھ پتا نہیں ہے عین ممکن ہے وہ نادر کی موت کا الزام ہم پر رکھ کر اپنے رشتے داروں اور مریدوں کے غم و غصے کا رخ ہماری طرف موڑ دے۔“

”اگر وہ محاذ آرائی برقرار رکھنا چاہتا ہے تو ایسا ضرور کرے گا ویسے حضرت اعلیٰ اس کے علاج کا ارادہ فرما رہے ہیں۔“

”حالانکہ حضرت اعلیٰ خود بہت بڑا روگ ہیں۔“ سفیر نے کہا۔ ”یہ لوگ پتا نہیں پیدل آرہے ہیں۔“

”ٹو بہت بے چین ہو رہا ہے لیکن میں ایک ہی بار بات کروں گا۔“ میں نے سفیر سے کہا۔

”بیٹو کہاں ہے اس کے ساتھ رہ کر تیرا دماغ خراب نہیں ہوا۔“

”وہ آپ کا خراب ہے۔“ بیٹو جو سن رہا تھا تڑپ کر بولا۔ ”آپ کے ساتھ رہنے والے کا دماغ ہی نہیں

بچتا۔“

”تمہارا تو ملا نہیں تھا۔“ سفیر نے اسے چھیڑا۔ ”ہاں کچھ بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ سنا ہے تم بھی انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو گئے ہو۔“

”ہم نے انگلی نہیں کٹایا۔ سینے پر گولی کھایا۔“ بیٹو نے فخر سے کہا۔

دونوں کی نوک جھونک اس وقت تک چلتی رہی جب تک وسیم اور عبد اللہ نہیں آ گئے۔ وہ یہ جان کر پریشان ہوئے تھے کہ میں ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہوں۔ پہلے میں نے انہیں حالات سے آگاہ کیا کہ کس طرح فتح خان نے درمیان میں کود کر میری منزل کو کھوٹا کیا اور پھر بتایا کہ ڈیوڈ شا مجھ سے کیا چاہتا تھا اور اس کے بدلے کیا کرنے کے

لیے تیار تھا۔ ”دوستو میں تم سے مشورہ چاہتا ہوں۔ میرا اور بیٹو کا خیال ہے یہ پیشکش اچھی ہے اور ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے کیونکہ کنور پبلش میں گھسنا صرف دو افراد کے بس کی بات نہیں ہے اور پھر وہاں سے سادی کو بھی لانا ہے۔ صرف کنور پبلش سے نکالنا مسئلہ نہیں ہے اس کے بعد ہمارا واپس آنا بھی اتنا بڑا مسئلہ ہوگا۔“

”آپ کا خیال ہے ڈیوڈ شاہارے یہ دونوں مسئلے حل کر سکتا ہے؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”اس کا کہنا یہی ہے وہ فری ہینڈ دے رہا ہے میں آدمی اور ہر چیز خود منتخب کروں۔ پلان خود بناؤں اور کمانڈ بھی خود کروں۔ اگر میں ایسا نہیں کرتا تو دوسری صورت یہ ہے کہ ذمے داری اسے دے دوں اور وہ پھر جیسے چاہے یہ کام کرے۔“

وسیم سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”اس کے بدلے آپ ڈیوڈ شاہ کے ساتھ اس وادی تک جائیں گے؟“

”اس کی اول آخر شرط یہی ہے۔“

”جب آپ اسے وادی تک لے جائیں گے اور اس کا کام نکل جائے گا تب آپ کے خیال میں اس کا رویہ کیا ہوگا؟“

”میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میرے لیے یہ بہت دور کی بات ہے۔“

”ڈیوڈ شاہ اس بار پہلے آپ کا مسئلہ حل کر رہا ہے کیا اس کے ذہن میں نہیں ہونا کہ کام نکلنے کے بعد اس کے کام آنے سے انکار کر سکتے ہیں یا اس کے کام میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔“

”اس نے یقیناً اس کا حل سوچا ہوگا پہلے بھی اس نے بہت چالاکی سے مجھے جکڑا تھا اور مجھ سے قرآن کریم پر قسم لی تھی۔ وہ تو مرشد اور اس کے آدمی مارشل نے دھوکا کیا اور میں قسم سے آزاد ہو گیا۔ وہ اس بار بھی ایسی کوئی حرکت کرے گا۔“

وسیم ایک بار پھر سوچنے میں مصروف تھا۔ چند منٹ بعد اس نے کہا۔ ”جناب ایسا کریں آپ دو گھنٹے بعد رابطہ کریں۔ تب تک ہم آپس میں ذرا بات کر لیں۔“

آپس میں بات کرنے کی کوئی تک نہیں تھی کیونکہ میرے بعد وسیم تھا اس کا فیصلہ مانا جاتا تھا۔ وہ اصل میں سوچنے کی مہلت لے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں دو گھنٹے بعد کال کرتا ہوں۔“

لیپ ٹاپ بند کر کے میں لیٹ گیا۔ بیٹو پہلے ہی لیٹا ہوا سر ہانے موجود خشک میدہ جات سے شغل کر رہا تھا اس نے اخروٹ گری، بادام اور کاجو میرے سامنے رکھے۔ ”شوبی کھاؤ دشمن کا مال ہے۔“

”ہاں یار پر پیٹ تو اپنا ہے۔“

”آپ جانتا ہے ہمارا پیٹ کیسا ہے؟“ اس نے اپنا پیٹ بجایا۔ ”سب ہضم کر لیتا ہے۔“

”تم سب کھا رہے ہو یہ بتاؤ دو ابھی لی ہے؟“

”صبح بھی لیا تھا ابھی بھی لیا ہے۔“ بیٹو نے کہا۔ ”شوبی اگر آپ نے کنور پبلش پر حملے کا فیصلہ کیا تو ہم بھی اس میں شامل ہوگا۔“

میں نے انکار کیا۔ ”تم پوری طرح فٹ نہیں ہو ابھی تمہارا زخم بھرنے میں کم سے کم تین دن اور لگ سکتے ہیں۔“

”شوبی اوپر سے بالکل ٹھیک ہو گیا ہے اب ہم کو بازو ہلاتے یا کوئی چیز اٹھاتے ہوئے معمولی سادہ ہوتا ہے۔“

”دیکھیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو فیصلہ بھی نہیں ہوا ہے۔“

”شوبی اگر وہیم بھائی لوگ نے منع کیا تو آپ منع ہو جائے گا۔“

”صرف اس صورت میں کہ وہ وجہ بتائیں اور متبادل طریقہ سامنے رکھیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں کسی صورت سادی کے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتا۔“

جب فتح خان ہمیں یہاں لایا تھا تب یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی کہ ڈیوڈ شا میرے اس طرح سے کام آ سکتا ہے لیکن جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا مجھے یہ آپشن بہتر لگ رہا تھا اس سے میرے بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔ دوسری صورت میں سب غیر یقینی تھا۔ ہمارا کنورٹیکس تک رسائی حاصل کرنا، وہاں سے سادی کو نکالنا اور پھر اٹھایا سے بحفاظت نکل جانا۔ اس کے بدلے مجھے ڈیوڈ شا کی شرط پوری کرنی تھی۔ اگر بات میری ذات کی ہوتی تو میں ایک بار پھر انکار کر دیتا لیکن معاملہ میرے ساتھیوں اور خاص طور سے سادی اور وہیم کا تھا۔ ان کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ اب تک میں جن بحرانوں سے گزرتا آیا وادی تک جانے کی مہم میں خطرہ یقیناً اس کے مقابلے میں کم ہوتا۔ اب تک گریز کی وجہ یہی تھی کہ مجھے یہ خیال احمقانہ لگتا تھا۔ ٹھیک ہے ہالیوے کی یہ وادی ایک حقیقت کی طرح موجود تھی مگر ضروری تو نہیں تھا کہ اسے اساطیری داستانوں جیسی ماورائی دنیا بنا کر پیش کیا جائے۔

راجا عمر دراز اور ڈیوڈ شا جیسے تجربے کار، جہاندیدہ اور عقل مند انسان وہاں جانے کی مجنونا نہ کوشش کر رہے تھے۔ اس کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ اپنی اور دوسروں کی جانیں خطرے میں ڈال رہے تھے۔ دونوں برف میں رہنے والے ایک بوڑھے انسان کی بات کو حرف آخر سمجھ کر کوشاں تھے کہ میں ان کے ساتھ وادی تک چلوں کیونکہ وادی میں اترنے کی اجازت اسے ہی ملتی جو مجھے لے کر وہاں جاتا۔ گویا میں وادی میں داخلے کا اجازت نامہ تھا۔ राजा عمر دراز کی حد تک یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ وادی تک جا چکا تھا اور وہاں کے عجائبات دیکھ چکا تھا وہ دوبار برف والے سے ملاقات کر چکا تھا۔ پھر وہ وضع در مشرقی آدمی تھا۔ اس کے لیے یہ سب بہت اہم تھا۔ وہ روایات سے انحراف نہیں کر سکتا تھا لیکن ڈیوڈ شا جدید دنیا کا آدمی تھا۔ اس کے دادا نے یہ وادی دریافت کی تھی۔ اس کے پاس ذرائع تھے وہ چاہتا تھا تو جدید ہتھیاروں سے لیس فوج لے کر وہاں جاسکتا تھا اور یقیناً کوئی اسے نہیں روک سکتا تھا مگر وہ بھی برف والے کی بات کو سینے سے لگائے گزشتہ کچھ عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ میں اس کے ساتھ وادی تک چلوں گویا اسے بھی یقین تھا کہ میرے بغیر وادی میں داخلہ ناممکن ہے اسے ذرا بھی شک ہوتا تو وہ خود کوشش کرتا اور شاید ناکامی کے بعد مجھے لے جانے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ ایک بار برف والے کی بات سن کر اس پر ایمان لے آیا تھا۔ دو گھنٹے بعد میں نے دوبارہ اسکا پ آں کیا۔ سفیر آں لائن تھا اس نے کال کی۔ مٹن دباتے ہی وہیم نمودار ہوا۔

”جناب ہم نے سوچ لیا ہے آپ شام سے بات کریں اگر وہ سادی کو واپس پاکستان پہنچانے کی ضمانت لیتا ہے۔ دوسرے واڈی کی طرف صرف آپ نہیں جائیں گے بلکہ آپ کے ساتھ میں اور عبداللہ بھی ہوں گے۔“

”میں بھی۔“ سفیر نے درمیان میں ٹانگ اڑائی۔

”ہم تو پہلے ہی ساتھ ہے۔“ بیٹو نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

”کیا پوری پارٹی جائے گی؟“

”بالکل ہم صرف آپ کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ صرف ہم تین نہیں بلکہ ہم اگر چند اپنے اعتماد کے افراد بھی ساتھ لے جانا چاہیں تو ڈیوڈ شام اعتراض نہیں کرے گا۔“

”اعتراض تو نہیں کرے گا لیکن اس بار اس کا مقصد ضرور پوچھ گچھ کا؟“

”آپ کی باحفاظت واپسی۔“ وسیم نے جواب دیا۔ ”آپ کی حفاظت کے معاملے میں ہم اس کی ضمانت پر اعتبار نہیں کر سکتے ہیں۔“

”اگر ڈیوڈ شام مان جاتا ہے؟“

”تب آپ اسے ڈبان دے سکتے ہیں کہ سادی کی باحفاظت واپسی کے بعد آپ اس کے ساتھ جائیں گے۔“

وسیم تجربے کار آدمی تھا اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ شرط رکھی تھی مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شام یہ بات مانے گا۔ ”سادی کو وہاں سے ہار کرانے کی ذمہ داری کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”یہ ذمہ داری ڈیوڈ شام یا اس کے آدمیوں کی ہوگی آپ اس میں عملی حصہ نہیں لیں گے لیکن ان کے ساتھ ضرور ہوں گے سادی کو آزاد کرتے ہی آپ اسے اپنی تحویل لیں گے اور وہ اس وقت تک آپ کے ساتھ رہے گی جب تک اس کی واپسی کا انتظام نہیں ہو جاتا۔“

وسیم بہت ہوشیاری سے ہر بات پر غور کر کے تجویز پیش کر رہا تھا۔ میں نے تائید کی۔ ”تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔“

اچانک وسیم نے اشارہ کیا کہ وہ ایک لکھا ہوا پیغام بھیج رہا ہے میں ریسیو کروں۔ میں نے پیغام ریسیو کیا۔ وسیم نے لکھا تھا۔ ”بڑے اور راج کنور کو کسی صورت مت چھوڑیے گا ورنہ یہ مسئلہ ہمیشہ اٹھا رہے گا آپ متفق ہیں تو اثبات میں سر ہلائیے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے کے بجائے جوابی پیغام لکھا۔ ”یا سادی کے سامنے اس قسم کا کام مشکل ہو گا۔“

”میں سمجھتا ہوں لیکن اگر وہ منظر پر نہ ہو تو آپ دل کڑا کر کے یہ کام کر گزریں گے گا۔ راج کنور تو ہے ہی ایک نمبر کا حرامی بڑے کنور نے بھی اپنی اصلیت دکھا دی ہے یہ دونوں ناسور ہیں جن کا ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔“

”میں تم سے متفق ہوں۔“

”بہتر ہوگا آپ یہ کام بیٹو کے سپرد کریں یہ اس کا حق بھی ہے یہی دو بھائی اس کے پورے قبیلے اور خاندان کی بربادی کے ذمے دار ہیں۔“ وسیم نے مشورہ دیا۔ ”وہ بالکل نہیں چکچکائے گا۔“

”چھپکا ہٹ تو مجھے بھی نہیں ہے صرف سادی کا خیال ہے۔“

”اس کا دل مضبوط ہے اور وہ بھی جان گئی ہے کہ اس کے بھائی موڑی ہیں اس لیے اسے پتا چل بھی گیا تو وہ ہمیں غلط نہیں سمجھے گی وہ ہماری مجبوری جانتی ہے۔“

بیٹو پاس بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ انگریزی سے ناواقف تھا اور ہم احتیاطاً رومن اردو میں لکھ رہے تھے اس سے تو بیٹو قطعی ناواقف تھا اس لیے اسے خبر نہیں ہوئی کہ اس کے بارے میں کیا بات ہو رہی ہے۔ وہ تجسس لیکن خاموش تھا۔ میں نے کہا۔ ”او کے میں ڈیوڈ شا سے ان دونکات پر بات کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے پھر کب رابطہ کریں گے؟“

”ممکن ہے آج رات ہی۔“ میں نے کہا اور اسکا پبند کر دیا پھر انٹرنیٹ ڈیوائس نکال لی۔ مانی نے بتایا تھا کہ اس کے سگنل کی مدد سے میرا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ بے شک میں کسی سیاست دان کی رہائش گاہ میں ڈیوڈ شا کے ساتھ موجود تھا لیکن یہ دونوں بہر حال بھارتی سرکار سے زیادہ طاقتور نہیں تھے۔ اگر بھارتی ایجنسیاں میرا سراغ لگالیتیں تو یہ مجھے نہیں پچاسکتے تھے بلکہ عین ممکن تھا خود زیر عتاب آجاتے۔ میں نے اشارے سے بیٹو سے کہا کہ وہ اس بارے میں ابھی کوئی بات نہ کرے۔ وہ سمجھ گیا اور دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا میں نے اس کے زخم پر موجود پٹی ہٹا کر دیکھی۔ باہر سے زخم تقریباً بھر گیا تھا اور کھرٹ کی سرفی اب سیاہی میں بدل رہی تھی۔ اندر سے بھی زخم کی حالت اچھی تھی کیونکہ بیٹو آرام سے اپنا بازو گھما رہا تھا اور اسے تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

”شوبی ہم نہالے؟“

”میرا خیال ہے کل تک اور صبر کرلو۔ ابھی پانی لگانا مناسب نہیں ہے اور اب میں چاہتا ہوں تم جلد از جلد ٹھیک ہو جاؤ۔“

بیٹو سمجھ گیا کیونکہ اس کا چہرہ چمکنے لگا تھا اس نے چپک کر کہا۔ ”اب تو ہم پورا ہفتہ نہالے بغیر رہ سکتا ہے۔“

”لیکن اس کے بعد تمہارے ساتھ کون رہے گا۔“ میں ہنسا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”میں کم ان۔“

وہی خادمہ اندر آئی اور اس نے پوچھا۔ ”سر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے۔“

”فی الحال تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اگر کسی چیز کی ضرورت ہو یا کوئی بات

کہنی ہو تو تمہیں کیسے طلب کیا جائے؟“

اس نے بیڈ کے برابر میں سائیڈ دروازے پر رکھے ریموٹ نما آلے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کا زیر و نمبر دبا بیٹے گا میں آ جاؤں گی۔“

”یعنی یہ تمہارا ریموٹ ہے۔“ میں نے اس کا معائنہ کیا اور صفر دیا یا تو خادمہ کے پاس سے ہلکی سی ہپ کی

آواز آئی۔ اس کا ریموٹ اس کے لباس میں پوشیدہ تھا۔ ”ٹھیک ہے جب تمہاری ضرورت ہوگی تو بلا لوں گا۔“

بیٹو اسے کینہ تو زنگیوں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ اس نے بیٹو کو قابو کر لیا تھا اور یہ اس کی بے عزتی تھی۔ اس

نے خادمہ کے جانے کے بعد کہا۔ ”شوبی ہم کو اس کا صورت سے نفرت ہے، کیا کوئی اور عورت نہیں آ سکتا۔“

”آ سکتا ہے لیکن اس میں کیا برائی ہے۔“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”اچھی خاصی خوب صورت

ہے۔“

”ہم کو اس کا صورت نہیں اس کا حرکت برا لگا۔“ بیٹو نے منہ بنایا۔

”ہوا کیا تھا میں اس وقت اس آدمی کی طرف متوجہ تھا۔“

بیٹو جھینپا پھر اس نے بتایا کہ وہ اس کے پاس گیا تھا اور آسان طریقہ یہی لگا کہ اسے بالوں سے پکڑ کر قابو کر لے لیکن ادھر اس نے خادمہ کے بال پکڑے اور وہ بل کھا کر اس کی پشت پر آئی اور بہت تیزی سے چاقو کی نوک بیٹو کی گردن سے لگادی۔ ”ہم تو سمجھا کہ وہ ہمارا گردن کاٹ دے گا۔“

”شاید اسی لیے اسے یہاں لگایا گیا ہے۔ ہم جیسے قیدیوں کی خاطر مدارت کے لیے کیونکہ اسے خاطر مدارت کا دوسرا طریقہ بھی آتا ہے۔“

”ہم اس سے بدلہ لے گا۔“ بیٹو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”چھوڑو یا کیسی سہی، ہے تو عورت نا، مرد عورت سے بدلہ لے لے تو بھی یہ اسی کی نکست ہوتی ہے۔“

”تب کیا کرے ہم کو غصہ آرہا ہے۔“

”لی جاؤ۔۔۔۔۔“ میں نے مشورہ دیا اور جیکٹ اتارتے ہوئے بچوں کے بل اچھلنے لگا۔ جوتے میں نے پہلے ہی اتار دیئے تھے۔ جسم گرم ہوا تو ایک ایک کر کے سارا اوپری لباس اتار دیا کچھ دیر بعد میں صرف پتلون میں ایک سرساز کر رہا تھا۔ ایک گھٹنے کی مشقت سے جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اندراتی ٹھنڈ نہیں تھی۔ ایک سرساز کر کے میں نے داش روم کا رخ کیا جہاں ہر چیز موجود تھی۔ حد یہ کہ ہاتھ رو بہ بھی تھے۔ میں نے ٹب میں پانی بھرا اس میں یوڈی کلون اور جھاگ کے لیے جل شامل کیا اور باقی ماندہ کپڑے اتار کر اس میں بیٹھ گیا۔ ایک گھٹنے میں گرم خوشبودار پانی نے میل کے ساتھ ساری محسوس بھی اتار دی تھی اور جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ میں ہاتھ رو بہ بہن کر باہر آیا تو حسرت سے مجھے دیکھا۔

”شوبی آپ نہا آیا۔“

مجھے خیال آیا۔ ”تب میں تو تم بھی نہا سکتے ہو۔ زخم پانی سے محفوظ رہے گا۔“

”یہ ٹھیک ہے پر یہ پرانا کپڑا پہنے گا کیا؟“

”شاید ہمارا کپڑوں والا بیگ بھی یہاں آیا ہے ایک منٹ۔“ میں نے ریوٹ کا ٹن دبا کر خادمہ کو بلایا اور اسے بیگ کے بارے میں بتایا۔ ”یہ بیگ چاہیے اگر بیگ نہیں مل سکتا تو اس میں موجود کپڑے لے آؤ۔“

”اگر کپڑے بھی نہ ہوں تو آپ کو ہر قسم کے کپڑے فراہم کیے جاسکتے ہیں۔“

”پہلے بیگ دیکھ لو۔“ میں نے کہا۔ وہ سر جھکا کر چلی گئی۔ عام حالات میں وہ مسکین اور دہلی ہوئی خادمہ نظر آتی تھی جس کی زندگی کا واحد مقصد اپنے آقا کے مہمانوں کی تن من سے خدمت کرنا تھا۔ مگر اس کی مستعدی اور مہارت میں اور بیٹو دیکھ چکے تھے۔ میں نے آئینے میں دیکھ کر بال بنائے تو مجھے خیال آیا۔ پندرہ منٹ بعد خادمہ ہمارے کپڑے بیگ سمیت لے آئی تھی میں نے اس سے کہا۔

”مجھے باربر کی ضرورت ہے۔“

”یہیں کمرے میں یا پھر سیلون میں؟“

”سیلون کہاں ہے؟“

”میشن میں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”میں سیلون چلوں گا۔“ میں نے کہا اور واش روم کا دروازہ ناک کر کے بیٹو کو مطلع کیا کہ میں جا رہا ہوں تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ پھر میں خادمہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ سیلون اسی عمارت کے عقب میں واقع ایک چھوٹی عمارت میں تھا جو ای قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھی کیونکہ وہاں ایک چھوٹا سا کینک بھی تھا اور لائڈری بھی تھی۔ سیلون جدید ترین تھا اور وہاں ایک ماہر باربر خادمہ بھی موجود تھی۔ اس نے پہلے میری ہدایت کے مطابق بال تراشے۔ اس سے پہلے چاروں طرف سے یکساں بڑھے ہوئے تھے اس نے سائینڈوں سے چھوٹے کر کے اوپر کے بال لیے چھوڑ دیئے۔ پھر اس نے قلموں کو کسی قدر دراز رکھتے ہوئے میری شیوینائی۔ آخر میں اس نے میرے بالوں کو نیچرل کلر سے رنگ دیا۔ میرے بالوں کا قدرتی رنگ لائٹ براؤن تھا لیکن اب یہ ڈارک براؤن شیڈ میں آگئے تھے۔ نفاست سے بنی ہوئی مونچھیں اچھی لگ رہی تھیں لیکن یہ سب میں نے اچھا لگنے کے لیے نہیں بلکہ مختلف لگنے کے لیے کیا تھا۔ جب تک کلر پکا ہوتا رہا اس نے میرا چہرہ صاف کیا اور اسے بھی چمکا دیا۔ آخر میں اس نے بال دھوئے۔ میں نے اس کے کام کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی تھی۔ میں واپس آیا تو بیٹو نہادھو کر نکل آیا تھا۔ اس نے زخم بچاتے ہوئے سر بھی دھولیا تھا۔

”شوٹی آپ تو چمک رہا ہے۔“

”چاہو تو تم بھی چمک جاؤ۔“ میں نے اس کا معائنہ کیا۔ ”تمہارے بھی بال بے ترتیب ہیں اور چہرے پر رواں آ گیا ہے۔“

اس بار خادمہ اسے لے گئی اور بیٹو بادل نا خواستہ اس کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے دوسرے کپڑے پہنے۔ پہلے والے بھی صاف سترے تھے لیکن نہادھو کر انہیں پہننے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بیٹو ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو وہ بھی چمک رہا تھا۔ بال ترشوا کر اور شیو کے بعد صفائی سے اس کی سانولی رنگت گھر آئی تھی۔ اس نے لباس پہلے ہی تبدیل کر لیا تھا۔ واپس آتے ہی اس نے پوچھا۔ ”شوٹی کیسا لگ رہا ہے؟“

”ایسا لگ رہا ہے کہ اب کوئی عین جانا بھی چاہے تو نہ جائے۔“ میں نے ہنس کر کہا تو وہ بھی چنپ گیا۔

”شوٹی آپ بھی چھیڑتا ہے۔“

”ہاں یا سب چھیڑتے ہیں تو کیا میرا حق نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں شوٹی آپ کا تو سب سے زیادہ حق ہے۔“ وہ چمکا اور پھر بولا۔ ”شوٹی ایک مزے کا چیز

دکھائے۔“

میں سمجھا شاید وہ کوئی جج جج کی چیز دکھائے گا۔ ”ہاں دکھاؤ۔“

بیٹو نے خادمہ سے کہا۔ ”ناچ کر دکھاؤ۔“

میں بیٹو کی بات پر حیران ہوا تھا اور جب خادمہ نے جج جج رقص شروع کیا تو میں دمک ہی رہ گیا بیٹو نے

خبر سے کہا۔ ”یہ ہمارا حکم مانتا ہے۔ اے ڈانس بند کرو اب ایک پاؤں پر کھڑا ہوا جاؤ۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی اور یوگا اسٹائل میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا بچکانہ پن ہے۔“

”بیٹو ہم کو مزہ آرہا ہے اس نے بھی ہم کو چاقو لگا یا تھا۔“

”وہ دوسری بات تھی لیکن اس وقت یہ خادمہ ہے ہم اسے غلط استعمال نہیں کر سکتے۔“

بیٹو مر جھا گیا۔ ”اچھا ہم نے غلط کیا سوری۔“

”تم جاؤ اور چائے کے ساتھ کچھ ریفریجریٹ لے آؤ۔“ میں نے خادمہ سے کہا اس نے پاؤں نیچے کیا اور رخصت ہو گئی۔ اس دوران میں وہ سب نہایت سنجیدگی سے کرتی رہی اس کے چہرے پر ذرا بھی تاثر نہیں آیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بیٹو سے کہا۔ ”یار وہ دشمن نہیں ہے اس نے اپنا فرض پورا کیا۔“

”شوہی آپ کو برا لگا ہے سوری۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

مکروہ اداس ہو گیا تھا۔ ”شوہی ہم کو دیدی یاد آرہا ہے وہ پتا نہیں کس حال میں ہوگا۔“

مجھے بھی سادی کا خیال آرہا تھا یہ امید تو نہیں تھی کہ اس پر کوئی جسمانی جبر ہوگا لیکن وہ قید میں تھی اور وسیم سے دور تھی اس کے لیے یہی سب سے بڑی تکلیف ہوگی۔ پھر وہ ماں بننے والی تھی ایسے میں تو عورت اور بھی حساس ہو جاتی ہے۔ ”مگر مرت کرو اللہ نے چاہا تو وہ جلد واپس اپنوں میں ہوگی۔“

”شوہی ہمارا تین بہن تھا ہم اچھا بھائی نہیں ہے کبھی ان کا خیال نہیں رکھا پر ان سے محبت کرتا تھا کبھی ان کو تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا یہ کنور کیسا بھائی ہے؟“

”دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے بھی ماں جی کے بعد گھر میں سب سے زیادہ محبت صغراں آپا سے ہے۔“

”وہ بہت اچھا ہے ہم کو چھوٹا بھائی بنایا۔ شعی ہم کو چھوٹا ماموں کہہ کر چھیڑتا تھا۔“

بیٹو نے ذکر چھیڑا تو میں حویلی پہنچ گیا۔ جہاں میرے پیارے تھے۔ ماں جی، بابا، آپا، شعی، بھائی، بھابھی، ان کے بچے اور سویرا۔ بیٹو ان کے بارے میں بتا رہا تھا اور میں سن رہا تھا کبھی میں اسے بتاتا اپنے ماضی کے بارے میں۔ پہلی بار بیٹو کو بتایا کہ میں کیسے گھر سے نکلا تھا؟ بابا نے مجھ پر اور سویرا پر کیا ظلم کیا تھا؟ بیٹو بھی دکھی ہو گیا۔ ”کاش ایسا نہ ہوتا بابا اس وقت سمجھ جاتا۔“

”بس یار یہ نصیب کی بات ہے انسان کے مقدر میں اوپر والے نے جو کچھ دیا وہ ہوتا ہے۔“

”پر اب بابا بالکل بدل گیا ہے۔ کسی پر ذرا بھی غصہ نہیں کرتا سب کا بہت خیال رکھتا ہے کبھی ہمارے ساتھ ہوتا تو آپ کا بہت بات کرتا تھا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں بابا اولاد سے چھپی محبت کرتے ہیں خاص طور سے بیٹوں سے بس وہ آپا کے لیے اپنی محبت نہیں چھپا پاتے۔“

”شعی کا ہونے والا دلہا بھی آیا تھا ہم کو اچھا لگا۔ دونوں کا جوڑی اچھا ہے۔“

ماضی کی یادیں اتنی ہوتی ہیں کہ کبھی ختم نہیں ہوتی ہیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھا کہ خادمہ آئی ہے لیکن جب اجازت دی تو اس کے بجائے فتح خان اندر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا مگر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ”کیا

حال ہیں شہباز خان؟“
 ”قید میں دشمن کا حال پوچھتے ہو؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”درحقیقت مجھے تمہارا حال اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”فتح خان اس بار تم مجھے کچھ بے بس سے لگ رہے ہو۔ پہلے جیسی کمانڈ نہیں ہے تمہارے پاس۔“
 اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمارے پاس کمانڈ کبھی نہیں ہوتا کیونکہ ہمیں روپیہ دیا جاتا ہے۔“
 ”پھر کیا بات ہے؟“

”وہ صوفے پر گر گیا۔“ اس بار ہم خوشی سے نہیں کر رہا ہے۔“
 ”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم خوشی سے کر رہے ہو یا ناخوش ہو کر..... کیونکہ تمہیں جو ڈیوٹی میرے خلاف دی گئی وہ تم نے ادا کر دی ہے۔“
 ”کیونکہ مجھ کو اس کا معاوضہ دیا گیا ہے۔“

میں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ ”فتح خان تمہارا کام ختم ہو گیا ہے۔“
 ”ابھی باقی ہے جب تک شاہیاں ہے میرے کو اس کے ساتھ رہتا ہے۔“
 ”یہاں اس کے نمک خواروں اور اس کے ایک اشارے پر ڈم ہلانے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے پھر تمہاری کیا ضرورت ہے؟“

”یہ نہیں بتا سکتا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تمہارا اپنے ساتھیوں سے بات ہو گیا۔“
 ”تم جانتے تو ہو بلاوجہ کیوں پوچھ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔
 ”میں باہر تھا ابھی آیا ہوں۔“

”ہاں ہوئی ہے اور اب مجھے ڈیوٹی سے بات کرنی ہے۔“
 ”ٹھیک ہے میرا خواہش ہے کہ یہ کام جلد ہو جائے۔“ اس نے میری طرف یوں ہاتھ بڑھایا جیسے مصافحہ کرنا چاہ رہا ہو حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں اس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا میں اسے انکار کرنے والا تھا کہ میری نظر اس کی ہتھیلی پر گئی اس پر کچھ تحریر تھا۔ میں نے غور کیا اس نے لکھا ہوا تھا۔
 ”شاسے اپنی بات منوانا وہ مانے گا ضرور مانے گا۔“

میں نے پڑھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میری بھی یہی خواہش ہے۔“
 فتح خان نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ بیٹو اس کے ہاتھ کی تحریر نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے حیران تھا اس نے کہا جاتا تو میں نے غیر محسوس انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ یہ بات یقینی تھی کہ یہاں ہمیں دیکھنے کا بندوبست بھی تھا ورنہ فتح خان یوں ایکٹ نہ کرتا۔ بیٹو چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد خادمہ چائے اور دوسری چیزیں لے آئی۔ سرد موسم اور پھر پہاڑوں کے معدنی پانی کی وجہ سے یہاں کھایا پیا آسانی سے ہضم ہو جاتا تھا اور آدی کسی بھی وقت کھانے کے لیے تیار ہوتا تھا۔ میں نے ورزش کی تھی اور غسل کے بعد بھوک کھل گئی تھی۔ ہم نے چائے اور اس کے لوازمات سے پورا انصاف کیا۔ اس وقت چھنچ رہے تھے میرا اندازہ تھا کہ ڈنڑیاں آٹھ یا ساڑھے آٹھ

تک ہو گا کیونکہ انگریز کے لیے اس کے بعد رات ہو جاتی ہے۔ رات کو بجے کے بعد انگریز دنیا جہان کی شرائیں لی سکتا ہے لیکن ایک لقمہ کھانا بھی صحت کے لیے مضر سمجھتا ہے۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کی بات کر رہا ہوں جو گھڑی کے پابند ہوتے ہیں۔ ڈیوڈ شا ایسا ہی انگریز تھا۔ ریفر شمنٹ کے بعد میں ٹی وی دیکھ کر وقت گزارتا رہا۔ ٹھیک آٹھ بجے خادمہ نمودار ہوئی۔

”ساڑھے آٹھ بجے مسٹر شاؤزن ٹیبل پر منتظر ہوں گے۔ آپ آٹھ بیس تک تیار رہے گا۔“

مجھے دل میں ہنسی آئی۔ میں اور بیٹو یہاں قیدی تھے لیکن ڈیوڈ شا اور اس کے آدمی یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے ہم بہت معزز مہمان ہیں۔ پورا رکھ رکھاؤ کیا جا رہا تھا۔ ہم بھی مہمان بنے ہوئے تھے۔ بہر حال جلد سب کھل کر اپنی اصلیت پر آجاتے۔ آٹھ بج کر بیس منٹ پر پوچھا آئی اور ہمیں ساتھ لے گئی۔ اس بار بھی ڈنر اسی بڑے سے ہال میں تھا دو پہر میں وہاں میں اور ڈیوڈ شا اکیلے تھے اب فرق یہ تھا کہ میرے ساتھ بیٹو تھا اور ڈیوڈ شا کے بائیں طرف ایک طویل قامت اور مضبوط جسامت کا سفید فام موجود تھا۔ اس نے آری جیکٹ پہن رکھی تھی اور چھوٹے بالوں سے وہ آری مین ہی لگ رہا تھا۔ ڈیوڈ شانے اس کا تعارف کرایا۔

”ایکس آری آفیسر کرنل جیمز بکسٹر۔“

”شہباز ملک۔“ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اس کی گرفت میں مضبوطی تھی لیکن سخت نہیں تھی اس لیے میں نے بھی ہاتھ ڈھیل رکھا پھر بیٹو کا تعارف کرایا۔ اس نے بیٹو سے بھی ہاتھ ملایا تھا۔ ہم آٹھ ساڑھے آٹھ ڈنر اسی بار بھی کئی کورس کا تھا اور تقریباً فائید اشار تھا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا اور کھانے کے بعد قبوہ بھی خاموشی سے پیا گیا۔ ڈیوڈ شائیکین سے منہ صاف کرتا ہوا تھا۔

”شہباز ملک میرا خیال ہے تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

میں نے سر ہلایا اور بیٹو کی طرف دیکھا وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اس نے کہا۔ ”ہم دوا لے کر آرام کرے گا۔“ بیٹو پوچا کہ ساتھ چلا گیا۔ میں، ڈیوڈ شا اور کرنل جیمز اسی کمرے میں آئے۔ اب شیشے کی دیوار کے پار تاریکی تھی اور دور برف پوش پہاڑیاں ہیولوں کی صورت میں تھیں۔ آسمان پر بادل تھے اس لیے چاند نکلا ہوا بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم صوفوں پر آٹھ ساڑھے آٹھ ڈیوڈ شا اور کرنل نے وہی کی بوتل سنبھال لی تھی اور میرے لیے کافی کا آرڈر کیا۔ میں نے غصے سے کہا کہ ڈیوڈ شا بہ ظاہر لا پرواہ اور سرد تھا لیکن اندر سے وہ مضطرب تھا۔ کرنل جیمز کی موجودگی بھی معنی خیز تھی۔ گویا فتح خان کی بات درست تھی اور ڈیوڈ شا ہر قیمت پر میرا تعاون حاصل کرنے پر تیار تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ شرائط میں کچھ اضافہ کر لیا جائے تو اس میں حرج نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ڈیوڈ شائیکین سے انکار کر دے گا لیکن وہیم کی بتائی شرائط لازمی منوائی تھیں۔ اندر سے میں بھی مضطرب تھا لیکن اپنا ظاہر میں نے بھی سرد رکھا ہوا تھا اب معلوم نہیں کہ ڈیوڈ شا میرے اضطراب سے واقف تھا یا نہیں۔ میں خاموش تھا اور منتظر تھا کہ وہ پہل کرے۔ مگر وہ بھی خاموش تھا اس لیے پہل کرنل جیمز نے کی۔

”میرا خیال ہے ہم یہاں بات کرنے آئے ہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے اور میں منتظر ہوں کہ مسٹر ڈیوڈ شا اس کا آغاز کرتے ہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اپنی بات تم تک پہنچا چکا ہوں تم نے جو مطالبہ کیا میں نے وہ پورا کیا اس

لیے اب تم بات کرو تمہیں میری بات منظور ہے یا نہیں۔“
 ”میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا ہے۔“ میں نے کسی قدر رامائی انداز میں کہا اور یہ جملہ بول کر
 چپ ہو گیا اس پر دونوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ڈیوڈ شا سے رہا نہیں گیا اس نے بے تابلی سے پوچھا۔

”تم بات کرنے کی کیا سوچا؟“

”میں راضی ہوں لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔“

میری بات پر ڈیوڈ شا کے چہرے پر جوتا اثرات اور اطمینان آیا تھا اس سے مجھے مزید یقین ہو گیا کہ وہ میرا
 تعاون حاصل کرنے کے لیے سب مان جائے گا۔ مگر اس نے فوراً خود پر قابو پالیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”کیسی
 شرائط؟“

”پہلی شرط سادی کی حفاظت کنوریہس سے رہائی اور اس کے بعد اسے پاکستان پہنچانا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”اس کی آفر میں تمہیں پہلے ہی کر چکا ہوں اور تمہیں فری ہینڈ بھی دے چکا ہوں۔“

”یہ کام تمہارے آدمیوں کو کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں ساتھ رہوں گا اور سادی میری تحویل میں

آئے گی۔“

”جیسا تم کہو گے۔“ اس نے گویا شرط مان لی۔

”دوسری شرط یہ ہے کہ میں وادی کی طرف تمہارے ساتھ آیا نہیں جاؤں گا میرے دوستی اور کچھ آدمی

بھی ساتھ ہوں گے۔“

اس بار وہ کچھ مضطرب ہوا تھا۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہ میری حفاظت کے لیے لازمی ہے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”مجھے خطرہ ہے کہ اس سفر کے بعد

میں تمہارے لیے غیر ضروری ہو جاؤں گا۔“

”تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے کیونکہ میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم میں اور مجھ میں فرق ہے تم با اختیار ہو اور میں بے اختیار ہوں۔ اس لیے

مجھے تحفظ کی ضرورت ہے۔“

”مسئلہ یہ نہیں ہے میں مختصر پارٹی لے کر جاؤں گا اول تو بڑی پارٹی کی اجازت نہیں ملے گی دوسرے بڑی

پارٹی کی صورت میں رازداری مشکل ہو جائے گی۔“

”ڈیوڈ شا اجازت اور رازداری تمہارے لیے مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے لازمی سمجھو اس کے

بغیر بات آگے نہیں بڑھے گی۔“

اس نے چند لمحوں سوچا۔ ”اوکے میں تمہارے دوستیوں کی حد تک مان لیتا ہوں۔“

”یوں سمجھو کہ ہم تمہارے اتحادی ہوں گے ہمارے پاس اپنی حفاظت کا بندوبست ہو گا ہم اس معاملے

میں تمہارے محتاج نہیں ہوں گے۔“

”اسلمہ مشکل ہے لیکن دیکھیں گے؟“

”نہیں ڈیوڈ شا یہ ابھی طے ہوگا۔“

”مجھے اعتراض نہیں ہے۔“ ڈیوڈ شانے کہا۔ ”لیکن اس سے اعتماد کی فضا متاثر ہوگی۔“
 ”نہیں ہوگی میں اس کی ضمانت دوں گا۔“

”اوکے اٹ ازڈن ناؤ۔“ ڈیوڈ شانے بد معرگی سے کہا۔

”تیسرے میں چاہتا ہوں تم مرشد کا کوئی مستقل دوست کرو تاکہ اس کے بعد وہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہ بن سکے۔ میں اور میرے ساتھی سکون سے عام انسانوں جیسی زندگی گزاریں بغیر کسی خوف و خطر کے۔“
 ”میں اسے دیکھوں گا۔“ اس بار اس نے واضح جواب نہیں دیا۔ ”میں تمہاری مرشد سے صلح کرا سکتا ہوں لیکن صلح دو طرفہ ہوتی ہے۔“

”بات صلح کی نہیں مرشد کی طرف سے دشمنی کا باب ختم کرنے کی ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق وہ تادور کے بعد اس کی موت کا ملبد ڈال کر میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف نئی مہم شروع کرنے والا ہے اس کا مقصد اپنے خاندان والوں اور مریدوں کو مطمئن کرنا ہے۔“

”مرشد سے کچھ حساب میں نے بھی لینا ہے اس لیے تم اسے شرط مت بناؤ مجھے پوری امید ہے میں اس مسئلے کو حل کر لوں گا۔“

مجھے پہلے بھی یقین نہیں تھا کہ ڈیوڈ شانے مرشد کے بارے میں کوئی ضمانت دے گا اس لیے میں اس پر زیادہ زور نہیں دیا۔ ”ٹھیک ہے یہاں میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ سجدیہ کو کنور پیلس سے کیسے اور کب نکالا جائے گا؟“

”یہ تم اور کرنل جبریل کر طے کرو گے۔“ ڈیوڈ شانے کہا۔ ”کرنل سیورٹی کا ماہر ہے۔ سیورٹی کرنے کا بھی اور اسے بریک کرنے کا بھی۔“

میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا کر سکو گے؟“

”ہم پروفیشنل انداز میں کام کریں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہر اسٹیپ کی پلاننگ کریں گے۔ اس کے مطابق عمل کریں گے۔“

”پلاننگ کا اولین مرحلہ کنور پیلس کی سیورٹی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات اندر کا کوئی آدمی ہی بتا سکتا ہے۔“

کرنل نے مسکرا کر کہا۔ ”خوش قسمتی سے ہمارے پاس اندر کا ایک آدمی ہے۔“

”وہ آدمی کہاں ہے؟“

”ابھی یہاں نہیں ہے لیکن کل تک آجائے گا۔“ کرنل نے کہا۔ ”وہ کچھ کارآمد معلومات لے کر آئے گا اور اس کی مدد سے ہم اپنے منصوبے کو حتمی صورت دیں گے۔“

”وہ لالچ میں کام آ رہا ہے؟“

”ہاں لالچ بھی ہے لیکن اصل میں اسے بڑے کنور سے بدلہ لینا ہے اس لیے وہ ہمارے ساتھ ہے۔“

”یہ اچھی بات ہے ورنہ جو شخص رقم کے بدلے بکے وہ قابل اعتماد نہیں ہوتا وہ ایک کو دھوکا دیتا ہے تو دوسرے کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔“

”تم فکر مت کر مسٹر شہباز ہم ہر پہلو پر نظر رکھیں گے۔“
میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ”سادی کو کنورٹیلز سے آزاد کرانا تمہاری ذمہ داری ہے لیکن میں ساتھ ہوں گا اور بعض معاملات میں فیصلے میں کروں گا۔“
”کن معاملات میں؟“

”یہ میں وہیں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا اور کرنل کی طرف دیکھا۔ ”گارڈز کے ساتھ تم جو چاہے سلوک کرو لیکن عام ملازموں اور کنورٹیلز کے افراد کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“
اس نے سر ہلایا۔ ”میں بھی عام آدمیوں کو نہ چھیڑنے کا قائل ہوں۔“

میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ میری اس بات سے ڈیوڈ شا شکر ہو گیا تھا۔ البتہ اس نے پہلے سوال کے بعد اس معاملے پر مزید کچھ نہیں کہا۔ البتہ اس کے اور کرنل کے درمیان معنی خیز لگا ہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اس کا روانی کے پس پشت ڈیوڈ شا کا بھی کوئی مفاد تھا؟ کیونکہ یہ ظاہر تو ڈیوڈ شا کا اس معاملے میں کوئی مفاد نہیں تھا اور وہ یہ سب صرف مجھے راضی کرنے کے لیے کر رہا تھا۔ مجھے اپنی ریزہ کی ہڈی میں سننا ہٹ سی ہوئی جیسے کسی سنسنی خیز کھیل کا آغاز ہو گیا ہو۔ میں اس کھیل کا ایک حصہ تھا اور کھیل کے کچھ حصے یقیناً میری نظروں سے اوجھل تھے اسی طرح کچھ حصے دوسرے حصے داروں کی نظروں سے بھی اوجھل تھے سب اپنا اپنا کھیل کھیل رہے تھے اور اپنا مفاد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈیوڈ شا سے کام کی بات ہو گئی تھی اس لیے وہ کھڑا ہو گیا اور میری طرف دیکھا۔
”اب تم آرام کرو۔“

اس نے صرف مجھے کہا تھا اور کرنل اپنی جگہ موجود رہا تھا یعنی وہ رہتا اور ڈیوڈ شا اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ فوراً ہی فتح خان نمودار ہوا جیسے اسے کوئی ناییدہ اشارہ ملا ہو اور میں اس کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے راستے میں پوچھا۔ ”کیا میں اور بیٹو اپنے کمرے میں قید ہوں گے؟“

”نہیں لیکن اس عمارت سے باہر جانے پر پابندی ہوگی اور کمرے سے باہر تم نظروں میں رہو گے۔“
”مجھے تو یقین ہے کمرے میں بھی میں تم لوگوں کی نظروں سے محفوظ نہیں ہوں اس لیے احتیاطاً داش روم میں کپڑے بدلے تھے۔ یقین تو وہاں کے بارے میں بھی نہیں ہے لیکن مجبوری ہے وہی آخری جگہ بچتی ہے جہاں انسان کسی کی نگاہوں سے بچ سکتا ہے۔“

میں اندر آیا تو بیٹو خرائے لے رہا تھا اور یہ خاصے خوفناک خرائے تھے۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ آج رات کالی ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے گرم پانی سے شاور لیا اور پھر لینا تو جلد نیند آگئی اور پھر بیٹو کے خرائوں نے پریشان نہیں کیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو بیٹو اٹھ گیا تھا اور آئینے کے سامنے کھڑا اپنے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس پر کمر ٹھکی سرفنی ختم ہو چکی تھی اور اب یہ برداؤں ہو رہا تھا اس نے خوش ہو کر مجھے آگاہ کیا۔ ”شوہی اب ہم بالکل ٹھیک ہے۔“

”لیکن دوادو دن اور کھانی ہوگی۔“ میں نے اٹھ کر واش روم کا رخ کیا۔

”شوہی ناشتے کا کہہ دے؟“ عقب سے بیٹو نے پوچھا۔

”ننگی اور پوچھ پوچھ۔“ میں نے دروازہ بند کر کے کہا۔ فارغ ہو کر باہر آیا تو بیٹو پوجا کو ناشتے کا بتا رہا تھا۔ یہ خاصا بھاری بھر کم اور لہبا چوڑا ناشتہ تھا مگر میں نے ٹوکا نہیں تھا۔ البتہ اس میں انگریزی کے تازہ اخبارات کا اضافہ کر دیا۔ پھرنی دی ریوٹ سے آن کیا۔ یہ کوئی سیلا میٹ ٹی وی سسٹم تھا اور اس میں کئی سو جوٹلو تھے مگر زیادہ تر مقامی بھارتی جوٹلو تھے اور باقی انٹرنیشنل جوٹلو تھے۔ میں پاکستان بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن یہ کام میں نے ناشتے کے بعد کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ وقت گزاری کے لیے چینل گھمار رہا تھا کہ اچانک ایک چینل پر میرا ہاتھ رک گیا یہ ماحولیاتی چینل تھا اور اس پر ایمن کا پروگرام آرہا تھا۔ بیٹو اسے دیکھ کر چونکا۔

”شو بی تو وہی ہے نا؟“

”ہاں یہ ایمن ہے۔“ میں نے کہا اور آواز تیز کی۔ ایمن ہمالیہ کے پس منظر میں ایک ڈاکو میٹری پیش کر رہی تھی مجھے یاد تھا جب آخری بار اس سے بات ہوئی تھی تو اس نے ذکر کیا تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے انڈیا اور نیپال آئے گی۔ پروگرام کے ساتھ کوئی تاریخ نہیں آ رہی تھی جس سے پتا چلا کہ یہ کب ہنا تھا۔ مگر موسم گرما کا لگ رہا تھا کیونکہ ماؤنٹ ایورسٹ کے نیچے دور سے ہی سبزہ نمایاں تھا۔ خود ایمن ایک گل رنگ وادی میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جھڑ پر مقامی انداز کا کرتہ پہن رکھا تھا اور یہ اس پر بچ رہا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ ہمالیہ پہاڑوں کے دیوتاؤں کا گھر تھا یہاں دنیا کی سب سے بلند ترین چوٹیاں تھیں اور ہمالیہ سے باہر بلند ترین چوٹی کا نمبر سو کے بعد آتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اس پروگرام میں سوائے ہمالیہ کے تعارف کے اور کچھ نہیں تھا۔

اس دوران میں ناشتہ آ گیا اور میں ناشتے کے دوران ہی پروگرام دیکھتا رہا۔ پروگرام کے بعد جب ناموں کی سلائیڈ چلتی ہے تب میں نے دیکھا۔ پروگرام اسی مہینے کی نو تاریخ کا ریکارڈ ہوا تھا یعنی آج سے گیارہ دن پہلے کا تھا اس کا مطلب تھا کہ ایمن اس خطے میں ہو سکتی تھی لیکن اس وقت اس کا یہاں ہونا میرے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا تھا۔ ڈیوڈ شا ایک بار پہلے بھی اس کے حوالے سے مجھے بلیک میل کر چکا تھا اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا وہ ایک بار پھر ایمن کی مدد سے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ میں نے دل ہی دل خواہش کی کہ وہ یہاں سے جا چکی ہو۔ ناشتے کے بعد میں نے اسکا پپر رابطہ کیا۔ عبد اللہ آن لائن تھا۔ سفیر سو رہا تھا کل رات اس کا موڈ خراب تھا اور اس نے دسم سے جھگڑا کیا تھا کہ وہ کیوں نہیں جا رہا۔ میں نے عبد اللہ سے کہا۔

”میری خواہش ہے کہ تم دونوں بھی نہ چلو کیوں کہ بہر حال اس مہم میں بھی خطرہ ہے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ عبد اللہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”ڈیوڈ شانے کیا کہا ہے۔“

”میرے دوستا قیوں کے بارے میں مان گیا ہے ہم اپنی حفاظت کے خود ڈرے دار ہوں گے لیکن مزید

لوگ لے جانے سے ہچکچا رہا ہے اس کا کہنا ہے کہ پارٹی ایک حد سے زیادہ بڑی نہیں ہو سکتی۔“

”بیٹو آپ کے ساتھ ہے ایک آدمی اور لے سکتے ہیں۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”ڈیوڈ شا جیسے شخص کے لیے

پارٹی چھوٹی بڑی ہونا مسئلہ نہیں ہو سکتا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے وہ بلاوجہ ہچکچا رہا ہے۔“ میں نے کہا اسی دوران میں دسم آ گیا وہ تو لیے سے سر رگڑ

رہا تھا۔

”کیسے پیر کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے اسے تفصیل سے اپنی اور ڈیوڈ شا کے مذاکرات کے بارے میں بتایا اور کرنل جیمز کے بارے میں بتایا تو وسیم چونک گیا۔ ”میرا خیال ہے میں اسے جانتا ہوں کسی وقت یہ افغانستان میں برطانوی فوج کا حصہ تھا۔ پھر ایک لڑائی میں شدید زخمی ہوا تو فوج سے رٹاڑ ہو گیا۔ میں جس افغانی سے اسلحہ اور دوسرا سامان لیتا تھا اس نے اس لڑائی میں شرکت کی تھی اور اس کا کہنا تھا کہ کرنل جیمز نے زخمی ہونے کے باوجود نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا اور اپنے دو درجن ساتھیوں کی جان بچانے میں بنیادی کردار ادا کیا ورنہ وہ سب مارے جاتے۔“

”اس کا مطلب ہے کرنل جیمز پیشہ ور سپاہی ہے۔“
 ”بالکل اگر یہ وہی کرنل جیمز ہے تو بہت اچھا کمانڈر اور سپاہی ہے۔“ وسیم نے تائید کی۔
 ”ڈیوڈ شانے کنور پیلس کے اندر کا ایک آدمی بھی تلاش کر لیا ہے وہ اندر کے سکیورٹی کے بارے میں بتائے گا۔“

”یہ ضروری تھا اس کے بغیر کامیابی محکوک اور بہت زیادہ قوت اور قتل و غارت گری کے بعد ہی ممکن ہوتی۔“

”وہ آج آئے گا اس کے بعد پلان تیار کیا جائے گا۔“
 وسیم نے کہا۔ ”مائی نے کنور پیلس کا قہری ڈی نقشہ دکھایا ہے اس جگہ حملہ کرنا بہت مشکل ہے اور حملہ آوروں کا پوری طرح تربیت یافتہ اور مسلح ہونا ضروری ہے۔ غیر روایتی ہتھیار لازمی ہوں۔ جیسے گیس اور دھوئیں کے بم، راستے صاف کرنے کے لیے دھماکہ خیز مواد اور اس کے استعمال کا ماہر بھی ہو۔“
 ”میرا خیال ہے کرنل جیمز کے ذہن میں یہ سب ہوگا پلان پر بات کر کے میں ایک بار پھر سب تمہارے سامنے رکھوں گا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ سب اب عام ہو گیا۔ بلٹ پروف، راجلے کے جدید آلات، رات کی تاریکی میں دیکھنے والی عینکیں اور لیزر کی مدد سے الیکٹرونک نشانہ لینے والی عینکیں۔“
 عبداللہ نے کہا۔ ”جناب میرے ذہن میں ایک خیال اور آ رہا ہے۔ اوشا بھی تو اسی جگہ رہی ہے اور وہاں سے اچھی طرح واقف ہوگی۔“

میں چونکا۔ ”اوشا..... لیکن وہ رانا دیاس کے پاس ہے۔“
 ”اسے وہاں سے بلایا جاسکتا ہے۔“ عبداللہ نے اصرار کیا۔ ”وہ خاص کنور فمیلی کے حصے میں ہوتی تھی اور ہمیں وہیں تک جانا ہے سادی وہیں ہوگی۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ وسیم نے عبداللہ کی تائید کی۔
 میں موج میں پڑ گیا پھر میں نے کہا۔ ”اے آپشنل رکھو اگر کنور پیلس کا مجیدی مجھے مطمئن نہ کرے گا تو پھر ہم اوشا کو بھی بلوا سکتے ہیں۔“

عبداللہ ہنسا۔ ”آپ اس سے ڈرتے ہیں۔“
 ”یہ پوچھیں کہ یہ کس سے ڈرتا ہے؟“ وسیم نے شرارت سے کہا۔
 ”کوئی نہیں ڈرتا۔“ عبداللہ جلدی سے بولا۔

”یہ کس کا ذکر ہو رہا ہے؟“

”اسی گل بانو کا جو آپ نے بھیجی تھی۔“ دسیم کے لہجے کی شرارت بڑھ گئی۔ ”خاتون نے گھر کا نظام ایسے سنبھال لیا ہے کہ اب یہ ہر کام اس سے پوچھ کر کرتا ہے۔“

”بانو۔“ میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اے تو میں بھول گیا کیسی ہے وہ؟“

”وہ آپ سے خفا ہے کہ آپ نے اتنی بار بات کی اور ایک بار بھی اس سے بات نہیں کی۔“

”یار یہ غلطی ہوئی اسے بلاؤ۔“

عبداللہ بلانے گیا اور ایک منٹ بعد بانو اس کا پپر تھی اس نے حسب معمول فراک سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ کچھ نازک اندام ہو چکی تھی اس لیے یہ لباس اس پر اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی شکوہ کیا۔ ”کیسے ہیں آپ مجھے تو بھول ہی گئے۔“

”سوری۔“ میں نے جلدی سے معذرت کی۔ ”تمہیں واپس بھیجنے کے بعد ایک منٹ بھی چین سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اب دشمن کی قید میں ہوں تو ذرا سکون ہے۔“

وہ پریشان ہو گئی۔ ”کیا بڑے کنور نے.....“

”نہیں یہ ڈیوڈ شاہ ہے بہر حال میری جان کا دشمن نہیں ہے۔“ میں نے اسے بتایا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”تم کیسی ہو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔“

”نہیں میں بہت آرام سے ہوں ہاں یہ لوگ مجھ سے تنگ ہیں۔“ بانو نے ترجیحی نظروں سے دائیں طرف دیکھا۔ اس کی نظروں کا نشانہ عبداللہ تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب۔“

”میرا خیال ہے تم نے ان لوگوں کو ٹائٹ کر دیا ہے ویسے یہ ہیں اسی قاتل۔“

”میں پہلے ہی ٹائٹ ہوں۔“ دسیم نے سرد آہ بھری۔ ”نٹ بولٹ سب پوری طرح ٹائٹ ہو گئے ہیں البتہ

یہ عبداللہ.....“

”شوبی میں نے بریانی دم پر لگائی ہے۔“ بانو اٹھتے ہوئے بولی۔ ”وہ دیکھ کر آتی ہوں۔“

بانو کے جانے کے بعد دسیم فحس رہا تھا اور عبداللہ جھینپ رہا تھا۔ کہانی سمجھ میں آ رہی تھی لیکن میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”یہ کیا پکڑ ہے برادرز؟“

دسیم بولا۔ ”آپ انجان نہ بنیں..... یہ اپنے عبداللہ بھائی.....“

”آپ اس کی باتوں میں مت آئیے گا۔“ عبداللہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”یہ فارغ ہے نا اس لیے صرف دماغ استعمال کر رہا ہے۔“

دسیم فحس رہا تھا اور عبداللہ جھینپ رہا تھا لیکن میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”یار یہ سب مذاق ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔“

”میں تو سمجھ رہا ہوں کہ یہ حقیقت ہے لیکن یہ نہیں مان رہا۔“ دسیم نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔

”تم کیا کہتے ہو عبداللہ؟“

میرے لہجے سے عبداللہ بھانپ گیا تھا اس لیے وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ مجھے جانتے ہیں اور میرے خیالات بھی۔ ان دونوں نے بلاوجہ میرا پیچھا لیا اور پھر بانو کو بھی چھینر نے لگے۔ یہ ٹھیک ہے وہ اچھی لڑکی ہے اور مجھے اچھی بھی لگتی ہے۔“ عبداللہ کہتے ہوئے شرمایا۔ ”لیکن جناب اس کے دل میں کیا ہے مجھے نہیں معلوم۔“

”بیٹے وہ تم سے جس طرح گریز کرتی ہے لیکن ساتھ ہی جیسے خیال رکھتی ہے اس سے اس کے دل کا حال معلوم ہے۔“

”اس کے دل کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”عبداللہ اگر وہ تمہیں پسند کرے تو تم کیا کرو گے۔“

”فکاح جناب۔“ دسم پھر شرارت سے بولا۔ ”اور کیا کرنا ہے اس نے۔“

”جناب میں سنجیدہ ہوں۔“ عبداللہ نے دوسرے لفظوں میں کہا۔

”ٹھیک ہے یہ میری ذمہ داری ہے لیکن مہربانی کر کے تم لوگ ذرا ہاتھ ہلکا رکھو۔ وہ بہت حساس لڑکی ہے اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”ساری بے چاریوں کا ٹھیکہ ہمارے پاس ہے۔ ایک اور سبکی۔“ یہ سفیر تھا چواچک نازل ہوا تھا۔

”آغاز تیری زوجہ سے ہوا تھا۔“ میں نے تائید کی۔ ”بہر حال بانو موننا اور سادی سے مختلف ہے۔“

”وہ کیسے؟“ دسم اور سفیر نے بیک وقت اعتراض کیا۔

”وہ ایسے کہ وہ صرف زبان ہی نہیں ہاتھ پاؤں چلانا بھی جانتی ہے۔ اگر اس کا دماغ گھوما تو وہ سب کا دماغ درست کر سکتی ہے اس لیے سب حد میں رہیں۔“

”پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔“ سفیر نے کہا۔ ”اب میں ایک ذرا فاصلے پر رک کر مذاق کروں گا۔“

”تب بہتر ہے میں اسے بھی حویلی بھیج دوں۔“

”یعنی سیف ڈیپازٹ میں جمع کرادوں۔“ سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہماری کائنات میں جو تھوڑا بہت رنگ ہے وہ بھی چلا جائے گا۔“

”تو رنگ کے پیچھے کیوں پڑتے ہو؟“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”اس صنف کو آس پاس پا کر آپ سے باہر کیوں ہو جاتے ہو؟“

سفیر بد معاشی کر رہا تھا وہ چھینر کر مجھے اشتعال دل رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا تو میں نے خود پر قابو پایا ورنہ میں نے اسے سنا دی تھیں جس پر سفیر سمیت سب ہنس رہے تھے۔ میں نے لیپ ٹاپ بیٹو کے حوالے کر دیا اور وہ سفیر سے لڑنے لگا کہ شوبی پہلے یہاں پریشان ہے اور تم لوگ اسے اور پریشان کر رہا ہے۔ وہ بے چارہ ان بد معاشوں کو کہاں قابو کرتا۔ غصے میں اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور مجھ سے کہا۔ ”شوبی یہ لوگ ناقابل علاج ہو گیا ہے۔“

”بیٹے ان کا علاج ہے مگر ان کی ڈاکٹر ز دور ہیں نا وہ ہوتیں تو پھر دیکھتے ان کی بولتی کیسے بند ہوتی ہے۔“

بیٹو نے سر ہلایا۔ ”آپ ٹھیک کہتا موننا اور سادی دیدی کے سامنے دونوں ایسے شریف بن کر رہتا ہے۔“

”بس تو وہ واپس آکر ان سے سارے بدلے لیں گی اور جب ہم نہیں گے۔“

”جیسے ابھی یہ لوگ ہنستا ہے۔“ بیو نے کہا اور پھر پوچھا۔ ”شوبی اس کمرے سے باہر نہیں جاسکتا دروازہ تو کھلا ہوا ہے؟“

”کمرے سے جاسکتے ہیں عمارت سے باہر نہیں جاسکتے۔“

”تب ہم مرگٹ کر کے آتا ہے۔ آج زیادہ کھالیا ہے۔“ اس نے دودھ سے ابٹی باؤنک کپسول نگلتے ہوئے کہا۔ ”بس اب دودھ کا دوارہ گیا ہے۔“

”وہ بھی لازمی کھانا..... میرا خیال ہے تم بھی میرے ساتھ چلو گے لیکن اس کے لیے ضروری ہے تم بالکل فٹ ہو۔“

”ہم بالکل فٹ ہے۔“ اس نے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔ پوچھنا شے کی ٹرائی لے جا چکی تھی میں نے ریوٹ کا بٹن دبا کر اسے طلب کیا اور کافی کا کہا۔ میں سوچتا چاہتا تھا اور یہ موقع تھا اور نہ بیو ہوتا تو وہ آسانی سے سوچنے نہیں دیتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کنور پیلس پر ہونے والے حملے میں میری کیا کردار ہوگا اور مجھے کن معاملات کے لیے پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔ کچھ دیر غور کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا صرف نگران کی حیثیت سے موجودگی کافی نہیں تھی اپنی کمائنڈ قائم کرنے کے لیے مجھے اس حملے میں عملی طور پر حصہ لینا ہوگا۔ کمرے میں ایک طرف چھوٹی رائٹنگ ٹیبل اور اس پر لکھنے کے لوازمات تھے میں نے چین اور رف پیڑ اٹھایا اور اس پر کنور پیلس کا نقشہ کھینچا۔ تقریباً نصف مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا پیلس کئی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ میں نقشے میں ان عمارتوں کو واضح کرنے لگا۔

مرکزی پیلس جس میں کنور خاندان کی رہائش تھی۔ کسی قدر عقب میں تھا۔ اس کے پیچھے صرف دو عمارات تھیں ایک جس میں کلینک اور دوسری سہولیات تھیں یہ کسی قدر عقب میں دائیں طرف تھی۔ جب کہ ملازموں کے لیے مخصوص عمارت بالکل عقب میں تھی۔ فرنٹ پر ایک بڑی ہال نما عمارت تھی جو یقیناً تقریبات کے لیے مخصوص تھی جب کہ بائیں طرف کی عمارات میں کیا تھا یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ سیوریٹی کے نکتہ نظر سے پورے پیلس کو مختلف سطحوں میں تقسیم کیا ہوا تھا اور ان کی درمیان میں اونچی دیواریں تھیں۔ میں ان دیواروں کو واضح کر رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے چین رکھ دیا۔ جب انٹرنیٹ موجود تھا تو میں اتنی زحمت کیوں کر رہا تھا۔ میں نے گوگل ارتھ پر کنور پیلس کا تصویر نکالی۔ اس تصویر میں نہ صرف پیلس کی تمام عمارات واضح تھیں بلکہ اس میں پینائٹس بھی دی ہوئی تھیں۔ پوچھا کافی لے کر آئی تو میں نے اس سے کہا۔

”مجھے ایک اچھا پرنٹر چاہیے۔“

”کچھ دیر میں آجائے گا۔“ اس نے کہا اور چلی گئی۔ میں کافی پیتے ہوئے پیلس کے مختلف حصے واضح کر کے دیکھتا رہا۔ دس منٹ بعد ایک ملازم جدید ترین کلر پرنٹر لے آیا۔ اس نے اسے پلگ کیا اور پھر اس کی پورٹ لیپ ٹاپ سے انچ کر دی۔ پرنٹ کا طریقہ کار مجھے آتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں کنور پیلس کی تصاویر پرنٹ کرنے لگا۔ یہ مختلف ساز کی تھیں اور ہر عمارت اور ہر حصے کی الگ الگ تصاویر پرنٹ کی۔ گوگل ارتھ میں یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ تصویر غلط سے لی جاتی ہے اس لیے ٹو ڈی ہوتی ہے عمارتوں اور مختلف سطحوں کی اونچائی اور دیواروں کی اونچائی کا اندازہ دشوار تھا۔ مانی کے پاس تھری ڈی گوگل ارتھ تھا جس میں ان عمارتوں کو کسی بھی

زاویے سے دیکھا جاسکتا تھا۔ مگر مجھے مانی سے مدد لینے کی ضرورت نہیں تھی مجھے یقین تھا کہ کرل جیمز اور ڈیوڈ شا کے پاس اس سے بھی آگے کی معلومات ہوں گی اور وہ میں ان سے لے سکتا تھا۔ تصاویر پرنٹ کر کے میں انہیں بستر پر پھیلا کر دیکھنے لگا۔ بیٹو اندر آیا۔ اس نے دلچسپی سے دیکھا۔

”شوبی یہ کیا کرتا ہے؟“

”کنورٹریس کا نقشہ ہے۔“

”کوئل ارتھ سے لیا ہے مانی نے ہم کو بتایا تھا۔“ بیٹو نے سر ہلایا۔

”یہ مرکزی عمارت ہے۔“ میں نے ایک تصویر پر ہاتھ رکھا۔ ”کنورٹریس یہیں رہتی ہے۔ قبائلیوں کے حملے میں یہ عمارت جل کر تباہ ہو گئی تھی۔ سادی بھی یہیں ہوگی۔“

بیٹو غور کرنے لگا۔ میرے کسی بھی ساتھی کی نسبت میدان عمل میں اس نے میرے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارا تھا۔ وہ ذہن بھی تھا اور اس نے سب بہت تیزی سے سیکھا تھا۔ اس نے کہا۔ ”شوبی ادھر حملہ کرنا آسان نہیں ہوگا اور اس جگہ تک جانا تو بہت ہی مشکل کام ہوگا۔“

”تمہارا مطلب ہے اگر کرل حملہ کیا جائے تو یہ کام بہت مشکل ہے؟“

”ہم کو لگ رہا ہے۔ پہلے باہر سے کچھ کرنا ہوگا۔“

”کیا کرنا ہوگا؟“

”یہ تو ہم کو نہیں پتا پر پہلے سامنے آئے بغیر کچھ کرنا ہوگا جب یہ الجھ جائے تب اندر گھسے ورنہ بہت نقصان ہوگا۔ اندر گھسنے کے لیے پورا فوج چاہیے ہوگا۔ ہمارا قبائلی بھی ایسے ہی گھسا تھا اسے اندر سے مدد ملتا تھا۔ پھر بھی بہت نقصان ہوا تھا۔“

”وہ مدد ایک جال تھا جس میں قبائلی پھنس گئے اور پھر سرکار نے آپریشن کر کے تمہارے پورے قبیلے کو نابود کر دیا۔“

بیٹو نے سر ہلایا۔ ”حملہ کرنے والا پانچ چھ سو بندہ تھا۔“

”یہاں پانچ چھ سو بندے مشکل ہیں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا اور پھر چین اور رف پیڈ لے کر کچھ نکات نوٹ کرنے لگا۔ دو پہر تک میں ان ہی کاموں میں لگا رہا۔ ایک بجے پوچا جانے لگا کہ بتایا لیکن اس بار پانچ اسی عمارت میں تھا۔ کھانے کی ٹرالی کے ساتھ وہ کرل جیمز کا پیغام لائی۔

”وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

لنگ کے بعد میری کرل جیمز سے اسی عمارت کی نشست گاہ میں ملاقات ہوئی۔ وہ تقریباً چالیس یا پچاس برس کا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم افغانستان میں لڑ چکے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”سات سال پہلے..... پھر میں زخمی ہوا اور ریٹائرمنٹ لے لی۔“

”تب سے پرائیویٹ کام کر رہے ہو؟“

”پانچ سال سے..... ایک سال تو میں اسپتال میں رہا میرے سولہ آپریشن ہوئے تھے۔ کئی بار موت کے منہ سے واپس آیا۔ ڈاکٹر میرے بچنے پر حیران تھے۔“

”حالانکہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے موت سے پہلے آدمی مر نہیں سکتا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ وہ بولا اور پھر اس نے اپنے سامنے رکھے ایک بڑے لفافے سے کچھ تصاویر نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ یہ کنور پیلس کی تصاویر تھیں۔ یہ بھی گولگن اترتھ سے تھیں مگر یہ بہت واضح اور تھری ڈی تھیں۔ جب تک میں تصویریں دیکھ رہا تھا کرنل نے ایک بڑا رنگین نقشہ پھیلایا۔ اس نقشے میں تمام سکیورٹی پوائنٹس واضح تھے۔ اسی طرح جہاں گاؤں گشت کرتے تھے وہ جگہیں بھی واضح تھیں۔ عمارتوں کے نقشے آرکیٹیکٹ کے لحاظ سے تھے یعنی ان کے اندر کمرے اور دیواریں بھی واضح تھیں دروازوں اور کھڑکیوں کی نشان دہی بھی تھی۔ کرنل نے کہا۔ ”ایک ماہر اس کا کمپیوٹر پر تھری ڈی نقشہ بنا رہا ہے۔“

”اس عمارت کی حد تک اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے مرکزی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں اس سے واقف ہوں اور یہاں گھنٹا میری ذمہ داری ہوگی۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا تم بھی حصہ لو گے؟“

”ہاں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس عمارت پر حملہ میں کروں گا اور میرے ساتھ موجود تمام افراد میرے حکم کے پابند ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے لیکن ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے نقشے کی تیاری لازمی ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”کنور پیلس سے تعلق رکھنے والا شخص آگیا؟“

کرنل نے گھڑی دیکھی۔ ”ایک گھنٹے میں آ رہا ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے واکی ٹاکی پر کسی شخص سے رابطہ کیا۔ ”نقشہ تیار ہو گیا؟..... اوکے میں آ رہا ہوں۔“ وہ واکی ٹاکی جیب میں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مسٹر شہباز میرے ساتھ آؤ۔“

ہم اس عمارت سے نکلے ہوئے سبزہ زاروں کے درمیان پختہ روش سے گزرنے لگے۔ کرنل نے خبردار کیا۔ ”راستے سے مت اترنا، یہاں آٹومیک انسائپر گن لگی ہے۔“

”کیا یہ خطرناک نہیں ہے یہاں بہت سے لوگ ہیں کوئی غلطی سے اتر جائے۔“

”تو مارا جائے گا۔“ کرنل نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ویسے سب کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے ایک شخص اپنی حماقت سے مارا گیا جو نقشے میں تھا اور لان پر نکل آیا تھا۔“

میں نے چاروں طرف دیکھا تو دوا انسائپر گنیں میری نظر میں آ گئیں۔ ایک اس عمارت پر سامنے کی طرف تھی جس میں ہم قید تھے اور دوسری اس عمارت کے اوپر تھی جس میں ڈیوڈ شا سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر ہم ایک تیسری عمارت میں پہنچے۔ یہ چھوٹی اور ایک منزلہ تھی۔ اس کے اوپر ترچھی سبز رنگ کی چھت تھی۔ اندر ایک کمرہ کمپیوٹرز اور اس کے متعلقہ آلات سے سجا ہوا تھا وہاں تین افراد موجود تھے اور یہ سب سفید فام تھے۔ کرنل نے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی یعنی وہ سب نچلے درجے کے لوگ تھے اسے دیکھتے ہی الارٹ ہو گئے۔ کرنل نے

ایک نوجوان سے پوچھا

”کارل.....“

”نقشہ تیار ہے سر۔“ اس نے کہا اور اپنے سامنے رکھے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا فوراً ہی میں انچ کے

ایل سی ڈی مانیٹر پر کنورٹریس کا قہری ڈی نقشہ نمودار ہوا۔ کرنل نے مرکزی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔
”اس کے اندر چلو۔“

کارل جو اے اسٹک استعمال کرنے لگا۔ کنورٹریس کی مرکزی عمارت ہو، ہوا ایسی ہی تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہوئے اور مختلف راہداریوں میں گھومنے لگی۔ کرنل نے میری طرف دیکھا۔ ”غالبا تمہیں اس نقشے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

”ہاں لیکن میں اسے آزمانا چاہوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کارل واپس داخلی دروازے پر آؤ۔“
کارل نے کرنل کی طرف دیکھا اور اس سے اشارہ پا کر میرے کہنے پر عمل کیا۔ میں اسے بتانے لگا کہ اسے کہاں جانا تھا میں راج کنور کے عشرت کدے کی طرف لے جا رہا تھا مگر جب عقبی راستے سے وہاں جانا چاہا تو نقشے میں دیوار آگئی۔ میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ”نقشہ مکمل نہیں ہے یہاں ایک دروازہ ہے جو ایک راہداری میں کھلتا ہے اور اس کے دونوں طرف پانچ پانچ کمرے ہیں۔“

”کمرے موجود ہیں۔“ کارل نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جیوں جو مینول نقشہ دیا گیا اس میں یہ دروازہ موجود نہیں ہے۔“

”دروازہ ہے تم اپنا نقشہ درست کر لو۔“ کارل نقشہ درست کرنے میں لگ گیا۔ میں نے کرنل سے پوچھا۔ ”تمہارے آدمی اس نقشے کو کیسے استعمال کریں گے؟“

”ان کے پاس ڈیجیٹل ڈیوائس ہوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے واکی ٹاکی نے ہپ دی کرنل نے واکی ٹاکی نکالا اور بشن دباتے ہوئے بولا۔ ”لیس.....؟ لے آؤ..... نمبر فور میں۔“ اس نے واکی ٹاکی رکھا اور میری طرف دیکھا۔ ”کنورٹریس والا آدمی آگیا ہے آؤ میرے ساتھ۔“

ہم ایک چھوٹے کمرے میں آئے یہاں ایک میز کے گرد کچھ کرسیاں تھیں۔ کرنل میز کے پیچھے بیٹھ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں نے کسی معمولی درجے کے ملازم کو توڑ لیا ہو گا وہ پیلس کے اندر کا احوال تو بیان کر سکتا تھا لیکن اس کے رازوں سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس معاملے میں کنور خاندان بہت محتاط تھا۔ انہوں نے آنے جانے کا خفیہ راستہ بس چند افراد تک محدود رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ پر دستک ہوئی اور ایک شخص کے پیچھے جو شخص نمودار ہوا اسے دیکھ کر میں حیران ہوا اور وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ پھر میں نے سنبھل کر کہا۔
”منشی دل جی.....“

”شہباز جی آپ.....؟“ اس نے مخصوص لہجے میں کہا۔

کرنل نے مجھے دیکھا۔ ”تم اسے جانتے ہو؟“

”بہت اچھی طرح..... تم لوگوں نے بالکل ٹھیک آدمی تلاش کیا ہے یہ گھر کے بھیدی سے بھی بڑھ کر کچھ ہے۔“

منشی اندر آیا اور مجھ سے ذرا دور والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ”مجھے بتایا نہیں تھا کہ شہباز جی بھی اس معاملے میں شامل ہیں۔“

”یہ اصل میں شہباز کا معاملہ ہے۔“ کرنل نے جلدی سے کہا۔ ”ہمیں وہاں سے ایک عورت کو نکالنا

ہے۔“

”عورت۔“ فشی دل جی چونکا۔

”کیا آپ یہ بات نہیں جانتے ہیں؟“

”نہیں مجھے اس کا علم نہیں تھا۔“ فشی دل جی سنبھل کر بولا۔ ”میں تو کنوروں سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔“

”حالانکہ تم خود بھی کنور ہو۔“

”کرل چونکا۔“ تم کنور خاندان سے ہو۔“

”اس کا مطلب ہے تم فشی دل جی کے بارے میں پوری طرح سے نہیں جانتے۔ یہ اس جاگیر کے

داروں میں سے ہیں۔“

”شامی یہ بات جانتے ہیں۔“ فشی دل جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”یعنی کرل جیمز کا جاننا اتنا ضروری نہیں ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ اس پر فشی دل جی نے ناگواری سے

مجھے دیکھا۔

”شہباز جی آپ غیر ضروری بات کر رہے ہیں۔“

”فشی جی آپ اس کا بغیر میں شامل ہوئے ہیں تو آپ کا کچھ مقصد تو ہوگا؟“

”میں کنوروں کو تباہ کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ

جھلی تھا وہ بہت ٹھنڈے انداز میں بات کرنے والا شخص تھا جس پر گریہ سکین کا لفظ بالکل فٹ آتا تھا میں نے کبھی

اسے اس انداز میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

”صرف تباہ کرنا چاہتے ہیں؟“ میرا لہجہ زیادہ معنی خیز ہو گیا۔

”اگر آپ کا اشارہ جاگیر کی طرف ہے تو وہ بعد میں مجھے ہی ملے گی۔“

”لیکن یہ بڑے اور راج کنور کی زندگی میں ممکن نہیں ہے پھر ان کی بنیادیں بھی زندہ ہیں۔“

”جلد دونوں کنور باقی نہیں رہیں گے۔“ فشی دل جی نے اپنی کٹاری مونچھوں کو تاذ دیا۔ ”دونوں بہنوں

کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی جاگیر سے دست بردار ہو چکی ہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”گو کیا آپ نے پہلے سے سوچ لیا ہے۔“

”شہباز جی وہ عورت کون ہے جسے آپ وہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔“

”آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ چونکا۔

”آپ بانو کی بات کر رہے ہیں۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ ”فشی جی میں نے ڈیوڈ شا سے ایک بات طے کر لی ہے بڑے کنور

اور اس کے خاندان کے لوگوں پر میرا اختیار ہوگا۔“

وہ پھر چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ان کی زندگی اور موت کے بارے میں فیصلے کا اختیار صرف مجھے ہوگا۔“

اس نے نفی سر ہلایا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اسی شرط پر تم لوگوں کے ساتھ ہوں کہ یہ دونوں بھائی زندہ نہ

رہیں ورنہ مجھے تم لوگوں سے کیا؟“

میں نے کرٹل کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو مسئلہ ہو گیا ہے اب اس کا کوئی حل نکالنا ہو گا۔“

اس نے شانے اچکائے۔ ”اس کا حل تو ڈیوڈ شاہی نکال سکتا ہے۔“

”اس سے بات کرو کیونکہ یہ طے ہوئے بغیر معاملہ آگے نہیں بڑھے گا۔“

کرٹل نے واکی ٹاکی پر ڈیوڈ شاہ سے رابطہ کیا۔ ”سر میں ہوں، دل جی اور مسٹر شہباز میں کچھ کنفلکٹ ہو گیا

ہے آپ سے بات کرنی ہے..... لیس سر۔“ اس نے واکی ٹاکی بند کیا۔ ”مسٹر شاہ خود آ رہا ہے۔“

دس منٹ ڈیوڈ شاہ اندر آیا تو کرٹل جیمز نے اس کے لیے اپنی نشست چھوڑ دی۔ ڈیوڈ شاہی سے ہاتھ نہیں

ملاتا تھا اس لیے اس نے دل جی کے ساتھ بھی ہاتھ نہیں ملایا اور بلا تہدید بولا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

میں نے نشی دل جی کو بولنے کا موقع دیا اور وہ پھٹ پڑا تھا۔ وہ بولتا رہا اور میں بے نیازی سے ہنسنے سے

سے کھیلتا رہا۔ ڈیوڈ شاہی پٹ چہرے کے ساتھ سن رہا تھا۔ جب نشی دل جی بات کر چکا تو اس نے کہا۔ ”اس میں

مسئلہ کیا ہے؟“

”شہباز جی کا کہنا ہے کہ بڑے کنور اور دوسرے لوگوں کا انجام اس کی مرضی سے ہو گا یعنی یہ چاہے تو انہیں

زندہ بھی چھوڑ سکتا ہے۔“

”اس میں بھی کوئی مسئلہ نہیں۔“

”مسئلہ کیسے نہیں ہے؟ وہ زندہ رہیں گے تو جاگیر میرے ہاتھ کیسے آئے گی؟“

ڈیوڈ شانے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز ملک..... کیا تم بڑے کنور اور راج کنور کو اپنے قبضے میں کرنا

چاہتے ہو؟“

میں نے انکار کیا۔ ”تیرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”یعنی وہ بعد میں مر جاتے ہیں تو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا؟“

میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔ ”ظاہر ہے بعد میں ان کے ساتھ کچھ ہوتا ہے تو میں اعتراض کرنے والا

کون ہوتا ہوں۔“

اب ڈیوڈ شانے نشی جی کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے تم مطمئن ہو گئے ہو گے۔ وہ اگر اس حملے میں بچ

گئے تو بعد میں مارے جائیں گے میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔“

نشی دل جی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں تھا وہ کچھ کہنے والا تھا کہ کرٹل جیمز نے کہا۔ ”اب

تمہیں مان جانا چاہیے۔ مسٹر ڈیوڈ شاہان کے پابند ہیں۔“

میں دل ہی دل میں مسکرایا میں جانتا تھا کہ وہ زبان کا کتنا پابند تھا اور مجھے ایک بار پھر شبہ ہونے لگا کہ نشی

دل جی اور ڈیوڈ شاہ کے گھ جوڑ کے پیچھے کوئی اور کہانی بھی تھی ورنہ ان لوگوں کو کنور پیلس پر حملے کے لیے کسی اندر

کے آدمی کی اتنی بھی ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال جو بھی تھا جلد سامنے آ جاتا۔ میں نے کرٹل کی طرف دیکھا۔ ”اب

ہمیں وقت ضائع کیے بغیر پلان پر کام شروع کر دینا چاہیے۔“

”میں تیار ہوں۔“ اس نے کہا تو ڈیوڈ شاہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے اب میری ضرورت نہیں ہے۔“

”میں سراب ہم سب دیکھ لیں گے۔“ کرئل نے کہا۔

ڈیوڈ شاپلا گیا اور کرئل واپس اپنی نشست پر آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”افراد ی قوت کیا ہے؟“

”میرے ساتھ ایک درجن تربیت یافتہ کماڈرز ہیں۔ وہ ہر ہتھیار اور آلے کے استعمال کے باہر ہیں۔ چھ

افراد فٹے کھان کے ساتھ ہیں۔“

”یہ ہوئے ہیں افراد اس میں تم اور فتح خان بھی شامل ہو۔ میں اور میرا ساتھی ہوئے۔ یہ ہوئے بائیس

افراد..... کیا اتنے لوگ کافی ہوں گے؟“

کرئل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دو درجن مقامی افراد بھی ہوں گے۔“

”ایکس آرمی مین؟“ میں نے پوچھا۔

کرئل ہچکچایا پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہ عام جرائم پیشہ ہیں مسٹر دل جی فراہم کرے گا۔“

میں نے انکار کیا۔ ”مقامی اور جرائم پیشہ لوگوں پر کسی صورت اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے کیا تمہیں معلوم ہے

کنور ہیلز کے گارڈز کی تعداد ڈیڑھ سو ہے جن میں پچاس انتہائی تربیت یافتہ اور خطرناک گورکھے بھی ہیں۔ ان

سے ٹھنڈا آسان نہیں ہوگا۔“

”مزید تربیت یافتہ افراد کا بندوبست کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں وقت لگے گا۔“

”کتنا وقت لگے گا اور ناکام حملے کی نسبت ذرا دیر سے سبھی لیکن ایسا حملہ کیا جائے جس کی کامیابی کا زیادہ

امکان ہو۔“

”ایسا کرو پاکستان سے منگوا لو۔“ کہتے ہوئے فشی دل جی کے لہجے میں زہر آ گیا تھا۔

”اگر ممکن ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا اور تم لوگوں کو دکھا بھی دیتا لیکن میں اس جہنم میں مزید اپنے کسی ساتھی کو

دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا تو فشی دل جی کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

”پلیز۔“ کرئل نے ہاتھ اوپر کیا۔ ”موضوع سے نہ بھگیں۔“

”کرئل تم کتنے دن میں مزید اتنے ہی آدمیوں کا بندوبست کر سکتے ہو؟“

”تین دن لگ سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرے کچھ آدمی سنگاپور میں ہیں وہ یہاں آ سکتے ہیں۔“

”کتنے ہیں؟“

”سات افراد ہیں اور سب تربیت یافتہ ہیں۔ اسی طرح چھ افراد یوکرائن میں ہیں وہ بھی دو دن میں آ سکتے

ہیں۔“

”بس تو ان کو بلا لو۔“ میں نے کہا۔ ”پینتیس افراد ٹھیک ہیں ہم کوئی مقامی فرد اندر کی کارروائی کے لیے

استعمال نہیں کریں۔ ان سے صرف باہر کام لیا جائے گا۔“

”وہ اندر بھی ہوں گے۔“ فشی دل جی نے کہا۔

”کوئی مقامی آدمی اندر نہیں جائے گا وہ صرف کور دیں گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

کرئل نے سر ہلایا۔ ”اوکے..... باہر کا کوئی آدمی اندر کارروائی میں حصہ نہیں لے گا۔“

”نشی دل جی نے تیر لہجے میں کہا۔“ کرل تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

”میں کر سکتا ہوں میں اس مشن کا انچارج ہوں۔“ وہ غرایا۔

نشی دل جی خاموش ہو گیا لیکن اس کے چہرے سے کبیدگی ٹپک رہی تھی۔ کرل نے میری طرف دیکھا۔

”مسٹر شہباز..... اس جگہ دو طریقے سے ایک ممکن ہے۔ ایک نفاذ سے اور دوسرا زمین سے۔“

”ہمیں دونوں طریقوں سے کام لینا ہوگا۔“

”اس کے لیے ہمیں ہیلی کاپٹر درکار ہوگا۔“

”صرف ہیلی کاپٹر نہیں کم سے کم دو سے تین آرمرڈ ویپل بھی ہوں۔ جو پارٹی دروازے سے گھسے گی

اسے صرف آرمرڈ کار ہی بچا سکتی ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

کرل نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”مسٹر شہباز تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے؟“

”نہیں یہ تمہارا کام ہے۔“ میں نے انکار کیا حالانکہ میرے ذہن میں ایک منصوبہ واضح ہو رہا تھا مگر میں

نشی دل جی کے سامنے اس پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کنور خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور میں اس پر کسی صورت

اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی جو منصوبہ تھا وہ بہت خام سا تھا میں اس پر دسم سے بات کرنا چاہتا تھا اگر کرل

اکیلے میں ملتا تو اس سے بھی بات کر لیتا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ”تم اپنے آدمیوں کو بلالو۔ جتھیا تو تمہارے پاس

ہوں گے اس مقصد کے لیے ہیلی کاپٹر اور بکتر بند کا بھی بندوبست کرنا تمہارے لیے یا ڈیوڈ شا کے لیے مشکل نہیں

ہوگا۔“

”سب ہے ہاں ان چیزوں کا بندوبست کرنا پڑے گا لیکن ہو جائے گا۔“

”جب ہو جائے تب مجھے بتانا۔“ میں اس کے دفتر اور پھر اس عمارت سے نکل آیا۔ روشوں سے ہوتا ہوا

میں واپس اسی عمارت میں آ گیا۔ راستے میں کسی نے مجھے روکنے یا گمرانی کے لیے میرے ساتھ ہونے کی کوشش

نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ شا کی طرف سے مجھے اتنی چھوٹ دی گئی تھی البتہ اتنا مجھے یقین تھا کہ کسی اور

ذریعے سے میری گمرانی کا عمل جاری ہوگا۔ مجھے بالکل ہی چھوٹ نہیں دی جا سکتی تھی۔ سات بجے سورج ڈوبنے

والا تھا اور شام کی خنکی آسمان سے اتر رہی تھی۔ بیڑ میرا منتظر تھا اس نے ٹھکڑہ کیا۔

”شبوئی آپ کہاں چلا جاتا ہے؟“

”کرل مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔“ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”تم کیا کر رہے تھے۔“

”ہم ٹی وی دیکھ رہا تھا اور پور ہو رہا تھا۔“

”کچھ دیر بعد ڈنر ہے اور تمہاری ساری بوریت دور ہو جائے گی۔“

ساڑھے سات بجے دروازے پر دستک ہوئی میں خیال تھا پوجا ہو گی لیکن وہ کرل تھا۔ وہ اندر نہیں آیا

دروازے سے بولا۔ ”شہباز میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔“

”اندر ہی آ جاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ اندر آ گیا۔ ”بیٹھو۔“

کرل نے اپنا بیک میز پر رکھا اور بیڑ کو دیکھا پھر مجھ سے کہا۔ ”تمہارا ساتھی مقامی ہے؟“

”ہاں اس کا تعلق اعلیٰ علاقے سے ہے لیکن یہ میرا ساتھی ہے تم اسے میرے جیسا سمجھ سکتے ہو۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”اب ہم بات کریں گے..... مجھے یقین ہے تم دل جی کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔“

”یہ درست ہے وہ ناقابل اعتماد شخص ہے۔ کم سے کم میں اس شخص پر اعتماد نہیں کر سکتا اور تمہیں بھی یہی مشورہ ہے اس سے یوں ہوشیار جیسے آدمی کو برا سا نپ سے ہوشیار ہوتا ہے۔“

”تم فکر مت کرو وہ ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا ہے۔“ کرٹل نے اعتماد سے کہا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے..... اب ہم بات کرتے ہیں۔“

”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

”دیکھو میں اس چیز کا ماہر نہیں ہوں لیکن میں نے کچھ عرصے میدان جنگ میں گزارا ہے۔“

”تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر شا کے پاس تمہاری فائل ہے جس میں تمہارے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔“

”ہمیں بیک وقت فضا اور زمین دونوں سے کارروائی کرنا ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”اپنا نقشہ نکالو۔“

کرٹل نے پلاسٹک نقشہ نکال کر میز پر بچھا دیا۔ میں نے اصل پیلس کی عمارت کے آس پاس کی تمام عمارتوں کو نشان زدہ کیا۔ ”ہمیں باہر سے انہیں نشانہ بنانا ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“

”راکت یا چھوٹے گائیڈڈ میزائلوں کی مدد سے۔“

کرٹل نے سر ہلایا اس کا مطلب تھا کہ وہ گائیڈڈ میزائل فراہم کر سکتا تھا۔ ”ٹھیک ہے آگے کہو.....“

”اس کے ساتھ مختلف جگہوں پر دھوئیں کے گولے پھینکے جائیں گے۔“

”میں سمجھ گیا آگے چلو.....“

اس کے بعد چار سے پانچ اسائپر دور مار رائفٹوں سے باہر آنے والے گارڈز کو نشانہ بنانا شروع کریں۔ مارنے کے بجائے کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ گارڈز نا کارہ ہو جائیں۔“

”عمارتوں کو براہ راست نشانہ بنانا ہوگا۔“

”نہیں کیونکہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مطلوبہ عورت کسی اور عمارت میں نہ ہو اسے نقصان نہیں ہونا چاہیے۔“

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اس لیے براہ راست کسی عمارت کو نشانہ نہ بنایا جائے کوشش کی جائے ان کے داخلی حصوں کو نشانہ بنایا جائے۔“

”ٹھیک ہے اندرونیوں کو اندر محصور کر دیا جائے اور باہر والوں کو نشانہ بنایا جائے؟“

”بالکل ایسا ہی ہو۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تین باتیں طے ہیں۔ اول عمارتوں کو نشانہ بنانا، دوسرے دھواں پھیلانا اور تیسرے باہر موجود گارڈز کو نشانہ بنانا۔“

”یہ تینوں باتیں میرے ذہن میں بھی تھیں۔ اب ہم آتے ہیں ہیلی کاپٹر اور آرمرڈ ویہیکلو کے استعمال پر۔“

”نہیں ایک حصہ باقی ہے۔ پانچ اسائپر اپنا کام مستقل جاری رکھیں گے وہ جتنے زیادہ گارڈز گرائیں گے

اندر جانے والوں کو اتنی کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے اندر جانے والوں کا حلیہ ایسا ہونا چاہیے کہ اسنا پٹر کی صورت دھوکا نہ کھائیں۔“

”گڈ یہ اچھا آئیڈیا ہے۔“ کرٹل نے سر ہلایا۔ ”لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک کام اور کرنا ہوگا۔ پبلز کا باقی دنیا سے رابطہ کاٹنا ہوگا۔ پبلز میں لائن فون کے علاوہ موبائل فون اور وائرلیس انٹرنیٹ اور سیٹلائٹ فونز کی موجودگی عین ممکن ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہم لائنیں کاٹیں گے اس کے بعد موبائل ٹاور اڑا دیں گے۔ آخر میں ایک جاسر کی مدد سے ہر قسم کی ریڈیائی لہروں کو ناکارہ کر دیں گے۔“

”یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی۔ لیکن کیا تمہارے پاس مطلوبہ صلاحیت موجود ہے؟“

”بالکل..... جو ہیلی کاپٹر وہاں جائے گا اس میں ریڈیو جامنگ کی صلاحیت بھی ہے۔“

”گڈ وہ پولیس یا انتظامیہ سے مدد نہیں لے سکیں گے۔“

”اس کے بعد ہم پبلز میں داخل ہوں گے۔ پہلے آرمرڈ کاریں اندر جائیں گی ان میں آدی بھی ہوں گے۔ ان کے اوپر بھاری مشین گنیں لگی ہوں گی جو راستہ صاف کرنے میں معاون ہوں گی۔“

مجھے خیال آیا۔ ”تمہارے پاس جو خود کھلا اسنا پٹر گنیں ہیں کیا وہ آرمرڈ کاروں پر نہیں لگ سکتیں؟“

کرٹل سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”میں معلوم کرتا ہوں شاید ہو سکتا ہے۔ اس طرح کسی کی جان خطرے میں نہیں پڑے گی۔“

”دوسرے اس میں اسنا پٹر داخل ہے کیا اس میں مشین گن لگ سکتی ہے۔ تیسری بات کیا اسے دور سے ریوٹ کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔“

”میں معلوم کرتا ہوں۔“

”ان کے اندر گھسنے کی صورت میں یہ مرکزی عمارت کے آس پاس کا علاقہ کلیئر کریں گے تاکہ ہیلی کاپٹر سے اس پر دوسرا دستہ اتر سکے۔“

کرٹل سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”بہ ظاہر یہ بہت اچھا منصوبہ لگ رہا ہے۔ مگر اس کو ریٹائن کی ضرورت ہے۔“

”بالکل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کنور پبلز کے آس پاس کے پہاڑ اچھی طرح دیکھے ہیں۔ اس کے بائیں طرف اور سامنے پہاڑ پر کئی ایسی جگہیں ہیں جہاں آسانی سے مورچہ لگایا جاسکتا ہے ان جگہوں سے تقریباً پورا پبلز نظر آتا ہے اور ریج بھی ایک کلومیٹر کے اندر ہے۔“

”میزائلوں یا رائیٹوں کا مسئلہ نہیں ہے لیکن ٹارنل اسنا پٹر رائفوں کے لیے یہ فاصلہ زیادہ ہے ایسی رائفیں ایک کلومیٹر کے اندر کام کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ دور تک کام کرنے والے گن بھاری ہوتی ہے اور اسے چلانے کا ماہر بھی الگ ہوتا ہے۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بائیں طرف اور فرنٹ سے بھی فاصلہ زیادہ سے زیادہ آٹھ سو میٹر ہو

گا۔“

”اتنی ریج ٹھیک ہے۔“

مجھے ایک خیال اور آیا۔ ”پیس میں ایک ہیلی کاپٹر بھی ہے اسے سب سے پہلے تباہ کرنا ہوگا ورنہ یمن ممکن ہے بڑا کنوراں عورت کو لے کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے۔ عورت کی ہیلی کاپٹر میں موجودگی کی صورت میں ہم اسے تباہ بھی نہیں کر سکیں گے۔“

کرل نے سر ہلایا۔ ”بات کلیئر ہو رہی ہے۔ واپسی کا کیا ہوگا؟“
 ”میں ہیلی کاپٹر سے جاؤں گا اور عورت ہمارے ساتھ واپس آئے گی۔ میرے ساتھ چھ افراد ہوں گے۔ ہیلی کاپٹر اتنا بڑا ہو کہ یہ تمام افراد اس میں آسکیں۔“
 ”ہیلی کاپٹر اتنا ہی بڑا ہے۔“ کرل نے سر ہلایا۔ ”باقی پارٹی جس طرح جائے گی اسی طرح واپس آجائے گی۔“

”اس میں خطرہ ہوگا راستے میں انہیں روکا جاسکتا ہے۔“
 اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دونوں آرمڈ کاریں دو کنٹینروں میں جائیں گی اور پیس کے قریب انہیں اتار دیا جائے گا۔ واپسی بھی اسی طرح ہوگی۔ کنٹینرز تیل ہوں گے اور بلا وچ کوئی چپک نہیں کرے گا۔“
 کرل جیمز جی پلان کو واضح کر رہا تھا۔ کچھ باتیں اور قصیں لیکن ابھی میں نے ان پر بات نہیں کی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ مارے جانے یا شدید زخمی ہونے والوں کا کیا کرنا تھا کیونکہ انہیں پیچھے چھوڑ کر آنے کا مطلب تھا کہ پولیس یا ایجنسیوں کو اپنا نشان دینا۔ کرل میرے پاس سے روانہ ہوا تو میں مطمئن تھا اگر پلان پر ٹھیک سے عمل ہوتا تو سادی کو پیس سے حفاظت لگانا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ ابھی کرل نے فشی دل جی سے پیس کے اندر کے حفاظتی انتظامات کا معلوم کرنا تھا۔ یہ اس کا کام تھا اور میں نے سوچا تھا کہ اس میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں تھی۔ بیٹہ میری اور کرل کی مٹھکوں رہا تھا اس کے جاتے ہی اس نے سوال کیا۔ ”شوبی ہم بھی جائے گا؟“
 ”اب امکان ہے کیونکہ حرید تین دن لگ سکتے ہیں۔ کرل کے کچھ آدمی بیرون ملک سے آرہے ہیں۔“
 ”شوبی اگر ہم شامل ہوا اور کامیاب رہا تو راج کنورا اور بڑے کنورا کو ہمارے حوالے کرنا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”وہ تمہارے محرم ہیں اور میرے ذہن میں بھی یہی بات ہے لیکن یہاں ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ میں نے اسے فشی دل جی کے بارے میں بتایا۔ ”یہ شخص کنورا خاندان سے ہے اور کسی طرح بڑے کنورا یا راج کنورا سے کم خطرناک نہیں ہے۔ جاگیر پر قبضے کے لیے وہ ان دونوں بھائیوں کا خاتمہ چاہتا ہے۔“
 بیٹہ نے غور کیا۔ ”شوبی ہم کو اس سے کیا؟ ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے۔ سادی کو نکالنا ہے اور ان دونوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔“

”تم اس شخص کو نہیں جانتے جب یہ ان کی جگہ لے گا تو یہ ہمارے لیے اتنا ہی خطرناک ہو جائے گا کیونکہ اسے دولت اور اختیارات مل جائیں گے۔ کنوروں کی دو بینیں بھی ہیں اور وہ ان کے درپے ہو جائے گا۔“ میں نے ایک ہمارے پاس ہوگی۔“

اب بیٹہ کی سمجھ میں آ گیا اس نے میری طرف دیکھا۔ ”آپ ٹھیک کہتا ہے یہ تو بہت ڈنجرس ہے اس کا کچھ کرنا پڑے گا۔“

”ابھی ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ڈیوڈ شا کے ساتھ ہے اور اس مشن کی حد تک وہ ہمارا

ساتھی بھی ہے۔“

بیٹو مزید کچھ کہتا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ میں نے موضوع بدل دیا تھا۔ ”اسے بعد میں دیکھیں گے ابھی تو میں چاہتا ہوں تمہارا معائنہ ہو جائے۔“

”کیسا معائنہ؟“

”زخم کا۔“ میں نے کہا۔ پوچھا کو طلب کیا اور اسے بیٹو کے زخم کا معائنہ کرانے کو کہا وہ بیٹو کو لے کر چلی گئی۔ میں مشن کے بارے میں سوچ بچار میں لگ گیا۔ اپنے ذہن میں منصوبے کو بار بار چیک کر رہا تھا۔ ایسا کرنا بہت ضروری تھا کیونکہ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں سادی کو حاصل کرنے میں ناکام رہتا تو پھر یہ کام بہت ہی مشکل ہو جاتا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ حملے میں سادی کو نقصان نہ ہو۔ اگرچہ نانوے فیصد امکان تھا کہ وہ مرکزی عمارت میں ہوگی لیکن ایک فیصد امکان یہ بھی تھا کہ اسے کسی اور عمارت میں رکھا گیا ہو۔ اگرچہ کرنل سے طے ہو گیا تھا کہ عمارتوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جائے گا مگر جب میزائل اور راکٹ چلتے ہیں تو اپنے پرانے کی پروا کہاں کرتے ہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ دسم سے مشورہ کر لوں۔ میں نے اسکا پ آں کیا مگر ان میں سے کوئی آں لائن نہیں تھا اس لیے پہلے عبداللہ کو کال کی اور پھر وہ آں لائن آیا۔

”دسم کہاں ہے؟“

”کوٹھی میں ہی ہے میں اسے بلاتا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا اور چلا گیا چند منٹ بعد وہ دسم اور سفیر دونوں کے ساتھ آیا۔ میں نے ان کے سامنے صورت حال اور اپنے خدشات رکھے تھے۔ دسم نے سر ہلایا۔

”یہ خطرہ تو ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟“

”ایک کام ہو سکتا ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”ہمارے پاس کنورٹبلز کے نمبرز ہیں ہم سادی سے بات کر سکتے

ہیں۔“

”بشرطیکہ بڑے کنور نے اجازت دی۔“ دسم بولا۔

”اس کا باپ بھی اجازت دے گا۔“ سفیر بولا۔ ”وہ شہباز کے لیے مراجارہا ہے۔“

”فحیک ہے بات کر کے دیکھو لیکن بہت ہوشیاری سے کال سنی جا رہی ہوگی اور سننے والوں کو کوئی شک نہ

ہو۔“

”ہم بچے نہیں ہیں یار۔“ سفیر نے کہا۔ ”آں لائن رو۔“

کال سفیر نے کی۔ اس نے اپنے موبائل کی ریکارڈنگ اور اسپیکر آں کر لیے تھے۔ چند ہیلز کے بعد کسی

نے کال ریسیو کی اور بولا۔ ”دس از کنورٹبلز ہو رہی؟“

”بڑے کنور سے بات کراؤ۔“ سفیر نے کہا۔ ”اسے کہو پاکستان سے فون ہے۔“

ایک منٹ سے بھی پہلے بڑا کنور لائن پر تھا۔ ”شہباز..... تم شہباز ہو؟“

”نہیں میں اس کا دوست ہوں۔“ سفیر نے نام بتانے سے گریز کیا۔

”شہباز کہاں ہے؟“ بڑا کنور اب ذرا سرد لہجے میں بولا اور نہ پہلے وہ مہترہ تھا۔ ”اس سے کہو مجھ سے

رابطہ کرے۔“

”وہ وہیں ہے اور کہاں ہے اس سے ہم بھی لاعلم ہیں سرحد پار کرنے کے بعد سے اس سے صرف ایک بار رابطہ ہوا ہے اور پھر وہ غائب ہے۔ ہمیں شک ہے وہ تمہارے ہاتھ لگ گیا ہے۔“

”نہیں وہ میرے پاس نہیں ہے۔“

”لیکن سعد یہ تو تمہارے پاس ہے۔“

”ہاں وہ میرے پاس ہے اگر شبہاز ہوتا تب بھی مجھے بتانے میں کوئی تاثر نہ ہوتا لیکن وہ نہیں ہے۔“
”تم نے کہا تھا کہ جب سعد یہ تمہارے پاس آئے گی تو تم ہم سے بات کراؤ گے لیکن تم نے اب تک وعدہ پورا نہیں کیا ہے۔“

”تم میں سے کسی نے رابطہ نہیں کیا۔“ بڑے کنور نے ہوشیاری دکھائی تو سفیر نے تلخ لہجے میں کہا۔
”جھوٹ مت بولو، کیا سعد یہ کے پاس ہمارے نمبر نہیں ہیں اور کیا اس نے تم سے نہیں کہا ہوگا لیکن تم نے بات نہیں کرائی۔“

بڑا کنور کچھ دیر کے لیے چپ ہوا تھا پھر اس نے کہا۔ ”میں نے اپنی خوشی سے یہ سب نہیں کیا ہے۔“
”میں سعد یہ سے بات کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کی فکر ہے۔“

”کیا اس کا شوہر پاس ہے؟“

سفیر نے دسیم کو اشارہ کیا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ سفیر نے کہا۔ ”نہیں وہ پاس نہیں ہے میں اس کا بھائی ہوں اس لحاظ سے سعد یہ میری بھابی ہوئی۔“

”ٹھیک ہے میں تمہاری بات کراتا ہوں۔“ بڑے کنور نے خلاف توقع زیادہ جھٹ نہیں کی تھی اور وہ مان گیا تھا چند منٹ بعد سادی لائن پر تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے کمزوری آواز میں کہا تو دسیم کے چہرے پر زلزلے جیسے تاثرات نمودار ہوئے تھے اور وہ ایک دم اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ عبد اللہ اس کے پیچھے گیا تھا۔ سفیر بھی تڑپ گیا تھا۔

”سادی میں ہوں۔“

”سفیر بھائی۔“ وہ رونے لگی۔ ”آپ لوگ کہاں ہیں میں آپ سے بہت دور ہوں، دسیم کہاں ہے؟“
”وہ گھر میں نہیں ہے۔“ سفیر نے اپنا جھوٹ بھایا۔ ”تم ٹھیک ہونا۔۔۔۔۔ سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ہم جلد تمہیں واپس لے آئیں گے۔“

”میں ٹھیک ہوں مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ وہ بولی مگر اس کی سسکیاں جاری تھیں اور وہ میرے دل پر گرم قطروں کی طرح سلگ رہی تھیں۔

”روست گڑیا۔۔۔۔۔ تم ہماری بہن ہو۔۔۔۔۔ ہمارا مان ہو۔۔۔۔۔ آنسو تمہیں زیب نہیں دیتے ہیں۔“

”سفیر بھائی یہاں آنے کے بعد یہ میرے پہلے آنسو ہیں جو آپ کی آوازیں کر نکل آئے ورنہ مجھے خود بھی کسی کے سامنے رونا اچھا نہیں لگتا ہے۔ شونی کہاں ہیں؟“

”وہ وہیں ہے تمہارے غائب ہونے کا سن کر وہ واپس چلا گیا تھا۔“

سادی پریشان ہو گئی۔ ”کیا شونی جا کر واپس آگئے ہیں۔۔۔۔۔ کیوں آئے ہیں؟ یہاں ان کے لیے بہت

خطرہ ہے..... ان سے کہیں وہ فوراً واپس جائیں۔“

”وہ تمہیں لیے بغیر واپس نہیں آئے گا ہم میں سے کسی کو چین نہیں آئے گا۔“

”نہیں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں میرے لیے کوئی خود کو خطرے میں نہ ڈالے۔“

”امتحانہ باتیں مت کرو۔“ سفیر نے اسے ڈانٹا۔ ”تم ہماری عزت بھی ہو اور ہم تمہیں کہیں نہیں چھوڑ سکتے

چاہے وہ تمہارے بھائی کا گھر کیوں نہ ہو۔“

”سنی بھائی سمجھنے کی کوشش کریں یہاں کوئی نہیں ٹھس سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے لیے کسی کی جان

خطرے میں پڑے۔“

”تم ٹھکرت کرو۔“ سفیر نے موضوع بدل دیا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم ٹھیک ہونا..... تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک

تو نہیں ہوا ہے تمہیں کسی جگہ قید تو نہیں کیا ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں یہاں میرا بہت خیال رکھا جا رہا ہے صرف میرے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر بلوائی گئی ہے وہ

میرا خیال رکھتی ہے۔ میں قید نہیں ہوں میں اسی کمرے میں ہوں جو کبھی میرا ہوتا تھا۔“

میں نے دل ہی دل میں سفیر کو خراج تحسین پیش کیا۔ وہ بالکل درست انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس نے

منا کسی شک کے سادی سے اگلا لیا تھا کہ وہ مرکزی پبلکس میں تھی اور اب ہمارا کام آسان ہو گیا تھا۔ سفیر نے کچھ

دیر اس سے اور بات کی۔ سادی نے کہا کہ اس کے کمرے میں بھی فون ہے اور وہ ویم سے بات کرنا چاہتی تھی۔

سفیر نے وعدہ کیا کہ وہ جلد اس سے بات کرائے گا۔ اس نے کال ختم کی تو وہ اداں تھا۔ اس دوران میں ویم اور

عبداللہ آگئے تھے۔ ویم نے سفیر کی بات سن کر کہا۔ ”میں اس سے بات نہیں کروں گا ورنہ بڑے کنور کو دباؤ ڈالنے

کا ایک موقع مل جائے گا۔“

”یار اس نے دباؤ شوبی پڑا لیا ہے اس کا خون چاہیے اور تیرے خون میں دیسے ہی فساد ہے۔“

مگر ویم سنجیدہ رہا تھا۔ ”تم ان معاملات کو نہیں سمجھو گے۔ یہ ٹیکلوجی سادی مبر کر رہی ہے۔ مجھ سے بات

کر کے اس کا حوصلہ جواب دے گیا تو ہم سب کے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے اسے کوئی خطرہ

ہو تو شہباز صاحب خود بڑے کنور کے سامنے چلے جائیں گے۔“

”میرا خیال ہے ویم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سادی کی بہادری ہم سے ہے اگر وہ کمزور ہوتی تو ہم کمزور ہو

جائیں گے۔ اس نے خود کہا کہ وہ اب تک روٹی نہیں تھی سفیر کی آواز سن کر روٹی ہے۔“ میں نے ویم کی تائید کی۔

”ابھی اسے چھیڑنے سے گریز کرنا چاہیے۔“

”اور جو میں نے وعدہ کیا ہے۔“ سفیر نے یاد دلایا۔ ”وہ واپس آ کر مجھے معاف کرے گی۔“

”کوئی بات نہیں ٹو پہلے ہی خواتین سے سننے کا عادی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ٹو نے وقت کی قید نہیں

لگائی تھی اور نہ ہی قسم کھائی ہے جس کا کفارہ ادا کرنا پڑے۔“

میں بات کر رہا تھا کہ بیٹو آگیا اور وہ بہت خوش تھا۔ اس نے آتے ہی بتایا۔ ”شوبی ہمارا زخم اندر سے بھی

بھر گیا ہے بس تھوڑا کسر رہ گیا ہے ڈاکٹر کہہ رہا تھا دو دن میں وہ بھی پورا ہو جائے گا۔“

”لیکن جو غلط تمہارے دماغ میں ہے وہ کبھی پر نہیں ہوگا۔“ سفیر نے پنگا لیا مگر بیٹو ہنستا رہا۔

”آج آپ بول لو..... ہم برا نہیں مانے گا۔ ہو سکتا ہے پھر آپ کو موقع نہ ملے۔“
 ”بیٹا اتنی جلدی تمہاری جان چھوڑنے کا ارادہ نہیں ہے۔“ سفیر نے کہا۔ بیٹو کو پتا چلا کہ سادی سے بات
 ہوئی ہے تو وہ بے تاب ہو گیا۔

”ہم کو کیوں نہیں بتایا ہم بھی بات کرتا۔“
 ”لو بات کر دی نا احمقانہ۔“ سفیر نے کہا۔ ”بھائی میں نے پاکستان سے بات کی ہے تم کہاں سے بات
 کرتے اور کرتے تو کچھ دیر بعد کتوروں کے گرگے یا پولیس والے آکر تمہیں لے جاتے۔“
 ”پہلے ہم زخمی تھا پر اب ہم ٹھیک ہے۔“ بیٹو نے سینہ تان کر کہا۔ ”کوئی مائی کالا ہم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔“
 وسم خاموش بیٹھا تھا اس کے چہرے پر ٹھکرتا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”پریشان کیوں ہوتا ہے یا اللہ
 نے چاہا تو سب ٹھیک ہو گا سادی تیرے پاس ہوگی۔“
 وہ سنہیل گیا۔ ”میں پریشان نہیں ہوں۔“

”مجھے جو خطرہ تھا وہ اب نہیں ہے اور میں خود اس دستے کی کمانڈ کروں گا جو مرکزی عمارت میں گھسے گا۔
 پلان تقریباً مکمل ہے بس نوک پلک درست کرنا باقی رہ گیا ہے۔“
 ”اب مجھے اطمینان ہے۔“ وسم نے کہا۔ ”یہ اچھی بات ہے کہ اس کی لوکیشن کا علم ہو گیا ہے اب ہم مکمل کر
 کارروائی کر سکتے ہیں۔“

”نہیں ہم اس معاملے میں پوائنٹ دن پر سب کا رسک بھی نہیں لے سکتے، کیونکہ ابھی حملے میں بہت
 دن ہیں اور کچھ پتا نہیں ہے بڑا کنور سادی کو کب کہاں منتقل کر دے ہمیں بہت زیادہ جاہی پھیلانے سے بچنا ہو
 گا۔“ میں نے کہا۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“
 ”دو تین دن بعد کا مطلب ہے کرنی الحال کرنے کو کچھ نہیں ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”اتنے دن تو کیا کرے
 گا؟“

”ہم عیش کرے گا۔“ بیٹو نے جواب دیا۔ ”اور آپ چلے گا۔“
 ”بیٹے یہاں ایک ماہر کلک خاتون آگئی ہے اور آج کل ہم تینوں وقت گھر کا کھانا کھا رہے ہیں۔“ سفیر بولا۔
 ”مرشد کی طرف سے کوئی آپ ڈیٹ ہوئی ہے؟“
 ”نہیں..... لیکن وہ اندرون خانہ ہمارے خلاف کچھ کر رہا ہے تو اس کی خبر نہیں ہے۔“ وسم نے کہا۔
 ”وہ کتنے کی ذمہ ہے اتنی آسانی سے سیدھا نہیں ہوگا۔“
 ”اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ سادی کے واپس آتے ہی وسم، سفیر، سادی اور مونٹا واپس دعویٰ جائیں
 گے۔“

”ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“
 ”یار میں بھی آؤں گا۔“ میں نے کہا۔
 ”اور مجھے چھوڑ جائیں گے۔“ عبداللہ بولا۔

”نہیں تم بھی ہمارے ساتھ ہی ہو گے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جب تک ہمیں یقین نہیں ہو جائے گا کہ مرشد کے شر سے محفوظ ہو گئے ہیں تب تک ہمیں اس سے دور رہنا ہوگا۔ ملک میں ہم صرف چھپ کر بچ سکتے ہیں اور ظاہر ہے کوئی ساری عمر نہیں چھپ سکتا ہے۔“

”ویسے دینی اور باقی یو اے ای کو پاکستان ہی سمجھو وہاں ہر دوسرا بندہ پاکستانی ملتا ہے اور قارن کے مزے الگ ہیں۔“ سفیر نے کہا۔ ”دینی تو سمجھ لو یورپ کا ملک لگتا ہے اگر مومن نظر انداز کر دو۔“

”موسم بھی بنایا ہوا ہے ہر جگہ اسی ہے۔“ وسیم نے تائید کی۔ ”سارا سال کبل لے کر سونا پڑتا ہے۔“

”تیرا خیال نہ ہوتا تو آج وہیں مزے سے رہ رہے ہوتے۔“ سفیر نے سرد آہ بھری۔

”اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم چاروں وہیں رہو گے۔ باقی بھی موقع پا کر وہاں آجائیں گے۔ میں اپنے کسی ساتھی کو پیچھے نہیں چھوڑوں گا۔“

”جل پہلے سادی آجائے پھر دیکھتے ہیں۔“ سفیر نے کہا۔ ”ویسے اس کا پاکستانی پاسپورٹ بن گیا ہے۔“

”ڈیوڈ شامان گیا؟“ وسیم نے پوچھا۔

”ہاں تم اور عبد اللہ میرے ساتھ ہو گے۔ مگر وہ مزید کسی اور کو لے جانے کو تیار نہیں ہے۔ بیٹو بھی ہے۔“

”چار افراد بھی کافی ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن ہم وہاں کیسے پہنچیں گے؟“

”یہ بھی ڈیوڈ شاکی ذمے داری ہوگی اس مہم کی شروع سے آخر تک ذمے داری اسی کی ہے۔“

”اس طرح تو ہم اس کے رحم و کرم پر آجائیں گے۔“

”اتنی آسانی سے نہیں۔“ وسیم نے عبد اللہ کا اعتراض رد کر دیا۔ ”ابھی ہمارے پاس وقت ہے اور ہم اس معاملے میں مزید سوچ بچار کر سکتے ہیں۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔ بیٹو نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ پوچھا اندر آئی۔ ”سر آپ ڈنر کمرے میں کریں گے یا ڈائننگ روم میں؟“

پوچھا کی مراد یقیناً اس عمارت کے ڈائننگ روم سے تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ شاکی آج رات میزبان کا کردار ادا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اور شاید اسے ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ مجھے رضامند کر چکا تھا۔ میں نے پوچھا سے کہا۔ ”یہیں لے آؤ۔“

”سر ڈنر کتنے بجے پسند کریں گے؟“

ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اس لیے میں نے نوبے کا کہہ دیا اس طرح مجھے مزید گفتگو کے لیے وقت مل جاتا۔ پوچھا رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد سفیر نے رشک سے کہا۔ ”کیا ٹھٹھ ہیں تیرے کتنے سریلے لہجے میں پوچھ رہی تھی اتنی تابعدار تو آج کل کی بیویاں بھی نہیں ہوتی ہیں۔“

”ہاں کیونکہ تابعداری کا کام زن مرید شوہروں سے سنبھال لیا ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”ویسے اس کے سریلے لہجے پر مت جاؤ..... خطرناک چیز ہے۔“ میں نے بیٹو کو قابو کرنے والا واقعہ سنایا۔ اس پر ان سب کو ایک نیا موضوع مل گیا اور بیٹو کی شامت آگئی۔ جب وہ حد سے بڑھنے لگے تو بیٹو نے غصے میں آکر لیپ ٹاپ بند کر دیا اور مجھ سے کہا۔

”اچھا ہے یہ لوگ یہاں نہیں ہے ورنہ ہر وقت ہٹا راد دل جلاتا۔“
 ”تم توجہ کیوں دیتے ہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ابھی تو میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم نے اس سے بدلہ کیسے لیا؟“

آدھے گھنٹے بعد پوجا بڑی سی ٹرائی کے ساتھ نمودار ہوئی اس کی تین منزلوں پر کئی طرح کی ڈشیں بھی تھیں۔ کیونکہ صوفوں کے ساتھ رکھی میر مختصر تھی اور اس پر ساری ڈشیں نہیں ساسکتی تھیں اس لیے پوجا وہیں رہی اور ہم سے پوچھ کر سرد کرنا شروع کر دیا۔ شام کو اچھی خاصی ریفریجیٹڈ لی تھی اس کے باوجود پھر بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے اور بیٹو نے تمام ڈشوں کے ساتھ انصاف کیا۔ آخر میں بیٹھے سے کھانے کا خاتمہ کیا اور فو اکہات میں چائے اور گرین ٹی کا کھا تھا۔ پوجا برتن ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے لباس سے ہپ کی آواز آئی اور اس نے اوپر سے ہی کچھ کیا اور بولی۔

”لیس سر۔۔۔۔۔“

اس کے لباس سے ایک تار نکل کر اس کے کان تک جا رہا تھا جس میں یقیناً ایر فون اور مائیک تھا۔ مگر اچانک ہی اس کے لباس میں موجود آلے سے آواز آئی اور جب تک وہ پھرتی سے ہٹن دبا کر اس کا اپٹیکر بند کرتی میں نے ایک جملہ سن لیا تھا۔ بولنے والا فٹی دل جی تھا اور وہ ڈیوڈ شا سے مخاطب تھا اس نے کہا۔ ”شامی۔۔۔۔۔ شہباز ملک کس عورت کو چھڑانے کے لیے یہ سب کر رہا ہے؟“

میں ڈیوڈ شا کا جواب نہیں سن سکا تھا کیونکہ اسی وقت پوجا نے آلے کا اپٹیکر بند کر دیا تھا۔

آواز صاف فٹی دل جی کی تھی اور اس کا طرز خطاب بتا رہا تھا کہ وہ نہ صرف ڈیوڈ شا سے مخاطب ہے بلکہ وہ اس سے یوں مخاطب ہونے کا حق بھی رکھتا ہے۔ پوجا کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اسے شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سے نہ صرف سنگین غلطی ہوئی ہے بلکہ ہونے والی غلطی پکڑی جا چکی ہوگی اور اب اسے سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کی غلطی سے میں نے وہ سن لیا تھا جو مجھے نہیں سننا چاہیے تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت کھڑی رہی پھر اس نے دوبارہ برتن سینٹا شروع کر دیئے۔ ابھی وہ یہ کام کر رہی تھی کہ اس کے لباس سے پھر ہپ کی آواز آئی اور اس بار اس نے ہٹن دباتے ہوئے کہا۔ ”لیس سر۔۔۔۔۔“ اس کا رنگ مزید زرد پڑ گیا۔ اب کے اس کے لہجے میں لرزش تھی۔ ”لیس سر۔۔۔۔۔“

پھر وہ ٹرائی لیے کمرے سے نکل گئی اس کے جاتے ہی بیٹو نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”شو بی یہ کیا تھا۔۔۔۔۔ یہ حرامی دیدی کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ میں نے کہا اور کسی قدر بلند آواز سے بولا۔ ”لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا چاہیے کہ ہم اصل میں سعدیہ کو وہاں سے نکالنے جا رہے ہیں۔ ورنہ میں کسی بھی گڑبڑ کا ڈرے دار ڈیوڈ شا کو سمجھوں گا۔“

میں نے اپنے لہجے سے جتا دیا تھا کہ میں یہ بات ڈیوڈ شا سے کہہ رہا ہوں۔ ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ فٹی دل جی محض ایک مہرے کے طور پر اس کھیل میں شامل نہیں تھا۔ بلکہ وہ اس کھیل کا ایک کھلاڑی تھا تب ہی وہ ڈیوڈ شا سے یہ سوال کرنے کا مجاز ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈیوڈ شا نے اسے کیا جواب دیا۔ وہ کسی پر مکمل اعتماد

کرنے والا شخص نہیں تھا جس طرح وہ مجھ سے بہت چھپا رہا تھا اسی طرح وہ یقیناً فشی دل جی سے بھی بہت کچھ چھپا رہا ہوگا۔ بے شک آنے والے دنوں میں فشی دل جی اس جاگیر کا مالک ہوتا مگر فی الحال وہ ایک عام آدمی تھی اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر وہ کنور پبلز کا راز داں نہ ہوتا تو شاید اس کی یہ حیثیت بھی نہ ہوتی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ اس نے ڈیوڈ شا سے یہ سوال کیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کے بعد پوچھا دکھائی نہیں دی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک اور ملازمہ ہمارے لیے چائے اور گرین ٹی لے کر آئی تو میں نے اسے سے کہا۔

”میں ڈیوڈ شا سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اس نے سر ہلایا اور رخصت ہو گئی۔ جب تک ہم چائے سے فارغ ہوئے فتح خان وارد ہو گیا۔ اس کی آمد خالی از علت نہیں تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”شہباز خان! فکر مت کرو..... فشی دل جی کا کوئی حیثیت نہیں ہے اور اسے کچھ نہیں معلوم ہے۔“

”میں کیسے مان لوں؟ وہ ڈیوڈ شا سے سوال کر رہا تھا تو کسی حیثیت کے برتے پر کر رہا ہوگا۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”بہر حال یہ میرا مسئلہ نہیں ہے کہ فشی دل جی کو کچھ معلوم ہے یا نہیں لیکن اگر اس نے کوئی حرکت کی تو اس کی ذمہ داری ڈیوڈ شا پر ہوگی۔“

”وہ کوئی حرکت نہیں کرے گا۔“ فتح خان نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ”میں تم کو یہی بتانے آیا تھا۔“

”فتح خان میں تمہاری بات مان لیتا ہوں جب تک اس کے برخلاف نہیں ہوتا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے کچھ اور بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ جاتے ہوئے رک گیا۔“ ”کرد۔“

”تم بھی کنور پبلز پر حملے میں شامل ہو گے، اپنے ساتھیوں سمیت؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بالکل۔“

”تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”آدمی تو بہت ہیں لیکن کام کے بندے چھ ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”سب لڑنے مرنے اور مارنے والے ہیں۔ کوئی پیچھے نہیں ہٹے گا۔“

”میں نے سر ہلایا۔“ ”صرف نرے لڑاکا ہیں یا تربیت یافتہ بھی ہیں۔“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں تم اور تمہارے آدمی میرے ساتھ رہیں۔ وہ مقامی ہیں اس لیے ان سے کمیونیشن میں آسانی رہے گی۔ میرے ساتھ جو جائیں گے وہ ہیلی کاپٹر میں ہوں گے کیا تمہارے آدمیوں کو اس کا تجربہ ہے؟“

”ہیلی کاپٹر کا نہیں ہے باقی ہر طرح کا تجربہ ہے۔“

”انہیں مطلق ہیلی کاپٹر سے رسی کے سہارے اترنا پڑے گا۔“

”میں سمجھ گیا۔“ فتح خان نے سر ہلایا۔ ”میں خود دیکھتا ہے کہ وہ اس کام میں کتنا ماہر ہے۔ پھر تم کو بتائے گا۔“

”ہمارے پاس دو دن ہیں اگر تمہارے آدمی اس میں ماہر نہیں ہیں تو ان سے کہو پریکٹس کر لیں۔ میری پہلی ترجیح تم اور تمہارے آدمی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس لڑکی سے ایک غلطی ہوئی ہے کیا اسے سزا ملے گی۔“ میرا اشارہ پوجا کی طرف تھا۔

”نہیں..... البتہ اسے یہاں سے ہٹا دیا گیا ہے اس کی جگہ دوسرا عورت آئے گا۔“ فتح خان نے کہا اور چلا گیا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ دوسری خادہ ابھی چکی تھی۔ بیٹو لافلتی سے سن اور دیکھ رہا تھا فتح خان کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

”شوبی یہ شرارتی آدمی ہے۔“

”ہاں لیکن ابھی کوئی شرارت نہیں کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے برابر میں بستر پر دراز ہو گیا۔ ”برخوردار تم سوتے میں خرائے بہت خوفناک لیتے ہو۔ مجھے تو اس بے چاری پر ترس آ رہا ہے جسے تمہارے ساتھ سونا پڑے گا۔“

بیٹو جھینپ گیا۔ ”شوبی ابھی ایسا کوئی بے چاری نہیں ہے اور ہم کو پتا نہیں چلتا کہ سونے کے بعد ہم کیا خرابا لیتا ہے؟“

”آج رات میں ریکارڈ کر کے تمہیں سناؤں گا۔“

”کیسے ریکارڈ کرے گا؟“

”اس لیپ ٹاپ سے، اس میں آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ کا بندوبست بھی ہے۔“

بیٹو کو گرلا حق ہو گئی۔ ”شوبی ہم واقعی خوفناک خرائے لیتا ہے؟“

”بہت زیادہ مجھے صحیح معنوں میں کل رات پتا چلا..... وہ تو شکر ہے نیند آگئی ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا میں ساری رات جاگتا رہوں گا۔“

”تب ایسا ہے کہ پہلے آپ سو جاؤ ہم جاگتا ہے جب آپ سو جائے گا تب ہم سوئے گا۔“ بیٹو نے تجویز پیش کی۔ ”اس طرح آپ کا نیند خراب نہیں ہوئے گا۔“

دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میں ذرا ٹہل کر آتا ہوں۔“

”کہاں جا رہا ہے؟“

”باہر لان میں۔“

”ہم بھی چلے۔“

”آجاؤ۔“ میں نے چیٹک پہننے ہوئے سر ہلایا۔ باہر خاصی سردی تھی اور کسی گرم چیز کے بغیر گزارا مشکل تھا۔ بیٹو نے بھی چیٹک لے لی تھی۔ ہم باہر نکل آئے۔ کسی نے روکا نہیں عمارت کے سامنے موجود پہننے روش پر ٹپکنے لگے۔ باہر آنے کا اصل مقصد بیٹو بات کرنا تھا۔ اگرچہ یہاں بھی مجھے اطمینان نہیں تھا کہ کوئی ہماری بات نہیں سنے گا۔ آج کل ٹیکنالوجی بہت ترقی کر گئی ہے۔ ممکن ہے بہت طاقتور مائیک ہوں جو دور سے بھی ہماری آواز کچھ کر لیں۔ مگر بات کرنا بھی ضروری تھا۔ میں نے پہلے بیٹو کو وہ ساری گفتگو سنائی جس میں وہ موجود نہیں تھا اس میں منصوبہ بھی شامل تھا کہ ہم کس طرح سے کنورٹیلز پر حملہ کرتے۔ پھر میں نے دسیم کی تجویز سامنے

رکھی۔

”وسیم کا کہنا ہے اس مشن میں بڑے اور چھوٹے دونوں کنوروں کا خاتمہ کرنا ہے۔ میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔“

”ہم متفق ہے۔“ بیٹو بولا۔ ”اس میں منشی جی کو بھی شامل کرلو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اول تو وہ مشن میں ہوگا نہیں..... مطلب اندر کھسنے والوں میں نہیں ہوگا۔ دوسرے اس وقت وہ ڈیوڈ شاکی وجہ سے حلیف ہے لیکن دونوں کنور دشمن ہیں۔ منشی دل جی بھی ڈیوڈ شاکی ساتھ اسی لیے شامل ہوا ہے کہ وہ ان دونوں کا خاتمہ کر کے خود جاگیر کا وارث بننا چاہتا ہے۔“

بیٹو منشی دل جی کے بارے میں فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ ”شوہی اگر اس مشن میں نہیں تو اس کے بعد اس کا خاتمہ ضروری ہے ورنہ وہ دیدی کا دشمن بن جائے گا اور ہمارے پیچھے پڑا رہے گا۔“

”اسے بھی دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو مسئلہ دونوں کنور ہیں۔ وہ سادی کے بھائی ہیں اور سادی بھی وہیں ہوگی۔ اس کی موجودگی میں یا اس کے سامنے ان دونوں کا خاتمہ آسان نہیں ہوگا۔“

بیٹو نے غور کیا۔ ”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

”اب یہ تمہارا کام ہے کہ ان دونوں کا خاتمہ کرو اور سادی کو غلام نہیں ہونا چاہیے۔“

بیٹو نے پھر غور کیا اور بولا۔ ”ان کا کام ہم تمام کرے گا۔ دیدی کو آپ لاعلم رکھو۔“

”ٹھیک ہے سادی میری ذمہ داری ہوگی۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تم کنور پیلس کے نقشے سے واقف ہو؟“

”ہم نے آج تک دیکھا بھی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے کل تم دیکھنا یہاں کرلے آدیموں نے پورے پیلس کا تعری ڈی نقشہ تیار کیا ہے۔ تم اسے

دیکھنا اور جب ہم وہاں جائیں گے تو ہمارے پاس ڈیجیٹل نقشے بھی ہوں گے۔“

”ڈیجیٹل نقشہ کیا شوہی؟“

”آئی فون جیسا اسکرین والا آلہ ہوتا ہے اس میں پیلس کا مکمل نقشہ ہوگا۔“

”شوہی ہم کو ہتھیار استعمال کرنا ہوگا۔ ادھر دوسرا ہتھیار ہو سکتا ہے۔“ بیٹو نے نکتہ اٹھایا۔ ”نیا ہوگا تو عین

موقع پر استعمال کرنا مشکل ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہمیں پریکٹس کی ضرورت ہوگی۔ اب دو دن ہیں تو ہمیں بہت سی تیاری کرنی ہو

گی۔ صرف ہتھیار ہی نہیں بہت سے آلات بھی ہوں گے ان کے استعمال کی پریکٹس بھی کرنی ہوگی۔“

ہم کوئی آدھے گھنٹے باہر رہے۔ اس کے بعد سردی اثر کرنے لگی تھی تو ہم اندر آ گئے۔ میں نے سونے سے

پہلے غسل کیا۔ ہمارے لیے باجائے اور کرتے پر مشتمل آرام دہ نائٹ سوٹ بھی آ گئے تھے۔ میں لباس بدل کر

لیٹ گیا۔ بیٹو وعدے کے مطابق جاگنے کی کوشش کر رہا تھا اور ٹی وی دیکھتے ہوئے وقت گزاری کر رہا تھا۔ اس نے

آواز بند کر رکھی تھی۔ میں کچھ دیر بعد سو گیا تھا۔ اس کے بعد بیٹو کب سو یا اسے بھی نہیں پتا چلا تھا رات کسی وقت

میری آنکھ کھلی تو ٹی وی چل رہا تھا اور بیٹو بستر پر نیم دراز سو رہا تھا اس نے کبل بھی نہیں لیا تھا میں نے ٹی وی بند

کر کے اس پر کبل دیا اور پھر سو گیا۔ صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی۔ درزش اور شاور سے فارغ ہو کر میں نے ناشتہ

طلب کیا۔ دوسری لڑکی تقریباً پوجا کی عمر کی تھی۔ اس کا نام ساریہ تھا۔ دیکھنے میں وہ پوجا سے زیادہ خوب صورت تھی لیکن مجھے یقین تھا اسے صرف شکل صورت کی وجہ سے یہاں نہیں رکھا گیا ہوگا یقیناً اس میں اور خصوصیات بھی ہوں گی۔ جیسی کہ پوجا میں تھیں۔ اس نے ناشتے کا آرڈر نوٹ کیا اور جانے لگی تھی کہ میں نے روکا۔

”مجھے کرنل جنرل سے بات کرنی ہے فوری۔“

”لیس سر۔“ اس نے کہا تھا۔ چند منٹ بعد ایک آدمی آیا اور ایک واک ٹاک دے کر چلا گیا ایسا ہی واک ٹاک میں نے کرنل اور ڈیوڈ شا کے پاس دیکھا تھا وہ اس سے آپس میں رابطہ میں رہتے تھے۔ چند لمبے بعد واک ٹاک سے ہپ ہوئی تو میں نے ریسیو کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف کرنل تھا اس نے پوچھا۔

”لیس سر ملک؟“

”کرنل میں آج ان تمام آلات اور ہتھیاروں کا ڈیمو چاہتا ہوں جو ہمیں اس مہم میں استعمال کرنے ہیں خاص طور سے جو ٹیم میرے ساتھ جائے گی۔“

”دو پہر تک ہو سکے گا ابھی کچھ چیزیں نہیں ہیں منگوائی ہیں۔“ اس نے جواب دیا اور پھر پوچھا۔ ”تم کھانا اور اس کے آدمیوں کو ساتھ رکھنا چاہتے ہو؟“

”ہاں وہ سب مقامی ہیں اور ان سے کیونٹی کیشن میں آسانی رہے گی۔“

کرنل میرے اس فیصلے سے متفق نہیں تھا اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ”بیلی کا پٹر سے مشن مشکل ہوتا ہے اور اس میں آدمی کو زیادہ تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔ میرے پاس اس مقصد سے تربیت یافتہ بہترین آدمی موجود ہیں۔“

”فتح خان اپنے آدمیوں کو اس لحاظ سے چیک کر لے گا۔ اس کے بعد ہی حتمی فیصلہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”ویسے تمہارے آدمی بھی ہوں گے۔ نو افراد ہم ہوں گے اور کم سے کم تین افراد اور درکار ہوں گے۔“

”اوکے اس پر ملاقات میں بات کریں گے۔“ کرنل نے کہا۔ ”ممکن ہے جو بیلی کا پٹر ملے وہ اتنا بڑا نہ ہو جس میں درجن افراد جا سکیں۔“

”ایک منٹ اگر میں تم سے رابطہ کرنا چاہوں تو؟“

”دونہر دبانہ..... ایک نمبر ڈیوڈ شا کا ہے۔ میں ڈیمو کا بندوبست کر کے تمہیں کال کروں گا۔“

ڈیوڈ شا یہاں بھی ایک نمبر تھا۔ میں نے واک ٹاک بند کرتے ہوئے سوچا۔ میں نے محسوس کیا کہ کرنل فتح خان اور اس کے ساتھیوں کی میرے ساتھ موجودگی پر کچھ معترض تھا لیکن اس نے غل کر یہ بات نہیں کہی اس کے بجائے اس نے ان کے تربیت یافتہ ہونے پر اعتراض کیا تھا۔ ناشتے کے ساتھ اخبارات بھی آئے تھے اور یہ سارے انگریزی کے تھے اس لیے ناشتے کے بیٹوئی وی میں لگ گیا۔ میں بھی جلد بور ہو گیا کیونکہ اخبارات میں تقریباً ساری خبریں انڈیا سے متعلق تھیں اور اگر کوئی خبر پاکستان کی تھی تو اس میں تعصب کا رنگ نمایاں تھا۔ اس دوران میں بیٹو نے کچھ پاکستانی نیوز چینل تلاش کر لیے تھے۔ اس نے ایک چینل لگایا تو ہم دونوں ہی چونک گئے تھے۔ اس میں درگاہ مرشدیہ پر ہونے والے عرس کے بارے میں رپورٹ پیش کی جا رہی تھی۔ رپورٹر جو مرشد کا چچہ تھا کہہ رہا تھا۔

”پچھلے کچھ عرصے سے بعض جرائم پیشہ افراد اس مقدس درگاہ اور اس کے متولیوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ درگاہ کے موجودہ سجادہ نشین اعلیٰ حضرت مرشد علی کے چھوٹے بھائی نادر علی پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ شدید زخمی ہو کر کئی مہینے تک زندگی و موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد جام شہادت نوش کر گئے۔ حکومت نے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے کچھ نہیں کیا اللہ باؤڈلوا قاتلوں کے خلاف مقدمے ختم کرادیے گئے۔ اعلیٰ حضرت مرشد علی پر بھی کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے لیکن اللہ نے ان کی نیکیوں کے طفیل انہیں محفوظ رکھا۔ دہشت گردوں نے ایک بار درگاہ پر بھی حملہ کیا اور کئی افراد اس حملے میں شہید ہوئے۔“

رپورٹر کی بکواس کے بعد مرشد علی کی مختصر تقریر دکھائی گئی جس میں وہ اپنے جاہل مریدوں کے جم غفیر سے خطاب کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ باطل قوتوں کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے گا چاہے اسے بھی اس کے بھائی کی طرح شہید کر دیا جائے۔ یہ تقریر مرشد نے گزشتہ روز کی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہمارے خلاف اعلان جنگ کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ مرشد کی کوئی کل سیدی نہیں تھی اور وہ اپنی فطرت کے مطابق شرارت پر اتر آیا تھا۔ اس نے میرے خلاف قانونی لڑائی ترک کر دی تھی مگر اب وہ دوسرے طریقوں سے میدان جنگ سجا رہا تھا۔ رپورٹ دیکھ کر میں نے ویم اینڈ کہنی سے رابطہ کیا۔ وہ بھی یہ خبر دیکھ چکے تھے اور فکر مند تھے۔ ویم نے کہا۔ ”وہ اپنی اوقات سے باہر ہو گیا ہے۔“

”اس لیے اب اسے دوبارہ اپنی اوقات پر لے آؤ۔“ میں نے کہا۔ ”اب دشمن کے وار کا انتظار کرنا بیکار ہے اس سے صرف اسے ہمہ ملتی ہے۔“

ویم خوش ہو گیا۔ ”یہی تو میں آپ سے کہتا تھا۔ اگر آپ مجھے فری ہینڈ دیں تو میں اس کا دماغ درست کر دوں گا۔ ویسے بھی بہت عرصے سے بیکار بیٹھا ہوں میرے اکثر آدمی بھی چھٹیاں گزار رہے ہیں۔“

”ان سب کو واپس بلا لو۔“ میں نے کہا۔ ”بھگوال والی حویلی کو مرکز بنا کر کارروائی کرو اور فیض آباد والی کوشی میں سرگرمیاں محدود کر لو۔۔۔۔۔ اسے محفوظ رہنا چاہیے۔“

”اس صورت میں عضو معطل بن جاؤں گا۔“ عبداللہ نے فریادی۔ ”یہاں کانگراں میں ہوں۔“

”کوئی بات نہیں اسے خالی چھوڑ دو۔۔۔۔۔ یاد رکھ بھال کے لیے ایک آدھ بندہ یہاں رکھ لو۔ باقی سب بھگوال منتقل ہو جائیں۔“

”اور بانو۔۔۔۔۔“

”میں سوچ رہا ہوں اسے بھی حویلی منتقل دیا جائے۔“ میں نے کہا تھا کہ عقب سے بانو کی آواز آئی۔

”میں کہیں نہیں جا رہی۔“ وہ عبداللہ اور ویم کے عقب میں نمودار ہوئی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”آپ

بھول رہے ہیں میں اب گھریلو لڑکی نہیں ہوں اور آپ نے ہی مجھے لڑنا سکھایا ہے اب گھر بٹھانے کی بات کر رہے ہیں۔“

”تمہیں لڑنا آتا ہے لیکن ہمارے لیے تم لڑکی اور ذمے داری ہو۔ اس لیے تمہیں محفوظ بنانا ہماری پہلی ترجیح ہے۔“

”میں آپ لوگوں کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اس لیے میں کہیں

نہیں جاری۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے یار۔“ سفیر نے بھی ٹانگ اڑائی۔ ”یہ بھی چلی گئی تو چاروں طرف اپنی جیسی منخوس صورتیں رہ جائیں گی۔“

”ٹو ایسا کرونا کو بھی بلا لے۔“ میں نے ہنسا کر کہا۔ ”کچھ دن میں اللہ نے چاہا تو سادی بھی آجائے گی اور تم لوگوں کے اچھی صورتیں دیکھنے کے سارے ارمان پورے ہو جائیں گے۔“

”جناب ہمیں کیوں رگڑ رہے ہیں۔“ عبداللہ نے جلدی سے کہا۔ ”صرف سفیر کی خواہش ہے۔“

”اچھا بیٹے بتاؤں کل رات تم کیا کہہ رہے تھے۔“

”میں تو چلتی ہوں۔“ بانو نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں فضول باتیں شروع ہو گئی ہیں۔“

”اور اس پر بھی تم ان کے ساتھ رہنے پر مصر ہو۔“

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ ”وہ الگ بات ہے۔ جب میں پاکستان واپس آئی تب ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ آپ کی جنگ اب میری جنگ ہے اور میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہوں گی۔“

”اوکے اس پر بعد میں بات ہوگی۔“ میں نے موضوع ختم کیا۔

”امن و امان کے خراب حالات کی وجہ سے اب شہر میں سیوریج خست کی جارہی ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”اس لیے بھی اس کو بھی اس کو مرکز بنانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”صرف شہر نہیں بلکہ مضافات پر بھی نظر رکھی جارہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آئے دن نواحی علاقوں میں چھاپے پڑتے ہیں اور دہشت گرد پکڑے جاتے ہیں۔ اس لیے حویلی کو بھی بہت محفوظ سمجھو۔ پھر دیہی علاقے میں لوگ اپنے آس پاس مکمل نظر رکھتے ہیں وہاں کچھ چھپانا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے نہ صرف محتاط رہو بلکہ کسی سیٹ آپ کے ساتھ رہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

”سیٹ آپ سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”یہی کہ تم میں سے کوئی شوقین حراج جاگیر دار بن جائے جو جنوبی پنجاب سے تعلق رکھتا ہے اور آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے یہ حویلی کرائے پر حاصل کی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے چیلے چچے ہوں گے۔“

”جاگیر دار کون بنے گا؟“ عبداللہ نے سوال کیا۔

”یہ دونوں غریب غریب ہوں۔“ سفیر نے حقارت سے وسیم اور عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”انہیں کیا پتا کہ جاگیر دار کیسے رہتے ہیں؟“

”تو تمہیں پتا ہے؟“ عبداللہ نے فحقی سے کہا۔

”ہاں مابدولت..... جدی پشتی جاگیر دار ہیں۔“ سفیر نے گردن اکڑائی۔ ”میں جاگیر دار بنوں گا۔“

”اور ہم تمہارے حالی موالی ہوں گے؟“ وسیم نے طنز کیا۔ ”تمہیں تو بیوی کچھ نہیں سمجھتی تو دوسروں سے کیا توقع کرتے ہو؟“

”صحیح بولا۔“ بیٹو نے خوش ہو کر کہا۔ ”جاگیر دار بنیدہ ہوتا آپ مسخرہ ہوتا۔“

اس سے پہلے کہ لڑائی مزید بڑھتی میں نے ہاتھ اوپر کیا۔ ”خدا کے لیے آپس میں لڑنا بند کرو۔ تم لوگوں کو کسی مرشد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے ہم آپس میں مشورہ کر کے کوئی سیٹ آپ بناتے ہیں۔“ دیم نے کہا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا مقامی لوگوں کو کوئی مشکوک بات نظر نہیں آتی چاہیے۔“

”اس سے اسلحہ بھی کور ہو جائے گا۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”آج کل معمولی سا جاگیردار بھی چار پانچ مسلح محافظ تو رکھتا ہے بے شک اسے سوائے اپنی بیوی کے اور کسی سے خطرہ نہ ہو۔“

سفر نے فوراً پنگا لیا۔ ”اب تم نے بھی بات بات پر بیوی کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے دل میں بھی بیوی کا ارمان اٹھائیاں لے رہا ہے۔“

وہ باز آنے والے نہیں تھے۔ سفر مجھ سے مختلف فطرت کا تھا ہر ایک سے دو منٹ میں بے تکلف ہو جانے والا۔ عبداللہ اور دیم میرا احترام کرتے تھے اس لیے مجھ سے وہ کبھی اس طرح بے تکلف نہیں ہوئے جیسے سفر سے ہو گئے تھے۔ پھر دن رات کا ساتھ تھا۔ دکھ سکھ میں شریک تھے اس لیے ان میں یہ محبت بھری نوک جھوک فطری امر تھا۔ سفر کے مزاج نے ان کے لیے آسانی کر دی تھی۔ اچانک سفر نے کہا۔ ”یارو نے کتنے دنوں سے حویلی کال نہیں کی ہے مونا بتا رہی تھی سویرا بہت اداس ہے۔“

میں گڑبڑا گیا۔ ”ہاں یار بس مجھے مناسب نہیں لگا۔“

”کر لے یار..... میرا خیال ہے اب اتنا خطرہ نہیں ہے۔“

”خطرہ ہو گا.....“ دیم نے مداخلت کی۔ ”انڈین شہباز کے بارے میں جانتے ہیں تو اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے ممکن ہے انہوں نے حویلی کے مواصلاتی رابطوں پر کوئی ٹریپ لگا رکھا ہو۔ آج کے دور میں یہ ناممکن نہیں ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے اس سے وہ میرا سراغ لگا سکتے ہیں؟“

”بالکل اور آپ ڈیوڈ شا کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھیں۔“ دیم نے مشورہ دیا۔ ”آج کل آپ بہت زیادہ اسکا پ پوز کر رہے ہیں مانی کا کہنا ہے کہ یہ محفوظ نہیں ہے اس کی نگرانی کی جاسکتی ہے اور کال کرنے والے کا پتا لگایا جا سکا ہے کہ وہ کہاں ہے؟“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شاید میں ڈیوڈ شا کی قید میں آنے کے بعد کچھ لاپرواہ ہو گیا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ میری حفاظت کی ذمہ داری اس پر ہے حالانکہ کوئی مشکل آتی تو وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہونے میں ایک منٹ کی تاخیر نہ کرتا۔ اس لیے میں نے دیم سے اتفاق کرتے ہوئے اسکا پ بند کر دیا اس پر بیٹو کو کچھ مایوسی ہوئی۔ ”شوبی مزہ آرہا تھا۔ آپ نے جلدی بند کر دیا۔“

”وہ تو ہے یار پر احتیاط بھی ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔

”ابھی آپ کٹرل کے پاس جائے گا تو ہم بھی جائے گا؟“ بیٹو نے پوچھا۔ میں نے سر ہلایا۔

”بالکل تمہیں بھی سب جانا ہے۔“

”ہم کو انگریزی نہیں آتا ہے۔“

”میں بتاؤں گا تم فکر مت کرو۔“

کرل نے دوپہر کا کہا تھا اس سے میں سمجھا کہ اس کی مراد ایک دو بجے ہوگی لیکن میں بھول گیا تھا کہ بارہ بجے سے انگریزوں کے لیے دوپہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ واکی ٹاکی نے ہپ دی۔ کرل نے کہا۔ ”شہباز اسی کنٹرول سینٹر میں آ جاؤ بیو کے لیے۔“

”میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ کنٹرول سینٹر سے اس کی مراد وہی ایک منزلہ عمارت تھی جس میں کمپیوٹر والے بیٹھے تھے۔ میں نے بیو سے کہا۔ ”تیار ہو جاؤ بر خوردار۔“

وہ فکر مند ہو گیا۔ ”شوہی ابھی لچ نہیں کرتا ہے؟“

”لچ واہی پر۔“

ہم باہر آئے اس بار بھی کسی نے نہیں روکا اور نہ ہی سر پر مسلط ہونے کی کوشش کی۔ کرل نے مجھے تفصیل سے خبردار کر دیا تھا کہ کسی بھی پختہ روش سے اترنے کی صورت میں اسنا پیرگن خود کار انداز میں شوٹ کر دے گی اس لیے ایسی غلطی بھی خود کشی کے مترادف ہوگی۔ میں نے بیو کو ایک بار پھر بتایا کہ پختہ روش سے نیچے پاؤں بھی مت رکھنا۔ وہ اسنا پیرگن کے بارے میں سن کر حیران ہوا تھا۔ ”شوہی یہ اتنا خطرناک ہتھیار ہے؟“

”سوچ سے بھی زیادہ، اسے کمپیوٹر کنٹرول کرتا ہے اور اس میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا ہے۔“

”شوہی انسان کو مارنے کا ٹیکنالوجی اتنا ترقی کر گیا جب کہ وہ ایک چاقو ایک پتھر سے بھی مر جاتا ہے۔ تب اسے بچانے کا ٹیکنالوجی نے اتنا ترقی کیوں نہیں کیا؟“

”کیونکہ ٹیکنالوجی کے خالقوں کو اس میں دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”ورنہ یہ دنیا آج اتنی بری جگہ نہ ہوتی۔“



ہم عمارت تک پہنچے دروازہ خود بخود کھل گیا۔ یقیناً دیکھا جا رہا تھا کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔ کرل اندر اپنے دفتر میں ہمارا انتظار تھا۔ مگر مجھے وہاں ڈیو کا کوئی بندوبست نظر نہیں آیا۔ اس نے اٹھ کر مجھ سے اور بیو سے ہاتھ ملایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مکمل پرفیشنل آدمی تھا۔ سردار ایک متوازی رویے کا مالک۔ کسی سے نہ تو فری ہوتا تھا اور نہ ہی بلاوجہ کسی سے الجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ ہمیں ایک مختصر مینٹگ ہال میں لایا جہاں ایک بڑی میز تھی مگر اس وقت یہ میز مینٹگ کے بجائے ڈیو کا مرکز بنی ہوئی تھی اس پر کئی طرح کے جدید ہتھیار اور آلات سجے ہوئے تھے۔ انہیں تین حصوں میں بانٹ کر الگ الگ رکھا ہوا۔ جس حصے میں ہتھیار تھے ان کے بھی دو حصے تھے۔ ایک میں عمومی ہتھیار تھے اور دوسرے میں کچھ خاص ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔ کرل میز کے ایک سر پر آگیا اور اس نے اشارہ کیا۔ ”یہ تمام چیزیں اس مشن میں ہمارے کام آئیں گی۔ ان آلات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو الگ الگ مقاصد کے لیے ہیں۔ پہلا مقصد دشمن سے خبردار رہنا ہے۔ اس کے لیے ہمارے پاس یہ آلات ہیں۔“ اس نے ایک نائٹ ویژن گگل اٹھا کر دکھائی وہ اس نے پہن لی۔ ”یہ رات میں دیکھنے والی عینک ہے، لیکن اس وقت یہ نائٹ موڈ پر ہے۔ اگر تم اس کے اوپر لگا دیا تو یہ جھوٹا سا ابھار دباؤ گے تو یہ نائٹ ویژن موڈ پر آجائے گی اور اسی بین کو دبانے سے یہ نائٹ ہو جائے

گی۔ ایک بات یاد رکھنا۔ نائٹ ویژن موڈ پر صرف تاریکی میں استعمال کیا جائے دوسری صورت میں پنل ٹارچ کی روشنی بھی ایسی لگے گی جیسے تم نے براہ راست دوپہر کے سورج کو دیکھ لیا ہے۔ تیز روشنی بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ آدی چند سیکنڈ میں اندھا ہو سکتا ہے۔ تم اس کا تجربہ کر سکتے ہو۔“

میں نے ایک عینک اٹھا کر پہنی اس میں کمائی کے بجائے چمکیلا پٹا تھا جو سر پر فٹ آجاتا اور اس کے کرنے کا کوئی خدشہ نہیں رہتا چاہے آدی قلابازیاں کھائے۔ جیسے ہی میں نے اسے نائٹ موڈ پر کیا ایسا لگا جیسے روشنی کا سیلاب آگیا ہو۔ حالانکہ کمرے میں نائل روشنی تھی۔ میں نے دوبارہ بن دیا تو روشنی نائل ہو گئی۔ بیٹو نے بھی تجربہ کر کے دیکھا۔ اس کا استعمال آسان تھا اور یہ بہت کام کی چیز تھی۔ کرٹل نے کہا۔ ”اب تاریکی میں اس کا تجربہ کرتے ہیں۔“

اس نے چنگی بجائی تو ہال تاریک ہو گیا ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں نے نائٹ ویژن موڈ کیا منظر بالکل سبز روشنی میں دکھائی دینے لگا۔ یہ بہت اچھی کوالٹی کا نائٹ ویژن تھا کیونکہ میں اس میں صرف ہولے نظر نہیں آ رہے تھے بلکہ ایک ایک چیز اپنی تفصیل کے ساتھ نمایاں تھی۔ اسی حسیت کی وجہ سے یہ روشنی بہت زیادہ دکھاتا تھا اور کرٹل نے اسی چیز سے خبردار کیا تھا۔ پھر اس نے ایک چھوٹا سا اسکرین والا آلہ دکھایا۔ ”یہ چالیس فٹ کے فاصلے تک کسی بھی زندہ اور متحرک چیز کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ چاہے درمیان میں کوئی دیوار یا رکاوٹ ہی کیوں نہ ہو۔“

اس نے تجربہ کر کے دکھایا۔ کمرے سے باہر افراد اسکرین پر نقطے کی صورت میں دکھائی دینے لگے یہی نہیں ان کا فاصلہ بھی لکھا ہوا آ رہا تھا۔ کرٹل نے کہا۔ ”اس کے چھ بیٹ ہیں اس لیے ہر ٹیم کو دو آلے دیئے جائیں گے۔“

وہاں ایک ٹیب نما آلہ بھی رکھا ہوا تھا یہ کسی زندہ چیز کی نشان دہی کرنے والے آلے سے خاصا بڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کیا ہے؟“

کرٹل نے اسے اٹھا کر آن کیا۔ ”یہ ڈیجیٹل کمپاس ہے۔ اس کے علاوہ یہ سمت بھی بتاتا ہے۔ اس نے اس کے بچ اسکرین مینو پر ایک بن چھو تو اس پر قہری ڈی نقشہ ابھر آیا۔ یہ کنورجس کا مکمل نقشہ تھا اس میں تمام عمارتیں، ان کے اندر کے راستے اور مکانیت واضح تھی۔ اسکرین پر ایک کونے میں چھوٹی سی اسکرین الگ ہو رہی تھی۔ کرٹل نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بتا رہی ہے کہ تم مجموعی نقشے میں کہاں ہو۔ چاہو تو اسے بڑا بھی کر سکتے ہو۔“ کرٹل نے دو اٹھکیوں سے پھیلائے کا اشارہ کیا تو یہ چھوٹا نقشہ پوری اسکرین پر محیط ہو گیا۔ وہ کچھ دیر اس سسٹم ٹنکشن سمجھا تا رہا۔ ”یہ بھی چھ ہیں اور ہر ٹیم کے پاس دو آلے ہوں گے۔“

”یہ میں لے جا رہا ہوں۔“ میں نے ڈیجیٹل کمپاس اٹھا لیا۔ کرٹل نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور وہ دوسرے حصے کی طرف آیا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ ہم پہلے سے اسے استعمال کر کے بعد میں اس سے بہتر کام لے سکتے تھے۔ اس نے اس حصے میں پہلے آلات کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ حفاظتی، مواصلاتی اور خبردار کرنے والے آلات ہیں۔ یہ بلٹ پروف ہے اور سب پہنیں گے۔ یہ دس فٹ کے فاصلے سے چلائی جانے والی شاٹ گن کی گولی بھی روک سکتا ہے۔ یہ ریڈیو ہیڈ سیٹ ہیں۔ انہیں دونوں

کانوں میں پہننا لازمی ہوگا اس کی وجہ میں ابھی بتاتا ہوں۔“ کرنل نے لمبی فون والے ایرفون دکھائے ان کی ساخت ایسی تھی کہ یہ کان کے سورج میں فٹ ہو جاتے۔ باریک تار نکل کر ایک چھوٹے سے ریڈیو تک جا رہا تھا اسے جیکٹ پر سامنے والی جیب میں رکھا جاسکتا تھا۔ اس کے سامنے والے حصے کو چھونے سے مانیک کام کرتا تھا۔ پھر کرنل نے ایک چھوٹی سی سیٹی دکھائی۔ ”اگر کسی وجہ سے ریڈیو خراب ہو جائے یا کام نہ کرے اور آس پاس کوئی دوسرا ساقی نہ ہو تو چھڑنے والے والا اسے بجا کر دوسروں کو بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔“ کرنل نے ایک جدید قسم کا گیس ماسک اٹھایا۔ ”یہ آنسو گیس سے لے کر اھصائی اور تمام زہریلی گیسوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ حملے کے بعد اسے لازمی استعمال کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہم باہر سے گیس والے گریذ بھی فائر کریں گے۔ اسے پہننے ہوئے خیال رہے کہ یہ پوری طرح منہ پر فٹ ہو اور کوئی خلا باقی نہ رہے۔“

میں کرنل کی باتوں کو ذہن نشین کر رہا تھا۔ بیڑے کا انداز ڈرا لاپرواہ تھا لیکن مجھے معلوم تھا اس کی یادداشت بہت اچھی ہے اور وہ مشکل سے ہی کوئی بات بھولتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی انگریزی معمولی سی تھی اور مجھے بعد میں اسے سب سمجھانا تھا۔ اس نے اٹھا کر سیٹی بجائی تو ایک بہت باریک، کرپہ اور کانوں کو چھسنے والی آواز آئی تھی اس نے گھبرا کر سیٹی واپس رکھ دی۔ کرنل مسکرایا۔ ”اگر اسے زور سے بجایا جائے تو اس کی آواز ایک میل تک صاف سنائی دیتی ہے۔“

”اگر یہ کان سے گئے ہوں تب بھی اس سیٹی کی آواز سنائی دے گی؟“ میں نے ایرفون کی طرف اشارہ کیا۔

”بالکل یہ بہت ہائی ٹیج کی باریک آواز نکالتی ہے۔ اگر تم اسے کسی گھوڑے یا کتے کے سامنے بجاؤ تو وہ بدک جائے گا۔ کیونکہ ان کے لیے یہ آواز بہت زیادہ ہوگی۔ میرا خیال ہے تم یاد کر رہے ہو جو میں بتا رہا ہوں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اگر کوئی کسر وہ جائے گی تو ہم پریکٹس سے پوری کر لیں گے۔“

”کل تک میرے سارے آدمی آجائیں گے اور فل ڈریس ریہرسل ہوگی۔“

”ہم ٹارگٹ پریکٹس بھی کرنا چاہتے ہیں۔“

”وہ بھی ہوگی..... تمام ہتھیارے ہیں ان کی آزمائش بھی لازمی ہوگی۔“ اس نے کہا اور ہتھیاروں والے حصے کی طرف آیا۔ اس نے ایک چھوٹے دستے اور چھوٹی نال والی رائفل اٹھائی۔ ”یہ دنیا کی جدید ترین اسالٹ رائفل ہے۔ اسے AK74U کہتے ہیں۔ کلاشکوف کا ایک ورژن ہے۔ چھوٹی، ہلکے وزن کی، ایکوریٹ اور دور مار رائفل ہے۔ اس کی مار برسٹ موڈ پر ساڑھے تین سو گز اور سنگل موڈ پر پانچ سو گز ہے۔ پانچ سو گز بعد نشانے میں صرف ایک سینٹی میٹر کا فرق آتا ہے۔ اس پر یہ لیزر ٹارگیٹ پوڈ لگا ہے۔“ کرنل نے رائفل کے اوپری حصے میں ایک ڈرا ابھرے ہوئے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیزر کی جد چھ سو گز ہے۔ پینتالیس گولیوں کا میگزین لگتا ہے۔ ایک منٹ میں چھ سو راونڈز فائر کرتی ہے۔“

میں نے رائفل اٹھا کر دیکھی۔ رائفل کی لمبائی مشکل سے ڈھائی فٹ تھی اور اس کا دستہ اور نال سے نیچے ہاتھ سے پکڑنے والا حصہ جدید قسم کے فابریک سے بنا ہوا تھا یہ وزن میں ہلکا تھا اور پگھلا ہوا لیزر پوڈ بہت مختصر اور

رائفل میں جڑا ہوا تھا۔ یقیناً میں یہ استعمال میں آسان تھی باقی خصوصیات کرنل نے بتادی تھی۔ اس نے مزید کہا۔ ”ہم افغانستان میں ایم سولہ رائفل استعمال کرتے تھے لیکن یہ اس کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ جام نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کی نال بہت جلد گرم ہوتی ہے۔“

میں نے اس کا میگزین نکالا پھر اس کا بولٹ کھسکایا۔ اس کا دستہ مختصر تھا اس لیے فکس تھا۔ ”تمام افراد کے پاس یہی ہوگی؟“

”نہیں ہمارے چھ افراد ہماری مشین گنیں اٹھائیں گے۔“ کرنل نے ایک ہماری مشین گن کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ امریکی ساختہ انیر زخم ایک گن ہے۔ ڈبل ایکشن بلٹ پمپ کی وجہ سے یہ بے انتہا فائر پاور رکھتی ہے۔“

یہ گن عام حصے سے الگ رکھی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا رائفل کا وزن تو بہت زیادہ نہیں تھا مگر اس کے ساتھ گولیوں کا بڑا سا پوڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ مجموعی وزن چھ سات کلو گرام ہو رہا تھا یقیناً اسے بہت طاقتور افراد ہی چلا سکتے تھے۔ کرنل نے اشارہ کیا۔ ”اس میں پونے دو سو پلٹ ہوتے ہیں۔“

چھوٹے ہتھیاروں میں بریٹا تھے یہ سروس پتول تھے جو عام طور سے آرمی افسران کو دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سولہ گولیوں کا میگزین لگتا تھا اور میں پہلے بھی اسے استعمال کر چکا تھا۔ اس کی مار زیادہ اور نشانہ اچھا ہوتا ہے۔ ہماری مشین گن کے ساتھ ایک چھوٹی اور موٹی نال والی گن رکھی تھی۔ اس کے پیچھے ریو اور جیسا بڑا سا گھومنے والا چمبر تھا۔ اس کے اوپر بڑی اور خاصی جدید قسم کی دوربین فٹ تھی۔ کرنل نے اس کے بارے میں بتایا۔ ”یہ امریکی ساختہ ایم بتیس گرینڈ لاچر ہے۔ دھماکہ خیز اور دھویں کے گرینڈ فائر کر سکتا ہے۔ اس کی مار ایک ہزار گز ہے۔ یہ دو کلو گرام وزنی ہیٹ یا اسموک گرینڈ فائر کر سکتا ہے۔ ایک وقت میں چھ راؤنڈ ہوتے ہیں جو دس سیکنڈ میں فائر کیے جاسکتے ہیں اور اسے ایک منٹ میں دوبارہ لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ راستہ صاف کرنے کے لیے بے مثال چیز ہے۔ یہ بیس ملی میٹر موٹی فولادی چادر کو اڑا سکتا ہے۔“

”اسے بھی ماہر استعمال کرے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل اس کے بھی ماہر ہیں ہمارے پاس۔ ماہروں کی تعداد تین ہے اس لیے تین ہی لاچر لے جاسکتے ہیں۔“ کرنل نے سر ہلایا۔ ”تم نے آٹو ایک انسائپر گن کے بارے میں جو تجویز دی تھی وہ قابل عمل نہیں ہے اس میں کوئی بھی ہماری مشین گن نصب کی جاسکتی ہے لیکن اسے ای پی سی پر نصب کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اسے ریموٹ کنٹرول کیا جاسکتا ہے ہاں اسے آن آف کیا جاسکتا ہے۔“

باقی ہتھیاروں میں ہاتھ سے پھینکنے والے گرینڈ، دھویں کے بم، چھوٹے فکس ہونے والے ٹائم بم، ان پر دس سیکنڈ کا وقت مقرر ہوتا تھا۔ یہ کسی بھی سطح پر چپک سکتے تھے۔ ان پر تین ٹین لگے تھے جنہیں باری باری دبانے سے یہ ایکٹو ہو جاتے۔ ان کے ساتھ ایک ہاڈی اسپرے سائز اور شکل کی چیز رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”وئس بم۔“ کرنل نے کہا اور اٹھا کر دکھایا۔ ”اس کا یہ کپ کھینچ کر پھینک دو تو دس سیکنڈ بعد یہ ایسی آواز خارج کرتا ہے جو تیس میٹر کے دائرے میں کسی بھی شخص کا دماغ نافذ کرنے کے لیے کافی ہے۔ تم لوگوں کے

کانوں میں لگنے والے ایرفون جہیں اس بم کی آواز سے محفوظ رکھیں گے اس لیے ایرفون لازمی پوری طرح لگے ہوں۔“

”واقعی کام کی چیز ہے کیونکہ اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا اور اس سے حفاظت کا خیال بھی کم ہی آئے گا۔“

”کیا کہہ سکتے ہیں، دشمن بھی ہماری طرح کا انسان ہوتا ہے جو ہم سوچ سکتے ہیں وہی وہ بھی سوچ سکتا ہے۔“ کرل نے شانے اچکائے اور آگے بڑھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مکمل لباس معہ جوتوں اور دستاؤں کے آویزاں کیا گیا تھا۔ یہ آرمی کا ڈھونڈا شائل کا لباس تھا۔ کرل نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم نے کنور بیلس کے گاؤں دیکھے ہیں یہ ان کی وردی سے کس حد تک مختلف ہے؟“

”بالکل مختلف ہے لیکن تاریکی میں اپنے پرانے کی پہچان کیسے ہوگی؟“

”یہ دیکھو۔“ اس نے جیکٹ کے دونوں شانوں پر ابھرے ہوئے سیاہ دھات کی بنی دو ڈسکوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ہیٹ سکر ہیں، جسم سے حرارت لے کر چھوڑیں گے۔ نانٹ ویژن سے یہ واضح نظر آئیں گے۔ دور بیٹھے اسنا پیرز کو بھی۔ جن کے شانے پر یہ ہوں گے وہ اپنے ہوں گے اور باقی پرانے ہوں گے۔“

یہ اچھی ترکیب تھی اس سے اپنے پرانے کی شناخت بہت آسان ہو گئی تھی۔ خاص ہتھیاروں پر ایک بڑی رائفل اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ دیکھنے میں ہی یہ دور مار ہتھیار لگ رہا تھا۔ کرل نے میری دلچسپی بھانپ لی۔ اس نے رائفل پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ”یہ بارہ اعشاریہ سات کیلی باری برٹش ساختہ اے ایس فغٹی اسنا پیر رائفل ہے۔ مار اور درنگی میں دنیا کے کم ہتھیار اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کی حد اٹھارہ سو میٹر ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے اسنا پیرز کو زیادہ بلند اور زیادہ محفوظ مقامات پر ہونا چاہیے کیونکہ ہماری کامیابی کا بہت زیادہ انحصار ان پر ہوگا۔ کنور بیلس میں بھی اسنا پیرز کی موجودگی یقین ممکن ہے اور وہ ہمارے اسنا پیرز کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اس لیے اب ہمارے اسنا پیرز بارہ سو سے پندرہ سو میٹر کی دوری پر ہوں گے۔“

”یہ اچھا فیصلہ ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

تمام ہتھیاروں کے ساتھ ان کا ایندیشن بھی موجود تھا۔ سب سے آخر میں کرل نے ایک لمبے پائپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ جدید ترین روسی ساختہ مین فائر گائیڈ میزائل ہے۔ یہ تین کلومیٹر کی حد میں کسی ٹینک، گاڑی یا چھوٹی عمارت کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“

”اس کی تباہ کاری کا دائرہ کار کتنا ہے؟“

”تقریباً بیس میٹر کے دائرے میں ایک فٹ تک موٹی کوئی بھی کنکریٹ یا تین ایم ایم کی دھاتی چادر محفوظ نہیں رہے گی۔“

”تب اسے بہت احتیاط سے استعمال کرنا ہوگا۔“ میں نے فکر مندی سے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہنا کہ اسے یقینی طور پر صرف راستہ تباہ کرنے کے لیے استعمال کریں عمارت کے اسٹرکچر کو نقصان نہ ہو۔“

”تم بے فکر ہو اسے استعمال کرنے والے افراد ماہر ہیں اور پھر اس کا سسٹم اتنا جدید ہے کہ اگر کسی جگہ بین سے نصف انچ کا دائرہ بنا دیا جائے تو تین کلومیٹر دور بیٹھا آپریٹر ٹھیک اس دائرے پر میزائل مار سکتا

ہے۔“

یہ بریٹنگ تقریباً دو گھنٹے جاری رہی تھی۔ بیٹو کو انگریزی کی زیادہ سمجھ نہیں تھی اس لیے وہ عملی طور پر ہتھیار دیکھ رہا تھا اور ہاتھوں میں لے کر سمجھ رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ بھوک اس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لیے میں نے واپسی کا فیصلہ کیا اور جانے سے پہلے کرٹل سے کہا۔

”آج شام تاریکی کے بعد ہم ٹارگٹ پر ٹیکس کرنا چاہتے ہیں۔“

”کھلے میں تو ممکن نہیں ہے لیکن یہاں ایک زیر زمین پر ٹیکس ہال ہے۔“

”کوئی بات نہیں ہم روشنیاں کم کر کے پر ٹیکس کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں یاد آیا تم نے منشی دل جی

سے یقیناً کنورٹیلر کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لی ہوں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تقریباً تمام اہم معلومات حاصل کر لی ہیں۔“

”پاور سلائی کے بارے میں کیا معلوم کیا ہے؟“

”کنورٹیلر کو مرکز کی گرڈ سے لائن دی ہوئی ہے اس کا گرڈ اسٹیشن تک اپنا ہے۔ پہلے مرحلے میں لائن اڑا

دی جائے گی۔ دوسرے مرحلے میں ہم جنرل جہاز کریں گے وہ گرڈ اسٹیشن کے ساتھ ہے۔ اس کے باوجود ہر

عمارت کے لیے پو پو ایس پاور بیک آپ ہے۔ مکمل طور پر بند کرنا ممکن نہیں ہے۔“

”بالکل ممکن ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”اس کی ایک آسان سی ترکیب ہے۔ ہر عمارت میں گھسنے والے

سب سے پہلے کسی بھی ساکٹ میں تار ڈال کر اسے اڑا دیں۔“

”تم نے اچھی تجویز دی ہے۔“ وہ بولا۔ ”یہ آسان سا کام ہے اور جب تک ساکٹ میں وائر رہے گی فیوز

اڑتا رہے گا۔“

”ہاں اور بیٹو میٹنگ روم سے نکل رہے تھے کہ کرٹل جہز نے آواز دی۔“ ”شہباز ملک..... مجھے اس عورت کی

تصویر چاہیے جسے ہم نکالنے جا رہے ہیں میرے ہر آدمی کو اس کی صورت سے واقفیت ہونی چاہیے تاکہ کسی قسم کی

کوئی غلطی نہ ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”تصویر مل جائے گی..... تم اسے پرنٹ کروالینا۔“

”یہ کام ہو جائے گا۔“

میں اور بیٹو واپس آئے اور لنچ کا آرڈر دیا۔ میں نے کم کھایا تھا اور جلد اٹھ گیا۔ اسکاپ آن کر کے رابطہ

کیا۔ سفیر آن لائن تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”سادی کے چہرے کی واضح تصویر بھیج دو۔“

”کیسے؟“ سفیر نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے اسکاپ سے بھی ٹرانسفر ہو جاتی ہے۔ لیکن پہلے تصویر دیکھو۔ اگر نہیں ہے تو دوسم سے

معلوم کرو۔“

”دس منٹ بعد کال کرنا۔“ سفیر نے کہا۔

میں نے ساریہ سے اپنے لیے کافی منگوائی اور دس منٹ بعد کال کی۔ سفیر نے کہا۔ ”تصویر ہے دوسم کے

پاس..... وہ مانی سے اسکیں کر رہا ہے۔“

”عبداللہ کہاں ہے؟“

”وہ حویلی گیا ہوا ہے۔ دسم کے آدمی آنا شروع ہو گئے ہیں۔“ سفیر نے مطلع کیا اسی اثناء میں دسم پو ایس بی لے آیا اور اس نے لگا کر اسکا پ سے فائل ٹرانسفر کی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ سادی کی بہت واضح تصویر تھی وہ حویلی کے پس منظر میں کھڑی تھی اور اس کے بال ہوا کے ساتھ اڑ رہے تھے۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ تصویر لینے والا دسم تھا۔ میں نے اسے محفوظ کر لیا اور پھر ان لوگوں کو آج کی میٹنگ کا مختصر احوال سنا کر اسکا پ بند کر دیا۔ بیٹو لٹچ سے فارغ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے آگاہ کیا۔ ”شوبی آج سے ہمارا دو اہم ہو گیا ہے اور ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ زخم ٹھیک ہے۔ آج ہم نہائے گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن ہاتھ پر اتنا زور مت دینا کہ زخم متاثر ہو۔ ایک ہفتہ پورا ہو گیا ہے لیکن گولی کا زخم اتنی جلدی نہیں بھرتا ہے۔“

”ہم نے ہر طرح سے ہاتھ ہلا کر اور استعمال کر کے دیکھ لیا ہے ہم کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔“

”آج ٹارگٹ پر ٹیکس کے بعد پھر ڈاکٹر کو دکھالینا۔“ میں نے کہا اور کرٹل سے رابطہ کیا۔ ”تصویر آگئی ہے۔“

”بلو ٹوٹھ پری بے نام کا آئی فون سرچ کر کے اس پر بھیج دو۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور یہیں بیٹھے بیٹھے سادی کی تصویر کرٹل کے پاس پہنچ گئی اس نے مطلع کیا۔ ”مل گئی ہے۔“

”مجھے فتح خان سے بات کرنی ہے۔“

”تین نمبر دباؤ اس پر کھان ملے گا۔“

میں نے تین نمبر دباؤ فتح خان کی محمور آواز آئی۔ ”شہباز خان..... اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”تو پھر کس وقت یاد کروں..... ویسے سہ پہر کے تین بج رہے ہیں۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”فورا؟“ اس نے ہچکچا کر پوچھا۔

”اگر تم مصروف ہو تو کچھ دیر بعد بھی مل سکتے ہو۔“

”بہت مصروف ہے..... آہ.....“ فتح خان نے کہتے ہوئے آہ بھری اور عقب سے آئی نسوانی ہنسی نے راز فاش کیا کہ مصروفیت کی نوعیت کیا تھی۔ میں نے واکی ٹاکی بند کر دیا۔ بیٹو نے کہا۔

”شوبی ہمارے ہاتھ میں خارش ہو رہا ہے اس کا مطلب ہے مار دھاڑ ہو گا اور ہم اس میں حصہ لے گا۔“

”ظاہر ہے نہ ہم کنور پبلس پر پھول برسائے جارہے ہیں اور نہ وہ ہار پھول لے کر ہمارا استقبال کریں گے۔“

”شوبی ہم کو پیدی کا ٹکڑا ہے۔“

”مجھے بھی اس کی فکر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کنور پبلس کی مرکزی عمارت میں ہے۔“

”حلے سے پہلے تصدیق کرے گا کہ وہ وہاں ہے یا کہیں اور تو نہیں بھیج دیا ہے۔“

یہ تقدیر سیر کر سکتا تھا۔ سادی نے بتایا تھا کہ وہ بیس میں اپنے کمرے میں تھی اور وہاں اسے فون کی سہولت دی گئی تھی۔ اس سے براہ راست رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ہم نہ تو اسے کوئی اشارہ دے سکتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے کہ وہ کسی نگہانی صورت حال میں اپنے کمرے میں رہے۔ اسے تو خبر بھی نہیں تھی کہ اسے چمڑانے کے لیے ہم ہالی ووڈ کی مووی جیسا ایکشن کرنے جا رہے تھے۔ اس میں مار دھاڑ ہوتی اور نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کون بچتا اور کون مارا جاتا۔ اگر سادی کو پتا چل جاتا تو وہ یقیناً مخالفت کرتی کیونکہ وہ اپنے لیے کسی کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ تو میرے بارے میں کہہ رہی تھی کہ یہاں خطرہ تھا اور میں واپس پاکستان چلا جاؤں۔ مگر میں اس کی یہ بات نہیں مان سکتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد فتح خان آیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی جو یقیناً ناوقت شراب و شباب سے فطش کا فطری نتیجہ تھا اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے بد مزگی سے کہا۔ ”شہباز خان تم نے غلط وقت پر کال کیا۔۔۔۔۔ میرا سارا مزہ خراب ہو گیا۔“

”کوئی بات نہیں یہاں یقیناً تم پر مزے کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ بعد میں تم مزے کو وہیں سے شروع کر سکتے ہو جہاں چھوڑا ہوگا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم نے اپنے آدمیوں سے بات کی؟“

”ہاں میں نے ان کو بتا دیا ہے وہ تیاری کر رہا ہے کرنل کا آدمی ان کا تربیت کر رہا ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے، اس کا مطلب ہے تمہارے آدمی ہی میرے ساتھ ہوں گے؟“

”تم نے فرمائش کیا تو وہ پورا ہوگا۔۔۔۔۔ میں نے بتایا تھا شامہارے لیے سب کرے گا۔“

”تم نے کہا تھا اس بار تم دل سے ساتھ نہیں ہو اس کی وجہ؟“

”ہم اس خنزیر کا بچہ کرنل زریسکی کے پیچھے تھا۔ ادھر شامیب کا حکم آ گیا کہ اٹھ یا آؤ۔۔۔۔۔ ہم اس کے پاس پہنچ گیا تھا پر کیا کرتا۔۔۔۔۔ اسے چھوڑ کر ادھر آنا پڑا۔“

اب میری سمجھ میں آیا کہ فتح خان بیزاریوں تھا۔ اس کی کرنل زریسکی سے ٹھن گئی تھی۔ میں نے اسے ٹھونکنے والی نظروں سے دیکھا۔ ”صرف یہی وجہ ہے یا کوئی بات اور بھی ہے؟“

”اور کیا بات ہو سکتا ہے؟“

”اس بار تم ڈیوڈ شا کے بعد دو نمبر نہیں ہو۔۔۔۔۔ کرنل جیمز دو نمبر ہے۔“

اس کے چہرے پر ایک لمحے کو سختی آئی لیکن پھر اس نے لاپرواہی سے شانے ہلائے۔ ”ہم کو اس کا پروا نہیں ہے۔۔۔۔۔ شامیب باس ہے وہ جسے چاہے دو نمبر بنائے اور جسے چاہے دس نمبر بنا دے۔“ کہتے ہوئے فتح خان کے لہجے میں ہلکی سی تنگی آ گئی تھی۔

”اس مہم کے بعد تم واپس چلے جاؤ گے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی مجھے یہاں رکنا ہے جب تک شامیب جانے کا اجازت نہ دے۔“

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا فتح خان کو ہمالیہ والی مہم میں بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ کرنل جیمز اور اس کے آدمی بھی شامل ہوں۔ میں نے کہا۔ ”امید ہے نشی دل جی کے بارے میں جو طے ہوا تھا اس پر عمل کیا جا رہا ہوگا۔“

”تم اس کا فکرمات کرو۔ اب اس کا شامیب سے رابطہ بھی نہیں ہے۔ وہ کرنل کے پاس ہے اور ابھی اسے

ادھر ادھر جانے کا اجازت بھی نہیں ہے۔"

"وہ بہت شاطر آدمی ہے اس نے بیک وقت دونوں کنوروں کو بے وقوف بنایا وہ دونوں

اسے اپنا آدمی سمجھتے رہے جب کہ وہ صرف اپنے لئے کام کر رہا تھا۔ پھر پول کھلنے پر وہ ان کے ہاتھ نہیں آیا کامیابی سے وہاں سے فرار ہو گیا۔"

"چالاک سے چالاک آدمی بھی جب حالات کے ٹکٹے میں آتا ہے۔ تو کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر اسے معلوم ہے ڈیوڈ شا کو دھوکا دینے کی صورت میں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔" فتح خان نے سر ہلایا۔ "یہ بتاؤ تم کو کسی چیز کا ضرورت تو نہیں ہے۔"

"ابھی تک تو ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی ہے جس کے لئے خاص طور سے تمہیں کہنا پڑے۔"

میں نے کہا۔

"ادھر بہت اچھا جم اور سوئمنگ پول بھی ہے اگر استعمال کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔"

یہ اچھی خبر تھی۔ "کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" فتح خان بولا۔ جم اور پول والی عمارت اس عمارت کے عقب میں تھی اور اسی لئے

مخصوص تھی۔ سوئمنگ پول بڑا نہیں تھا مگر تیراکی کے لئے کافی تھا موسم کی مناسبت سے اس میں گرم پانی تھا۔ جم میں تمام آلات اور مشینیں تھیں۔ یہاں تیراکی کے لئے زنانہ اور مردانہ دونوں طرح کے لمبوسات دستیاب تھے۔



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
پندرہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کاشفِ دلچسپ کے قلم سے ایک تیز رفتار ایگیشن سے بھرپور ناول



PDFBOOKSFREE.PK

ایک ایک ایک ایڈورٹائزنگ، ازخیر آج تک سلسلہ

- ❖ کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- ❖ انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص مہیا ذاتیہ نظر رکھتی ہے۔
- ❖ خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفہ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی ممکن نہیں۔
- ❖ اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اس کی منتظر تھی۔
- ❖ اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مسطور تھا۔
- ❖ چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور
 فون: 37247414

علی میاں پبلیکیشنز

Email: alimian_publications@yahoo.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk